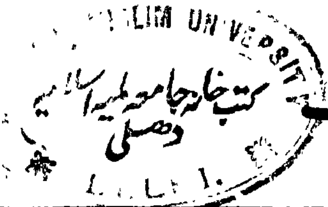


سیاست

جلد ۲	جولائی ۱۹۴۱ عیسوی	نمبر ۳

فہرستِ مضامین

تعلیم اور زندگی

از

گرچہ برہم ہے قیامت سے نظام ہست و بود
ہیں اسی آشوب سے بے پردہ اسرار وجود

تعلیم کا حقیقی مقصد ہمارے ہاں کے معلمین و اساتذۂ مدارس گو اپنے مفوضہ فرائض کی سرانجام دہی میں بڑے جوش اور گہرے انہماک کا اظہار کرتے ہیں۔ مگر حقیقی مقصد تعلیم کی طرف سے بالعموم بے اعتنائی ہی برتی جاتی ہے۔ سالانہ نصاب کی تکمیل کی دھن میں وہ اس درجہ محو ہوتے ہیں اور شاندار امتحانی نتائج کے لئے وہ اس قدر بے تابی کے ساتھ ساعی و کوشاں رہتے ہیں۔ کہ انھیں تعلیم کے حقیقی منشا پر غور و خوض کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ اتفاق سے اگر کوئی افسر معائنہ اپنے تحت کے اساتذۂ مدارس سے اس قسم کے سوالات پوچھ بیٹھے کہ آپ اپنے نزدیک تعلیم کا کیا مقصد قرار دیتے ہیں حکومت کیوں اس قدر کثیر رقوم اس مدرسہ پر اور اس جیسے دیگر تعلیمی اداروں پر بیدریغی سے خرچ کر رہی ہے، والدین کیوں اس قدر زیادہ عرصہ تک، اپنے نونہالوں کی تعلیم و تربیت پر کنبہ کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ صرف کئے جا رہے ہیں وغیرہ۔ تو شاذ ہی کوئی مدرس معین و مخصوص پیرایہ میں اپنا زاویہ نظر بیان کرنے کے قابل ہو سکے؟ بڑے بڑے ماہرین کے اقوال و نظریے

جو عام طور پر اصول تعلیم کی کتابوں میں درج رہتے ہیں۔ بے شک اکثروں کو یاد ہوں گے مگر عملی طور پر تعلیم کا حقیقی مقصد موجودہ زمانہ میں اور ہمارے مخصوص ملکی ماحول کے تحت کیا ہونا چاہیئے۔ اور اس کی تکمیل موجودہ مدارس میں کس حد تک ہو رہی ہے۔ معمولی مدرسین آسانی سے بیان نہیں کر سکیں گے۔ ملک و قوم کا حقیقی نقطۂ نظر اور صحیح نصب العین کیا ہے۔ اس کی خاطر خواہ طور پر کس طرح تکمیل ہو سکتی ہے۔ بہت کم مدرسین بتا سکیں گے۔

بیشک یہ عام جواب تو آسانی سے مل سکے گا۔ کہ بچے کو آیندہ زندگی کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ مگر یہ جواب نہ صرف مبہم اور گول مول سا ہی ہے۔ بلکہ بہت بڑی حد تک گمراہ کن بھی ہے۔ مبہم اس وجہ سے ہے کہ زندگی کی تیاری کا مفہوم صحیح طور پر شائد ہی کوئی سمجھتا ہو۔ ایسی تیاری سے مراد بالعموم آیندہ زندگی میں سرکاری ملازمت لی جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مدرسہ تحتانیہ میں داخلہ پانے والے طلبار کا ایک فیصد حصہ بھی سرکاری ملازمت پانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور گمراہ کن اس وجہ سے ہے کہ ابتدا سے ہی تعلیم کا مقصد آئندہ زندگی کی تیاری قرار دے لیا جاتا ہے۔ اور اسی بنا پر مدرسہ ابتدائیہ یا تحتانیہ میں بچوں کو عام طور پر ان ہی معلومات۔ حسابات۔ تجربات اور مسائل سے واقف کرانے کی ٹھانی جاتی ہے جو آئندہ زندگی میں کارآمد و مفید ثابت ہو سکیں۔ خواہ ایسی باتوں میں بچے کو کوئی دلچسپی ہو یا نہ ہو۔ اسے طوعاً و کرہاً انھیں رٹنا ہی پڑتا ہے۔ خواہ یہ باتیں اس کی فہم و استعداد سے بالاتر ہی کیوں نہ ہوں۔ اسے ضرور حفظ کرنی چاہییں۔ بالفاظ دیگر اس کا یہ مطلب ہے کہ بچے کو اپنا بچپن قطعاً بھلا کر ایک دم بلوغ و جوانی کے دھندوں میں لگنا یا انھیں زبردستی سے اپنے غور و فکر کا مرکز بنانا پڑتا ہے۔ جو صریحاً بے راہ روی کی دلیل ہے۔ اس طرح سے بچے کی ذاتی اور فطری دلچسپیوں کو بالغوں کے نقطۂ نظر کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔ اور بلا لحاظ سخت اور مشکل ذرائع اختیار کئے جا کر اسے اہم تجربات زندگی کا علم بہم پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کی موجودہ مسرتوں اور

دلچسپیوں کا مطلقاً لحاظ نہ رکھ کر صرف آیندہ کی موہوم ضروریات کے مدنظر جن کا تعین بھی خود بالغ حضرات ہی اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے کرتے ہیں۔ اسے تعلیم دی جاتی ہے۔ نصاب کی تدوین مسئلہ صوری تربیت اور منطقی و نفسیاتی ترتیب مضامین کے ضمن میں ہم ایسی بہت سی غلطیوں کی وضاحت دوسرے موقع پر کر چکے ہیں۔ زمانۂ حال کے ماہران تعلیم جدید اور محققین علم اطفال بڑے زور سے اس طرز عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے اور آئندہ زندگی کی بجائے مدرسہ تحتانیہ کا مقصد بچے کی موجودہ زندگی کو عمدگی اور خوش اسلوبی سے بسر کرنے کے قابل بنانا قرار دیتے ہیں۔

زندگی کے ساتھ مطابقت

مدعائے تعلیم کے ضمن میں ہم بخوبی وضاحت کر آئے ہیں۔ کہ تعلیم کا حقیقی مقصد زندگی سے مطابقت پیدا کرنے کے قابل بنانا ہے۔ یعنی بچے کو مکمل طور پر زندگی بسر کرنے کے قابل بنانا ہمارے پیش نظر ہونا چاہیئے۔ زندگی کی مطابقت کی وضاحت کرتے ہوئے ہم نے سب سے پہلے کسی پیشہ کی تربیت کو مقدم قرار دیا تھا۔ اور فی الحقیقت پیشہ وری تربیت کے بغیر ہر کس و ناکس کے لئے عام اور ادبی تعلیم کا انتظام کرنا صحیح راہِ عمل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا نظام تعلیم جس میں پیشہ وری تربیت کا خاطر خواہ انتظام نہیں پایا جاتا۔ اور جس میں تمام اقسام کے افراد کو اپنی مخصوص ذہنی قابلیتوں کے لحاظ سے پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کے مواقع حاصل نہیں ہیں سخت بدنام ہو رہا ہے۔ بلکہ موجودہ خلفشار و ابتری اور معاشی بدحالی و بے روزگاری کی تمامتر ذمہ داری اسی پر عائد کی جارہی ہے چنانچہ مشرق کے شاعر اعظم نے اس خصوص میں کیا پتے کی بات اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں کہی ہے

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

بدیں لحاظ ہمارا نظام تعلیم جس میں سراسر ادبی و کلچری تعلیم کا ہی انتظام ہے اور

علی زندگی کی تیاری سے جسے بہت کم سروکار ہے۔کبھی مستحسن متصور نہیں ہوسکتا۔اور جب تک اس میں ہر قسم کے افراد کے لئے عملی زندگی کی تیاری کا لوازمہ نہ پایا جائے۔اسے موزوں اور صحیح نہیں کہہ سکتے۔خوشی کی بات ہے کہ اب ہر طرف اسے پورے طور پر خود مکتفی اور حقیقی طور پر عملی بنانے کی اسکیمیں بنائی جارہی ہیں۔

ہر نئی تعمیر کو لازم ہے تخریب تمام
ہے اسی میں مشکلات زندگانی کی کشود (اقبال)

نظام تعلیم میں ملک کے مخصوص حالات کا لحاظ

موزوں نظام تعلیم کی تشکیل و تنظیم ملک کے مخصوص حالات کے تحت ہونی چاہئیے۔جس طرح کہ ایک طبیب کے لئے اپنے مریض کی طبیعت و مزاج سے آگاہی حاصل کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح ایک ماہر تعلیم کے لئے ملک کے عام حالات اور دیگر کوائف سے واقفیت حاصل کرنا ناگزیر ہے۔جس طرح کہ ایک ہی دوا انگریز۔جرمن۔امریکی اور جاپانی مریضوں کے لئے یکساں طور پر مفید و موثر نہیں ہوسکتی۔اسی طرح ایک ہی قسم کا نظام تعلیم تمام ممالک کے لئے یکسانیت کے ساتھ موزوں و موافق نہیں ہوسکتا۔چنانچہ انگلستان۔امریکہ۔جرمنی۔اور جاپان میں سے ہر ایک نے اپنے مخصوص حالات کے تحت اپنا اپنا نظام تعلیم علیحدہ تجویز کر رکھا ہے اور وقتاً فوقتاً انہی حالات کے تحت ضروری اصلاحیں عمل میں لائی جاتی ہیں۔بدیں لحاظ ہمارے لئے بالکلیہ جاپان یا جرمنی۔انگلستان یا امریکہ اور روس یا ترکی کا نظام تعلیم اختیار کرنا ہرگز سودمند نہیں ہوسکتا۔اسی طرح ہمارا ملک ہندوستان چونکہ ایک بڑا وسیع برّ اعظم ہے۔اور مشرق و مغرب یا شمال و جنوب کے صوبوں میں ایک ہی طرح کے حالات وخصوصیات نہیں پائے جاتے۔اس لئے ہر کہیں ایک ہی طرح کا نظام تعلیم نافذ کرنا مصلحت اندیشی کے سراسر خلاف ہے۔تاہم ہندوستان بحیثیت مجموعی ایک زراعتی ملک ہے۔جس میں ساٹھ فیصدی سے زیادہ زراعت پیشہ لوگ آباد ہیں صنعت

وحرفت اور تجارتی کاروبار کے اعتبار سے دیگر متمدن ممالک سے بہت پیچھے ہے۔ باشندے مذہب کے دلدادہ اور مذہبی تفریق کے ازحد شائق ہیں۔ ہر ہر صوبے میں مختلف نسلیں اور فرقے پائے جاتے ہیں۔ اور کئی ایک صوبوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ قومی نصب العین گو عام طور پر اور مبہم پیرایہ میں قومی عروج وترقی بیان کیا جاتا ہے۔ مگر فرقہ واریت کا بھوت عام طور پر مسلط ہونے کے اعتبار سے ہر فرقہ اپنے ہی مفاد کو آگے بڑھانے اور اپنے ہی فرقہ والوں کو تفوق وبرتری دلانے پر تلا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ تمام رہنما اور مدبرین صنعت وحرفت اور تجارتی کاروبار کو ملک کی عام فلاح وبہبود کے لئے ضروری وناگزیر سمجھتے ہیں۔ فرقہ واریت کی تفریق وانتشار کو مٹانا اور لسانی وسماجی اعتبار سے ایک متحدہ قوم کی داغ بیل ڈالنا ملک کے سچے بہی خواہوں۔ ذمہ دار مدبروں اور سیاسی رہنماؤں کے نزدیک اولین نصب العین ہے جس کی تکمیل موزوں نصاب اور صحیح طریقہ تعلیم کے ذریعہ سے بڑی حد تک ہوسکتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ زراعتی ترقیوں اور ان سے متعلقہ دیہی سرگرمیوں کو بھی خاصی توجہ دینی ہوگی۔ ملک کے ان سب مخصوص حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمارا قومی نظام تعلیم تجویز کیا جانا چاہئے۔ تاکہ ہر فرد کو اپنے مخصوص حالات کے تحت ترقی کے مدارج طے کرنے اور بخوبی پھلنے پھولنے کے مواقع دستیاب ہوسکیں۔ خوشی کی بات ہے کہ اب متعدد حلقوں میں ہمارے ہاں کے نظام تعلیم کی خامیوں کا احساس بڑی شدت سے ہونے لگا ہے۔ اور ملک کی عام معاشی ابتری اور بڑھتی ہوئی بے روزگاری کا اسی کو ذمہ دار گردانا جارہا ہے۔ تدوین نصاب اور پیشہ وری تعلیم کے ضمن میں ہم گزشتہ ابواب میں ہی موزوں نظام تعلیم کی وضاحت کر آئے ہیں۔ اس لئے یہاں پر اب موجودہ بے روزگاری کے اسباب اور چارۂ کار سے بحث کرکے مجوزہ نظام تعلیم کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔

بے روزگاری کے اسباب اور ان کا چارۂ کار (۱) پیشہ وری تربیت کا فقدان۔

ایسے بچے جو بوجہ مفلسی و کم استطاعتی اعلیٰ تعلیم کی جانب رخ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ مدرسہ تحتانیہ سے نکل کر آوارہ گردی کرنے کے سوائے اور کوئی راہ نہیں پاتے۔ ادنیٰ مزدوروں کی طرح محنت و مشقت سے کام کرنا ان کے لئے دوبھر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ بچے جو گرتے پڑتے مدرسہ ثانویہ کی چند جماعتوں کی تعلیم سے بہرہ یاب ہونے کے بعد بوجہ کم استعدادی یا معاشی مشکلات کے اپنے سلسلۂ تعلیم کو توڑنے پر مجبور ہوتے اور میٹرک کی کامیابی سے ہمکنار ہونے سے پہلے ہی مدرسہ کو خیرباد کہہ دیتے ہیں اور بھی زیادہ زبون حالی و ابتری کا شکار ہوتے ہیں۔ ادھوری ثانوی تعلیم سے بہرہ ور ہونے کی حیثیت سے یہ اپنے باپ دادا کے معمولی دھندوں مثلاً کاشتکاری۔ سنجاری۔ معماری۔ خیاطی۔ اصلاح سازی وغیرہ میں پڑنا اپنی شان کے خلاف اور باعث عار سمجھتے ہیں۔ گویا کہ یہ گھر کے رہتے ہیں نہ گھاٹ کے۔ آوارہ گردی میں پڑ کر طرح طرح کے جرائم کے مرتکب ہوتے اور بے چارے افراد کو گوناگوں مصائب و آلام میں مبتلا کرتے ہیں۔ حکومت کے لئے بھی یہ نت نئی مشکلات پیدا کرتے اور ناجائز انجمنوں اور خلاف قانون اداروں میں شرکت کر کے ملک کے امن و امان کو درہم برہم کرتے ہیں۔ اگر ملک میں ایسا موزوں نظام تعلیم ہو جس کی رو سے ہر تعلیمی منزل پر مختلف دھندوں اور پیشوں کی تربیت کا معقول انتظام ہو سکے۔ تو ایسی خرابیوں اور قباحتوں کا خود بخود سدباب ہو جاتا ہے۔ اسی لئے زمانہ حال کے مدبران اپنی اپنی حکومتوں کو پُر زور الفاظ میں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ جیلوں اور تادیب خانوں کے اخراجات کم کر کے اور مختلف قسم کی عدالتوں اور پولیس کی خدمات کو گھٹا کر موزوں پیشہ وری تربیت کے مصارف بڑی فراخدلی اور خندہ پیشانی سے برداشت کئے جانے چاہیں۔

ان حضرات کو جو ابتدائی تعلیم کو جبری اور لازمی کرنے کے حق میں ہیں یاد رہنا چاہئے کہ محض ابتدائی تعلیم کو عام کرنا ہمارے ملک کی خوش حالی کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ پیشتر اس کے کہ اس طرف کوئی عملی قدم اٹھایا جائے۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ موزوں پیشہ وری

تربیت کا کوئی خاطر خواہ اور معقول انتظام عمل میں لائیں ورنہ مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر موجودہ زبون حالی اور معاشی خلفشار میں اور بھی اضافہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ ہندوستان بہت ہی مفلس و نادار اور زراعتی ملک ہے۔ کسی طرح بھی یہ انگلستان جرمنی امریکہ اور جاپان جیسے صنعتی و تجارتی ممالک کا جہاں ہر فرد کو محنت و مزدوری سے پیٹ پالنے اور گزر بسر کے وزائع حاصل کرنے میں بڑی حد تک فراغت و سہولت ہے۔ مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اکثر و بیشتر باشندے یہاں پر ابھی تہذیب و تمدن کے اوّلین مرحلہ پر ہی ہیں اور دو وقتہ نان جویں حاصل کرنا ان کے لئے سخت مشکل و دشوار ہے۔ اس لحاظ سے یک بیک تمام طبقات کے بچوں کے لئے ابتدائی تعلیم لازمی گردانا دیگر ممالک کی اندھی تقلید متصور ہوگی۔ اس لئے اول شہری اور بلدی علاقوں میں اس کا نفاذ ہونا چاہیئے۔ اور وہاں بھی بہت نادار و قلاش طبقوں کو شروع شروع میں اس سے مستثنیٰ کرنا ہی ضروری ہوگا۔ کیونکہ متعدد پست اقوام ۵-۶ سال تک اپنے بچوں کی پرورش و نگہداشت کے مصارف خوراکی و پوشاکی برداشت کرنے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہوں گے۔ اور حکومت کے خزانہ میں اس قدر وافر گنجائش بھی نہیں ہے کہ ان کے ہمہ اقسام کے اخراجات پورے کئے جاسکیں

(۲) جامعی تعلیم کی بیجا آزادی:۔ ملک میں موزوں پیشہ وری تربیت کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے ہر کس و ناکس بی۔اے اور ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرنا ہی اپنا مطمع نظر قرار دیتا ہے۔ کہ اس طرح سے سرکاری ملازمت کا پروانہ حاصل کرکے وہ کسی اعلیٰ حکومتی خدمت پر آسانی سے فائز ہوسکے گا۔ مگر ظاہر ہے کہ سرکاری خدمات اس قدر وافر نہیں ہوتیں کہ گریجویٹوں کی پوری تعداد کی سمائی ہوسکے۔ سرکاری محکموں کی خاک چھاننے کے بعد ان کے لئے کسی قسم کے صنعتی و زرعی کاروبار میں حصہ لینا سخت دشوار و دوبھر ہوتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ایسے ہاتھ کے کام کے دھندوں میں ان کی سمائی ہی نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ متعدد و اعلیٰ تعلیم یافتگان بعض ایسے کام کرنے سے ہچکچاتے اور پس و پیش کرتے ہیں۔ جو دوسرے

خوشی خوشی سرانجام دیتے ہیں۔ انہی وجوہ کی بنا پر تجارتی کاروبار میں بھی انہیں داخلہ ملنا امحال ہے۔ اور گو اب گریجویٹوں نے اپنا معیار تنخواہ بیس پچیس روپیہ تک بھی گھٹا دیا ہے۔ مگر پھر بھی بے شمار ڈگری یافتہ نوجوان حیران و سرگردان مارے مارے پھر رہے ہیں۔ چنانچہ گریجویٹوں میں بعض بہت ہی ادنیٰ قسم کی دوکانیں کھولنے پر اتر آئے ہیں۔ کئی ایک پولیس کے کانسٹیبلوں میں بھرتی ہو رہے ہیں اور اکثر و بیشتر اپنے غریب والدین یا بھائی بندوں کی محدود کمائی و گزران پر اچھا خاصا بوجھ بنے بیٹھے ہیں یا باپ دادا کی پیدا کی ہوئی جائدادیں بیچ بیچ کر پیٹ پال رہے ہیں۔ ملک کی اس پریشان کن صورت حال پر فلسفی شاعر اعظم کا شعر کس قدر صادق آتا ہے ؎

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ (اقبال)

اسی کی وجہ سے بیشمار جماعتی برائیاں اور سیاسی الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں۔ حکومت کا فریضہ ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے۔ اس صورت حال کا پوری چھان بین کے ساتھ جائزہ لے۔ اور نہ صرف ملک میں موزوں پیشہ وری تربیت کا نظام ہی نافذ کرے بلکہ جامعی تعلیم پر تحدیدات قائم کر کے صرف اعلیٰ ادبی استعداد والوں کو ہی اس سے بہرہ ور ہونے کا موقع دے۔ ایسے گریجویٹ جو پچاس فیصدی سے کم نشانات پاکر ڈگری پانے کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ یقیناً غلطی سے جامعی تعلیم کا رخ کرتے تھے۔ میٹرک کی کامیابی کے بعد ہی اگر یہ نوجوان کسی موزوں پیشہ کی تربیت میں لگائے جاتے تو یقیناً اس قدر گھاٹے میں نہ رہتے۔ بدیں لحاظ اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ یونیورسٹی کے داخلہ پر مناسب تحدید عائد کی جائے۔ ایک سو سے کم ذہنی خارج قسمت والوں کو یونیورسٹی میں داخل کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔ ایسے نوجوان بلاشبہ کسی دوسرے پیشہ کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوں گے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں عموماً ہر شعبہ زندگی میں ایک قسم کی بھیڑ چال سی پائی جاتی ہے۔ بڑے بڑے

زمیندار اور مہاجن بھی جو گھر پر بہت عمدہ کاروبار کے کافی اور وافر ذرائع رکھتے ہیں۔ اپنے بچوں کو خواہ مخواہ بلالحاظ ذہنی استعداد جامعی تعلیم کی طرف ڈھکیل رہے ہیں۔ اس کے لئے مؤثر تدبیر یہی ہوسکتی ہے کہ میٹرک کے امتحان میں پچاس فیصدی سے کم نشانات حاصل کرنے والوں کو کسی طرح بھی یونیورسٹی میں داخل نہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ عوام کی مناسب روک تھام کے لئے یہ چارہ کار اختیار کرنا بھی ضروری ہے کہ سرکاری ملازمت کی ماتحت سرویسوں اور معمولی آسامیوں مثلاً پولیس۔ جنگلات۔ آبکاری۔ صفائی۔ چنگی وغیرہ کی سب انسپکٹری اور محکمہ جات رسل و رسائل اور دیگر دفاتر کی محرریوں کے لئے ۱۸ سال کی عمر کی تحدید قائم کردی جائے۔ تاکہ میٹرک کی کامیابی کے عین بعد ہی موزوں نوجوان اپنے اپنے مذاق کے مطابق کسی ایک طرف رخ کرکے جامعی تعلیم کی تضیع سے نجات پاسکیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ حکومت کی جانب سے پیشہ ورانہ رہنمائی کے موزوں ادارے ہر ہر ضلع کے صدر مقام پر قائم کئے جائیں۔ تاکہ آئندہ ہونے والے شہریوں اور ان کے ناتجربہ کار سرپرستوں کو ادھر ادھر بھٹکنے اور بے راہ روی اختیار کرنے سے بچائیں۔ اس تجویز پر عمل کرنے سے حکومت کے مالیہ پر بھی کچھ زائد بار عائد نہیں ہوگا۔ کیونکہ ملک کا جو روپیہ بیجا طور پر جامعی تعلیم کی بے نتیجہ توسیع و اشاعت پر صرف ہو رہا ہے۔ پیشہ ورانہ تربیت اور رہنمائی کے اداروں پر آسانی سے منتقل کیا جاسکے گا۔ اور نتیجہ کے طور پر بیکاری و بے روزگاری کی مصیبتوں کا ہی نہ صرف خاتمہ ہوگا۔ بلکہ ملک میں جو غیر آئینی انجمنیں قائم ہو جاتی ہیں۔ اور خلاف قانون سرگرمیاں جو پائی جاتی ہیں۔ اور جو حکومت اور امن پسند شہریوں کے لئے موجب سخت پریشانی و حیرانی ثابت ہوتی ہیں یکسر معدوم ہو جائیں۔

علاوہ ازیں یہ احتیاط بھی ضروری ہے کہ پیشہ ورانہ تربیتی اداروں کے داخلہ پر بھی مثل جامعی تعلیم کے ضروری تحدیدات عائد کئے جائیں۔ تاکہ کسی مخصوص پیشہ کے تربیت یافتگان کی تعداد مناسب حدود سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ حکومت ہند نے چند سال قبل

انگلستان کے ماہر صنعتی تعلیم مسٹر ایبٹ سے جو عام بے روزگاری کی محققانہ چھان بین کروائی ہے اس میں صاحب موصوف نے زیادہ تر اسی بات پر زور دیا ہے کہ بعض مخصوص پیشوں اور صنعتوں کے تربیت یافتہ افراد حقیقی کھپت سے بہت زیادہ ہیں۔ اور ملک میں صنعتی کاروبار بہت محدود ہونے سے وہ موزوں روزگار حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ہر شعبۂ حیات میں کمیابی کی ہی قدر ہوتی ہے اور جب کسی شئے کی فراوانی حد سے متجاوز ہو جاتی ہے۔ تو اس کی وقعت بہت گھٹ جاتی ہے۔ چنانچہ شروع شروع میں وکالت اور ڈاکٹری کو محض اس وجہ سے اچھا خاصا فروغ حاصل تھا۔ کہ ان معزز پیشوں میں صرف معدودے چند اعلیٰ قابلیت کے افراد ہی پڑتے تھے۔ مگر جب عام وخاص محض ڈگریوں کے بل بوتے پر بلا لحاظ فطری ذوق و استعداد جوق در جوق ادھر آنے لگے۔ تو ان کی قدر وقیمت بہت بڑی حد تک گھٹ گئی۔ چنانچہ آجکل وکیلوں اور ڈاکٹروں میں بمشکل دس فیصدی ایسے خوش نصیب حضرات ہوں گے۔ جو خوش حالی و فارغ البالی سے اپنے پیشوں میں بلا شکوہ وشکایت لگے ہوئے ہیں۔ ورنہ باقیماندہ تمام اپنے شتابکارانہ انتخاب کا آہیں بھر بھر کر دکھڑا رو رہے ہیں۔

(۴) متوسط طبقہ پر دوطرفہ یورش۔ گو ایک حد تک دیگر ممالک میں بھی مگر ہمارے ہاں بڑی تیزی و تندی کے ساتھ متوسط طبقہ پر دو طرف سے یورش ہو رہی ہے یعنی اعلیٰ اور پست طبقوں میں اچانک معاشی برتری اور روزگاری ترقی کا خیال پیدا ہو گیا ہے۔ بڑے بڑے متمول امراز میندار اور سیٹھ مہاجن اوپر سے اور ادنیٰ و پست طبقہ کے افراد نیچے سے متوسط طبقے کے روزگاری کاروبار اور دھندوں میں گر پڑے ہیں۔ اعلیٰ اور امیر گھرانوں کے افراد آج سے چند سال پیشتر ٹھیکہ کے کاروبار تجارتی سرگرمیوں اور معاشی دھندوں کی مصروفیات کو اپنے لئے باعث عار سمجھتے تھے۔ مگر آج کل چھوٹی بڑی کمپنیوں کے حصے خریدنا۔ چھوٹے بڑے تجارتی سودے کرنا۔ ٹھیکے لینا۔ دوکانیں۔ فرمیں اور شاخیں کھولنا بلکہ سرکاری ملازمتیں قبول کرنا زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کے تحت ان کے لئے ضروری و ناگزیر ہو گیا ہے۔ اسی طرح

پست طبقوں کے افراد جو ابتک گھریلو اور زراعتی دھندوں اور خانگی ادنیٰ ملازمتوں پر ہی قناعت کئے بیٹھے تھے اب یک بیک نہ صرف ہمہ اقسام کی سرکاری ملازمتوں پر ہی قبضہ جمارہے ہیں۔ بلکہ ملک کے چھوٹے بڑے صنعتی و تجارتی کاروبار۔ حرفتی مشاغل اور دوسرے منفعت بخش کاموں میں بھی بڑی سرعت کے ساتھ گھستے چلے آرہے ہیں۔ اور اس طرح سے ملک کے محدود معاشی وسائل کو دن بدن تنگ کرتے جارہے ہیں صاف ظاہر ہے کہ جو وسائل معاش کچھ عرصہ پہلے صرف ایک سو خاندانوں کے لئے روزی مہیا کرتے تھے۔ اب دو سو خاندانوں کے لئے بھی کافی و کفیل نہیں ہو سکتے۔ تاہم ایسی صورت حال سے گھبرانے یا ڈرانے کی بجائے اس کے مناسب حال موزوں چارہ کار اختیار کرنا چاہیئے۔ یہ تو عام ملکی بیداری اور ہمہ جہتی ترقی و فروغ کے علامات ہیں۔ البتہ حکومتی مدبروں اور سیاسی رہنماؤں کو اس سے بخوبی نپٹنے کے لئے ضروری تدابیر اختیار کرنی چاہیں۔ یعنی وسائل معاش کو بڑھا کر المضاعف کردیا جائے۔ ان میں سے چند ایک کی ہم آئندہ اوراق میں ضمناً وضاحت کریں گے۔

(۴) **صنعتی و تجارتی کاروبار کا ناکافی ہونا**۔ مغربی تمدن اختیار کرنا اور معیار زندگی بلند کرنے میں گو ہمارا ملک بہت تیزی و سرعت کے ساتھ ترقی کرتا جارہا ہے مگر افسوس کہ سوائے چند صنعتی اشیاء کے باقیماندہ تمام ضروریات زندگی کی چیزیں بیرونی ممالک سے ہی منگوانی پڑتی ہیں جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ملک میں صنعت و حرفت کے کارخانوں کے لئے ابھی بہت بڑا وسیع میدان موجود ہے۔ اور اگر وسیع پیمانے پر صنعت و حرفت کے کارخانے قائم کئے جائیں تو وہ بخوبی چل سکتے اور ملک سے بے روزگاری کو بڑی حد تک دور رکھنے میں مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں۔ ملک میں پیشہ ورانہ تعلیم و تربیت کا نفاذ عمل میں لانے کے ساتھ ساتھ اگر حکومت اور بڑے بڑے سرمایہ داروں کی جانب سے ایسے کارخانے جابجا کھولے جائیں۔ تو یقیناً بہت سے تربیت یافتہ نوجوانوں

کو آسانی سے موزوں روزگار حاصل کرنے کے مواقع مل سکیں گے۔ ورنہ ان کے بغیر محض پیشہ ورانہ تربیت کا اہتمام کرنا بالکل ایسا ہی مضحکہ خیز ہوگا۔ جیسا کہ سمندر سے دور کسی صحرائی یا ریگستانی علاقے میں جہاز اور کشتیاں بنا کر بحری بیڑہ تیار کرنا۔ اس کے لئے حکومت کے محکمہ صنعت و حرفت کے زیر نگرانی اگر مشترک سرمایہ کی کمپنیاں قائم کی جائیں تو وہ آسانی سے ایسے بہت سے کارخانوں کو جاری کر سکیں گی اور جب ملک کے چھوٹے بڑے سرمایہ دار انہیں پھلتا پھولتا دیکھیں گے۔ تو خود بخود ہی اپنے ذاتی کارخانے قائم کرنے پر مائل ہو جائیں گے۔ ملک کی آئندہ خوشحالی کے لئے یقیناً یہ نیک فال ہے کہ اب ہمارے ہاں شکر۔ کاغذ۔ کپڑا۔ چمڑہ۔ اون وغیرہ کے متعدد کارخانے کھل رہے ہیں۔ مگر ملک کی وسعت کے اعتبار سے بہت کم اور ناکافی ہیں۔ جب تک صوبہ داری حکومتیں اور ان کے محکمہ جات صنعت و حرفت بڑے تردد سے اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیں گے۔ اور اپنے زیر نگرانی مشترک سرمایہ کی کمپنیاں قائم کر کے عملی اقدام نہیں کریں گے۔ ان کی رفتار ترقی ملک کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے اور بے روزگاری کا ازالہ کرنے کے لئے کافی و مؤثر متصور نہیں ہو سکتی۔

(۵) ملک میں بھاری شرح سود کا عام رواج :- ہمارے ہاں کاشتکاروں تاجروں۔ صناعوں اور چھوٹے موٹے کارخانہ والوں کو اپنے کاروبار کے لئے جب روپیہ قرض لینے کی ضرورت پڑتی ہے تو مجبور آساہوکاروں سے بڑی بھاری شرح سود پر قرضہ لیتے ہیں۔ یہ شرح سود عموماً ۲۴ فیصدی اور بعض صورتوں میں ۳۰ بلکہ ۳۶ فیصدی تک بھی بڑھ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے کاروبار میں اس قدر بھاری سود کی پابجائی کرنا سخت دشوار ہوتا ہے۔ اور اکثر صورتوں میں خسارہ بلکہ دیوالہ کی نوبت آجاتی ہے۔ ایسی متعدد صورتوں سے دہشت زدہ ہو کر بہت سے جوشیلے اور بلند عزائم رکھنے والے اہل اشخاص کو بھی کوئی ایسا کاروبار کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اگر حکومت کی جانب سے تمام شہری اور دیہی علاقوں میں بڑے وسیع پیمانہ پر اتحادی بنک کھول دیے جائیں جن سے واجبی

شرح سود پر کاروباری اشخاص۔ زمینداروں اور کاشتکاروں کو آسانی و سہولت کے ساتھ قرضہ مل سکے۔ تو یقیناً ایسے کاروبار کو بہت فروغ ہوگا۔ ملک میں بہت جلد ہی جا بجا بہت سے کارخانے قائم ہو جائیں گے اور معاشی بدحالی بڑی حد تک گھٹ جائے گی۔ اس کے علاوہ بھاری شرح سود کو اعتدال پر لانے کے لئے حکومت کو قانونی پابندیاں بھی عائد کرنی چاہئیں۔ خوشی کی بات ہے کہ بعض ترقی یافتہ صوبوں اور ریاستوں میں ساہوکارہ بل کا نفاذ عمل میں آچکا ہے جس کی رو سے سود کی انتہائی شرح بارہ روپیہ سالانہ سے متجاوز نہیں ہو سکتی۔ ضرورت ہے۔ کہ اسی طرح تمام ملک میں بڑی جدوجہد کے ساتھ مناسب کارروائی عمل میں لائی جائے اور قانونی حدبندیاں قائم کی جاکر بھاری اور ناقابل برداشت شرح سود کو گھٹایا جائے۔ اس کے ساتھ ہی سرمایہ داروں کی ذہنیت کو بدلنے کے لئے بھی ضروری تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں۔ تاکہ انھیں بخوبی معلوم ہو سکے۔ کہ مناسب اور واجبی شرح سود مقرر کرنے سے ان کا بہت سا روپیہ سود پر چڑھ سکتا اور قرض کے ڈوب جانے کا احتمال بڑی حد تک گھٹ جاتا ہے۔ زمانہ حال کے پرچار اور پروپیگنڈے کے عصری ذرائع ریڈیو۔ سینما۔ رسالوں۔ اخباروں۔ لیکچروں اور تعلیمی ڈراموں کے ذریعہ ملک کو بخوبی آگاہ کیا جائے کہ روپیہ کی گردش سے ہی زیادہ منافع حاصل ہو سکتا ہے۔ دولت کو ایک ڈھیر کی شکل میں جمع رکھنے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ افسوس کہ ہمارے ہاں کی یہ دقیانوسی ذہنیت ابھی کچھ بھی نہیں بدلی۔

(۶) بنجر اور غیر مزروعہ علاقوں کی طرف سے بے اعتنائی۔ سب جانتے ہیں کہ ہندوستان پورے طور پر زراعتی ملک ہے۔ مگر افسوس کہ آبادی کے اضافہ کے ساتھ ساتھ مزروعہ رقبہ میں کچھ قابل لحاظ اضافہ نہیں ہوتا۔ متعدد وبیشتر علاقے ابھی بنجر و ویران پڑے ہیں۔ اگر حکومت کی جانب سے ذرائع آبپاشی کی توسیع عمل میں آئے۔ نہروں اور تالابوں کی تعمیر پر ملک کی وسعت کے شایان شان توجہ کی جائے اور غیر آباد بنجر علاقوں اور غیر مزروعہ اراضیات کو

آباد کرنے کے لئے تربیت یافتہ نوجوانوں کو تھوڑی سی حکومتی امداد کے ساتھ آمادہ کیا جائے کہ وہ سائینٹفک طریقہ پر زراعتی کاروبار میں حصہ لیں تو بہت پڑھے لکھے نوجوانوں کو آسانی سے روزگار میسر آسکتا ہے۔ زراعتی کالج کے ہر فارغ التحصیل نوجوان کو دس بیس ایکڑ کا رقبہ دے کر حکومت کی جانب سے بلاسود قرضہ دینے کے اسکیمات جس قدر جلد ہوسکیں ہر ہر صوبے میں نافذ کئے جانے چاہییں۔ چنانچہ پنجاب میں تجربہ کے طور پر ایسا عملدرآمد شروع ہوچکا ہے اس طرح سے نہ صرف ملک سے بے روزگاری کا دفعیہ کرنے میں ہی سہولت ہوگی بلکہ ملک کی پیداواری اہلیت میں بھی قابل لحاظ اضافہ ہوجائے گا اور حکومت کی آمدنی بڑی حد تک بڑھ جائے گی۔

(۷) بیجا اسراف اور فضول خرچی:۔ ہمارے ہاں چھوٹے اور بڑے بڑی بیدریغی سے مسرفانہ طور پر بہت سا روپیہ فضولیات و بیجا تکلفات میں صرف کر دیتے ہیں۔ جب تک اس کی خاطر خواہ طور پر روک تھام نہ ہو۔ بے روزگاری کا قلع قمع ہونا دشوار ہے۔ مدارس میں بعض طلباء کا فاخرانہ لباس کسی طرح بھی قابل نظر اندازی متصور نہیں ہوسکتا۔ امیر و متمول طلباء کے دیکھا دیکھی متوسط اور کم استطاعت طبقہ کے طلباء بھی بیش قیمت کپڑوں کے تقاضوں سے اپنے والدین اور سرپرستوں کا ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ طالب علموں کے لئے کسی قسم کا بیش قیمت لباس کم از کم حدود مدرسہ کے اندر جائز نہیں رکھا جانا چاہیئے۔ ارباب مدرسہ کو چاہیئے کہ اس کی ضروری روک تھام کے لئے مناسب قواعد مرتب کریں۔ اسی طرح کالجوں میں کھانے پینے اور پہننے پر طلباء بہت ہی بیجا طور پر خرچ کرتے ہیں۔ والدین اور طلباء کو یہ بخوبی معلوم ہے۔ کہ آجکل ایک گریجویٹ بڑی مشکل سے بھی چالیس پچاس روپیہ ماہوار نہیں کماسکتا۔ ایسی صورت میں یہ کس قدر ستم ظریفی ہے۔ کہ زمانہ طالب علمی میں کالج کے طلباء ماہانہ پچاس ساٹھ روپیہ خرچ کرکے اپنے مذاق بسر بر د کو ہمیشہ کے لئے بگاڑ لیتے ہیں۔ حال ہی میں پنجاب کے ایک بڑے کالج کے پرنسپل نے اپنے ہاں کے ایک طالب علم کو موٹر میں آنے کی

ممانعت کرکے اس ضرورت کا عام احساس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ زمانہ طالب علمی میں طلباء کے رہنے سہنے کے طریقوں پر واجبی تحدیدات عائد کی جانی ضروری ہیں۔ ملک میں اگر ہر کہیں اسی احساس کے تحت تمام تعلیمی اداروں میں ارباب تعلیمات کی جانب سے ضروری انتظامات عمل میں لائے جائیں۔ اور سادہ زندگی بسر کرنے کی اہمیت طلباء کے بخوبی ذہن نشین کی جائے تو بہت عمدہ اور مفید نتائج برآمد ہوں گے۔ کیونکہ زمانہ طالب علمی میں اس قدر بے دریغی سے خرچ کرنے والے تعلیم یافتہ جب عملی زندگی میں گامزن ہوتے اور کسی کسب معاش کے دھندے کی جستجو میں پھرتے ہیں۔ تو معمولی سی آمدنی کو خاطر میں نہ لاکر گھر پر بیکار بیٹھے رہنا ہی گوارا کر لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ دیگر تعلیمی اخراجات میں بھی بڑی حد تک تخفیف عمل میں لائی جانی چاہیئے۔ تاکہ بعض غریب ونادار طلباء کو جو اپنی اعلیٰ ذہنی استعداد اور ادبی ذوق کی بناء پر جامعی تعلیم پانے کی خاصی صلاحیت رکھتے ہیں محض اخراجات کی زیادتی کی بناء پر اس سے محروم نہ رہنا پڑے۔ چھوٹوں کے علاوہ بڑوں کے مسرفانہ اخراجات پر بھی تحدیدات عائد کرنا ملکی عام فلاح وبہبود کے لئے ازبس ضروری ہے۔ ہمارے ہاں خاص کر بیاہ شادی کی تقاریب میں اور عام طور پر دوسرے خوشی غمی کے مواقع پر دل کھول کر خرچ کرنا عام رواج ہے۔ اسی طرح بہت سی فضول رسومات کی بجاآوری کے لئے بہت ہی مسرفانہ رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ صوبہ واری حکومتوں کی جانب سے دیگر ترقی کناں ممالک مثلاً ایران۔ ترکی وغیرہ کی طرح ان پر پابندیاں عائد کرنا بہت بڑی حد تک ایسی قباحتوں کی روک تھام کے لئے ضروری ہے۔ زیادہ تر مدرسہ میں اس جانب توجہ کی جانی چاہیئے۔ کہ اخلاقیات کے اسباق اور تاریخ وادب کی بصیرت افروز تشریحوں میں مناسب وموزوں اثر آفرینی کے ذریعہ جائز طور پر سرمایہ بنانے اور اسے محفوظ رکھنے کے فوائد بچوں کے ذہن نشین کئے جائیں۔ اور دستی مشاغل۔ تعلیمی سیاحتوں۔ عجائب خانہ مدرسہ کے ذریعہ جبلت ملکیت کو خاطر خواہ طور پر ابھرنے اور کام میں لانے کا انتظام کیا جائے۔ تو بڑی

حد تک ایسی سماجی برائیوں کا انسداد ہو سکتا ہے۔

(۸) طریقۂ تعلیم کی خامیاں:۔ تعلیم و تدریس محض مجہول طریقہ پر ہونے اور بچوں کی خود فعلی کو کام میں نہ لانے کی وجہ سے قوت ارادی کی عادات کی تربیت نہیں ہو سکتی۔ جوں جوں بچے مدرسہ کے اونچے درجوں میں ترقی کرتے جاتے ہیں وہ ہاتھ کے کام سے زیادہ عار کرنے لگتے ہیں۔ بدیں لحاظ جیسا کہ ہم دوسرے موقع پر وضاحت کر آئے ہیں۔ بچوں کو دستی مشاغل میں زیادہ مصروف رکھنا اور منصوبی طریقہ کو بڑی وسعت کے ساتھ مدرسہ میں رائج کرنا نہایت ضروری ہے۔ اسی طرح موجودہ طریقہ امتحانات جس میں طلبا مدرس کے مرتب کردہ نوٹوں یا کتابوں کے خلاصوں کو رٹ لے کر کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کے تخیّل کو بالکل محدود رکھنے اور انھیں تقلید کے غلام بنانے کے ذمہ دار ہیں۔ اسی وجہ سے مدرسہ کے ہر قسم کے کاروبار میں بچوں کو ترکیبی اور اختراعی تخیل سے کام لینے کے بہت کم مواقع دئے جاتے ہیں۔ نئی نئی اُلجھنوں اور گتھیوں کو سلجھانے کی جانب ان میں کسی قسم کا رجحان نہیں پایا جاتا۔ اگر زمانہ حال کے بڑے بڑے تعلیمی مفکروں کے حسب رائے مسائلی طریقہ کو جس کی وضاحت پچھلے ابواب میں کی گئی ہے۔ مدارس میں رائج کیا جائے۔ اور ساتھ ہی اعلیٰ وارفع نصب العین کی نشو ونما پر خاصی توجہ دی جائے تو بے کاری و بے روزگاری اور دیگر بہت سی سماجی و جماعتی برائیوں کا بڑی حد تک دفعیہ ہو سکتا ہے۔

نتیجہ پس ملک کی حقیقی ترقی کے لئے اس امر کی ضرورت ہے۔ کہ ملک کے نونہالوں اور آیندہ کی ذمہ داریاں قبول کرنے والے نو واردوں کو زندگی کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے لئے موزوں تعلیم و تربیت کے ذریعہ پورے طور پر لیس کیا جائے۔ اس قسم کی مطابقت زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہونے کے لئے پنج گونہ نوعیت کی ہونی چاہیئے

(۱) عقلی مطابقت:۔ حیاتیاتی نقطۂ نظر سے جیسا کہ ہم باب سوم میں وضاحت کر آئے ہیں۔ فطرت نے انسان کو دیگر تمام جانداروں پر فوقیت و برتری عطا کی ہے اور یہ

برتری زیادہ تر اس وجہ سے ہے۔ کہ انسان زندگی کی جدوجہد میں نسلاً بعد نسلٍ گزشتہ تجربات حیات منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتا اور اسی لئے دن بدن اور لمحہ بہ لمحہ ترقی کے مراحل طے کرتا جاتا ہے۔ نسلی ترکہ کا اس طرح کا انتقال شعوری اور زیادہ یقینی طور پر مدارس کے نصاب کے ذریعہ رو بعمل ہوتا ہے۔ اس لئے وہی اقوام تہذیب وتمدن میں پیش پیش ہیں۔ جن کے مدارس کا نصاب زمانہ کی عصری ضروریات کے عین مطابق وموافق ہے۔ اور اسی بنا پر ضرورت ہے۔ کہ ابتدائی تعلیم لازمی گردانتے ہوئے ملک کے ہر فرد کو ابتدائی آلات حصول علم سے بہرہ ور کیا جائے۔ تاکہ وہ ماضی وحال کے تجربات سے استفادہ کرکے مستقبل کے لئے بطریق احسن رہنمائی حاصل کر سکے۔ اس کے لئے زیادہ تر مدرسہ کے ضبط اور زائد نصاب مصروفیات سے بھی عمدہ اور خوشگوار ذہنی وجسمانی عادات قائم کرکے اسے سہولت وفراغت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں جیسا کہ دیگر متمدن ومہذب ممالک میں مدارس شبینہ اور توسیعی لکچروں کے ذریعہ عملی زندگی میں داخل شدہ افراد کو مفید اور عصری معلومات اور زمانہ کے جدید انکشافات سے واقف کرانے کے لئے ضروری انتظامات عمل میں لائے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی انھیں رائج کرنا ازبس ضروری ہے۔ اس طرح سے قدیم تعلیم یافتہ شہریوں کی جہالت کو ہم بڑی حد تک رفع کرسکیں گے۔

(۲) معاشی مطابقت:۔ جیسا کہ ہم گزشتہ ابواب میں صراحت کرچکے ہیں موزوں نظام تعلیم میں محض ادبی وکلچری تعلیم کا ہی مسالہ شامل نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ کسب معاش کے ذرائع کی تربیت کے لئے موزوں پیشہ وری تربیت کا بہم پہنچانا بھی ضروری اور ناگزیر ہے۔ حال حال تک ہمارے نظام تعلیم کی سب سے بڑی غلطی یہی رہی ہے کہ اس جانب کوئی توجہ نہیں کی جاتی تھی بلکہ مدرسہ کی تعلیم حقیقی زندگی سے بالکل بے ربط اور غیر متعلق رکھی جاتی تھی۔ اسی طرز عمل کی بدولت ہمارے ہاں اب روزگاری کے سیاہ بادل ہر کہیں چھائے ہوئے ہیں۔ اور عوام میں ردعمل کے طور پر گہرا احساس بیداری

پیدا کر دئے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ ہمارے سامنے ہے یعنی اس فرسودہ اور ناموزوں نظام تعلیم کو الٹنے اور از سر نو اس کی تشکیل کرنے کے لئے طرح طرح سے ہر جگہ پکار ہو رہی ہے اور اب ہر سنجیدہ و فہیم فرد قوم بخوبی محسوس کرنے لگا ہے کہ ابتدا رسے ہی معاشی مطابقت کا انتظام عمل میں لایا جانا ضروری ہے۔ چنانچہ گزشتہ ابواب میں اسی لئے بڑی وضاحت سے ہم نے پیشہ ورانہ رہنمائی اور پیشہ ورانہ تعلیم و تربیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

(۳) قومی یا سماجی مطابقت :۔ ہمارے ملک میں فرقہ واریت کا جو ہڑبونگ برپا ہے۔ سنجیدہ اور عاقبت اندیش مدبروں کے جائز اور واجبی اندیشوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ سیاسی مفکرین اور قومی رہنما اس فرقہ واریت کے بھوت سے بہت بری طرح سہمے ہوئے اور وحشت زدہ ہیں۔ مگر سب نے اب بخوبی بھانپ لیا ہے کہ اس سے نجات پانے اور ملک کو اس کی ضرر رسانیوں سے محفوظ رکھنے کا صحیح چارۂ کار مدرسہ اس کے نصاب تعلیم اور دیگر تعلیمی مصروفیات میں پایا جاتا ہے۔ اگر مدرسہ میں ہی باہمی اتفاق و رواداری اور اتحاد و یگانگت کی تربیت معقول پیرایہ میں کی جائے۔ تاریخ و ادب۔ مدرسہ کی سماجی سرگرمیوں اور کھیل کود کے ذریعہ اگر خوشگوار جذبات کو تقویت بہم پہنچائی جائے۔ اور متحدہ قومیت کا نصب العین پیش کرتے ہوئے فرقہ واری کشمکشوں کو مذموم قرار دیا جائے۔ تو تھوڑے ہی عرصہ میں یہ فتنہ دور ہو سکتا ہے۔ اور بہت جلد آج کے بچے کل کے مفید شہری بن کر ملکی و قومی ترقی کی جد و جہد میں شانہ بہ شانہ اپنا حصہ پورا کرنے کے لئے آمادہ و تیار نظر آئیں گے۔

(۴) اخلاقی مطابقت :۔ جب تک سماج میں ہر فرد اپنے جائز حقوق سے بخوبی آگاہ ہو کر اپنے واجبی فرائض کی تکمیل پر کمربستہ نہ ہو۔ ملک و قوم کا ترقی کرنا محض خواب و خیال متصور ہوتا ہے۔ معلمین کو اپنے نمونہ سے اور نیز تاریخ و ادب کے اسباق کے ضمن میں مناسب اثر آفرینی سے کام لیتے ہوئے اعلیٰ اخلاقی معیارات اور عمدہ

کرداری تمثیلات بچوں کے بخوبی ذہن نشین کرنی چاہئیں۔ تاکہ وہ آئندہ زندگی میں اپنے حقوق و املاک کی بخوبی حفاظت و مدافعت کے لئے سینہ سپر ہونا اور دوسروں کے مال و متاع اور مفاد و اغراض کو ٹھیس لگانے سے احتراز کرنا اپنا اخلاقی شیوہ قرار دیں۔ اسی لئے ہم نے عام تعلیم کی طرح پیشہ ورانہ نظام تعلیم میں بھی کلچری و اخلاقی عناصر کو شامل کرنے پر زور دیا ہے۔ تاکہ ہر فرد جب ضروری تعلیم و تربیت سے فراغت پاکر عملی زندگی میں گامزن ہو۔ تو وہ اپنے تمام دنیاوی معاملات اور زندگی کے تمام شعبوں میں عمدہ سیرت و نیک کرداری کا مظاہر کر سکے۔ یاد رہے کہ جسمانی مطابقت سے کہیں بڑھ کر روحانی مطابقت کا لوازمہ مہیا کرنا ضروری ہے ؎

بانگ اسرافیل ان کو زندہ کر سکتی نہیں
روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد (اقبال)

جمالیاتی مطابقت جس میں حسن و پاکیزگی کو سراہنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اخلاقی مطابقت کا ایک جزو ہے۔ مدرسہ میں فنون لطیفہ کی تدریس اور عجائب خانوں اور صنعتی کارخانوں کی تعلیمی سیاحتوں میں بطریق احسن اس کا اہتمام ہو سکتا ہے۔

(۵) مذہبی مطابقت:۔ مذہبی تعلیم و تربیت بھی عمدہ طور پر زندگی بسر کرنے کے لئے لازمی ضروری ہے۔ اس سے مراد فرقہ داری تنگ نظری اور بیجا تعصب نہیں ہے۔ بلکہ نوجوانوں کو فراخدل۔ بلند ہمت اور عالی حوصلہ بنانے کے لئے یہ موثر ترین ذریعہ ہے۔ اس میں زیادہ تر غیر ضروری انسانی تعلقات کی تلقین کرنے کے بجائے اگر خدائی تصورات پر نوجوانوں کی توجہ لگائی جائے۔ تو بہت مفید اثرات مترتب ہوں گے۔ خدائے متعال کی لامحدود قدرت اس کی بے مثال عظمت۔ اس کی تقدیس و پاکی وغیرہ کے تصورات نوجوانوں میں راسخ کر کے ہم انہیں صحیح طور پر راستبازی اور پاک بازی کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنا سکتے ہیں۔ یہ امر بخوبی یاد رکھنا چاہئے۔ کہ صحیح مذہبی وجدان ہی قوم و ملت کے شیرازہ کو مضبوط و استوار رکھ سکتا اور تہذیب

وتمدن کو فروغ دے کر آگے بڑھا سکتا ہے۔

خودی کی تکمیل کے لئے جیسا کہ باب اوّل میں ہی ہم صراحت کر چکے ہیں ضروری ہے کہ فرد پورے طور پر ماحول سے موافقت پیدا کرنے۔ اس پر عمدہ پیرایہ میں تسلط جمانے۔ اور اس میں اپنی حیثیت کو بخوبی پہچاننے کے قابل ہو۔ زندگی اور اس کی پنج گونہ مطابقت کی وضاحت سے یہ نکتہ اور بھی صاف اور واضح ہو گیا ہے۔ کہ دنیاوی کامیابی و کامرانی سے فرد اسی صورت میں ہمکنار ہو سکتا ہے۔ جبکہ مناسب آزادی۔ اطمینان قلب اور فارغ البالی کے ساتھ وہ زندگی بسر کرنے کے قابل ہو۔ اس کے لئے ہمارے ہاں ایسا نظام تعلیم نافذ ہونا چاہئے۔ جو زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہونے کے اعتبار سے جملہ افراد ملک کو اپنی تمام فطری صلاحیتوں اور طبعی قابلیتوں کے بموجب پھلنے پھولنے کی بخوبی گنجائش و صلاحیت رکھتا ہو۔ ؎

چوں خودی آرد بہم نیروے زیست
مے کشاید قلزمے از جوے زیست (اقبال)

عرب مصر میں

از

محمد جمیل الرحمن ایم۔اے۔ پروفیسر تاریخ۔ جامعہ عثمانیہ۔ حیدر آباد دکن

شام و عراق کی فتح کے بعد جب مسلمانوں نے گرد و پیش نگاہ ڈالی، اور سیاسی حالات کا مطالعہ کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ اگر ان فتوحات کو محفوظ رکھنا ہے تو آگے بڑھے بغیر چارہ نہیں۔ شام کو فتح کر کے مصر کی طرف سے بے فکر رہنا سیاسی خودکشی کے مترادف تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ مصر اور شام کا اس قدر گہرا تعلق ہے کہ کوئی شامی حکومت اُس وقت پوری طرح محفوظ نہیں ہو سکتی جب تک کہ مصر پر بھی اُس کا تسلط نہ ہو۔ اس کے علاوہ گو عربوں نے بازنطینی حکومت کے بہترین ایشیائی صوبوں پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن اس حکومت کی طرف سے خطرہ زائل نہیں ہوا تھا۔ بازنطینی سلطنت کا بحری اور فوجی مرکز قلزم سے حجاز اس قدر قریب تھا کہ جب تک مصر فتح نہ ہو جائے، اور قلزم پر مسلمانوں کا مستقل قبضہ نہ ہو حجاز کو محفوظ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اس سے بھی قطع نظر، سال کے چار مہینے قسطنطنیہ کا گذارا مصر کی زرعی پیداوار پر تھا[1]۔ اور ضروری تھا کہ ایک طرف تو اس سلطنت کے معاشی حالات پر اثر ڈالا جائے، اور دوسری طرف اس تمام زرعی پیداوار سے خود مسلمان فائدہ اٹھائیں۔ چنانچہ ۱۸ھ

---

[1] آرنلڈ۔ ص۔ ۱۳۰

ہی دن مصر کے غلے سے حجاز کی قحط زدگی کو دور کیا گیا۔

مصر کے سیاسی حالات بھی خاص قسم کے تھے۔ جب آگسٹس نے اکٹیم کی جنگ کے بعد، مصر پر قبضہ کر کے اسے رومی سلطنت میں شامل کیا ہے، تو اُسے باقاعدہ صوبہ بنانے کے بجائے شاہی ملک قرار دیا تھا، جو ہر قیصر کو کے بعد دیگرے بطور ورثہ ملتی رہتی تھی۔ آگسٹس نے اپنی ہی طرف سے وہاں ایک حاکم مقرر کیا تھا۔ مگر یہ حاکم مرکزی حکومت کا نمائندہ ہونے کے بجائے ذاتی طور پر قیصر کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے خلاف مرافعہ براہ راست قیصر کے سامنے پیش ہوتا تھا۔ مالی، عدالتی اور فوجی انتظامات اس کے سپرد تھے۔ فوج کی نقل و حرکت پر بھی اس کی نگرانی تھی۔ آگسٹس نے یہاں تک احتیاط برتی تھی کہ رومی سینات کا کوئی رکن مصر میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ لیکن رومیوں نے مصر کے اندرونی نظم و نسق میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی محاصل کی وصول یابی کے متعلق سب سے اہم کام مردم شماری اور اراضی کی مساحت کا تھا۔ یہ دونوں کام بطلیموسی خاندان پہلے ہی مکمل کر چکا تھا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تمام رومی مفتوحات میں یہی ملک ایسا ہے جہاں کی پیمائش اور مردم شماری بالکل مکمل حالت میں تھی اور رومیوں نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ رومیوں سے قبل یونانی دور ہی میں حکمران قوم کی نو آباد کاری کو محدود کر دیا گیا تھا۔ صرف اسکندریہ اور بطلیموسیہ کے دو شہر ایسے تھے جہاں یونانیوں کو آباد ہونے کی اجازت تھی، باقی وہ اور کہیں توطن اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ اس قانون کو رومیوں نے بحال رکھا اور رومیوں کو اندرون ملک میں پھیلنے اور آبادیاں قائم کرنے کی اجازت نہیں دی۔ یونانی اور رومی زمانے میں نو آباد کاری کی یہ تحدید اس وجہ سے نہ تھی کہ حکمران قوم کے ملک میں عام طور پر آباد ہو جانے سے اہل ملک کو معاشی یا معاشرتی لحاظ سے نقصان پہنچے گا۔ بلکہ اس کا سبب محض یہ تھا کہ حکمران قوم مفتوحین کے ساتھ میل جول پیدا کر کے

سلہ ابن سعد ج ۳ - ص ۲۰۳، ۲۲۳، ۲۲۴-

ان میں ضم ہونا نہیں چاہتی تھی۔ باوجودیکہ اسکندریہ قدیم یونانی شہر تھا، اور رومی سلطنت میں بھی دوسرے درجے کا شہر سمجھا جاتا تھا، اس کے باشندے اس قدر شورہ پشت واقع ہوئے تھے کہ شہر کو حکومت خود اختیاری عطا کرنا خطرناک سمجھا گیا تھا۔ جب اسکندریہ کی یہ حالت ہو تو دوسرے مقامات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ مصر میں بلدیات بالکل مفقود تھیں۔

محاصل میں آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ لگان تھا۔ مختلف قسم کی پیداواروں پر لگان کی شرح الگ الگ تھی۔ چراگاہوں، تاکستانوں، زرعی زمینوں، جنگلوں، ماہی گیری، نمک کے کارخانوں اور زیتون کے باغوں پر محصول لگایا جاتا تھا۔ اس باقاعدہ محصول کے سوا ایک اور محصول پیداوار کی صورت میں ادا کرنا پڑتا تھا، اور اغلب ہے کہ یہ ادائی حاکم صوبہ اور اس کے دفتر کے عمال کی ضروریات کے لحاظ سے ہوتی تھی۔ مصر اور افریقہ میں خاص طور پر محصول بصورت پیداوار ادا ہوتا تھا۔ مصر سے جو غلہ قسطنطنیہ بھیجا جاتا تھا وہ سال میں چار مہینوں کے لئے کافی ہوتا تھا۔ ہر سال مصری جہاز یکم اپریل سے ۱۵ اکتوبر تک یہ کام انجام دیتے تھے۔ لنگر اٹھانے کے بعد جہاز رانوں کو حکم تھا کہ قسطنطنیہ کا قریب ترین راستہ اختیار کریں، اور بلا ضرورت کسی بندرگاہ پر قیام نہ کریں، اور اگر ایسا کریں تو بندرگاہ کا حاکم انھیں لنگر اٹھانے پر مجبور کر سکتا تھا۔ اگر کوئی جہاز غرق ہو جائے تو صحیح حالات کی تحقیق کے لئے پس ماندہ ملاحوں کو طرح طرح کے عذاب دیئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ فی کس محصول تھا، جو سوداگروں کی جماعتوں، گھوڑوں، خچروں، بیلوں اور گدھوں، غرض کہ تمام جائداد منقولہ پر عائد کیا جاتا تھا۔ صناع اور دکاندار، موزہ فروش، جولاہے، نعل بند، نار اور دیگر پیشہ ور بھی محصول ادا کرتے تھے۔ مشرق کا سامان تعیش زیادہ تر شام و مصر سے ہو کر یورپ پہنچتا تھا۔ اسکندریہ مشرقی تجارت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ لیکن بحیرۂ احمر کے ہر بندرگاہ پر بھی ہندی یا عربی مالِ تجارت آنے پر کچھ فی صدی محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ اسی طرح دریائے نیل کے دہانے کے ہر شہر میں محصول خانے موجود تھے۔ محصول وصول کرنے کا کام اجارے پر دیا جاتا تھا۔ یہ لوگ پبلکن کہلاتے تھے۔ مفروضے

سے زیادہ خلاف قانون محصول وصول کرتے تھے۔ عدالتوں کے کارکن ان کے زیر اثر اور زیر احسان تھے، اس لئے ان کے خلاف عدالتی چارہ جوئی بیکار تھی۔ حاکم صوبہ ان کی مخالفت کرتے ہوئے ڈرتا تھا، اور ان سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ ان خدمات کے صلے میں حاکم بھی ان کے منافع میں شریک کر لیا جاتا تھا۔ پبلکن اس کا حق رکھتے تھے کہ بقایاداروں کو قید کرا دیں، اور ان کی جائدادیں ضبط کرا لیں۔ عوام کو پبلکن سے کس درجہ نفرت تھی اس کا اندازہ سیسرو کے اس بیان سے ہوگا کہ اُس نے اہل صقلیہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ تمام اقوام میں یہی ہمارے ایسے وفادار دوست ہیں کہ انھیں پبلکن اور قرض دہندگان سے بھی نفرت نہیں ہے۔

ایک اور جماعت قرض دہندگان کی تھی، جو پبلکن کے ساتھ ساتھ کام کرتی تھی، گو بعض مرتبہ ان دونوں جماعتوں میں جھگڑے بھی ہو جاتے تھے۔ یہ لوگ سنیات کے رکن نہیں ہو سکتے تھے، کیوں سنیات کے اراکین یہ پیشہ اختیار کرنے کے مجاز نہیں تھے۔ لیکن اکثر قرض دہندگان ان کے دلال ہوتے تھے۔ وہ خود روما میں رہتے تھے اور اپنے دلالوں کی کمائی میں حصہ دار سمجھے جاتے تھے۔ ان قرض دہندگان کی وجہ سے جو مصیبتیں صوبوں اور عوام پر نازل ہوتی تھیں وہ ناگفتہ بہ تھیں۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ شہر کے باشندے سرکاری محاصل ادا نہیں کر سکتے تھے، اور ان کی پابجائی کے لئے قرض دہندگان سے رقمیں لے لیتے تھے۔ اس طرح شہر کے شہر ان کے ہاتھ میں گروی تھے۔ ایسی حالت میں یہ دولت مند قرض دہندگان جو کچھ نہ کر گزریں کم ہے۔ بعض مرتبہ جو سلوک انھوں نے مرہون شہروں سے کیا ہے اسے پڑھ کر خون کے آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے۔

یہ تو محاصل تھے جو اہل مصر ادا کرتے تھے۔ خود مصریوں کی حالت یہ تھی کہ انھیں کوئی معاشری یا شہری درجہ حاصل نہ تھا۔ افسر اعلیٰ ظاہر ہے کہ رومی ہوتے تھے۔ دوسرے درجے کے عہدوں پر بھی مصری مقرر نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ عہدے اسکندریہ اور بطلیموسیہ کے

یونانیوں سے پُر کئے جاتے تھے۔ رومی فوج میں مصر کے یونانیوں کے لئے تو جگہ نکل آتی تھی، مگر فوج میں مصریوں کا داخلہ قطعاً ممنوع تھا۔ آخری زمانے میں وہ فوج کے صرف ادنیٰ ترین عہدوں پر مقرر ہو سکتے تھے۔ مصری زبان دفتری زبان نہیں تھی۔ فوج کی زبان لاطینی تھی اور شہری حکومت میں یونانی مستعمل تھی۔ یہ ضروری تھا کہ مصری زبان کی تمام دستاویزات کا ترجمہ یونانی زبان میں کیا جائے۔ گو عوام اپنی زبان استعمال کرنے میں آزاد تھے، لیکن کوشش یہی کی جاتی تھی کہ جہاں تک ہو سکے یہ زبان استعمال نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مصر میں عام طور پر دوہرے نام پائے جاتے ہیں۔ ایک مصری اور دوسرا یونانی۔ رومی مملکت میں مصری صرف ایسا ملک تھا جہاں رومی نوآبادکار نہیں تھے، اور جہاں رومیوں نے اپنی تہذیب پھیلانے کی کوشش نہیں کی۔

عام طور پر صوبہ کا حاکم بڑی بڑی رشوتیں دے کر اس خدمت پر مقرر ہوا کرتا تھا، اور اپنی حکومت کے دوران میں صوبے کو خوب لوٹ کر اپنا بھلا کرتا تھا۔ حاکموں کی یہ چیرہ دستیاں اس قدر عام تھیں کہ جب سیسرو اپنے زیر حکومت صوبے میں اس قسم کی زبردستیوں سے باز رہا تو وہاں کے لوگوں کو اس پر تعجب ہوا۔ صوبے کے صدر مقام پر پہنچنے سے پہلے ہی نامزد شدہ حاکم نذرانوں اور ضیافتوں کے نام سے صوبے کو لوٹنا شروع کرتے تھے۔ اول تو حاکم خود ہی ایک بلائے بے درمان تھا، اور اُس پر مستزاد یہ کہ فوج کے سپاہیوں کو شہریوں کے مکانات میں ٹھیرانے کا دستور عام تھا۔ موسم سرما میں یہ سپاہی صوبے کے کسی نہ کسی شہر کے گھروں میں ٹھیرا دیے جاتے تھے، اور اُن کے تمام اخراجات اہل خانہ برداشت کرتے تھے۔ سیسرو لکھتا ہے کہ روما کے دشمنوں نے ہمارے اتنے شہر برباد نہیں کئے جتنے کہ فوج کے سپاہیوں نے موسم سرما کے قیام کے دوران میں کئے ہیں۔ بعض سپہ سالار تو کسی شہر کو سزا دینے کی غرض سے سپاہیوں کو گھروں میں ٹھیرا دیتے تھے۔ بعض شہر ایسے تھے کہ اس مصیبت سے بچنے کے لئے سالانہ یک مشت رقم حاکم کے سامنے پیش کر دیتے تھے۔ ہم

اندازہ کر سکتے تھے کہ ان وحشی سپاہیوں کی وجہ سے اہل شہر پر کیا کیا مصائب نہ نازل ہوتے ہونگے ان تمام باتوں کے باوجود ایک مصنف یہ رائے ظاہر کرنے کی جرات کرتا ہے کہ

"مصر کی رومی فتح اہل ملک کے لئے برکت ثابت ہوئی ملک کے پہلے حکمران 'بطلیموسی' نالائق بھی تھے اور مطلق العنان بھی نئے حکمران مطلق العنان تو تھے مگر نالائق نہیں تھے۔ ہر دو صورتوں میں حکمرانوں کا تعلق مصر سے نہیں تھا، اور وہ اجنبی تھے۔ یقیناً اہل مصر کو اس کی مطلق پروا نہ تھی کہ ایک اجنبی قوم ان پر حکمران ہو یا دوسری" [۲] (؟)

مسیحیت کی اشاعت اور توسیع کے ساتھ مصر کے مصائب اور مشکلات میں اضافہ ہوا کمی نہیں ہوئی۔ حضرت عیسیٰ کے بعد ابھی بہت مدت نہیں گزری تھی کہ ان کے پیروؤں نے ان کی سیدھی سادی تعلیمات کو تو بھلا دیا، اور فلسفیانہ مناقشات میں مبتلا ہوگئے، اور حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ کی ذات وصفات کے متعلق بحثیں شروع ہوگئیں ان مناقشات کا نتیجہ یہ ہوا کہ شرقی سلطنت روما کے مختلف صوبوں میں نت نئے فرقے پیدا ہوتے گئے، اور ہر فرقہ اپنے مخصوص عقائد پر مُصر رہا۔ مصر بھی ان جھگڑوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اہل اسکندریہ ازل سے ضدی اور شوریدہ پشت واقع ہوئے تھے۔ اب تک یہ لوگ قیاصرہ یا والیان مصر کی ہجو میں لکھ کر دل کا ارمان نکالتے تھے۔ لیکن مذہبی عقائد کی صورت میں اب ایک نیا کھلونا ان کے ہاتھ آیا۔ انھوں نے مرکزی حکومت کے عقائد سے اختلاف کیا، اور مونوفیسائٹ عقائد اختیار کر لئے۔ اب مصر میں خون ریز مذہبی جھگڑوں کا آغاز ہوا۔ مگر حکومت کی سختیوں کے باوجود

---

[۲] آرنلڈ ص ۳۸۔ مصر کے یہ حالات آرنلڈ، ریڈ، کیمبرج میڈیول ہسٹری ج ۱۔ اور ماسن جلد ۲ سے ماخوذ ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر، شعبۂ معاشیات، جامعۂ عثمانیہ کا شکریہ جنھوں نے ان کتابوں کی طرف توجہ دلائی۔

اہل اسکندریہ اپنے مذہب پر جمے رہے۔ مرکزی حکومت کی طرف سے جتنی سختی ہوتی تھی، مونوفیسائی عقائد اتنے ہی مصر میں جڑ پکڑتے جاتے تھے۔ جب یہ مصائب انتہا کو پہنچ گئے تو خسرو پرویز ناجی بن کر مصر میں ظاہر ہوا۔ دس برس ایرانیوں نے مصر پر حکومت کی، اور اس عرصہ میں اہل مصر کو مذہبی آزادی بھی حاصل ہوئی، اور وہ دوسری نعمتوں سے بھی بہرہ ور ہوتے رہے۔ لیکن ان کی بدقسمتی کہ اس مختصر مدت کے بعد قیصر ہرقل نے خسرو پرویز کو شکست دے کر مصر پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اب وہی پرانے مذہبی مناقشات، وہی جبر و تعدی، وہی کشت و خون پھر شروع ہو گیا۔ ۶۳۱ء میں ہرقل نے مقوقس[ـــہ] کو اسکندریہ کا بطریک اور شہری نظم و نسق کا حاکم مقرر کیا۔ اس شخص نے دس برس تک متواتر یہ کوشش کی کہ قبطی کلیسا سے صلح ہو جائے ملک کی مالیات درست ہو جائیں، اور مکمل امن و امان قائم ہو لیکن اس کی جد و جہد رائگاں گئی بلکہ نتیجہ یہ ہوا کہ اختلافات اور زیادہ نمایاں ہو گئے۔ مصر کے اندرونی حالات اس قدر خراب ہو گئے تھے کہ اب اہل ملک کے لئے نجات کا صرف ایک طریقہ رہ گیا تھا، اور وہ یہ کہ پھر کوئی بیرونی قوم ملک پر قبضہ کر کے انھیں ان نالائق حکمرانوں سے خلاصی دلائے۔

عین اسلامی فتح سے قبل مصر کی تباہی کا اصلی سبب رومیوں کی فوجی حکومت اور اسکندریہ کے شورہ پشت یونانیوں کا اتحاد تھا۔ حالانکہ یہ یونانی کسی صورت میں بھی مصر کے حقیقی باشندے نہیں کہلائے جا سکتے تھے۔ کمزور قیاصرہ کے عہد میں مصر پر وحشی اقوام کے حملے ہوتے رہتے تھے، اور وہاں وحشت و بربریت پھیلتی جا رہی تھی۔ کلیسائی تنازعات کی وجہ سے مصر کی اصلی آبادی اور اہل اسکندریہ دونوں حکومت سے متنفر تھے۔ مصر پر فوجی قوت سے حکومت ہو رہی تھی، مگر صدر مقام کے باہر حاکم کے اختیارات ختم ہو جاتے تھے۔ عوام میں فوجی جوش اور تربیت دونوں غائب تھے۔ کیونکہ انھیں ہمیشہ اس سے محروم رکھا گیا تھا۔

ـــہ Cyrus

رومیوں کی مطلق العنانہ اور احمقانہ حکومت سے اندرونی تحریک کے ذریعے رہائی پانے کی کوئی صورت نہیں تھی، اور اہل مصر کسی بیرونی نجات دہندہ کے منتظر تھے کہ ۱۸ھ میں عربوں کی فوجیں مصر کی سرحد پر ظاہر ہوئیں۔

(۲)

روایات کے مطابق اسلام سے قبل حضرت عمرو بن العاص ایک مرتبہ مصر آئے تھے، اور تمام مصر میں سے گذر کر اسکندریہ پہنچے تھے، جہاں انھوں نے کچھ مدت قیام کیا تھا۔ اسکندریہ کا شہر انھوں نے خوب دیکھا تھا اور وہاں کی عظیم الشان عمارتوں سے بہت متاثر ہوئے تھے[۱]۔ اتنا تو صراحت سے بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے مصر میں آنے اور وہاں سے باہر جانے کے راستے پوری طرح دیکھے تھے، مگر یہ بھی ناممکن ہے کہ اس سفر کے دوران میں ان جیسا بالغ نظر اور تیز فہم شخص مصر کے عام حالات سے بے خبر رہا ہو۔ اس طرح حضرت عمرو بن العاص کو مصر سے کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور تھی۔ پھر عمرو بن العاص ان چار اصحاب میں سے تھے جنھیں حضرت ابوبکر نے اسلامی فوج کا افسر بنا کر فتح شام کے لئے بھیجا تھا۔ اس فتح کے دوران میں بھی وہ مصر اور شام کے گہرے سیاسی تعلق سے ناواقف نہ رہے ہوں گے، اور انھیں اس کا بھی بخوبی علم ہو گا کہ قیصر ہرقل نے شام کی حفاظت کی غرض سے مصر کی تمام رومی فوجیں وہاں سے ہٹا کر شام میں جمع کر دی ہیں۔ ان حالات کی وجہ سے وہ جانتے تھے کہ مصر پر حملہ کرنا اور اُسے فتح کر لینا کس قدر آسان کام ہے۔ ۱۸ھ میں جب حضرت عمر جابیہ آئے تو عمرو بن العاص نے ان سے اس کا تذکرہ کیا، اور انھیں یقین دلایا کہ فتح مصر مسلمانوں کے لئے قوت و امداد کا سرچشمہ ہو گی، کیونکہ یہ ملک جس قدر دولت مند ہے اسی قدر اپنی حفاظت کرنے سے عاجز ہے۔ حضرت عمر اس پر راضی نہیں تھے کہ مسلمانوں کو

---

[۱] ابن عبد الحکم ص ۵۳-۵۵ + الکندی ص ،

کسی ناگہانی خطرے میں ڈالیں۔ لیکن آخر عمرو بن العاص کے اصرار پر تین ہزار اور چار ہزار سپاہیوں کے درمیان ایک مختصر سی فوج ان کے سپرد کی' اور غالباً اس خیال سے کہ خلیفہ کہیں اپنا ارادہ نہ بدل دیں' عمرو بن العاص اسی رات کو مصر کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ کوچ ذی الحجہ ۱۸ھ میں شروع ہوا' اور محرم ۱۹ھ میں عربوں نے مصر کے باب الداخلہ' فرما کو فتح کر لیا۔ یہ فتح مصر کا آغاز تھا۔ اس عرصے میں حضرت عمر نے بھی مصر کی فتح کا ارادہ کر لیا تھا' اور حضرت زبیر بن العوام کی سرکردگی میں پانچ ہزار تازہ دم فوج عمرو بن العاص کی مدد کے لئے بھیج دی تھی۔

اب یہ متحدہ فوج آگے بڑھی' اور رجب ۱۹ھ میں عین شمس کے سامنے رومی فوج کو شکست دی۔ شہر کی فتح کے بعد قلعہ بابلیون کی مزاحمت جاری رہی۔ مقوقس بذات خود یہاں موجود تھا۔ اُس نے عمرو بن العاص سے خط وکتابت شروع کی' اور معاہدے کی شرائط طے کرنے کے بعد ان کی توثیق کے لئے قسطنطنیہ گیا۔ مگر قیصر ہرقل نے یہ عہد نامہ تسلیم کرنے سے انکار کیا' اور مقوقس کو جلا وطن کر دیا۔ اس دوران میں ۲۲ صفر ۲۰ھ کو ہرقل کا انتقال ہو گیا' اور جب اہل بابلیون ہر طرف سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے ربیع الثانی ۲۰ھ کو ہتھیار ڈال دئے۔ اس فتح سے ڈلٹا کے مشرقی حصے اور مصر صعید پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا' اور عمرو بن العاص دریائے نیل کو عبور کر کے اُس کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ نیکو پہنچے یہ مقام ایک اسقفیہ کا مرکز تھا۔ ۲۶ جمادی الثانی ۲۰ھ کو اہل شہر نے اطاعت قبول کر لی۔ اب اسلامی فوج آہستہ آہستہ اسکندریہ کی طرف بڑھی' یہ شہر سیاسی' بحری اور تجارتی لحاظ سے اس قدر اہم تھا کہ اسے کھو دینا رومیوں کے لئے خودکشی کے مترادف تھا۔ اس لئے یہاں مسلمانوں کی مزاحمت ہوئی۔ وہ اس کے گرد و نواح کے علاقوں پر تو قابض ہو گئے' مگر اس کے مستحکم اور قلعبند بندرگاہ کو فتح نہ کر سکے۔ اس دوران میں قسطنطنیہ سیاسی انقلابات اور شورشوں کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ آخر وہاں جب ذرا سکون ہوا' اور یہ محسوس کیا گیا کہ اسکندریہ کو

بچانا ناممکن ہے تو مقوقس کو دوبارہ مصر بھیجا گیا' تاکہ جس طرح بنے عمرو بن العاص سے مفید مطلب شرائط پر صلح کرے۔ اس کے بعد مقوقس نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا' اور اس میں اور مسلمانوں میں کیا گفت و شنید ہوئی۔ اس کی تفصیل ہمیں معلوم نہیں۔ بہرحال یہ طے پایا کہ ۱۶ر شوال ۲۱ھ کو شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا جائے' اور جو یونانی چاہیں وہاں سے چلے جائیں۔ یونانیوں کو یہ معاہدہ ناگوار گزرا۔ لیکن اسے منظور کرنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ اسکندریہ کے قبضے سے مصر کی فتح مکمل ہو چکی تھی۔ لیکن قسطنطنیہ کی حکومت اتنی آسانی سے اسکندریہ سے دست بردار نہیں ہو سکتی تھی۔ ۲۵ھ یا ۲۶ھ میں رومیوں کا ایک بیڑا مینوئل کی سرکردگی میں اسکندریہ پہنچا۔ اہل شہر نے عربوں کی اطاعت سے انحراف کیا' اور رومی بغیر کسی مزاحمت کے شہر میں داخل ہو گئے۔ عمرو بن العاص اس وقت مصر کے حاکم نہیں تھے اور ان کے جانشین عبداللہ بن سعد بن ابی سرح جب حالات پر قابو نہ پا سکے تو انھیں پھر وہاں بھیجا گیا۔ اس دفعہ انھوں نے پھر اپنی اعلیٰ سپہ سالاری کا ثبوت دیا' اور تھوڑی ہی مدت میں شہر خالی کرا لیا۔ پہلی فتح بذریعہ صلح تھی اور مسلمانوں نے اہل شہر کے جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا لیکن اب دوسری بزورِ شمشیر فتح کے بعد فاتحین اس قسم کی تمام پابندیوں سے آزاد تھے۔ اسکندریہ میں رومی مزاحمت کا خاتمہ کر دینے کے بعد مصریوں نے عربوں کی مزاحمت نہیں کی بلکہ انھیں اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جیسے کچھ مدت قبل وہ ایرانیوں کو لے چکے تھے۔ ان جنگوں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر ہوا' مصر میں عربوں کی فوجی مہموں کا حال نہیں ملتا' اور نہ یہ تذکرہ ہے کہ مصریوں نے عربوں کی اطاعت سے کہیں انحراف کیا تھا۔

مصر کے حدودِ اربعہ قدرتی طور پر متعین ہیں۔ شمال میں بحیرۂ روم ہے' مغرب میں صحرائے لیبیا' اور مشرق میں ریگستان عرب اور بحیرۂ احمر' صرف جنوبی سرحد غیر متعین ہے' اور واقعات کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ پہلی فتح اسکندریہ کے بعد ضروری تھا کہ مغربی سرحد کو بحیثیت مجموعی محفوظ بنا لیا جائے۔ چنانچہ ۲۱ھ کے اواخر میں حضرت عمرو بن العاص نے

برقہ کو اور ۲۲ھ (یا بروایت ۲۳ھ) میں طرابلس الغرب کو فتح کر کے یکسوئی پوری کر دی[۵]۔ جب ۲۳ھ میں حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے عمرو بن العاص کو معزول کر کے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مصر کا حاکم مقرر کیا، اور شہری اور مالی حکومت (صلاۃ وخراج) ان کے سپرد کر دی۔ عبداللہ بن سعد ۲۳ھ سے ۳۵ھ تک حاکم مصر رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے دو کام انجام دئے۔ اول تو انھوں نے جرجیر (گریگوری) جو طرابلس الغرب سے طنجہ تک تمام شمالی افریقہ کے ساحل پر رومیوں کی طرف سے حاکم تھا، شکست دی[۶]۔ گویہ واقعہ شمالی افریقہ کی فتح کا آغاز تھا، لیکن عبداللہ بن سعد نے ملک پر قبضہ کرنے کا خیال نہیں کیا، کیونکہ اس وقت مقصد مصر کی مغربی سرحد کی مزید حفاظت تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے مصر کی جنوبی سرحد کو بھی مشخص کر دیا۔ نوبہ کی سرحد پر مسلسل جنگ جاری رہتی تھی، اور عمرو بن العاص نے بھی اس طرف توجہ کی تھی لیکن بالآخر ۳۱ھ میں عبداللہ بن سعد نے، حضرت عثمانؓ کی خلافت میں، نوبہ پر حملہ کیا۔ دُمقلہ یا دُنقلہ کے مقام پر سخت معرکہ پیش آیا جس میں مسلمانوں نے بہت کچھ نقصان اُٹھا کر آخر فتح پائی۔ اس جنگ کے بعد جسے الکندی[۷] نے غزوۃ الاساود لکھا ہے، مسلمانوں اور اہل نوبہ میں ایک معاہدہ طے پایا، جو بقط کہلاتا ہے۔ مقریزی[۸] نے اس کی پوری عبارت نقل کی ہے۔ اس کے مطابق نوبہ پر مسلمانوں کی سیادت قائم ہوگئی، مصر کی جنوبی سرحد مشخص کر دی گئی، اور اس کے بدلے مسلمانوں نے وعدہ کیا کہ مصر سے غلہ نوبہ بھیجا جایا کرے گا۔

اس طرح بحیثیت مجموعی ۳۱ھ میں مصر کی فتح مکمل ہوئی۔ تاریخ مصر میں اس سے بڑا انقلاب

---

۵ الکندی ص ۹، ۱۰۔

۶ ابن العذاری ج ۱ ص ۴-۹

۷ کتاب الولاة والقضاة ص ۱۲		۸ خطط ج ۱ ص ۲۰۰

اس سے قبل کبھی واقع نہیں ہوا تھا۔ اس تیرہ برس کے عرصے میں صرف یہی نہیں ہوا کہ مصر کے حکمران بدل گئے، اور باشندوں کو نئے حالات سے دوچار ہونا پڑا، بلکہ یہ واقعہ مصر کی حقیقی آزادی کا پیش خیمہ تھا۔ تمام فاتحین اب تک مصر کو اپنے مفاد کی تکمیل کا ایک ذریعہ سمجھتے آئے تھے۔ اہل مصر کی حیثیت خود انھیں کے ملک میں غلاموں سے ذرا کم تھی۔ ان کے لئے قوانین جدا تھے، معاشرے میں انھیں کوئی درجہ حاصل نہ تھا، فوج میں وہ شریک نہیں ہو سکتے تھے، ہر وقت اور ہر طرح کے مظالم کا شکار ہوتے رہتے تھے، اور مذہبی تنازعات کی وجہ سے ان کا ملک خون ریزی اور فتنے کا گھر بن گیا تھا۔ اسکندریہ جیسا قدیم مرکز علم وفضل برباد ہو چکا تھا، اور وہاں کے مدرسے اور کتب خانے مذہبی دیوانگی کے نذر ہو کر تباہ حال تھے۔ علم کے ساتھ فن بھی رخصت ہو چکا تھا۔ لیکن اب اسلامی فتح سے ایک سیاسی انقلاب کی تکمیل ہی نہیں ہوئی، بلکہ ایک ہمہ گیر ذہنی اور مادی انقلاب شروع ہوا۔ ایک ایسی قوم وہاں حکمران بنی جو آزادی کا حقیقی مفہوم سمجھتی تھی، اور اسے عزیز رکھتی تھی۔ ان کا سیاسی اور معاشری نظام اور ان کی زبان اس جذبے کو نقصان پہنچانے کے بجائے اُسے اور زیادہ پختہ اور مستحکم بنا دیتے تھے۔ یہ کیوں کر ہو سکتا تھا کہ ان جذبات کا اثر مفتوحہ قوم پر نہ پڑے۔ نئی عرب حکومت ان کے ساتھ خواہ کیسا ہی سلوک کرے، ناممکن تھا کہ حکومت عربی زبان کی اشاعت روک دے، اور جوں جوں یہ زبان ملک میں پھیلتی گئی، ناممکن تھا کہ اس زبان کے مخصوص جذبات آزادی کی اشاعت ملک میں نہ ہو۔ دوسری نعمت جو اس نئی فتح سے اہل مصر کو حاصل ہوئی وہ قرآن شریف کا قانون تھا۔ قدیم قانون کی طرح یہ کتاب مہور نہ تھی کہ مخصوص اشخاص کے سوا کوئی اسے سمجھ یا پڑھ ہی نہ سکے۔ صلائے عام تھا، بلکہ ہر شخص کا فرض تھا، کہ اس قانون یعنی قرآن کو پڑھے اور سمجھے، اور اپنے جائز حقوق وفرائض سے واقف ہو۔ مزاحمت کا سوال تو پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اول تو عربی زبان کی اشاعت بذات خود آزادی کی تحریک کا باعث ہوئی، اور پھر جوں جوں قرآن کی اشاعت وسیع تر ہوتی گئی اس تحریک میں

سرعت اور تندی پیدا ہوئی۔ کوئی حکمران قوم جو قرآن کو ماننے والی ہو اس تحریک کا خاتمہ نہیں کرسکتی، کیونکہ مفتوح قوم کے مطالبات جب قرآن پر مبنی ہوں تو ان سے انکار کرنا ناممکن ہے یہی کیفیت مصر کی ہوئی۔ عربی زبان اور قرآن کی اشاعت نے اس ملک کے باشندوں کو نئی زندگی بخشی، جس کا پتہ اس کی ہزارہا سالہ تاریخ وتمدن میں نہیں ملتا۔

(۳)

مصر کی فتح کے بعد حضرت عمرو بن العاص کو وہاں کا حاکم "علی الصلاۃ وعلی الخراج" مقرر کیا گیا اور وہ چار سال چند مہینے وہاں رہے[۱]۔ اس دوران میں اگر انھوں نے مصر میں کوئی نئے سیاسی یا انتظامی ادارے قائم کئے تھے تو ان کا علم ہم تک نہیں پہنچا۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ پرانا نظم ونسق بدستور جاری رہا تھا، اور اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ آپ کے عہد حکومت میں عربوں نے صرف اس سے غرض رکھی کہ جو محاصل انھوں نے عائد کئے ہیں وہ باقاعدہ طور پر وصول ہوتے رہیں۔ جہاں تک مرکزی اور صوبہ واری حکومتوں کا تعلق ہے عمرو بن العاص ضروری امور کے متعلق ہمیشہ خلیفہ سے استفسار کرتے تھے اور ان کے احکام پر عمل کرتے تھے۔ ورنہ تفصیلی طور پر ان تعلقات کا تذکرہ کرنا ناممکن ہے۔

ایک اور سوال یہ ہے کہ فتح مصر سے عربوں کو کیا معاشی فائدے پہنچے! ہم اوپر ذکر کرچکے ہیں کہ ۱۸ھ ہی میں حجاز کے قحط کو مصر کے غلے کی مدد سے دور کیا گیا تھا۔ اس ابتدائی دور میں عربوں کو اسی قسم کی مدد کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ اسی کے بعد کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے عمرو بن العاص اور مصریوں کی ایک جماعت کو مدینہ بلایا، اور ان سے کہا کہ وہ سب اس پر غور کریں کہ ایک نہر دریائے نیل سے ساحل بحر احمر تک کھودی جائے، تاکہ حجاز تک غلہ پہنچنے میں آسانی ہو۔ کیونکہ غلہ کو دور سے اونٹوں پر لاد کر لانے میں

---

[۱] الکندی ص ۱۱۔

اتنا وقت گذر جاتا تھا کہ اہل حجاز اس سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اہل مصر نے آپس میں مشورہ کیا، وہ اس تجویز کے مخالف تھے، کیوں کہ اس سے ان کے ملک کے معاشی حالات پر برا اثر پڑتا تھا۔ لیکن کچھ ردو قدح کے بعد وہ اس پر راضی ہو گئے، اور حضرت عمرو بن العاص نے ایک سال میں یہ نہر (خلیج) جو خلیج امیر المومنین کہلاتی تھی تیار کرا لی، اور اس میں بار برداری کی کشتیاں چلنے لگیں۔ چنانچہ اب مکہ اور مدینہ کو اسی ذریعے سے غلہ بھیجا جانے لگا۔ خلیفہ عمر بن عبد العزیز بن مروان کے زمانہ تک یہ خلیج برابر کام میں آتی رہی، مگر بعد کے والیوں نے اس کی طرف توجہ نہ کی اور وہ ریت سے پٹ گئی۔ مصر کے حاجی کبھی ساحل تنیس سے اسی خلیج کے ذریعہ سفر کر کے قلزم پہنچتے تھے، اور وہاں سے بحری جہازوں میں منتقل ہوا کرتے تھے[۱۱]

حضرت عمرو بن العاص کے سامنے پہلا اور فوری مسئلہ یہ تھا کہ فاتح فوج کہاں ٹھیرائی جائے۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ معاہدے کے مطابق یونانیوں نے اسکندریہ خالی کر دیا تھا، اور وہاں کے مکانات بے کار پڑے تھے۔ ابن عبد الحکم[۱۲] نے بیان کیا ہے کہ جب عمرو بن العاص اسکندریہ میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر کہ وہاں کے جو مکانات خالی پڑے ہیں وہ مسلمانوں کے لئے کافی ہوں گے، انھوں نے وہیں قیام کرنا چاہا، اور حضرت عمر سے اس کے متعلق استصواب کیا گیا۔ لیکن آپ اس کے خلاف تھے کہ آپ کے اور مسلمانوں کے درمیان دریا حائل ہو، اور یہ معلوم کر کے اسکندریہ تک پہنچنے کے لئے نیل عبور کرنا پڑتا ہے، انھوں نے عمرو بن العاص کو اسکندریہ میں قیام کی اجازت نہیں دی، اور وہ فسطاط واپس آ گئے۔ یہاں آ کر نئے مسائل پیدا ہوئے۔ مختلف عرب قبائل جو اس فاتح فوج میں شریک تھے، ان میں جائے قیام کے متعلق

---

[۱۱] سیوطی: حسن المحاضرہ۔ ج ۱۔ ص ۷۶، ۷۷۔

[۱۲] فتوح مصر و اخبارہا۔ ص ۹۱۔

جھگڑے ہونے لگے، کیونکہ یہ قبائل اس عرصہ میں ایک دوسرے سے مِل جل گئے تھے۔ اس پر عمرو بن العاص نے معاویہ بن حُدَیج التُجیبی، شریک بن سُمَیّ الغطیفی، عمرو بن قحزم الخولانی حیویل بن ناشر المعافری کو اس کام پر مقرر کیا کہ وہ مختلف قبائل کی قیام گاہ کا تعین کریں سنہ ۲۱ھ میں انھیں حضرات نے لوگوں کو مختلف مقامات میں اتارا اور مختلف قبائل کو الگ الگ کیا۔[۱۳]

اگر ہم عربوں کے دوسرے بسائے ہوئے شہروں کا مقابلہ فسطاط سے کریں تو ایک بین فرق نظر آئے گا۔ عراق میں کوفہ اور بصرہ دو شہر بالکل اسی غرض سے بسائے گئے تھے، جو فسطاط کے بسانے کی غرض تھی۔ ان دونوں شہروں میں عرب قبائل ملے جلے رہتے تھے، اور یمنی اور مضری یا قیسی قبائل کے لئے شہر کے الگ الگ حصے مختص نہ تھے، اور نہ اس کا پتہ چلتا ہے کہ ان شہروں میں زیادہ تعداد قیسی قبائل کی تھی یا یمنی قبائل کی۔ برخلاف اس کے فسطاط کو اس طرح تقسیم کیا گیا تھا کہ ہر قبیلہ الگ الگ رہتا تھا۔ مذکورہ بالا حضرات نے جس طرح مختلف خطط بنائے تھے، اور جن جن قبیلوں کے لوگ اُس وقت مصر میں موجود تھے، اُس کی پوری تفصیل ہم تک پہنچی ہے۔[۱۴]

ان خطط پر نظر ڈالنا دلچسپی کا باعث ہوگا۔ سب سے پہلے خطۃ اہل الرایہ تھا۔ اس خطے میں قریش، انصار، خزاعۃ، اسلم، غفار، مزینۃ، جُہَینۃ، ثقیف، اَشجَع، دوس، عبس بن بُغَیض، بنو کنانہ کے حرش اور لیث بن بکر کے لوگ آباد تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خطے میں مختلف قبائل ملے جلے تھے، اور اسی وجہ سے اس تمام آبادی کو عمرو بن العاص نے ایک جھنڈے تلے جمع کر کے ان کا دیوان بھی یک جا کر دیا تھا۔ انھیں میں

---

۱۳ خطط ج ۱۔ ص ۲۹۰، منقول از قضاعی + ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۴۷ + سیوطی ج ۱۔ ص ۴۷، سیوطی نے ناموں کا املا الکندی اور مقریزی سے ذرا مختلف لکھا ہے۔

۱۴۔ خطط ج ۱۔ ص ۲۹۸، ۲۹۸ + ابن عبد الحکم ص ۹۱، ۱۳۲ + قلقشندی ج ۳۔ ص ۳۲۹ ۔ ۳۳۳ ۔

عُتَقا بھی شامل تھے، مگر وہ عربوں سے الگ رہتے تھے۔ ان سب کو ایک عام نام اہل الرایہ دے دیا گیا تھا۔ خط مہرہ: بن حیدان بن عمر بن الحاف بن قضاعہ ابن مالک بن حمیر۔ خطۃ تجیب: اشرس بن شبیب بن اسکن بن الاشرس بن کندہ کے دو بیٹوں عدی اور سعد کی اولاد تھے۔ تجیب ان کی ماں کا نام تھا۔ پھر خطۃ لخم۔ یہ دو خطے تھے: خطۃ اللفیف: اسکندریہ کی فتح کے بعد عمرو بن العاص کو معلوم ہوا کہ رومی بیڑہ اسکندریہ آرہا ہے۔ انھوں نے خبریں معلوم کرنے کے لئے جاسوس مقرر کئے۔ اس اثنا میں وہ قبائل جو لفیف کہلاتے ہیں اسکندریہ کی حفاظت کے لئے جمع ہو گئے۔ انھیں قرآن شریف (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۰۶) کے مطابق لفیف کا عام نام دے دیا گیا۔ ان میں ازد، حجر، غسان، شجاعہ، نضر بن جذام، لخم، حزاف اور تنوخ کے لوگ تھے۔ یہ سب ایک جگہ رہتے تھے۔ لیکن ان کے دیوان الگ الگ تھے۔ یہ سب قبیلے یمنی یا کلبی تھے۔ خطۃ اہل الظاہر: یہ وہ لوگ تھے جو عمرو بن العاص کی فتح اسکندریہ سے واپسی کے بعد، جب فسطاط کے خطط معین ہو چکے ہیں، اسکندریہ سے وہاں آئے تھے۔ اس لئے انھیں شہر کے باہر جگہ ملی تھی۔ انھیں کے ساتھ عُتَقا بھی تھے۔ ان کے دیوان اہل الرایہ کے ساتھ تھے اور خطط شہر سے باہر تھے۔ ان میں ازد اور فہم کے لوگ تھے۔ خطۃ الغافق اور خطۃ الصدف تھے۔ یہ دونوں قبائل بھی یمنی تھے۔ خطۃ الفارسیین میں وہ ایرانی رہتے تھے جو باذان کی بقیہ فوج کے سپاہی تھے، اور فتح مصر میں عمرو بن العاص کے ساتھ شریک رہے تھے۔ اس طرح ظاہر ہے کہ ان کا تعلق بھی یمنیوں ہی سے تھا۔ خطۃ مذحج، خطۃ عطیف بن مراد، خطۃ وعلان، خطۃ یحصب، خطۃ رعین، خطۃ ذو الکلاع، خطۃ معافر بن یعفر بن مرہ بن ادد، خطۃ سبا، خطۃ رجبہ، خطۃ السلف بن سعد، خطۃ بنی وائل، خطۃ القبض بن مرثد، خطۃ الحمراوات الثلاث۔ ان لوگوں کو یہ نام اس وجہ سے دیا گیا تھا کہ ان میں وہ رومی شامل تھے، جو جنگ یرموک سے قبل اسلام لے آئے تھے، اور قیساریہ وغیرہ کے رہنے والے تھے۔ ان رومیوں کے علاوہ

اس خطے میں یمنی قبائل بھی رہتے تھے، جیسے بلی بن عمرو بن الحاف بن قضاعہ، فہم، عدوان، ازد، بنو بحر، بنو سلامان، یشکر بن لخم وغیرہ۔ ان کے خطط کی تعداد تین تھی: الاولی، الوسطی، القصوی۔[۱۶]
ابن عبد الحکم نے لکھا ہے کہ فسطاط کی تخطیط کے وقت خطط اور قلعے کے درمیان ایک میدان بطور جولان گاہ کے چھوڑ دیا گیا تھا۔ مگر امیر معاویہ نے یہ میدان خرید کر بطور قطائع مختلف لوگوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

فسطاط سے قطع نظر، ایک اور مقام جہاں عرب نو آباد کار بسے اور فسطاط کی طرح ان کے خطط معین کئے گئے جیزہ تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ عمرو بن العاص، اسکندریہ سے آنے کے بعد جب فسطاط میں مقیم ہوئے تو اس سمت میں اپنے آپ کو دشمن سے محفوظ کرنے کے لئے انھوں نے یمنیوں میں سے آل ذی اصبح، یافع بن زید بن رعین، ہمدان، آزد کے بعض حصے، اور بنو حجر بن الھنوبن الازد کو حبشیوں کی ایک جماعت کے ساتھ جیزہ میں مقرر کیا۔ جب ہر طرح امن و امان ہو گیا تو آپ نے ان قبائل کو بھی فسطاط بلایا مگر ان لوگوں نے نقل مکان کرنا پسند نہیں کیا، اور جیزہ میں مستقل قیام کرنا چاہا۔ حضرت عمرو بن العاص نے حضرت عمر کو اس کی اطلاع دی۔ حسب دستور خلیفہ نے اعتراض کیا کہ ان میں اور مسلمانوں میں دریا حائل ہوگا، اور لکھا کہ اگر دشمنوں نے اچانک ان اہل جیزہ پر حملہ کیا تو عمرو بن العاص ان کی مدد نہیں کر سکیں گے۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ ان لوگوں کو اپنے ساتھ ہی رکھو اور اگر وہ جیزہ میں رہنے پر اصرار ہی کریں تو سرکاری آمدنی (فَیِٔ المسلمین) سے ایک قلعہ ان کے لئے تعمیر کرا دو۔ مگر انھیں یہ مقام اتنا پسند آگیا تھا کہ اب بھی انھوں نے نقل مکان کرنے سے انکار کیا۔ قلعہ تعمیر کرنے پر ہمدانی معترض ہوئے اور کہا کہ "ہماری تلواریں ہمارے قلعے ہیں" بہر حال ۲۲ھ میں عمرو بن العاص نے

---

[۱۶] فتوح مصر و اخبارہا، ص ۱۳۲ + سیوطی ج ۱، ص ۶۵ +

خلیفہ کے حکم کی تعمیل کی اور قلعہ بنوانا شروع کیا۔ ۲۲ھ میں یہ قلعہ مکمل ہوا۔ ہمدان اور ان کے علاوہ جتنے اور قبائل جیزہ میں آباد ہوئے وہ سب یمنی تھے۔ عمرو بن العاص نے ان کے لئے خطط مقرر کئے، اور یہ قبائل زراعت میں لگ گئے[۱۴]۔

عربوں کی آبادی کا تیسرا مرکز اسکندریہ تھا۔ یہاں ابو الاسود بن نضر بن عبد الجبار کے سوا اور کسی کا خط نہیں تھا، اور یزید بن حبیب کی روایت ہے کہ حضرت زبیر بن العوام کا بھی ایک خط تھا۔ ان کے سوا باقی سب آخائذ تھے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ جس شخص نے جس مکان پر قبضہ کر لیا وہ مع اپنے اہل خاندان کے وہاں اتر پڑا۔ چنانچہ خود عمرو بن العاص نے بھی ایک قصر پر قبضہ کیا تھا، اور بعد میں اسے عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح کے نام ہبہ کر دیا تھا۔ عثمان بن صالح نے بیان کیا ہے کہ عمرو بن العاص نے اپنی فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک حصہ شہر اسکندریہ کی حفاظت کے لئے اور ایک چوتھائی ساحل کی حفاظت کے لئے مقرر تھا، باقی دو حصے وہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اول الذکر دو چوتھائی حصے اسکندریہ میں گرمی اور سردی کے موسم میں تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ ہر عریف کا ایک محل تھا، جہاں وہ مع اپنے حصہ فوج کے اترتا تھا۔ جب ساحل کی فوج اسکندریہ میں منتقل ہوتی تھی تو سپاہی انھیں گھروں میں اترتے تھے جہاں ان کے ساتھی پہلے رہ چکے تھے۔ ان مکانات کی مرمت رومیوں کے ذمے تھے، اور خالی ہونے پر رومی ہی ان پر قابض ہو جاتے تھے[۱۵]۔ سپاہیوں کو شہر کے مکانات میں ٹھیرانا قدیم رومی طرز عمل تھا، اور عربوں نے پرانے نظم و نسق کے ساتھ اسے بھی اختیار کر لیا تھا۔

مصر میں عربوں کی یہ پہلی تدوین تھی، اور حضرت عمرو بن العاص کے ہاتھوں اس کی

---

[۱۴] خطط ج ۱ ص ۲۰۶ + سیوطی ج ۱ ص ۶۶ + ابن عبد الحکم ص ۱۲۸-۱۲۹

[۱۵] ابن عبد الحکم ص ۱۳۰ + سیوطی ج ۱ ص ۶۵ +

تکمیل ہوئی[۲۹]۔ اِن خطط پر، اور اُن قبائل کے ناموں پر جو ان خطط میں آباد تھے، عورکرنے سے معلوم ہوگا کہ مصر کے فاتح یمنی یا کلبی تھے، اور انھیں کو مصر میں جگہ دی گئی تھی۔ صرف فہم اور عدوان دو قیسی قبائل مصر میں آباد ہوئے تھے۔

یمنی قبائل میں بھی تجیب سب سے پیش پیش تھے۔ معاویہ بن حُدَیج التُجیبی کا اس سے قبل ہوچکا ہے۔ ان کے متعلق اختلاف ہے کہ آیا وہ صحابی تھے یا نہیں۔ لیکن ابتدائی فتوحاتِ مصر میں ہی انھیں یہ درجہ حاصل تھا کہ اسکندریہ کی فتح کی خبر دینے کے لئے انھیں کو حضرت عمرو بن العاص نے حضرت عمرؓ کے پاس بھیجا تھا۔ حضرت عثمان کے عہد میں اور اس کے بعد شیعانِ عثمان میں سب سے زیادہ سربرآوردہ آدمی سمجھے جاتے تھے، اور اس فتنے کے زمانے میں مصر میں موجود تھے۔ واقعہ صفین میں امیر معاویہ کی طرف سے جنگ میں شریک تھے۔ محمد بن ابوبکر کے خلاف جو فوج بھیجی گئی تھی اس کے سپہ سالار تھے۔ ۴۵ھ اور ۵۰ھ کے درمیان انھوں نے افریقہ میں نمایاں فتوحات حاصل کیں۔ بنو امیہ میں ان کی عظمت وشان کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ۵۰ھ میں جب وہ امیر معاویہ سے ملنے کے لئے دمشق گئے ہیں تو راستے میں ان کے لئے خاص انتظامات کئے گئے تھے: "تعظماً لشانہ"[۳۰]۔ معاویہ بن حُدَیج کی اولاد بھی نہ صرف بنو امیہ بلکہ بنو عباس کے زمانے میں سربرآوردہ اور معزز رہی اور بڑے بڑے شہری اور عدالتی عہدوں پر فائز ہوتی رہی۔ کنانہ بن بشر بن سلیمان التجیبی ان لوگوں میں سے تھا جو مصر سے حضرت عثمان کے خلاف مدینہ گئے تھے۔ وہی حضرت عثمان کا قاتل ہے، اور دوسرے قاتلانِ عثمان کے ساتھ معاویہ بن حُدَیج نے اسے بھی

۲۹۔ خطط ج ۱۔ ص ۴۹ +

۳۰ ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۲۲، ۵۴، ۷۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۴، ۱۴۶، ۱۵۵، ۱۶۰، ۱۶۸، ۱۶۹، + ابن عبدالحکم ص ۹۵، ۱۰۲، ۱۳۰، ۱۸۸، ۱۹۲، ۱۹۴ +

قتل کرایا تھا۔ اسی کے متعلق ولید بن عقبہ کا قول ہے۔ ؎

الا ان خیر الناس بعد ثلاثة قتیل التجوبی الذی جاء من مصر

ومالی لا ابکی وتبکی اقاربی وقد حُجِبَت عنّا فضول ابی عمرو[21]

سلیم بن عمیر التجیبی ۴۰ھ میں مصر کے پہلے قاضی مقرر ہوئے تھے اور ۷۵ھ میں ان کا انتقال ہوا[22]۔ ۶۸ھ میں غیاض بن غنم التجیبی اسکندریہ کے والی مقرر ہوئے تھے[23]۔ ۷۵ھ میں عبد العزیز بن مروان اپنے بھائی خلیفہ عبد الملک سے ملنے کے لئے دمشق گیا ہے تو اس نے زیاد بن حنظلہ التجیبی کو اپنا قائم مقام بنایا تھا[24]۔ ۳۵ھ میں عبد اللہ بن سعد جب حضرت عثمان سے ملنے مدینہ گئے تو انھوں نے سلیم بن عمیر التجیبی کو مالیات کا حاکم (علی الخراج) مقرر کیا تھا[25]۔ یہ پہلا موقع تھا کہ "علی الصلاۃ" اور "علی الخراج" دو الگ الگ عہدہ دار مقرر ہوئے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر کا قاتل بھی مصر کا رہنے والا عبد الرحمن بن بُحنَس تجیبی تھا[26]۔ تجیب کے بعد دوسرا مقتدر قبیلہ خولان تھا۔ ۶۲ھ میں یزید بن معاویہ نے سعید بن یزید کو حاکم مقرر کیا، مگر اہل مصر کو یہ شخص پسند نہ آیا۔ مصریوں کا ایک وفد جس میں عمرو الخولانی بھی شریک

---

[21] الکندی ص ۱۷، ۱۹، ۲۰، ۲۹ + خطط ج ۲۔ ص ۳۳۵، ۳۳۶ + مبرد۔ ج ۲۔ ص ۲۴۰ + ولہاوزن (انگریزی ترجمہ) ص ۹۷ +

[22] ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۲۱۴

[23] ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۲۲۹، ۲۳۰

[24] ابن تغری بردی ج ۱ ص ۲۱۳ + الکندی (ص ۵۱) : زیاد بن حناط بن سیف

[25] ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۱۰۳ + خطط (ج ۱۔ ص ۳۰۰) میں سلیم بن عمیر کا نام سلیمان بن عنتر اور الکندی (ص ۱۲) میں سلیمان بن عمر التجیبی ہے۔

[26] الکندی ص ۵۱، ۳۲۱ +

تھا، اس سے ملا اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا[27]۔ ۸۹ھ میں عبد اللہ بن عبد الملک بن مروان حاکم مصر، اپنے بھائی خلیفہ ولید سے ملنے دمشق گیا ہے تو اس نے عبد الرحمٰن بن عمرو بن مخزوم الخولانی کو اپنا قائم مقام مقرر کیا[28]۔

فوج کے مختلف قبائل کی جا، قیام کا تعین کرنے کے علاوہ عمرو بن العاص نے موسم بہار میں ہر قبیلے کے لئے اس کی قیام گاہیں اور چراگاہیں (التربیع واللبن) بھی مقرر کر دیں، مگر اسے خود قبائل کی پسند پر چھوڑ دیا۔ زیادہ تر جن مقامات کو اس کام میں لایا جاتا تھا، وہ مَنُوف، سَمَنُّود، اَھناس اور طحا تھے۔ اہل الرایہ مختلف جگہوں میں منتشر ہو جاتے تھے۔ آل عمرو بن العاص اور آل عبد اللہ بن سعد نے منوف اور وسیم پسند کئے تھے۔ ھُذَیل نے بنا اور بُوصِیر، عدوان نے بوصیر اور عک کے قرئے۔ ان کا بڑا حصہ بوصیر، منوف، سندبیس (یا سبندس) اور اتربیت میں یہ موسم گذارتا تھا۔ قبیلۂ بَلِیّ منوف اور طرابیہ میں، فہم اتربیت عین الشمس اور منوف میں، مہرہ تتا اور تُمَیّ میں، صدف فیوم میں، تجیب تُمَیّ، بسط اور وسیم میں، لخم فیوم، طرابیہ اور قربیط میں، جذام طرابیہ اور قَربیط میں، حضرموت بَنَا، منوف اور فیوم میں، ان کے ساتھ صبس بن زوف بھی تھے۔ حمیری بوصیر اور اھناس کے قریوں میں، اسی طرح اس سلسلے میں اور قبائل کے نام بھی بیان ہوئے ہیں۔ ابن عبد الحکم[29] لکھتا ہے کہ گویہ انتظامات ایک حد تک مستقل تھے، لیکن بعض قبائل کبھی کبھی ایک جگہ سے دوسری جگہ تجاوز بھی کر جاتے تھے۔ بڑے بڑے قبائل انھیں مقامات میں موسم بہار گذارتے تھے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں بھی جن قبیلوں کا نام لیا گیا ہے ان میں عدوان اور فہم کے سوا سب یمنی ہیں۔ خواہ مقلات

---

[27] ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۱۷۵+

[28] ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۲۳۳+

[29] فتوح مصر و اخبارھا ص ۱۴۱۔۱۴۳۔ جہاں پوری تفصیل ملیگی۔ اس کے علاوہ دیکھو خطط ج ۲۔ ص ۲۶۰، ۲۶۱+

کے لحاظ سے کتنی ہی تبدیلی کیوں نہ ہوتی ہو، اتنی بات یقینی ہے کہ یہ قاعدہ محض وقتی نہیں تھا، بلکہ سال بسال یہی طرز عمل اختیار کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ سالانہ قیام کے دوران میں کچھ قبائل ایسے بھی تھے جنھوں نے مختلف اطراف میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ مُدلج نے حمیر کے بعض افراد کے ساتھ خَربتا میں، اور خشین نے لخم اور جذام کے ساتھ بل کرصان، اِتلیل اور طرابیہ میں مستقل نو آبادی بنالی تھی۔[۲۰]

عربوں کا فسطاط، جیزہ اور اسکندریہ میں بس جانا، اور خصوصاً موسم بہار میں اس طرح مختلف مقامات میں منتشر ہو جانا، درحقیقت مصر میں عربیت کے ارتقاء کی پہلی منزل تھی۔ کیونکہ ان کے قیام کے ساتھ ساتھ عربی زبان، عربی معاشرت اور عربی جذبات بھی ان مقامات میں پھیلے۔ یہ ایک چیز تھی جہاں عربوں نے قدیم رومی اصول کی پابندی نہیں کی، اور شروع ہی سے ملک میں پھیلنا شروع کر دیا۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اس تدوین سے حکومت کو کیا فائدہ پہنچا؟ واقعہ یہ ہے کہ عرب، جہاں کہیں بھی وہ آباد ہو، ایک پیشہ ور سپاہی سمجھا جاتا تھا، اور بوقت ضرورت اسے فوج میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ قانوناً سپاہی ہونے کے لحاظ سے وہ اس کا مجاز نہ تھا کہ زراعت یا کسی اور پیشے کو بسر اوقات کا ذریعہ بنائے۔[۲۱] گزارے کے لئے اُسے حکومت سے حسب مراتب وظیفہ (فریضہ) ملتا تھا، اور کوئی عرب ایسا نہ تھا جو وظیفہ خوار نہ ہو۔ چنانچہ امیر معاویہ کے زمانہ میں بیان ہوا ہے کہ مصر کے دیوان کی تعداد چالیس ہزار تھی، اور ان میں چار ہزار ایسے تھے جنھیں دو دو سو دینار وظیفہ ملتا تھا۔[۲۲] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

---

۲۰ ابن عبد الحکم ص ۱۴۲ + خطط ج ۲۔ ص ۲۶۱ +

۲۱ سیوطی ج ۱۔ ص ۵، ۶ +

۲۲ خطط [illegible] ۹۷ +

اُس زمانے میں مصر میں عرب فوج کی تعداد چالیس ہزار تھی۔ جیسا کہ آیندہ معلوم ہوگا، یہ عرب جو کسی زمانے میں سپاہی تھے، رفتہ رفتہ اراضی کے مالک ہوتے گئے، اور زراعت نہ کرنے کی پابندی اٹھ گئی۔ مگر ان کے فریضے بدستور جاری رہے، گو ان میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی چنانچہ عمر بن عبد العزیز نے اس "عطا" میں اضافہ کیا[۱۳] اور ان کے جانشین یزید بن عبد الملک نے اپنے حاکم مصر بشر بن صفوان کو حکم دیا کہ یہ اضافہ منسوخ کر دے[۱۴]۔

(۴)

یہ شہری تنظیم اور عرب قبائل کی نو آبادکاری کے مسائل کا فیصلہ حضرت عمرو بن العاص کے فرائض کا صرف ایک حصہ تھا۔ وہ مالیات کے حاکم (علی الخراج) بھی تھے، اور اس نو مفتوحہ ملک کے ذرائع آمدنی اور محاصل کا تصفیہ کرنا بھی انھیں کا فرض تھا۔

حضرت عمرو بن العاص نے جب مصر کی طرف کوچ کیا ہے تو حضرت عمر جابیہ میں موجود تھے۔ یہ وہ موقع تھا جب آپ نے انتظامی امور کی تشخیص کی ہے اور نظم و نسق اور مالیات کے متعلق مختلف معاملات کا فیصلہ فرمایا ہے۔ اس وقت جو خطبہ آپ نے ارشاد کیا ہے، اور جس میں یہ اصول بیان کئے ہیں، وہ بہت مشہور ہے[۱۵]۔ اس طرح فتح مصر سے ذرا ہی قبل نظم و نسق کے عام قواعد مرتب ہو چکے تھے، اور ضرورت کے لحاظ سے ان کا جاری کرنا باقی رہ گیا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مصر کی اراضی کی پوری پیمائش ہو چکی تھی، اور مردم شماری بھی مکمل موجود تھی۔ اس لئے مسلمانوں کو یہاں وہ مسائل پیش نہیں آئے جن سے انھیں دوسری فتوحات میں دوچار ہونا پڑا۔ بہر حال فتوحات کا یہ ابتدائی دور

---

۱۳ خطط ج ۱۔ ص ۳۰۲ + الکندی ص ۶۸ +

۱۴ ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۲۷۲ + الکندی ص ۷۰ +

۱۵ ابن عساکر ج ۱۔ ص ۱۷۵ ۔ ۱۸۰ + ابن الاثیر۔ کامل۔ ج ۲۔ ص ۲۱۷ +

تھا اور محاصل کا کوئی خاص پروگرام مرتب نہیں ہوا تھا۔

فتح کے دوران میں اور اس کے فوراً بعد فاتح فوج کو رسد کی ضرورت پیش آئی تھی۔ اس ابتدائی زمانے کے متعلق ایک روایت بیان کی گئی ہے کہ مصر کے تین روسا سے الگ الگ تین عہد نامے طے ہوئے تھے، اور ان کے مطابق صلح کی شرط یہ تھی کہ فی کس دو دینار بطور "جزیہ" ادا کئے جائیں گے۔ حضرت عمرؓ کے حکم کے مطابق جزیہ صرف بالغ مردوں پر لگایا گیا تھا[۳۴]۔ اور اس کے علاوہ "ارزق المسلمین" کا انتظام کیا جائے۔ پانچ شرطیں اور تھیں: کہ انھیں جلا وطن نہیں کیا جائے گا، ان کی عورتوں کو ان سے الگ نہیں کیا جائے گا، کاشتکاروں سے تعرض نہیں ہوگا، وہ اراضی سے بے دخل نہیں کئے جائیں گے اور محاصل میں اضافہ نہیں ہوگا[۳۵]۔ "ارزق المسلمین" کی تفصیل یہ بیان ہوئی ہے کہ ہر ماہ فی کس ایک اردب غلہ دیا جائے گا۔ چربی اور شہد کی مقدار راوی نے بیان نہیں کی۔ اس کے علاوہ وہ کپڑے اور لباس مہیا کرنے پڑتے تھے جو خلیفہ کی طرف سے لوگوں میں تقسیم کئے جاتے تھے۔ رعایا پر یہ بھی فرض تھا کہ جو مسلمان ان کے ہاں مقیم ہوں تین دن تک اُن کی ضیافت کا انتظام کریں[۳۶]۔

ابتدائی عہد کے جو قرطاس دریافت ہوئے ہیں ان سے اس روایت کی توثیق ہوتی ہے، اور بعض اور تفصیلات بھی معلوم ہوتی ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے زیادہ اہم چیز فوج کی رسد تھی خصوصاً اس وقت جب کہ فوج کوچ کر رہی ہو تین دن کے "ارزق المسلمین"

---

[۳۴] خطط ج ۱۔ ص ۷۶۔

[۳۵] خطط ج ۱۔ ص ۷۶، ۷۷، ۱۹۴۔ بلاذری۔ ص ۳۳۱-۳۳۲، ۳۲۱۔

[۳۶] ابن عبدالحکم ص ۱۵۲۔ خطط ج ۱۔ ص ۷۶۔ ضیافت کی تفصیل: امام شافعی کی کتاب الام۔ ج [illegible]۔ ص ۱۲۳-۱۲۴۔

ایک قفیز گیہوں فی کس فی ماہ، نصف پیمانہ تیل، موٹا پسا ہوا آٹا، بھیڑیں اور پکا ہوا کھانا تھے۔ گھوڑوں کے چارے کی قیمت نقد ادا کرنی پڑتی تھی۔ انھیں قرطاسوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو سپاہی گھروں میں مقیم ہوتے تھے ان کے لئے گھر والوں کو کیا انتظامات کرنے پڑتے تھے۔[59]

حضرت عمرو بن العاص پہلے شخص تھے جنھوں نے مصر سے محصول کیا۔ یہ رقم، بحساب دو دینار فی کس، ایک کروڑ بیس لاکھ دینار تھی[60]۔ لیکن کیا یہ محصول وہی چیز ہے جسے جزیہ کہتے ہیں؟ غالباً بیکر پہلا شخص ہے جس نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ابتدائی زمانے میں جزیہ اور خراج مترادف الفاظ تھے، اور دوسری صدی ہجری میں پہلی مرتبہ ان میں فرق پیدا ہو گیا ہے۔ اُس[61] نے رومی طرز عمل کے متعلق ولکن[62] کا ایک بیان نقل کیا ہے، جس سے عربوں کے طریق عمل کی توضیح ہوتی ہے۔ ولکن لکھتا ہے کہ تیسری صدی عیسوی سے سلطنت روما میں محاصل وصول کرنے کا یہ طریقہ تھا کہ صوبے کو مختلف اضلاع میں تقسیم کر کے ایک مقررہ رقم ہر ضلع پر عائد کر دی جاتی تھی، اور یہ رقم مجموعی طور پر ضلع سے

---

[59] بیکر ص ۸۴ +

[60] خطط ج ۱۔ ص ۹۸ + سیوطی (ج ۱۔ ص ۸۰) نے عبداللہ بن صالح سے روایت کی ہے کہ سنہ ۲۰ھ میں عمرو بن العاص نے دس لاکھ دینار، اور سنہ ۲۲ھ میں بابلیون کی فتح کے بعد، ایک کروڑ بیس لاکھ دینار۔ خراج (یا جزیہ) وصول کیا تھا۔ ابن حوقل (ص ۸۰) نے بھی یہی رقم بتائی ہے۔ بلاذری (ص ۲۲۳) نے صرف بیس لاکھ لکھا ہے۔ بٹلر کا یہ خیال درست ہے کہ یہ رقم کاتب کی غلطی سے بجائے ایک کروڑ بیس لاکھ کے صرف بیس لاکھ رہ گئی ہے۔ یعقوبی (ج ۲ ص ۹۳۳) نے لکھا ہے کہ پہلے سال آمدنی ایک کروڑ چالیس لاکھ تھی، اور دوسرے سال ایک کروڑ دینار تھی۔ بہر حال ایک کروڑ بیس لاکھ متفقہ رقم ہے۔ دیکھو بٹلر ص ۴۵۲، ۴۵۳۔ حاشیہ لین پول ص ۱۹۔ اور حاشیہ +

[61] بیکر ص ۸۸ +

[62] Wilcken

وصول کر لی جاتی تھی۔ مصر پر جو مجموعی رقم عائد کی جاتی تھی وہ بھی ملک کے بڑے بڑے شہروں پر، جو اضلاع یا صوبوں کے صدر مقام تھے، تقسیم کر دی جاتی تھی۔ اضلاع کے ملازم اس کا انتظام اس طرح کرتے تھے کہ سربر آوردہ لوگوں سے اس کی ادائی کے متعلق عہد لیتے تھے۔ جو رقم اس طرح وصول طلب قرار پاتی تھی وہ وصول کنندگان وصول کر لیتے تھے[42]

اب اگر غور کیا جائے تو یہاں لگان اراضی، فی کس محصول یا کسی اور محصول کا نام نہیں آتا۔ بلکہ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ مختلف محاصل کو یک جا جمع کر کے ایک مشت رقم کسی نہ کسی طرح وصول ہو جائے۔ اس رقم میں علاوہ لگان کے تجارتی محصول اور رومی فی کس محصول بھی شریک تھا، اور اسے صرف اس لحاظ سے فی کس محصول کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہر شخص سے بحصہ رسدی وصول ہوتا تھا۔ بعینہ یہی عمل پہلی صدی ہجری میں جاری رہا، اور جزیہ اور خراج (لگان) میں فرق نہیں کیا گیا۔ کیونکہ عرب اتنے بے وقوف نہ تھے کہ اس بنے بنائے اصول کو توڑ کر نئے مخمصوں میں پھنستے اور محاصل کے نظام میں ابتری پیدا کر دیتے۔ اس کی چند مثالیں نقل کر دینا کافی ہو گا۔ بلاذری[43] نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیہ کی ادائی پر اہل اُذرح سے صلح کی تھی۔ یہاں مردم شماری اور فی کس محصول کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ عام معنوں میں جزیہ نہیں بلکہ خراج (باج) ہے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دحیۃ الکلبی کو خط دے کر قیصر کے پاس بھیجا ہے کہ تین چیزوں میں ایک اختیار کر لے۔ ان میں سے ایک جزیہ ہے: ان اقرّ له بخراج يجرى عليه[44] آپ کی وفات کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ اسلامی فوجیں باہر بھیجی ہیں تو سپہ سالاروں کو ہدایت کی ہے کہ دشمن کے سامنے تین شرطیں پیش

---

[42] عبدالعزیز بن مروان نے اسکندریہ میں بعینہ یہی طرز عمل اختیار کیا تھا۔

[43] فتوح البلدان ص ۶۶، ۶۷۔ اس کے علاوہ دیکھو ص ۷۱، ۷۳، ۸۷، ۱۲۸، ۱۳۱، ۱۴۳، ۲۲۱، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۴۵۔

[44] الاستخراج لاحکام الخراج۔ ص ۵۔

کریں کہ ان میں سے ایک قبول کرلے ، اسلام یا جزیہ اور اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو جنگ حضرت خالد بن ولید نے عراق میں اہل حیرہ سے اور شام وفلسطین میں اہل دمشق اور اہل حمص سے یک مشت رقمیں وصول کی ہیں اور انھیں جزیہ ہی کہا گیا ہے۔ ان موقعوں پر بھی مردم شماری اور فی کس محصول کا ذکر نہیں، اور نہ اس کا موقعہ تھا۔ صریحاً یہاں جزیہ سے مراد پھر خراج (باج) ہے۔ امام زہری کا قول ہے کہ:

الخراج اسم لما يخرج من الفرائض
في الاموال ويقطع على القرية وعلى مال
الفئ ويقع على الجزية وعلى الغلة والخراج[^1]

یہاں خراج اور جزیہ ہم معنی ہیں۔ دوسرے عرب مصنف بھی دونوں میں فرق نہیں کرتے یا کم از کم ان کے بیانات مبہم ہیں:

قال يحيى بن سعيد[^2]: فنحن نقول الجزية	یحیی بن سعد کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک جزیہ دو طرح کا
جزيتان: جزية على روس الرجال	ہوتا ہے۔ جزیہ سروں پر اور جزیہ مجموعی طور پر (جملة) اہل
وجزية جملة تكون على اهل القرية	قریہ پر جس کا مطالبہ اہل قریہ سے کیا جاتا ہے۔
يوخذ بها اهل القرية فمن هلك	اس لئے اہل قریہ میں سے ایسے لوگ مریں جن پر
من اهل القرية التي عليهم الجزية	اہل قریہ کا مجموعی جزیہ ہے اور سروں پر جزیہ نہ ہو
مسماة على القرية ليست على رؤس	تو ہماری رائے ہے کہ ایسے مرنے
الرجال فانا نرى ان من هلك من	والے اگر اولاد اور وارث نہ چھوڑیں
اهل القرية ممن لا ولد له ولا وارث	



[^1]: الاستخراج لاحکام الخراج ص ۵ +
[^2]: ابن عبد الحکم ص ۱۵۴ + خطط ج ۱۔ ص ۷۷ +

الّا ارضه ترجع الی قریته فی جملة ما علیهم من الجزیة ومن هلك ممن جزیته علی رؤس الرجال ولم یدع وارثاً فان ارضه للمسلمین۔

تو ان کی زمین مجموعی طور سے اہل قریہ پر لوٹ جاتی ہے، اور ایسے لوگ مریں جو جزیہ علی الرؤس ادا کرتے ہیں اور وارث نہ چھوڑیں تو ان کی زمینوں کے مالک مسلمان ہیں۔

یہ فقیہ صریحاً جزیہ اور لگان کو ایک سمجھتے ہیں، مگر دوسرے طرز عمل سے بھی واقف ہیں حالانکہ حالت یہ ہے کہ جزیہ اور لگان ہر صورت میں ایک ہی لوگ ادا کرتے تھے، اور یک مشت ادا کرتے تھے۔ لغویین بھی خراج اور جزیہ کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔ الخوارزمی[۱۳] نے صاف لکھا ہے: الجزیة معرب گزیت وهو الخراج بالفارسیة۔ پھر حضرت عمر بن عبد العزیز کے حالات میں طبری[۱۴] نے لکھا ہے کہ

انما خراج خراسان علی رؤس الرجال۔

امام غزالی[۱۵] نے جزیہ میں ضیافت اور خراج دونوں کو شریک کیا ہے۔ ان تمام باتوں پر نظر رکھتے ہوئے صرف یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ابتدائی عہد میں جو فی کس محصول لگایا گیا تھا وہ ہر جگہ رومی نظام محاصل کے مطابق تھا، اور یہ محصول حقیقت میں خراج (یا باج) ہے نہ کہ جزیہ قرآن شریف میں بھی جزیہ کی غرض و غایت اور اس کے عائد کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ دشمنانِ اسلام اپنی تحقیر و ذلت محسوس کریں۔ یہ کیفیت فی کس محصول سے، جسے عرف عام میں جزیہ کہتے ہیں، اتنی واضح طور پر محسوس نہیں ہوتی جتنی کہ اس طرز عمل سے کہ تمام قوم کو فاتحین کا

---

[۱۳] مفاتیح العلوم۔ ص ۳۹؛ اس کے علاوہ دیکھو لسان العرب، تحت جزی، خرج، اور ضرب؛ لین پول (انگریزی) تحت جزیہ۔ خراج، ضریبہ وغیرہ۔

[۱۴] طبری ج ۷، ص ۱۹۶۔

[۱۵] کتاب الوجیز ج ۲۔ ص ۱۹۷-۲۰۲۔

باج گذار بنالیا جائے' اور ان کی آزادی سلب ہونے کا انھیں یقین دلادیا جائے۔ پہلی صدی میں جزیہ سے یہی مراد تھی۔ دوسری صدی میں جزیہ اور خراج میں فرق پیدا ہوا' اور برابر نمایاں ہوتا چلا گیا۔ اس وقت بھی جزیہ مسلمانوں کی خاص ایجاد نہیں تھا۔ رومی عہد میں فی کس محصول لگایا جاتا تھا' جسے ابتدائی دور میں دیگر محاصل سے ضم کر کے سب کو خراج (باج) قرار دیا گیا تھا۔ دوسری صدی میں مسلمانوں نے رومی فی کس محصول کو دوبارہ عائد کیا' اور اس کا نام جزیہ رکھا۔ عربی عہد کے پورے سو برس تک یہ محصول نہیں لگایا اور لوگ اُسے بالکل بھول گئے تھے۔ جب اس کا احیا ہوا تو قاعدہ کی بات ہے کہ تمام براہ راست محصول رعایا کو ناگوار گزرتے ہیں' اور یہ محصول بھی ناگوار گذرا۔ اس وقت سے اب تک جزیہ کا لفظ قابل نفرت سمجھا جا رہا ہے۔

حضرت عمرو بن العاص نے دو دینار فی کس جو اہل مصر پر عائد کئے ہیں وہ بھی دراصل خراج (باج) ہیں' اور اسے زمانۂ مابعد کا جزیہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ اس کے عائد کرنے کا اصول بھی قدیم رومی طرز عمل کے عین مطابق ہے' اور اس میں وہ فی کس محصول بھی شامل ہے جو رومی زمانے میں لگایا جاتا تھا۔ یہ قدرتی امر ہے کہ شروع شروع میں فاتحین کبھی ملک یا زمین سے تعلق نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک محصول ادا کرنے والے ملک کے باشندے ہیں نہ کہ زمین۔ انھیں اس سے بھی غرض نہیں ہوتی کہ یہ رقم کس طرح وصول ہوتی ہے۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کی فتح کے بعد اہل مصر پر سے محاصل کا بوجھ کم ہو گیا تھا' کیوں کہ رومی نظام محاصل گنجلک بھی تھا اور مطلق العنانہ بھی[۶۱]۔ محاصل کی مقدار اور ان کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ خاص خاص اشخاص یا جماعتیں ادائی محاصل سے مستثنیٰ تھیں۔ چنانچہ ملنے کے مطابق اہل اسکندریہ فی کس محصول کی ادائی سے بری تھے[۶۰]۔ یہی حال

[۶۰] ملنے۔ ص ۱۱۹۔ ۱۲۵۔

[۶۱] دیکھو بٹلر ص ۴۵۳' ۴۵۴۔

مذہبی پیشواؤں کا تھا۔ مگر اب عربوں کے زمانے میں مستثنیات کا زمانہ ختم ہو چکا تھا' اور اہل اسکندریہ بھی بغاوت کر کے اپنے حقوق کھو چکے تھے۔ عربوں نے محض ایک (یا دو) محصولوں پر اکتفا کر کے ایک اصلاحی صورت پیدا کی۔ محاصل کی تعداد گھٹا دینے کی وجہ سے انتظامی مصارف میں کمی ہوئی' اور محصول ادا کرنے والے بھی بار زیادہ محسوس نہیں کرتے تھے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت عمرو بن العاص نے تنظیم اراضی اور ان کے محاصل کو کس حالت میں پایا۔ اس کے متعلق ایک قدیم روایت ابن[۵۲] عبد الحکم میں محفوظ ہے' اور مقریزی اور سیوطی نے اسے نقل کیا ہے۔

وکان عمرو بن العاص لما استوثق له الامر اقر قبطها علی جبایة الروم' وکانت جبایتهم بالتعدیل۔ اذا عُمِرت القریة وکثر اهلها زید علیهم' واذا قل اهلها وَخَرِبَت نقصوا۔ فیجتمع عرفاء کل قریة وماروتها ورُوساء اهلها' فیناظرون فی العمارة والخراب' حتی اذا اقروا من القسم بالزیادة انصرفوا بتلك القسمة الی الکور۔ ثم اجتمعوا هم ورؤسا القری

جب حضرت عمرو بن العاص کی حکومت مستقل ہو گئی تو انھوں نے قبطیوں پر وہی محصول رکھا جو رومیوں کے زمانے میں تھا' کیونکہ یہ طریقہ عادلانہ تھا۔ اگر کوئی قریہ خوش حال ہے اور باشندوں کی کثرت ہے تو اس پر اضافہ کیا جاتا تھا' اور اگر باشندوں کی تعداد کم ہے اور قریہ تباہ حال ہے تو (محصول کی رقم میں) کمی کر دی جاتی تھی۔ ہر قریے کے چودھری اور بڑے بڑے سربرآوردہ لوگ جمع ہوتے تھے' اور قریے کی آبادی اور تباہی پر بحث کرتے تھے۔ اگر وہ

---

[۵۲] فتوح مصر و اخبارها۔ ص ۱۵۲ + خطط ج ۱۔ ص ۷۷ + حسن المحاضرہ۔ ج ۱۔ ص ۷۱ + تینوں مصنفوں کی عبارت میں چند لفظی اختلافات ہیں۔ ہم نے یہاں ابن عبد الحکم کو پیش نظر رکھا۔ بہر حال یہ اختلافات ایسے نہیں جن سے نفس مضمون پر کوئی اثر پڑے۔ اس کے علاوہ دیکھو بٹلر ص ۴۵۱' ۴۵۲ +

۔زعوا علی احتمال القری وسعة
لمزارع ثم ترجع کل قریة بقسمہم
یجمعون قسمهم وخراج کل
قریة وما فیہا من الارض العامرة
یبذرون فیخرجون من الارض
ندادین لکنائسهم وحماماتهم
ومعدیاتهم من جملة الارض،
ثم یخرج منها عدد الضیفة
للمسلمین ونزول السلطان۔ فاذا
وزعوا، نظروا الی ما فی کل
قریة من الصناع والاجراء فقسموا
علیهم بقدر احتمالهم۔ فاذا کانت
فیها جالیة قسموا علیهم بقدر
احتمالهم وقل ما کانت تکون
الارجل المنتاب او المتزوج
ثم ینظرون ما بقی من الخراج
فیقسمونه بینهم علی عدد الارض،
ثم یقسمون ذلک بین من یرید الزرع
منهم علی قدر طاقتهم۔ فان
عجز احدٌ وشکا ضعفاً عن زرع
ارضه، وزعوا ما عجز عنه علی الاحتمال

اس پر راضی ہو گئے کہ زیادتی ہونی چاہئے تو
وہ اس تقسیم کو مرکز ضلع (کورہ) میں لاتے تھے
پھر اور قریوں کے لوگ جمع ہوتے تھے، قریوں
کی طاقت برداشت اور کھیتوں کی وسعت کے
لحاظ سے حصوں کی تشخیص کر کے انھیں تقسیم
کرتے تھے۔ اس کے بعد ہر قریے کے لوگ
جمع ہوتے تھے اور اپنی تقسیم کو جمع کرتے تھے
پھر ہر قریہ کا لگان مقرر کر دیا جاتا تھا، جو اُن
کی آباد زمین کے مطابق ہوتا تھا۔ اس کے بعد
وہ زمین الگ کرتے تھے: یعنے اتنے قدان
کلیسا کے لئے، حماموں کے لئے اور کشتیوں
کے لئے۔ پھر اس کے بعد تقسیم شدہ رقم میں سے
مسلمانوں کی ضیافت اور سرکاری حکام
کی عارضی سکونت کے لئے رقم الگ کرتے
تھے۔ پھر دیکھتے تھے کہ ہر قریے میں کتنے
دستکار اور پیشہ ور ہیں اور ان کی طاقت
برداشت کے مطابق محصول لگاتے تھے،
اور اگر ان میں جلا وطن لوگ (جالیہ) بھی شامل
ہوں تو ان کی استطاعت کے مطابق ان پر
بھی محصول عائد کرتے تھے۔ لیکن
ان میں سے صرف وہ جو بالغ ہوں یا

وان كان بينهم من يريد الزيادة أُعطى ما عجز عنه اهل الضعف، فان تشاحوا قسموا ذلك على عدتهم، فكانت قسمتهم على القراريط الدينار اربعة عشرين قيراطا يقسمون الارض على ذلك وكذلك يروى عن النبى صلى الله عليه وسلم" انكم ستفتحون ارضاً يذكر فيها القيراط، فاستوصوا باهلها خيراً" وجعل عليهم لكل فدان نصف اردب قمح وويبتين من شعير الا القرط[۵۳]، فلم يكن عليه ضريبة والويبة يومئذ ستة امداد ـ وكان عمر بن الخطاب ...... يأخذ ممن صالحه من المعاهدين ما سمى على نفسه، لا يضع من ذلك شيئاً ولا يزيد عليه، ومن نزل منهم على الجزية ولم يسم شيئاً يوديه، نظر عمر فى امره فاذا احتاجوا خفف عنهم وان

یا شادی شدہ اس میں حصہ دار ہوتے تھے ـ یہ دیکھتے تھے کہ کتنا خراج باقی ہے ـ اور اسے آپس میں زمین کی مقدار کے مطابق تقسیم کرتے تھے ـ پھر جو لوگ زراعت کا ارادہ رکھتے ہوں ان کی استطاعت کے مطابق ان پر تقسیم کرتے تھے ـ اگر کوئی (دادائی سے) عاجز ہو اور کاشت سے مجبوری ظاہر کرے تو اس کی زائد زمین بھی ان لوگوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی جو اس کی بدداشت کی طاقت رکھتے ہوں ـ اگر کوئی ایسے ہوں جو زیادتی چاہتے ہوں تو ان لوگوں سے جو عجز ظاہر کریں زمین لے کر انھیں دے دی جاتی تھی ـ جھگڑے کی صورت میں زمین تعداد کے مطابق تقسیم ہوتی تھی ـ حصے کا حساب قیراط سے لگاتے تھے ـ ایک دینار میں چوبیس قیراط شمار ہوتے تھے ـ اسی وجہ سے آنحضرت صلعم کی ایک حدیث بیان کی گئی ہے کہ: " تم جلد ایک ملک فتح کرو گے جس میں قیراط کا ذکر ہوگا ـ اس ملک کے باشندوں سے اچھا سلوک کرنا " ایک فدان (ایکڑ) میں نصف اردب جو اور دو ویبہ گیہوں محصول عائد کیا گیا تھا، سوائے قرط[۵۳] کے جس پر محصول

[۵۳] قرط مصر کا خاص پودا ہے ـ اس کی رکھوالی بھی خاص پر کی جاتی تھی ـ ابن مماتی ص ۸۱ ـ

ولیس لاحد

بقیہ صفحہ آئندہ

متغنوا زاد علیھم بقدر
متغنا ئھم۔

معاف تھا۔ اس زمانے میں ایک دینا چودہ کے برابر تھا۔ عمر بن الخطاب ...... ان لوگوں سے جو ان سے معاہدے کے مطابق صلح کریں، وہی لیتے تھے جو وہ اپنے اوپر عائد کریں، اس میں نہ کمی کرتے تھے اور نہ زیادتی۔ اور جو لوگ جزیہ[۵۴] پر مطیع ہوتے تھے اور کسی قسم کی ادائی معین نہ ہوتی تھی تو حضرت عمر ان کے معاملے پر غور کرتے تھے۔ جب وہ محتاج ہوتے تو کمی کر دیتے اور جب وہ غنی ہو جاتے تو ان کے غنی کے مطابق بیشی کرتے۔

وہ علاقہ جسے اس روایت میں کورہ کہا گیا ہے۔ رومی زمانے میں نوم[۵۵] کہلاتا تھا، اور ہر نوم مختلف چھوٹے حصوں میں منقسم تھا۔ یہی وہ قریہ ہے جو محاصل کی غرض سے ایک اکائی سمجھا جاتا تھا۔ ملکی انتظام کو بھی عربوں نے بدستور قائم اور جاری رکھا تھا۔ محاصل کی مقدار کا فیصلہ کہ ہر قریہ کتنی رقم ادا کرے نہ رومی زمانے میں حکومت کی طرف سے

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) من الناس ان ینصرف فیه سوی مستخدمی الدیوان و متی وجدوا شیئًا لم یکن اشتری منه استهلکوه۔ و لیس له سعر یستقل بل تساوی مائة اردب مطحون من سبعین دینارًا الی ثلاث مائة دینار علی قدر اجتهاد و المستخدم و امانته و حسن تصرفه و هو یکثر فی وقت و یقل فی وقت۔ اس کی بیع کے احکام کے متعلق دیکھو کتاب الام۔ ج ۳۔ ص ۵۹۔

[۵۴] یہاں جزیہ سے صرف محصول اراضی مراد ہے۔

[۵۵] Nome

ہوتا تھا اور نہ اب عربی حکومت میں۔ صرف کورہ کا حصہ مقرر کر دیا جاتا تھا۔ فتح مصر کے وقت جو عہد نامہ ہوا تھا اس میں مفتوحین کی مذہبی آزادی برقرار رکھی گئی تھی۔ اس لئے کلیسا کا انتظام خود اہل مصر کے تصرف میں تھا، اور اُس کے اخراجات کے لئے وہی لوگ رقم مہیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی طرف سے کلیسا پر کوئی محصول نہیں لگایا گیا، پیشوایان مذہب محصول سے بری تھے، اوران کی طرف سے بھی اہل دہ محصول ادا کرتے تھے۔ زراعت پر تمام محصولوں کا بوجھ ڈالنا اور تاجروں کو اس سے مستثنیٰ رکھنا قرین انصاف نہ تھا۔ اس لئے قیاس یہ ہے کہ تجارت پر بھی محصول لگایا گیا ہو۔ خود رومیوں میں بھی اس کا دستور تھا۔ جالیہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنا وطن ترک کر کے کسی دوسرے مقام پر بس گئے ہوں[۵۵]۔

اب ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت عمرو بن العاص کے زمانے میں عربوں نے مصر کے اندرونی نظم ونسق میں بالکل دخل نہیں دیا تھا، اور صرف اس سے غرض رکھی تھی کہ محصول کی رقم وصول ہوتی رہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے قبطیوں سے مشفقانہ سلوک مرعی رکھا تھا، اوراس کی ضرورت بھی تھی۔ ظاہر ہے کہ مصر میں عربوں کی تعداد مٹھی بھر تھی، اور وہ نظم ونسق کے کام سے قطعاً ناواقف تھے۔ اس لئے لازمی تھا کہ پرانے ملازموں کو برقرار رکھا جائے۔ ابھی چالیس برس کا زمانہ گزرنا اور باقی تھا کہ مسلمان اندرونی نظم ونسق میں حصہ لیں، اور قبطیوں کو برطرف کرنے کا خیال دل میں لائیں۔ بہرحال عمرو بن العاص کی حکومت سے مصری مطمئن تھے[۵۶]۔ کلیسا کا ایک ذمہ دار افسر بھی ان کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ اس نے اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے خراج معاہدے کے مطابق وصول کیا، اور

---

۵۵ الخوارزمی۔ مفاتیح العلوم۔ منقول از خطط الشام۔ ج ۵۔ ص۔ ۵ +

۵۶ فتوح البلدان۔ ۲۲۳، ۲۲۴ +

کلیسا کے مال کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اس کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ تبدیل مذہب کے واقعات اُس زمانے میں ہی پیش آنے شروع ہو گئے تھے۔ اُسے شکایت ہے کہ لوگ بڑی تعداد میں تبدیل مذہب کر رہے تھے۔ یقیناً کلیسا کے افسر کو اس طرح کی تھوڑی سی تعداد بھی بہت معلوم ہوتی ہوگی مگر جیسا کہ آئندہ واقعات سے اندازہ ہوگا، یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ عرب اپنے آپ کو مصر کا فاتح اور مالک اور قبطیوں کو اپنا محکوم نہیں سمجھتے تھے۔[۵۷]

آخر میں اس کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ مورخین کی ایک جماعت ایسی بھی ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ مصر بزورِ شمشیر فتح ہوا تھا۔ اس رائے کی تصدیق میں وہ یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ حضرت عمرو بن العاص کے پاس اخنا کا رئیس آیا اور کہا کہ ہمیں بتا دو کہ ہم میں سے ہر ایک پر کس قدر جزیہ (باج) ہے۔ عمرو بن العاص نے رکن کنیسہ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اگر اس کی چھت تک تم سونا دیدو تب بھی میں اصل رقم نہیں بتاؤں گا۔ کیوں کہ تم لوگ ہمارا خزانہ ہو: جب ہم چاہیں گے تم سے کم وصول کریں گے اور جب چاہیں گے زیادہ۔[۵۸] اس روایت کے مطابق مسلمان کسی عہد نامے کے پابند نہیں تھے۔

عمرو بن العاص دو مرتبہ والئ مصر مقرر ہوئے۔ پہلی مرتبہ حضرت عمرؓ کے عہد میں: ۲۵ھ میں حضرت عثمانؓ نے انھیں معزول کیا۔ دوسری مرتبہ امیر معاویہ نے انھیں ۳۸ھ میں والی مقرر کیا، اور ۴۳ھ میں اپنی وفات تک آپ وہیں رہے اور وہیں دفن ہوئے۔[۵۹] پہلی ولایت کے دوران میں وہ ملک کا نظم و نسق مکمل کر چکے تھے۔

---

۵۷ بیکر۔ ص ۱۱۴، ۱۱۵ +

۵۸ ابن عبدالحکم ص ۱۵۴ +

۵۹ الکندی ص ۱۰، ۱۳ - الخ +

(۵)

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جو فتنہ برپا ہوا، اُس میں مصر کے عرب پیش پیش تھے۔ خلیفہ کے خلاف سازش یہیں شروع کی گئی، اور یہیں اس کی تکمیل ہوئی، حتیٰ کہ آپ کے مقرر کردہ حاکم، عبداللہ بن سعد کو مجبوراً مصر چھوڑنا پڑا۔ مصر ہی سے مفسدوں کی ایک جماعت خلیفہ کے خلاف مدینہ روانہ ہوئی، اور یہیں کے ایک شخص کنانہ بن بشر نے حضرت عثمان کو قتل کیا۔ بظاہر اس کا مطلب یہ ہونا چاہیئے تھا کہ مصر میں حضرت عثمانؓ کے مخالفوں اور حضرت علیؓ کے ہمدردوں کی تعداد زیادہ ہوتی۔ لیکن حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ہی مصر میں ایک ردّعمل شروع ہوا۔ ابتداً شیعان عثمان کی تعداد ضرور کم تھی۔ مگر ۳۶ھ میں آپ کے قصاص کا مطالبہ کرنے کے لئے ایک بیعت لی گئی، اور معاویہ بن حُدَیج کو شیعان عثمان نے اپنا رہنما مقرر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محمد بن ابی حُذَیفہ جس نے حضرت عثمانؓ کی مخالفت میں نمایاں حصہ لیا تھا، اور مصر پر قابض ہوگیا تھا، قتل ہوا۔ اب حضرت علیؓ نے قیس بن سعد الانصاری کو مصر کا حاکم مقرر کیا، اور ۳۶ھ میں وہ وہاں پہونچے۔ انھوں نے تالیف قلوب کی حکمت عملی اختیار کی اور فرقہ وارانہ سیاسیات سے احتراز کیا۔ جب تک وہ مصر میں رہے امن وامان رہا۔ لیکن اسی سال انھیں معزول کیا گیا، اور محمد بن ابی بکر والی بن کر مصر پہنچے۔ انھوں نے اپنے طرزِ عمل سے مصر کے حالات کو خراب کردیا، اور اسی وجہ سے شیعان عثمانؓ کو فروغ پانے اور ترقی کرنے موقع مل گیا۔ ۳۸ھ میں یہاں شیعان عثمان اتنے کامیاب ہوگئے تھے کہ عمرو بن العاص نے امیر معاویہ کی طرف سے مصر پر قبضہ کرلیا، اور ۴۳ھ میں اپنی وفات تک وہاں رہے۔ اب بنو علی کا رسوخ اور اثر مصر سے ایسا زائل ہوا کہ ڈیڑھ سو برس تک اس خاندان کے کسی رکن کو وہاں آنے اور قدم جمانے کی ہمت نہ ہوئی۔ شیعان بنو امیہ کے قدم اب وہاں اس قدر مضبوطی سے جم گئے تھے کہ انھیں اکھاڑنا ناممکن تھا۔ ۶۴ھ میں عبداللہ بن زبیر نے عبداللہ بن عتبہ

بن جحدم کو اپنی طرف سے مصر کا والی مقرر کیا مگر وہ ایک سال بھی وہاں نہ رہ سکے۔ ۶۵ھ میں شیعان بنو امیہ نے مروان بن الحکم کو، جسے اس سے قبل شام میں خلیفہ منتخب کر لیا گیا تھا، مصر آنے کی دعوت دی، اور غرۂ جمادی الاول ۶۵ھ میں مروان فسطاط میں داخل ہوا۔ اس کا نوجوان اور ناتجربہ کار بیٹا عبدالعزیز اس کے ساتھ تھا۔ اسی کو اُس نے ملک کے شہری اور مالی امور کا حاکم مقرر کیا (علی صلاتہا وخراجہا)[60] بیس برس تک عبدالعزیز نے یہ خدمت انجام دی۔ مروان جب مصر سے واپس ہونے لگا تو عبدالعزیز نے کہا کہ "اے امیر المومنین! ایسے ملک میں میرا گذارا کیسے ہوگا جہاں میرا کوئی رشتہ دار نہیں!" مروان نے جواب دیا:۔

یا بُنَیَّ اِعُمَّهُمْ باحسانك یکونوا
کلهم بنی ابیك واجعل وجهك
طلقاً تصف لك مودتهم واوقع
الی کُلِّ رئیس منهم انه خاصتك
دون غیره۔ یکن عیناً لك علی غیره
وینقاد قومه الیك[61]۔

بیٹا۔ احسان کے ذریعے سے انھیں ایسا کر لے کہ وہ تمہارے چچا ہو جائیں، وہ سب تیرے رشتہ دار بن جائیں گے۔ ہر وقت کشادہ پیشانی رہ، تجھ سے ان کی محبت صاف ہو جائے گی۔ ہر رئیس کو یہ باور کرا دے کہ دوسروں سے قطع نظر وہی تیرا خاص آدمی ہے۔ وہ دوسروں کے خلاف تیرا مددگار ہو جائیگا۔ اور اپنی قوم کو تیرا مطیع و منقاد بنا دے گا۔

اس کے علاوہ مروان نے عبدالعزیز کو اور بہت سی نصیحتیں کیں، جن میں اس بہ خاص طور سے زور دیا کہ بغیر مشورے کے کام نہ کرنا" کیونکہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورے کی ضرورت پڑتی تھی تو ہم جیسوں کو اس کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے[62]۔

---

[60] ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۱۸۴ +
[61] الکندی ص ۴۷ +
[62] الکندی ص ۴۸ +

تاریخ گواہ ہے کہ باپ کی نصیحتوں پر بیٹے نے کس طرح عمل کیا، اور بیس برس تک کس کامیابی سے مصر پر حکومت کی۔

ابن تغری[۳۳] بردی لکھتا ہے کہ:

"کان عبد العزیز جواداً، ممدحاً، سیوساً

حازماً"

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مصر بنو امیہ کا وفادار اور خیر خواہ تھا۔ ایشیا میں ابھی تک فتنہ جاری تھا۔ مگر مصر میں مکمل امن و امان تھا۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر مکہ میں خلافت کے دعویدار تھے۔ مصر کی امن سے یہ فائدہ پہنچا کہ ۷۳ھ میں خلیفہ عبد الملک نے جب عبد اللہ کے خلاف فوج کشی کا ارادہ کیا تو عبد العزیز نے اپنے بھائی کی مدد کے لئے تین ہزار آدمیوں کی ایک فوج مصر سے مالک بن شراحیل (یا شرجبیل) الخولانی کی ماتحتی میں حجاز روانہ کی اور اسی فوج کے ایک شخص نے عبد اللہ بن زبیر کو قتل کیا۔ مالک بن شراحیل بنو امیہ میں اسی وجہ سے بڑا معزز سمجھا جاتا تھا، اور ۸۳ھ میں عبد العزیز نے اسے مصر کا قاضی مقرر کیا تھا۔[۳۴] اس کے علاوہ خلیفہ عبد الملک نے اس خیال سے کہ اہل شام عبد اللہ بن زبیر کے خیالات سے متاثر نہ ہونے پائیں حج کا انتظام بیت المقدس میں کرایا تھا۔ عبد العزیز نے اس بارے میں بھی اپنے بھائی کی مدد کی۔ چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے عبد العزیز ہی نے مصر میں عرفہ ادا کیا تھا۔[۳۵]

---

۳۳ النجوم الزاہرہ - ج ۱ - ص ۱۹۵

۳۴ الکندی ص ۵۱، ۳۲۱ + خطط ج ۱ ص ۳۰۲ +

۳۵ "وعَرَّفَ بمصر وهو اول من عَرَّفَ بها" الکندی ص ۵۰ + خطط ج ۱ ص ۳۰۲ + گو فقہا اس قسم کے عرفے کو ناجائز سمجھتے ہیں، اور اسے خلاف قانون قرار دیتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا رواج اس قدر عام ہو گیا تھا کہ انہیں اس کے خلاف احتجاج کی ضرورت پڑتی تھی۔ عَرَّفَ کے معنے عرفا مقرر کرنا نہیں ہو سکتے کیونکہ مصر میں عرفا پہلے سے موجود تھے۔

۷۰ھ میں فسطاط میں طاعون پھیلا، اور عبدالعزیز وہاں سے حلوان چلا آیا، جو فسطاط سے دو فرسخ کے فاصلے پر دریائے نیل کے کنارے واقع تھا[۶۶]، اور آخری وقت تک وہیں رہا۔ یہاں اُس نے اپنے لئے نہایت عمدہ محل اور مکانات تعمیر کرائے، اور اس کی بدولت کھجور کے درخت اور انگور مصر پہنچے اور حلوان میں لگائے گئے۔ اس نخلستان کو پانی دینے کے لئے عبدالعزیز نے ایک نہر کھدوائی تھی[۶۷]۔ حلوان میں اس نے ایک اور رفاہ عام کا کام کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے زراعت سے خاص دلچسپی تھی۔ یہاں اُس نے دریائے نیل کا پانی ناپنے کے لئے ایک مقیاس تعمیر کرایا۔ مگر اس کا ذرعہ چھوٹا تھا[۶۸]۔ جیزہ میں بھی اُس نے کھجور کے درخت لگوائے تھے۔ یہ باغ بعد میں جنان کعب کے نام سے مشہور ہوا[۶۹]۔ ایک روایت کے مطابق عبدالعزیز ہی کے مشورے سے ۷۶ھ میں خلیفہ عبدالملک نے عہد اسلام سے پہلی مرتبہ دینار اور درہم مسکوک کرائے تھے[۷۰]۔ اس کے علاوہ اُس نے عمرو بن العاص کی تعمیر کردہ جامع فسطاط میں اضافہ کرایا تھا[۷۱]۔

عمرو بن العاص کے زمانے سے اب تک مصر کے حالات اس قدر تبدیل ہو چکے تھے کہ عبدالعزیز نے وہاں نئے سرے سے تدوین کی۔ یہ مصر کی دوسری تدوین تھی۔ اس کی تفصیل سے تو ہم ناواقف ہیں، لیکن یہ معلوم ہے کہ اس کی ضرورت کیوں واقع ہوئی تھی۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ عمرو بن العاص نے فسطاط کو خطط میں تقسیم کیا تھا، اور ان میں مختلف قبائل آباد کئے تھے لیکن اس عرصہ میں اکثر و بیشتر خطط پرانے باشندوں کے ہاتھ سے نکل کر نئے باشندوں کے قبضے میں

---

[۶۶] یاقوت معجم البلدان۔ تحت حلوان + [۶۷] خطط ج ۱۔ ص ۳۰۲

[۶۸] ابن عبدالحکم ص ۱۶، ۲۳۶ + ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۱۹۲، ۲۰۴

[۶۹] ابن عبدالحکم ص ۱۱۴ + [۷۰] ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۱۹۵ +

[۷۱] ابن عبدالحکم ص ۱۳۱ + ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۷۷ + الکندی ص ۵۱ +

آگئے تھے۔ بیع و شری کا سلسلہ جاری تھا، اور خود عبد العزیز اس میں نمایاں حصہ لے رہا تھا[۲۲]ان تمام تبدیلیوں کا ایک حد تک تفصیلی تذکرہ ابن عبد الحکم[۲۳] میں محفوظ رہ گیا ہے۔ سکونتی اراضی میں تو تبدیلیاں ہو ہی رہی تھیں زرعی اراضی بھی تغیر و تبدل سے محفوظ نہیں تھیں۔ چنانچہ اب پہلی مرتبہ مصر کی معاشی اور ارضی تاریخ میں قطائع کا اثر نمایاں ہونا شروع ہوا۔ یہاں قطائع سے مراد اس قسم کی جاگیریں نہیں جن کا رواج تیسری صدی ہجری میں ہوا۔ بلکہ ان سے مراد زرعی جائدادیں ہیں جن کی خرید و فروخت ہو سکتی تھی۔ قطائع کا رواج کب سے ہوا، اس کے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس طرح زمینیں تقسیم کرنے کی ابتدا ہوئی تھی، اور بعض کا خیال ہے کہ ان دو حضرات یا حضرت علیؓ نے کبھی قطائع تقسیم نہیں کئے[۲۴]، بلکہ یہ تبدیلی حضرت عثمان کے زمانے میں ہوئی[۲۵]۔ لیکن سب مورخوں کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک صحابی سَندر (یا ابن سَندر) کو مصر میں ایک ہزار فدان (ایکڑ) زمین بطور قطیعہ دی تھی، اور اس کے علاوہ مصر میں اور کوئی قطیعہ کسی کو نہیں دیا گیا۔ یہ قطیعہ سَندر کے مرنے کے بعد عبد العزیز کے بیٹے الاصبغ نے اُن کے وارثوں سے خرید لیا تھا، اور اسی کے نام پہ یہ زمین منیۃ الاصبغ کہلانے لگی تھی[۲۶]۔ یہ امر کہ

---

۲۲ ابن عبد الحکم ص ۹۸، ۱۰۳، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۳۳ وغیرہ۔

۲۳ فتوح مصر و اخبارھا۔ ص ۹۸۔ الخ

۲۴ یحییٰ بن آدم۔ کتاب الخراج ص ۷۷، ۷۸، ۸۰ + بلاذری ص ۱۹ + ابو یوسف ص ۲۲ +

۲۵ قطائع کی ابتدا کے متعلق تفصیلی اطلاعات ابن عساکر، تاریخ الکبیر (ج ۱ ص ۱۸۲-۱۸۴) میں ملیں گی۔
اس کے علاوہ دیکھو ابن عبد الحکم ص ۱۳۲-۱۳۹ + الخوارزمی ص ۳۹ +

۲۶ خطط ج ۱۔ ص ۹۶ + ابن عبد الحکم ص ۱۳۷ +

کہ اس قطیعے کی خرید و فروخت ہوئی ثابت کرتا ہے کہ اسے عام معنوں میں جاگیر نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اب عرب زرعی زمینوں پر قابض ہوتے جا رہے تھے۔ یہ پرانے اصول اور قانون کے خلاف[۷۷] تھا۔ حقوق مالکانہ کی انھیں تمام تبدیلیوں اور عرب قبائل کے اس طرح نقل مکان کی وجہ سے اس دوسری تدوین کی ضرورت لاحق ہوئی تھی۔

اس طرز عمل سے ایک بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ جو زمینیں عربوں کے قبضے میں آگئیں ان پہ لازمی طور سے لگان نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ لیکن جو خراج حسب معاہدہ حضرت عمرو ابن العاص کے زمانے میں عاید کیا گیا تھا اُس میں کوئی کمی یا زیادتی ممکن نہ تھی۔ لہٰذا ذمیوں پر محاصل کا بوجھ بڑھتا گیا، اور سرکاری میزانیہ کو متوازن کرنے کی غرض سے محصول میں اضافہ کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اپنے زمانے میں امیر معاویہ نے حکم دیا تھا کہ ہر قبطی کے خراج میں ایک قیراط کا اضافہ کیا جائے۔ لیکن مصر کے صاحب الخراج وردان نے پرانے عہد نامے کی بنا پر ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا، اور اس کی پاداش میں معزول ہوا تھا[۷۸]۔ اس کے بعد عراق میں حجاج نے ان ذمیوں سے، جو مسلمان ہو گئے تھے جزیہ (خراج) وصول کرنا شروع کیا، اور خلیفہ عبدالملک نے عبدالعزیز کو لکھا کہ مصر میں بھی یہی طرز عمل اختیار کرے۔ لیکن عبدالرحمٰن بن حُجَیرہ الخولانی سے مشورہ کر کے عبدالعزیز نے خلیفہ کی اس تجویز کو منظور کرنے سے انکار کر دیا تھا[۷۹]۔ عبدالرحمٰن بن حُجَیرہ کا مشورہ دو وجہ سے اہم تھا، وہ عبدالعزیز کی طرف سے مصر کے قاضی بھی تھے، اور بیت المال کے نگران بھی[۸۰]۔ انھوں نے اس کی مخالفت اس

---

۷۷ ابن عبدالحکم ص ۱۵۴ +

۷۸ ابن عبدالحکم ص ۸۶ + خطط ج ۱۔ ص ۷۹ +

۷۹ ابن عبدالحکم ص ۱۵۶ + خطط ج ۱۔ ص ۷۷، ۷۸ +

۸۰ ابن عبدالحکم ص ۲۳۵ +

بنا پر کی تھی کہ ذمی پہلے ہی اپنے راہبوں کا جزیہ (خراج) ادا کر رہے ہیں، اور ان پر مزید سختی روا رکھنا ناواجب ہے[۵۱]۔ بہرحال عبد العزیز نے یہ مسئلہ ایک حد تک اس طرح حل کیا کہ اس کے حکم سے راہبوں کو شمار کیا گیا، اور ہر راہب پر فی کس ایک دینار جزیہ عائد کیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مصر میں راہبوں سے جزیہ وصول کیا گیا[۵۲]۔ اس سے قبل وہ اس سے مستثنیٰ تھے۔

ان روایات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عبد العزیز نے محصول کی کمی کے مسئلہ کو اس طرح حل کیا تھا کہ ذمیوں سے جو جزیہ لیا جاتا تھا وہ برقرار رکھا، اور اس کے علاوہ راہبوں پر ایک دینار فی کس جزیہ عائد کر دیا۔ حالانکہ اس سے قبل ان کی طرف سے بستیاں جزیہ ادا کرتی تھیں۔ مگر اب کہ مسلمان زمینوں پر قابض ہوتے جا رہے تھے اور خود ہی کوئی جزیہ (خراج) ادا نہ کرتے تھے تو کیسے ممکن تھا کہ راہبوں کا جزیہ ان سے وصول کیا جائے، اور اسی وجہ سے راہبوں کو اب مستثنیٰ رکھنا ناممکن تھا۔ اس سے ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ عبد العزیز ہی کے زمانے میں رفتہ رفتہ وہ نوبت آتی جا رہی تھی کہ جزیہ جو در اصل خراج تھا اور ذمیوں سے وصول کیا جاتا تھا، اب اس جزیہ (فی کس محصول) کی شکل اختیار کر لے جس سے ہم زمانۂ مابعد میں آشنا ہوتے ہیں۔ اس طرح عبد العزیز کے عہد میں محصول کے متعلق پرانے قاعدوں میں تبدیل ہونی شروع ہوئی ہے، مگر ابھی تک نئے قاعدے مروج نہیں ہوئے۔ فی کس محصول پہلے ہی سے رومیوں کے زمانے میں موجود تھا، اور وصول بھی کیا جاتا تھا۔ مگر مسلمانوں کو اب تک اس کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ لیکن جب ضرورت پڑی تو انھوں نے بھی اس سے فائدہ اٹھانے میں دریغ نہیں کیا۔ صرف فرق یہ تھا کہ پرانا فی کس محصول تکلیف دہ اور ذلت آمیز نہیں تھا، لیکن جب نیا فی کس محصول (جزیہ)

---

[۵۱] ابن عبدالحکم ص ۱۵۶ + خطط ج ۱- ص ۷۷، ۷۸

[۵۲] خطط ج ۲- ص ۴۹۲

لگایا گیا تو اس سے لامحالہ فاتح اور مفتوح کا فرق نمایاں ہو گیا۔ یہی چیز عوام کو ناگوار گذرتی تھی۔

اب عبد العزیز کے زمانے میں صرف اسکندریہ کا ذکر کرنا باقی رہ گیا ہے۔ گو رومیوں کے زمانے میں اسکندریہ میں نہ تو بلدیہ تھی اور نہ حکومت خود اختیاری کے دوسرے ادارے جو سلطنت روما کے شہروں میں پائے جاتے تھے، لیکن اس شہر کو سلطنت میں پھر بھی ایک خاص امتیاز حاصل تھا۔ یہاں کے باشندے فی کس محصول سے مستثنیٰ قرار دے گئے تھے، اور دوسرے محاصل بھی وہاں کم یا بالکل مفقود تھے۔ اب تک مسلمانوں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی تھی، اور بظاہر اہل اسکندریہ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اب ہر طرح مطمئن ہو جانے کے بعد وقت آگیا تھا کہ ان کی مراعات سلب کر لی جائیں، اور ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو تمام اہل مصر کے ساتھ ہو رہا تھا۔ درحقیقت بغاوت کے بعد اہل اسکندریہ کو یہ حق بھی نہیں رہا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی خاص سلوک مرعی رکھا جائے۔ ۷۴ھ میں عبد العزیز اسکندریہ گیا۔[۵۳] اس نے وہاں کے عمائد (وجوہ البلد) کو جمع کیا، اور مختلف کوروں اور قریوں کو ان میں تقسیم کر کے انھیں مجبور کیا کہ ہر کورہ سے ایک مقررہ رقم مزروعہ زمینوں اور تاکستانوں سے حاصل کر کے سرکاری خزانے میں جمع کرائیں۔ یہ عین قدیم رومی طرز عمل تھا۔ اب مصر کا کوئی حصہ ایسا باقی نہ رہا تھا کہ جس سے محاصل وصول نہ ہوتے ہوں۔ غالباً اسی نئے انتظام کو روبراہ لانے کے لئے عبد العزیز چار مرتبہ اسکندریہ گیا تھا۔ ۸۳ھ میں چوتھی اور آخری مرتبہ اس نے اسکندریہ کا سفر کیا تھا۔[۵۴]

اپنے بھائی وفات سے چند ماہ قبل، بیس برس دس مہینے تیرہ دن مصر پر حکومت کرنے کے بعد ۸۶ھ میں عبد العزیز نے مصر ہی میں انتقال کیا۔ عہد اسلام میں مصر پر اس سے زیادہ طویل حکومت کسی حاکم نے نہیں کی۔[۵۵]

---

۵۳ الکندی۔ ص ۵۱ +

۵۴ الکندی ص ۵۳ +

۵۵ الکندی ص ۵۵۔

(۶)

اب عبد الملک نے اپنے ستائیس سالہ نوجوان بیٹے عبد اللہ کو ۸۶ھ میں مصر بھیجا۔ اسے حکم دیا گیا تھا کہ عبد العزیز کی نشانیاں مٹا دے۔ اسی بنا پر اُس نے پرانے عمال میں تغیر وتبدل کیا۔ مگر اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے ۸۷ھ میں دواوین کو قبطیہ سے عربی میں منتقل کیا[۵۳]۔ یہ درحقیقت مصر کی تاریخ میں بہت بڑا انقلاب تھا۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب عرب براہ راست نظم ونسق میں حصہ لینا شروع کر رہے ہیں اور قبطیوں کو اس وقت تک جو اجارہ حاصل تھا اب ختم ہو رہا ہے۔ چند ہی سال بعد اس انقلاب کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ لیکن اس تبدیلی کا فوری اثر یہ ہوا کہ عبد اللہ نے قبطی افسر اثناش کو دیوان سے برخاست کرکے اس کی جگہ حمص کے ایک عرب ابن یربوع الفزاری کو مقرر کیا[۵۴]۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ عربی زبان فی الفور عام طور پر دواوین میں استعمال ہونے لگی، اور یونانی یا قبطی بالکل بے دخل ہو جائے۔ بلکہ اس تبدیلی کی تکمیل اُس وقت ہوئی جب قبطیوں نے خود روزمرہ کی زندگی میں عربی زبان بولنی شروع کی۔ چنانچہ ۱۶۶ھ کا ایک قرطاس ملا ہے جس میں نظم ونسق کے کاروبار کے لئے یونانی زبان استعمال کی گئی ہے۔ دوسری صدی ہجری کے آخر میں یونانی زبان الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتی تھی، اور تیسری صدی میں بطریک کو مجبوراً اپنے تمام احکام عربی زبان میں نافذ کرنے پڑے ہیں تاکہ عیسائی عوام انھیں سمجھ سکیں[۵۵]۔

لیکن بہیئت مجموعی عبد اللہ کامیاب نہیں رہا۔ اول تو ۸۷ھ میں مصر میں ایسا قحط پڑا کہ جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی، اور اس قحط کو لوگوں نے عبد اللہ کی نحوست سے منسوب کیا۔

---

۵۳ خطط ج ۱۔ ص ۹۸ +

۵۴ خطط ج ۱۔ ص ۹۸ +

۵۵ بیکر ص ۱۳۰، ۱۳۱ +

دوسرے اُس کا مقصد صرف اپنا بھلا کرنا، اور دولت جمع کرنا تھا۔ اسی وجہ سے اہل مصر اُسے تکیس کہتے ہیں۔ اہل مصر نے اُس پر یہ بھی الزام لگایا تھا کہ وہ رشوتیں لیتا ہے اور بیت المال سے رقمیں غبن کرتا ہے۔ آخر ان شکایات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۹۰ھ میں خلیفہ ولید نے اُسے معزول کر کے قُرّۃ بن شریک کو صلاۃ و خراج پر مقرر کیا۔[۵۹]

قُرّۃ بن شریک العبسی قِنّسرین کا رہنے والا تھا، اور ۹۰ھ سے ۹۶ھ تک مصر کا حاکم رہا۔ تاریخ میں یہ شخص بہت بدنام ہے۔ اول تو عرب مورخ اپنے کسی بڑے آدمی کے عیبوں اور کمزوریوں کو چھپاتے نہیں، اور پھر یہاں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مورخین نے مفتوحین کے ساتھ مل کر اس شخص کو بُرا بھلا کہا ہے، اور بدنام کیا ہے، کیونکہ مفتوحین کو اس کے افعال و کردار پر اعتراض تھا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے پہلی صدی ہجری کی تاریخی روایات کا بڑا حصہ مسیحی اسناد سے ماخوذ ہے، اور زمانۂ مابعد میں جب قبطی اور عرب ایک دوسرے سے مل جل گئے ہیں، اور حکومت کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا ہے تو یہ روایات عرب مورخوں کے یہاں بھی تاریخ کا ایک جزو بن گئی ہیں۔ بہر حال قرۃ بن شریک سے حضرت عمر بن عبد العزیز سخت ناراض تھے، اور ان کا یہ قول اکثر مصنف اور مورخ نقل کرتے ہیں۔[۶۰]

الحجاج بالعراق والولید بالشام وقرۃ بن شریك بمصر وعثمان بالمدینۃ وخالد بمکۃ ۔ اللھم قد امتلأت الدنیا ظلماً وجوراً، فارح الناس ۔	حجاج عراق میں، ولید شام میں، قرۃ بن شریک مصر میں عثمان مدینہ میں اور خالد مکہ میں، یا اللہ دنیا ظلم و جور سے بھر گئی ہے، لوگوں کو راحت دے۔

---

۵۹ ابن عبد الحکم ص ۱۲۲ + الکندی ص ۵۸، ۵۹، ۶۳ + خطط ج ۱ ص ۳۰۲ + ابن تغری بردی ج ۱ ص ۲۳۳ + سیوطی ج ۱ ص ۵۷، ۷۶ + سیوطی نے تکیس کے بجائے تکیس لکھا ہے۔

۶۰ مبرد۔ جزو الثانی ص ۸۷ + ابن تغری بردی ج ۱ ص ۲۴۳ +

ایک اور مصنف نے قرۃ کے متعلق لکھا ہے کہ

"کان سئ التدبیر، خبیثاً، ظالماً، غشوماً،

فاسقاً، منھمکاً"۔

آگے چل کر اسی مورخ نے بیان کیا ہے کہ جب قرۃ خلیفہ کے حکم سے فسطاط کی جامع مسجد میں اضافہ کر رہا تھا تو شام کو مزدوروں کے چلے جانے کے بعد وہ وہیں مسجد میں مجلس طرب منعقد کرتا، اور رات بھر گانا بجانا ہوتا، اور شراب کا دور چلتا؛ وہ کہا کرتا تھا کہ

"لنا اللیل ولھم النھار[۹۱]"۔

یہاں تک کہا جاتا ہے کہ قرۃ اور ولید کی موت عمر بن عبد العزیز کی بد دعا کا نتیجہ تھی۔ لیکن اس کے برعکس، ولید کو اپنے افسر پر بہت بھروسہ تھا، اور وہ سمجھتا تھا کہ عراق میں حجاج اور مصر میں قرۃ بڑے کامیاب والی ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان دونوں کی موت کی خبر ایک ہی دن ولید کو ملی۔ اور اُسے اس کا اتنا صدمہ ہوا کہ پریشان بال لوگوں کے سامنے آیا، منبر پر کھڑے ہو کر انھیں یہ خبر سنائی اور کہا۔

"واللہ لا شفعن لھا شفاعۃ تنفعھما[۹۲]"۔

۹۵ھ میں قرۃ بن شریک نے مصر کی تیسری مرتبہ تدوین کرائی[۹۳]۔ گو تفصیلات مفقود ہیں، لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ عبد العزیز بن مروان کی دوسری اور قرۃ بن شریک کی تیسری تدوین کی درمیانی مدت میں عرب قبائل نے اول تو مصر ہی میں کثرت سے نقل مکان کیا تھا، اور غالباً باہر سے بھی عربوں کی اتنی بڑی تعداد مصر میں داخل ہو کر وہاں متوطن ہوئی تھی کہ اس نئی تدوین کی ضرورت پڑی۔ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ عبد الملک نے جب یہ تجویز کی تھی کہ ان

---

[۹۱] ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۲۴۲۔ منقول از مرآۃ الزمان + اس کے علاوہ سیوطی ج ۲۔ ص ۷ +

[۹۲] ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۲۴۲ + المبرد۔ جزء الثانی ص ۸۰ + [۹۳] خطط ج ۱۔ ص ۹۴ + الکندی ص ۶۵۔

ذمیوں سے جو مسلمان ہو گئے تھے، جزیہ (خراج) وصول کیا جائے تو عبد العزیز نے اُس کی مخالفت کی تھی۔ گو ہمیں علم نہیں کہ یہ تبدیلی کس سنہ میں ہوئی تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قرۃ بن شریک نے عبد الملک کی پرانی خواہش پوری کر دی تھی، اور ایسے ذمیوں پر جزیہ عائد کر دیا تھا۔ کیونکہ سنہ [illegible] میں عمر بن عبد العزیز نے اپنے صاحب الخراج حیّان بن شُرَیح کو حکم دیا تھا کہ ان ذمیوں پر سے جو مسلمان ہو گئے ہوں جزیہ اٹھا لے۔[94] مگر آپ کا حکم بے اثر رہا۔

قرۃ بن شریک کے زمانے کی ایک اور اہم تبدیلی کا پتہ ایک پُرانے قرطاس سے چلتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عربی عہد میں پہلی مرتبہ محاصل عائد کرنے میں شمسی اور قمری سال کا فرق کیا گیا تھا۔[95] قرۃ کا ایک اور بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ان اراضی کو جو اب تک ناقابل زراعت سمجھی جاتی تھیں زراعت کے قابل بنایا (احیاء الموات)۔ برکۃ الحبش کو جسے بعد میں "اصطبل قرۃ" کہنے لگے تھے، اس نے قابل زراعت بنایا، اور جہاں تک ہمیں علم ہے اُسی نے مصر میں پہلی مرتبہ نے شکر کاشت کی۔[96] اور اس کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ پُرانے قرطاسوں میں پہلی مرتبہ اس وقت نے شکر کا ذکر آتا ہے۔[97] احیاء الموات کا یہ واقعہ معمولی نہیں تھا۔ کیوں کہ اسلامی قانون کے مطابق ایسی زمینوں کو جو شخص "زندہ" کرے وہی اُس کا مالک قرار پاتا ہے۔ اب اگر مسلمان ان زمینوں کو قابل زراعت بنا لیں تو وہ صرف عشر ادا کرینگے

---

[94] خطط ج ۱۔ ص ۷۷، ۷۸، + خطط (ص ۷۷) میں ہے "وضع عمر بن عبد العزیز الجزیۃ علی من اسلم من اہل الذمۃ" علی کی جگہ عن پڑھنا چاہیئے۔ ص ۷۸ سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

[95] بیکر ص ۱۰۰ + دیکھو خطط ج ۱۔ ص ۹۸ +

[96] خطط ج ۱۔ ص ۳۰۲ + ج ۲۔ ص ۱۵۲ + ابن تغری بردی ج ۱ ص ۲۴۴ + ابن عبد الحکم ص ۱۳۶ + الکندی ص ۶۵ +

[97] بیکر ص ۱۰۱۔ منقول از کاراباک +

اور خراج سے بری رہیں گے۔ حالانکہ باقی ماندہ جائدادیں جو خرید و فروخت کے ذریعے مسلمانوں کے قبضے میں آئی تھیں، وہ بستی کے مجموعی محاصل میں شریک تھیں۔ ان محاصل سے آزاد رہنے کا بہترین طریقہ "احیاء الموات" تھا۔ اس کے علاوہ اس ذریعے سے خالص عرب نوآبادیاں قائم ہو سکتی تھیں۔

۹۲ھ میں خلیفہ ولید کے حکم سے قرۃ بن شریک نے جامع مسجد میں اضافہ کیا۔ شعبان ۹۲ھ میں اس کا کام آغاز ہوا، اور ۹۳ھ میں نئی تعمیر مکمل ہو گئی۔ قرۃ نے جامع مسجد میں منبر (المنبر الجدید) نصب کرایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے بعد یہ قدیم ترین منبر تھا۔[۹۸]

یہ امر کہ قرۃ بن شریک مصر میں غیر ہر دل عزیز تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۹۱ھ میں جب وہ اسکندریہ گیا ہے تو وہاں اس کے قتل کی سازش کی گئی تھی۔[۹۹] قابل غور امر یہ ہے کہ اس سازش میں مہاجر بن ابی المثنیٰ التجیبی اور ابن ابی ارطاۃ التجیبی شریک تھے، یعنی اس قبیلے کے ارکان جو کسی زمانے میں عربی مصر کا سب سے بڑا پشت و پناہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن کیا یہ سازش اسکندریہ کے مخصوص حالات سے تعلق رکھتی تھی، یا مصر کا پورا ملک قرۃ بن شریک سے ناراض تھا؟ تفصیلات سے ہم بے خبر ہیں۔

۹۶ھ میں قرۃ بن شریک نے ولایت مصر کے دوران میں وفات پائی۔

(۷)

اب تک مصر میں صرف ایک مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ نظم و نسق کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ۳۵ھ میں عبداللہ بن سعد بن ابی سرح حضرت عثمانؓ سے ملنے گئے تو انھوں نے علی الصلاۃ اور

---

۹۸ الکندی ص ۶۵ + منبر کی مفصل تاریخ ہم نے اپنے مضمون "منبر و عصا" میں بیان کی ہے۔ اس سے قرۃ کے اس منبر کی پوری تفصیل معلوم ہو گی۔ دیکھو اورینٹل کالج میگزین۔ لاہور۔ ماہ اگست ۱۹۳۶ء +

۹۹ الکندی ص ۶۴ + ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۲۴۲۔

علی الخراج دو آدمیوں کو اپنا قائم مقام مقرر کیا تھا[100]۔ لیکن یہ انتظام عارضی تھا، اور مرکزی حکومت سے کوئی منظوری نہیں لی گئی تھی، بلکہ اندرونی طور پر حاکم مصر نے یہ انتظام کر لیا تھا۔ لیکن قرۃ بن شریک کے بعد نظم و نسق کی تقسیم مستقل ہو گئی، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ بہت ہی اہم بالشان تبدیلی تھی، کیونکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک عرب ملکی انتظامات کے علاوہ مالی معاملات بالکلیہ اپنے ہاتھ میں لے چکے تھے، اور قبطیوں کا اجارہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس سے قبل مصر میں صاحب الخراج نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ ان کا تقرر خود حاکم کرتا تھا اور وہ حاکم ہی کو جواب دہ تھے نہ کہ خلیفہ کو۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عبد العزیز بن مروان کے زمانے میں عبد الرحمٰن بن حُجَیرۃ یہ فرائض ادا کرتے تھے۔ اب فرق یہ پڑا ہے کہ یہ دونوں عہدہ دار مستقل ہیں، ان کے اختیارات اور فرائض کی حد بندی کر دی گئی ہے، اور وہ دونوں براہ راست خلیفہ کو جواب دہ ہیں۔

ولید کی وفات پر خلیفہ سلیمان نے عبد الملک بن رفاعہ کو ۹۶ھ میں مصر کا والی مقرر کیا، مگر صرف علی الصلاۃ[101]۔ وہ ۹۹ھ یعنی سلیمان کی وفات تک وہاں رہا، اور اس کے ساتھ اُسامہ بن زید التنوخی مصر کا صاحب الخراج مقرر ہوا[102]۔ اسامہ بن زید موالیٔ امیر معاویہ میں سے تھا، دمشق کا رہنے والا تھا، اور "کان کاتباً نبیلاً"۔ شہزادگی کے زمانے میں یزید بن عبد الملک کا کاتب تھا[103]۔ اس طرح وہ دار الخلافہ کے تجربہ کار افسروں میں سے تھا۔ وہ مصر کا صرف صاحب الخراج مقرر ہوا تھا، مگر اس کی شخصیت کا اثر اتنا تھا کہ طبری اور ابن الاثیر

---

[100] ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۱۰۳ +

[101] الکندی ص ۶۶ + المنوفی ص ۹۹ +

[102] خطط ج ۱۔ ص ۵۸ +

[103] جہشیاری ورق ۲۴ (الف)، ۲۶ (الف)

دونوں اُسے حاکم مصر لکھتے ہیں[104]۔ اس کے علاوہ قرہ بن شریک کے بعد شیشے کی بنی ہوئی سرکاری مہروں پر بھی، بجائے حاکم مصر کے اُسامہ بن زید ہی کا نام پایا جاتا ہے[105]۔

لیکن باوجود اس شخصی اہمیت کے اُسامہ کی اصلاحات کے متعلق تفصیلات اس قدر کم ہیں کہ ان اصلاحات کا پورا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اتنا بیان کیا گیا ہے کہ حلوان میں عبدالعزیز بن مروان نے جو مقیاس تیار کرایا تھا وہ صغیر الذراع ہونے کی وجہ سے بے کار سمجھ گیا اور خلیفہ سلیمان کے حکم سے اسامہ نے ۹۷ھ میں ایک نیا مقیاس جنیرہ میں تعمیر کرایا۔ اسی کو بعد میں مقیاس القدیم کہنے لگے[106]۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ مقیاس خلیفہ ولید کے زمانے میں تعمیر ہوا تھا[107]۔ اُسامہ کا ایک اور کام بیت المال کی تعمیر ہے[108]۔ ان دونوں باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے زراعت کو ترقی دینے پر خاص توجہ کی تھی، اور غالباً اُس نے مالیات کی بھی نئی تنظیم کی تھی۔

مقریزی[109] نے لکھا ہے خلیفہ سلیمان کے زمانے میں اُسامہ بن زید نے مصر سے ایک کروڑ بیس لاکھ دینار بطور محاصل وصول کئے تھے۔ یہ یقینی امر ہے کہ خلیفہ ولید کے تعمیری کاموں اور خلیفہ سلیمان کی عیش پرستیوں کی وجہ سے بے انتہا رقم کی ضرورت پڑی ہوگی، اور ان کی پابجائی محاصل ہی کے ذریعے سے ہوئی ہوگی۔ اس لئے لامحالہ محاصل وصول کرنے میں

---

۱۰۴ طبری (مطبوعہ یورپ) ج ۲۔ص ۱۴۳۶۔حوادث ۱۰۲ھ + ابن الاثیر ج ۵ ص ۴۹۔حوادث ۱۰۲ھ

۱۰۵ بیکر ص ۱۰۲ +

۱۰۶ خطط ج ۱۔ص ۵۸ +

۱۰۷ ابن تغری بردی ج ۱۔ص ۷۴۲ + ابن عبد الحکم ص ۱۶

۱۰۸ خطط ج ۱۔ص ۵۸ + ابن تغری بردی ج ۱۔ص ۸۰، ۷۴۲ +

۱۰۹ خطط ج ۱۔ص ۹۹ +

پہلے سے زیادہ سختی روا رکھی گئی ہوگی۔ ایک طرف تو محاصل میں سختی برتی گئی ہوگی اور دوسری طرف مصر میں عربوں کے توطن پذیری سے نئے نئے معاشی مسائل پیدا ہوئے۔ لہذا عیسائیوں میں بے چینی برابر بڑھتی چلی گئی۔ پوری تفصیلات یہاں بھی مفقود ہیں۔ لیکن غالباً یہی مخصوص حالات تھے جن سے مجبور ہو کر اُسامہ نے عیسائیوں کی طرف توجہ کی، اور اس نئی بے چینی کو، قبل اس کے کہ وہ خطرناک شکل اختیار کرے، دبا دینے کی کوشش کی۔ عبدالعزیز بن مروان کے زمانے میں راہبوں پر فی کس ایک دینار محصول لگایا گیا تھا۔ مگر راہبوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کیونکہ بقیہ محاصل سے بچنے اور ان کا تمام بوجھ غریب رعایا پر ڈال دینے کا آسان طریقہ یہی تھا کہ مذہبی لباس اختیار کر لیا جائے۔ چونکہ ان کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی اس لئے ضروری تھا کہ نگرانی میں سختی کی جائے۔ اس خیال سے کہ ان میں سے کوئی شخص فی کس محصول سے بچ کر نہ نکل جائے، اُسامہ نے لوہے کے حلقوں سے اُن کے ہاتھوں پر نشان لگوائے، جن میں راہب اور اس کے دیر کا نام اور تاریخ مندرج تھی، اور جس راہب کے ہاتھ پر نشان نہیں پایا جاتا تھا اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا تھا۔ اُسامہ نے عمال کو حکم دیا کہ جب کوئی عیسائی ایسا ملے جس کے پاس اجازت نامہ (منشور) نہ ہو تو اس پر دس دینار جرمانہ کیا جائے۔ اس حکم کے بعد اُس نے اچانک دیروں پر دھاوا کیا، اور جتنے راہب ایسے ملے جن کے ہاتھوں پر نشان نہ تھے، ان میں بعض کو قتل کرایا، اور بعضوں کو اتنا مارا کہ وہ مر گئے[۱۱۰]۔ جہاں تک ہمیں علم ہے عیسائیوں کے خلاف یہ پہلا ردعمل تھا، ورنہ اب تک بحیثیت مجموعی دونوں قوموں کے تعلقات خراب نہ تھے، گو امیر معاویہ کے حاکم مصر مسلمہ بن مخلد[۱۱۱] کے خلاف عربوں کی شورش اس وجہ سے ہوئی تھی

---

[۱۱۰] خطط ج ۱۔ ص ۹۹ + ج ۲۔ ص ۴۹۲، ۴۹۳ + خیال رہے کہ یہاں صرف ہاتھوں پر نشان کرنے یا مہر کرنے کا ذکر ہے، نہ کہ انھیں داغ دینے کا جیسا کہ غلطی سے ویسٹن فیلڈ نے سمجھ لیا ہے۔ دیکھو اس کی تاریخ قبط دوم ص ۵۵۔

[۱۱۱] الکندی ص ۳۷۔

کہ انہیں نے ایک نیا گرجا تعمیر کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ مگر یہ شورش مسلمہ کے اس عذر پر ختم ہو گئی تھی کہ گرجا عربوں کی آبادی سے دور ہے[۱۱۲]۔ عبد العزیز بن مروان کے زمانے تک نئے گرجا برابر بن رہے تھے[۱۱۳]۔ اب اچانک اس ردعمل کی یہی معنیٰ تھے کہ نئے حالات کی وجہ سے دونوں اہل مذاہب میں پرانے تعلقات یا بے تعلقی باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ مگر یہ خیال رہے کہ اس تمام عمل میں مذہب کو کوئی دخل نہیں، بلکہ معاشی اسباب اس کے حقیقی بنا تھے۔ یہاں ہمیں پھر رومی عہد کے فی کس محصول (جزیہ) سے سابقہ پڑتا ہے، کیونکہ ہمیں اس کی اطلاع نہیں کہ راہبوں پر یہ محصول لگانے کے بعد عام رعایا کا وہ محصول معاف کر دیا گیا تھا جو وہ راہبوں کی طرف سے ادا کرتے تھے۔ راہب فی کس محصول، جسے عرف عام میں جزیہ کہتے ہیں، ادا کرتے ہیں، اور عام رعایا کا خراج بدستور سابق باقی ہے۔

ابن تغری بردی[۱۱۴] بیان کیا ہے کہ سلیمان بن عبد الملک نے اُسامہ بن زید کو لکھا تھا کہ،

"اطب الدر حتی ینقطع و احلب الدم حتی

ینصرم" (دودھ دوہو تا آنکہ تمام دودھ نکل آئے، اور پھر خون دوہو

تا آنکہ وہ بھی ختم ہو جائے)۔

ابن تغری بردی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اُسامہ بن زید کی تمام سختیاں اسی حکم کی بنا پر تھیں۔ بیکر بھی اسے خلیفہ کا حکم سمجھتا ہے، اور لکھتا ہے کہ تعریف کے قابل بات یہ ہے کہ اُسامہ نے اس حکم کی حرف بہ حرف تعمیل نہیں کی۔ لیکن جو تفصیل جہشیاری نے بیان کی ہے اُس سے اصل صورت حال معلوم ہو جاتی ہے، گو سلیمان نے یہ الفاظ ضرور کہے تھے، مگر یہ اُس کا حکم نہیں تھا، اور اسی لئے اُسامہ کے نظم و نسق پر اُس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ بہتر ہے کہ باوجود طوالت کے

---

۱۱۲ ابن عبد الحکم ص ۱۳۲ + ۱۱۳ بیکر۔ ص ۱۰۴ +

۱۱۴ النجوم الزاہرہ۔ ج ۱۔ ص ۲۵۷ +

جہشیاری[۱۲] کی عبارت یہاں نقل کردی جاتی ہے:

فبلغه أن عمر بن عبد العزيز يعرضه
ويغمص عليه في سيرته فقدم
أسامة بن زيد على سليمان بمال
اجتمع عنده ووافقه على ما احتاج
إليه وعمل على الرجوع إلى عمله
وتوخى وقتاً يكون فيه عمر عند سليمان
فلما بلغه حضوره مجلسه استأذن
عليه فلما وصل إليه قال له: إني
ما جئتك حتى نهكت الرعية
وجهدت، فإن رأيت أن ترفق
بها وترفه عليها وتخفف من خراجها
ما تقوى به عمارة بلادها وصلاح
معاشها فافعل، فإنه يستدرك
ذلك في العام المقبل۔ فقال له سليمان:
هبلتك أمك۔ احلب الدر فإذا انقطع
احلب الدم بجا۔ فخرج أسامة بن زيد
فوقف لعمر بن عبد العزيز حتى خرج

اُسامہ کو معلوم ہوا کہ عمر بن عبدالعزیز اُس کی کاٹ میں
لگے رہتے ہیں اور اس کی شکایت کرتے ہیں۔ ایک
مرتبہ اُسامہ مال لے کر جو اُس کے پاس جمع ہوگیا تھا،
سلیمان کے پاس آیا، اُسے اپنی ضرورتوں سے آگاہ
کیا اور اپنے عمل کو واپس ہونے کی تیاری کرنے لگا۔
وہ ایسے وقت کے انتظار میں رہا جب عمر خلیفہ کے
پاس ہوں۔ اُسے معلوم ہوا کہ عمر خلیفہ کے پاس ہیں
اُس نے بھی حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ خلیفہ
کے پاس پہنچ کر کہا کہ "اے امیرالمومنین میں آپ
کے پاس اُس وقت تک نہیں آیا جب تک کہ رعایا
سختی میں مبتلا نہیں ہوئی۔ اگر اجازت ہو تو ان سے
نرمی برتی جائے اور مہربانی کی جائے اور ان کا
خراج کم کر دیا جائے تا کہ ملک کی آبادی کا باعث
ہو اور معاش کی بہتری ہو، تو میں ایسا کروں کہ آئندہ
سال اس پر عمل ہو سکے۔ سلیمان نے جواب دیا کہ
خدا تیری ماں کا بیٹا دنیا سے اٹھالے۔ دودھ دوہو
اور جب وہ ختم ہو جائے تو خون دوہو تا آن کہ

---

[۱۲] کتاب الوزراء والکتاب۔ ورق ۲۴ (الف)۔ ۲۴ (ب)۔ اس کے علاوہ دیکھو ورق ۲۶ (الف)۔ ورق ۲۶ (ب) جس سے معلوم ہوگا کہ دارالخلافے میں اُسامہ کے متعلق عام خیال کیا گیا۔

فكب۔ ثم سار معه وقال له انه بلغنى يا ابا حفص انك تلومنى وتذمنى وقد سمعت اليوم ما كان مقالتى لابن عمك وما رد على فعرفت عذرى فقال عمر، سمعت والله كلاما جل لا يخفى عنك شيئا۔

وہ بھی ختم ہو جائے۔ اُسامہ باہر آیا اور عمر کے انتظار میں رہا۔ وہ بھی باہر آئے اور سوار ہو گئے۔ اب اُسامہ اُن کے ساتھ ہوا، اور ان سے کہا کہ اے ابا حفص تم مجھے قابل ملامت سمجھتے ہو اور بُرا کہتے ہو آج تم نے سنا کہ میں نے تمہارے ابن عم سے کیا گفتگو کی اور اُس نے کیا جواب دیا؟ اب تو تمہیں میری مجبوری معلوم ہو گئی ہو گی۔ عمر نے جواب دیا "ہاں میں نے ایسے شخص کا کلام سنا جس سے کوئی چیز بعید نہیں۔"

ان الفاظ سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ سلیمان مصر کے خراج میں کوئی کمی کرنا نہیں چاہتا تھا ورنہ اُس نے اُسامہ کو بے جا سختی کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔

اُسامہ سے عمر بن عبد العزیز کی ناراضگی کا حال معلوم ہو گیا۔ مگر سلیمان کو اُسامہ پر اتنا ہی بھروسہ تھا جتنا کہ ولید کو قرۃ بن شریک پر۔ ایک مرتبہ ان کی موجودگی میں سلیمان نے اُسامہ کی تعریف کی کہ "اُسامہ بھی کیا آدمی ہے کہ ایک درہم یا دینار رشوت نہیں لیتا۔" عمر بن عبد العزیز نے جواب دیا کہ "میں تجھے ایک اور نام بتاؤں کہ ایک درہم یا دینار رشوت نہیں لیتا اور اُسامہ سے بدتر ہے؟" سلیمان نے پوچھا "وہ کون"؟ عمر نے جواب دیا "ابلیس!" اس پر سلیمان خفا ہو کر مجلس سے اُٹھ گیا[۱۲۱] ۹۹ھ میں سلیمان کی وفات کے وقت اُسامہ بدستور مصر کا صاحب الخراج تھا۔ لیکن عمر بن عبد العزیز کی ناراضگی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے سلیمان کے دفن ہونے سے قبل اُس کی قبر کے قریب بیٹھ کر اُسامہ کی معزولی کا حکم لکھا اور لوگوں نے جب اس پر کراہیت کا اظہار کیا تو کہا:

۱۲۱؎ ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۲۵۸۔

"انی، واللہ، خفت عز وجل واستحییتہ
ان افرھا یحکمان فی امور الناس طرفۃ عین
وقد ولیت امورھم۔"[۱۲۲]

(۸)

خلیفہ ہوتے ہی عمر بن عبد العزیز نے مالیات کے مسئلہ پر غور کیا۔ انھوں نے جو اس ضمن میں کیا وہ والہاسن[۱۲۳] کے مطابق اہم بھی تھا، اور دیرپا بھی۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ مالیات میں جو ابتری واقع ہو رہی ہے اُسے روک دیں، اور اُن کا خیال تھا کہ اس ابتری کی بڑی وجہ یہ تھی کہ تنظیم اراضی میں خرابی واقع ہو رہی تھی۔ اس لئے انھوں نے دو کام کئے، اول تو انھوں نے وہ تمام قطائع جو ان کے پیشرو اپنے اہل خاندان کو دے گئے تھے، واپس لے کر عامۃ المسلمین کو دے دئے، اور اس کے علاوہ حکم دیا کہ ۱۰۰ھ کے بعد مسلمان زمینیں نہ خریدیں۔ انھوں نے مصر کے عمال کو فوراً تبدیل کیا۔ عبد الملک بن رفاعہ کی جگہ ایوب بن شرجیل بن اکسوم علی الصلاۃ اور اُسامہ بن زید کی جگہ حیّان بن شُریح صاحب الخراج مقرر کیا گیا۔ نظم ونسق پہلے کی طرح اب بھی دو حصوں میں منقسم رہا۔

ابن عبد الحکم[۱۲۴] نے بیان کیا ہے کہ حیان بن شریح نے تجویز کی تھی کہ جو قبطی مر گئے ہیں ان کا جزیہ زندہ قبطیوں پر لگایا جائے۔ خلیفہ نے عراک بن مالک سے مشورہ کیا، اور عراک نے یقین دلایا کہ

"ان کا اور ہمارا کوئی عہد نہیں اور وہ بمنزلہ غلام کے ہیں۔"

---

[۱۲۲] جہشیاری ورق ۴۲ (ب)۔ اُسامہ بن زید اور یزید بن ابی مسلم کاتب حجاج دونوں کی معزولی کا حکم بوقت واحد دیا گیا تھا۔

[۱۲۳] انگریزی ترجمہ ص ۲۶۷۔ الخ۔ اس مصنف نے عمر بن عبد العزیز کی مالی حکمت عملی پر مفصل بحث کی ہے۔

[۱۲۴] فتوح مصر واخبارہا۔ ص ۸۹۔ اس کتاب میں حیان بن شریح ہے۔ اسکے علاوہ دیکھو ص ۱۵۴ + خطط ج ۱۔ ص ۷۷ +

اس پر حیان کی تجویز منظور کر لی گئی۔ ایک اور روایت اسی کتاب[۱۲۵] میں یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے خود ہی حیان بن شریح کو لکھا تھا کہ

"مصر بزورِ شمشیر فتح ہوا ہے، اور اہلِ مصر کے ساتھ ہمارا کوئی عقد یا عہد نہیں ہے۔

پھر لیث بن سعد نے عمر بن عبدالعزیز سے روایت کی ہے کہ

"جزیہ سروں پر لگایا جاتا ہے، زمینوں (جائداد غیر منقولہ) پر نہیں لگایا جاتا۔ اس سے ان کی مراد اہل الذمہ ہیں"[۱۲۶]

اس کے علاوہ لیث بن سعد سے ایک دوسری روایت ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے ان ذمیوں پر جو اسلام لے آئے تھے، جزیہ اٹھا لیا تھا، اور ان نومسلموں کو اُن عرب عشائر کے ساتھ دیوان میں ملحق کر دیا تھا، جن کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے، حالانکہ اس کے قبل ذمی مسلمانوں سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا[۱۲۷]۔ لیث بن سعد نے حیّان بن شریح کے نام خلیفہ کا ایک خط بھی نقل کیا ہے[۱۲۸]۔ ان روایات سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کے نزدیک مصر بزورِ شمشیر فتح ہوا تھا، اور جزیہ قریوں پر لگایا گیا تھا۔ اہل قریہ میں سے جو مر جائے اُس کا جزیہ بہرحال قائم رہتا تھا، اور کسی صورت میں قابل معافی نہیں تھا[۱۲۹]۔ معلوم ہوتا ہے کہ

---

۱۲۵ ابن عبدالحکم ص ۹۰ +

۱۲۶ خطط ج ۱-ص ۷۷ + ابن عبدالحکم ص ۱۵۴ +

۱۲۷ ابن عبدالحکم ص ۱۵۶ + خطط ج ۱-ص ۷۷ + ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ "علی من اسلم" کی جگہ من من اسلم پڑھنا چاہیے۔ دیکھو خطط ج ۱-ص ۷۸ +

۱۲۸ خطط ج ۱-ص ۷۸ + ابن عبدالحکم ص ۱۵۶ +

۱۲۹ خطط ج ۱-ص ۷۷ +

حیان بن شریح نے ان احکام کے خلاف بہت جدو جہد کی تھی کیونکہ میزانیہ میں توازن قائم رکھنا نا ممکن تھا۔ اسی موقع پر عمر بن عبد العزیز نے فرمایا تھا کہ

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دین پھیلانے آئے تھے'
محصول جمع کرنے نہیں آئے تھے"

ہمارے نزدیک مندرجۂ بالا روایات میں جہاں کہیں جزیہ کا لفظ آیا ہے وہاں اس سے مراد "فی کس محصول" نہیں، بلکہ وہی پرانا خراج (باج) ہے۔ عمر بن عبد العزیز سے قبل نومسلموں پر اس خراج کا جسے جزیہ کہا گیا ہے، بار اتنا ہی تھا جتنا کہ اہل ذمہ پر۔ آپ نے یہ تبدیلی کی کہ نومسلموں پر سے جزیہ اُٹھا کر انھیں دیوان میں شریک کرلیا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح نومسلم جب جزیہ سے بری کردئے گئے، اور دیوان سے انھیں فریضہ (وظیفہ) ملنے لگا تو محاصل میں کمی ہوئی اور اخراجات میں اضافہ ہوا۔ اس سے میزانیہ میں خلل واقع ہو رہا تھا۔ ایک حد تک حیان نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ خلیفہ کی اجازت سے مرنے والے قبطیوں کا جزیہ زندہ قبطیوں سے وصول کیا مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بھی میزانیہ میں توازن قائم نہ ہو سکا اور قبطیوں پر سرکاری محاصل کا بوجھ بڑھ گیا۔ پھر لگان اراضی کی کمی کو روکنے کی ترکیب ان کے خیال میں آئی کہ مسلمانوں کے لئے زمین خریدنا ممنوع قرار دیں تاکہ خراجی اراضی عشری اراضی میں تبدیل نہ ہونے پائیں۔ یہ تو وہ محاصل تھے جو اسلام میں قانوناً جائز سمجھے جاتے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ رومی عہد کے دوسرے محاصل رفتہ رفتہ دوبارہ زندہ ہو رہے تھے[۱۳۱]۔ یہ محاصل مکس (جمع مکوس) کہلاتے تھے۔ عمر بن عبد العزیز ان مکوس کے سخت مخالف تھے۔ ان کا قول تھا کہ یہ مکس نہیں بلکہ بخس ہے۔ جس کے متعلق قرآن شریف میں ہے:۔

"ولا تبخسوا الناس اشیاءهم ولا تعثوا فی الارض مفسدین" (سورۂ ہود۔ آیت ۸۶[۱۳۲])

---

[۱۳۰] بکر ص ۱۰۷+

[۱۳۱] خطط الشام ج ۵۔ ص ۵۹، ۶۰+ لیکن ابن عساکر تاریخ

(بقیہ لے صفحہ آئندہ)

لیکن اس کے باوجود وہ انھیں منسوخ کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

محاصل کی اس نئی تنظیم کے علاوہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے ۹۹ھ میں ایوب بن شرحبیل کو حکم دیا تھا کہ عطایا میں اضافہ کیا جائے۔ چنانچہ پچیس ہزار دینار حاجت مند ول (غارمین) میں تقسیم کئے گئے۔ انھیں کے حکم سے اضلاع (کُور) میں قبطیوں کے مواریث ضبط کرکے مسلمانوں کے حوالے کئے گئے، شراب کی خرید و فروخت ممنوع قرار دی گئی، شراب خانے بند کردیے گئے، اور توڑ دیے گئے، اور حماموں میں عورتوں کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا[۱۳۲]۔ دو باتیں قابل توجہ ہیں ایک طرف تو جو ذمی مسلمان ہوگئے ہیں، باوجود غیر عرب ہونے کے، دیوان میں شریک کئے گئے ہیں، اور اس طرح دیوان خالصتہً عربوں کے لئے مخصوص نہیں رہا۔ دوسرے قبطی اپنے پرانے مواریث سے بے دخل ہو رہے ہیں، اور مسلمان ان کی جگہ لے رہے ہیں۔

۹

عمر بن عبد العزیز کے جانشین یزید بن عبد الملک نے شروع میں ایوب بن شرحبیل کو ولایت مصر پر بحال رکھا، لیکن چونکہ نیا خلیفہ اپنے پیشرو کی مخالفت پر اڑا ہوا تھا، اس لئے رمضان ۱۰۱ھ میں اُسے معزول کرکے بشر بن صفوان کو مقرر کیا[۱۳۳]۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایوب کی موت کے بعد (۷ا رمضان ۱۰۱ھ) بشر بن صفوان کا تقرر ہوا تھا[۱۳۴]۔ مگر اصلیت

بقیہ نوٹ ۱۔ الکبیر ج ۳۔ ص ۱۳۶) کی ایک روایت کے مطابق مکس کا وجود حضرت عمر کے زمانے میں بھی تھا، اور گو لوگ اسے برا سمجھتے تھے، لیکن خود آپ نے اس کے انتظام کے لئے ایک شخص مقرر کیا تھا۔

۱۳۲ خطط ج ۱ ص ۳۰۲ + الکندی ص ۶۸، ۶۹ + ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۲۴۶ + خطط میں بجائے "الناس" کے النسا پڑھنا چاہیے۔

۱۳۳ الکندی ص ۔ ۶۹ + ابن تغری بردی ص ۲۶۵ +

۱۳۴ ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۲۷۲ +

یہ ہے کہ یہ تبدیلی ایوب کی زندگی میں ہو چکی تھی، اور بشر اُس کی موت کے بعد مصر پہنچا تھا۔

مصر کے اہل دیوان کے عطایا میں جو اضافہ عمر بن عبد العزیز نے کیا تھا، وہ خلیفہ یزید کے حکم کے مطابق منسوخ کیا گیا۔ بشر کی مختصر سی ولایت کا سب سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ اس کے زمانے میں چوتھی اور آخری تدوین عمل میں آئی۔ الکندی[۱۳۵] نے اس کی یہ وجہ بتائی ہے کہ بشر نے دیکھا کہ قضاعہ کے لوگ مختلف قبایل میں منتشر ہیں، اس لئے اس نے خلیفہ سے اجازت چاہی کہ انھیں یک جا کر کے ان کا دیوان الگ کر دیا جائے، اور اجازت ملنے پر اس نے مہرہ کو کندہ سے، تنوخ کو ازد سے، آل کعب بن عدی التنوخی کو قریش سے، جُہَینہ کو اہل الرایہ سے، اور خُشَین کو لخم سے جدا کیا اور انھیں قضاعہ سے ملحق کر کے ان کا دیوان الگ کر دیا۔ اس کے بعد بنو امیہ کے عہد میں صرف ایک مرتبہ ۱۰۹ھ میں ایک تبدیلی ہوئی، جس کا ذکر آگے آئے گا۔ بنو عباس نے خلافت پر تسلط حاصل کر کے دوسری تبدیلیاں کیں[۱۳۶]۔

بشر بن صفوان کا عہد حکومت بہت ہی مختصر رہا۔ ۱۰۲ھ میں اُسے حکومت افریقہ پر منتقل کر کے اُس کے بھائی حنظلہ کو مصر میں اس کا جانشین بنایا گیا۔ اس کے زمانے میں ۱۰۳ھ یا ۱۰۴ھ میں خلیفہ یزید کے حکم سے مصر میں بت توڑے گئے، اور تصویریں مٹائی گئی ہیں[۱۳۷]۔

لیکن اب خلیفہ یزید نے ایسے شخص کو مصر کا صاحب الخراج مقرر کیا کہ والیان مصر کے بجائے ہماری تمام تر توجہ اسی پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ یہ شخص عبید اللہ بن الحبحاب مولائے بنی سلول تھا[۱۳۸]،

---

[۱۳۵] کتاب الولاۃ والقضاۃ۔ ص ۷۰، ۷۱ +

[۱۳۶] الکندی ص ۷۰، ۷۱ + خطط ج ۱۔ ص ۹۴ +

[۱۳۷] ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۲۷۸ + الکندی ص ۷۱ +

[۱۳۸] خطط ج ۱۔ ص ۲۶۱ +

جس کا نام عبد اللہ بن الحبحاب بھی لکھا جاتا ہے۔ اس کی تاریخ تقرر کے متعلق بیکر کو بہت شبہ ہے، اور آخر اس نے ابن تغری[۱۳۹] بردی کی پیروی میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ ۱۰۹ھ میں مصر کا صاحب الخراج مقرر ہوا تھا۔ اس کے برعکس گروہمان، بعد تحقیق، اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ حنظلہ بن صفوان (۱۰۲ھ سے ۱۰۵ھ) سے قبل ہی وہ صاحب الخراج مقرر ہو چکا تھا کیونکہ حیان بن شریح کے بعد پتہ نہیں چلتا کہ ۱۰۹ھ تک مصر کا صاحب الخراج کون رہا تھا غالباً یہی وہ زمانہ ہے جب ۱۰۵ھ یا ۱۰۶ھ میں عبید اللہ بن الحبحاب کا تقرر ہوا ہے[۱۴۰]۔ عبید اللہ (۱۰۶ھ-۱۱۴ھ یا گروہمان کے فیصلے کے مطابق تقریباً ۱۱۶ھ) حسب ذیل والیوں کے زمانے میں صاحب الخراج رہا۔ حنظلہ بن صفوان۔ (۲) محمد بن عبد الملک بن مروان (۱۱ شوال ۱۰۵ھ سے ذی القعدہ ۱۰۵ھ)۔ (۳) الحر بن یوسف (۳ ذی الحجہ ۱۰۵ھ سے ذی القعدہ ۱۰۸ھ)، (۴) حفص بن الولید (دو ہفتہ تا ختم ذی الحجہ ۱۰۸ھ)، (۵) عبد الملک بن رفاعہ (از یکم تا ۱۵ محرم یا ۲ صفر ۱۰۹ھ)، (۶) ولید بن رفاعہ (۱۵ محرم یا ۲ صفر ۱۰۹ھ سے یکم جمادی الثانی ۱۱۷ھ)۔ اس حاکم کے زمانے میں عبید اللہ افریقہ کا حاکم مقرر ہوا[۱۴۱]۔ صرف یہی نہیں کہ عبید اللہ کی مدت ملازمت غیر معمولی طور پر طویل ہے، بلکہ مصر کے معاملات پر اسے اتنا عبور حاصل تھا کہ اور اس کی گرفت اتنی قوی تھی کہ دو حاکم علی الصلاۃ اس کی شکایت پر معزول کئے گئے اور اپنی جگہ پر قائم رہا۔ حُر بن یوسف نے اس سے جھگڑا مول لیا، اور اس کی شکایت پر معزول ہوا۔ حفص بن الولید صرف دو ہفتہ مصر میں رہ سکا، اور پھر اسی کی وجہ سے معزول کیا گیا۔ حالانکہ حفص کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ اس کا شمار بنو امیہ کے اکابر میں ہوتا تھا،

---

۱۳۹ النجوم الزاہرہ - ج ۱، ص ۲۸۷ + بیکر ص ۱۰۷ +

۱۴۰ گروہمان ص ۴۹ + اس کتاب سے دیگر والیان مصر کے متعلق بھی مفید معلومات دستیاب ہوتی ہیں۔

۱۴۱ گروہمان ص ۴۹ + ابن تغری بردی (ج ۱، ص ۳۰۴) نے ۱۱۶ھ میں لکھا ہے۔

اور وہ بہت معزز سمجھا جاتا تھا: "وکان شریفاً، مطاعاً، محبباً للناس، ولدیه معرفة و فضیلة۔"[۱۶۲] عبید اللہ ہی کے کہنے سے عبد الملک بن رفاعہ کا تقرر ہوا تھا، اور آخر ولید بن رفاعہ (۱۰۹ھ سے ۱۱۷ھ) نے عبید اللہ کی مخالفت کی، اور اس میں کامیاب ہوا کہ اُسے خلیفہ ہشام نے ۱۱۶ھ میں افریقہ کا حاکم مقرر کر دیا۔[۱۶۳]

تاریخی روایات میں عبید اللہ بن الحجاب کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت ہی ظالم و جابر شخص تھا۔ لیکن اگر مصر کے حالات پر غور کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اُس نے مصر کی فلاح و بہبود کے لئے کیا کام کیا تھا تو، بیکر کی رائے کے مطابق یہ شخص نہایت دانا و فرزانہ معلوم ہوتا ہے۔ جو حاکم اُس کی شکایت پر معزول کئے گئے وہ اس کے ممد و معاون ہونے کے بجائے اُس کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرتے تھے۔ ولید بن رفاعہ اور عبید اللہ بن الحجاب کے ذاتی تعلقات خواہ کیسے ہی ہوں لیکن انہیں دونوں کے تعاون سے مصر کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ اس کا آغاز مردم شماری سے کیا گیا۔ یاد ہوگا کہ فتح مصر کے بعد مسلمانوں نے پرانی مردم شماری ہی سے کام لیا تھا۔ اسلامی دور میں پہلی مرتبہ اب مردم شماری کی گئی تھی۔ اس سے قبل ہی ۱۰۶ھ یا ۱۰۷ھ میں حُر بن یوسف کے عہد ولایت میں عبید اللہ بن الحجاب ابتدائی نقشے تیار کر رہا تھا۔ مگر نظم و نسق کی زبردست اصلاح کا کام ولید بن رفاعہ کے زمانے کی مردم شماری سے مکمل ہوا۔ مالیات میں تبدیلی کی ابتدا ۱۰۷ھ سے قبل ہوئی۔ الکندی[۱۶۴] لکھتا ہے کہ حُر بن یوسف کے

---

۱۶۲ الکندی ص ۷۴، ۷۵ + خطط ج ۱۔ ص ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴ + ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۲۹۳ +

۱۶۳ ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۲۹۶ + ابن العذاری ج ۱۔ ص ۳۸ +

۱۶۴ کتاب الولاۃ والقضاۃ ص ۷۳، ۷۴ + خطط ج ۱۔ ص ۷۹ + ج ۲۔ ص ۲۶۱، ۲۹۲، ۲۹۴ + مقامات کے نام بہت کچھ بگڑ گئے ہیں

زمانہ میں مصر کے صاحب الخراج عبید اللہ بن الحجاب نے خلیفہ ہشام کو لکھا کہ سرزمین مصر خراج میں اضافہ برداشت کر سکتی ہے۔ چنانچہ اُس نے فی دینار ایک قیراط (یعنی $\frac{1}{24}$) اضافہ کیا۔ اس تبدیلی کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ تنو دمی، قربیط اور حوف الشرقی میں اُس کے خلاف شورش ہوئی۔ حر بن یوسف نے ان شورشیوں سے لڑنے کے لئے اہل دیوان کو بھیجا، لڑائی میں شورشیوں کی بڑی تعداد قتل ہوئی۔ مگر حالات اس قدر تشویش ناک تھے کہ حُر بن یوسف تین مہینے تک دمیاط میں جنگ کے لئے مستعد رہا۔ مصر میں عربوں کے خلاف قبطیوں کی یہ پہلی بغاوت تھی۔

اب مقریزی[۱۴۵] کی زبانی خراج مصر کے حالات سنئے۔ عمرو بن العاص اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے بعد مصر کا خراج فساد کے بڑھ جانے، اکثر اراضی کی تباہی اور جنگوں کی وجہ سے برابر گھٹتا گیا، اور بنو امیہ اور بنو عباس کے خلفا تیس لاکھ دینار سے زیادہ وصول نہ کر سکے، سوائے ہشام کے، جس نے عبید اللہ کو حکم دیا تھا کہ مصر کو آباد کرنے پر توجہ کرے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ خراج مصر میں کمی کے بعد صرف دو مرتبہ زیادتی ہوئی۔ پہلے عبید اللہ کے زمانے میں، اور ہم نے دیکھا کہ اُس نے کیا طرز عمل اختیار کیا تھا، اور پھر اس وقت جب احمد بن طولون نے احمد بن المدبر سے مصر کی مالیات کا جائزہ لیا۔ لیکن ابن الحبحاب نے جو اضافہ کیا تھا وہ بے سوچے سمجھے اور بلا تحقیق نہیں تھا۔ مقریزی[۱۴۶] لکھتا ہے کہ اُس نے ذاتی طور پر تمام ملک کا دورہ کیا اور غیر آباد زمینوں کی، جہاں تک وہ دریائے نیل سے سیراب ہوتی تھیں، پیمائش کی۔ اُس نے دیکھا کہ تین کروڑ فدان (ایکڑ) زمین اُن زمینوں کے علاوہ تھی جو طغیانی کی سرحد سے بلند تھیں، اور یہ وہ زمینیں تھیں جو خس و خاشاک[۱۴۷] (وسخ) سے پر ہو کر

---

۱۴۵ خطط ج ۱۔ ص ۹۸، ۹۹ +

۱۴۶ خطط ج ۱۔ ص ۷۵، ۹۹، ۱۰۰ +

۱۴۷ خطط ج ۱۔ ص ۱۰۰ + ابن مماتی ص ۲۹ +

ناقابل زراعت ہوگئی تھیں۔ اس نے ان سب کی فہرست تیار کی، اور انتہائی عدل کے ساتھ انھیں دوبارہ تقسیم کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے چالیس لاکھ دینار خراج وصول کیا، حالانکہ غلہ سستا تھا، اور ملک میں کوئی اور محصول (ٹکس) یا چونگی (ضریبہ) بھی نہ تھا۔ اوائل خلافت میں ہشام نے ۱۰۷ھ میں عبید اللہ کو حکم دیا تھا کہ وہ ان موجودہ طبقات کی تنقیح کرے جو مصر کے دواوین سے متعلق تھے۔ اُس نے یہ کام اس خوبی سے انجام دیا کہ اس کے تنقیح کردہ دواوین بنوامیہ کے بعد بھی مستند سمجھے جاتے رہے۔ ان کی مجموعی تعداد ستر ولاکھ دو سینتیس دینار تھی۔ ان میں سے دس لاکھ چار سو بیس اور نصف دینار مصر صعید کے تھے، اور باقی مصر اسفل کے۔ چند سطر آگے چل کر مقریزی (خطط ج ۱ ص ۹۹) لکھتا ہے کہ ابن خرداذبہ[۱۴۸] نے لکھا ہے کہ عبید اللہ نے ستائیس لاکھ تیئیس[۲۲] ہزار آٹھ سو انتالیس دینار وصول کئے تھے۔ یہاں ابن خرداذ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ کیونکہ درحقیقت یہ وہ رقم تھی جو اہل مصر کے عطیات اور دیگر اخراجات کے بعد دمشق کے مرکزی خزانے کو روانہ کی گئی تھی۔

مختلف رقوم سے قطع نظر، کیونکہ مورخ ان کے متعلق متفق نہیں، ان روایات سے ابن الحبحاب کے کاموں پر خاص روشنی پڑتی ہے، اور اندازہ ہوتا ہے کہ فرائض کی ادائی میں وہ کتنا جفاکش تھا۔ ایسا شخص استحصال بالجبر کرنے والا، یا خون چوسنے والا نہیں ہو سکتا، جیسا کہ روایات میں اُسے ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مورخ بھی اس کی میانہ روی کی داد دیتے ہیں۔ ایک قیراط فی دینار کے متعلق صراحت نہیں کی گئی کہ یہ اضافہ اس تحقیق کے بعد ہوا تھا یا پہلے۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق کے بعد ہی یہ عمل اختیار کیا گیا ہوگا بہرحال اگر تحقیق سے پہلے بھی ایسا کیا گیا تو بھی ابن الحبحاب نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اس اضافہ میں بالکل حق بجانب تھا۔ اب رہی یہ بات کہ لوگوں کو اُس سے شکایت کا موقعہ ملا۔ اس قسم کی

---

[۱۴۸] المسالک والممالک ص ۸۳، ۸۴ +

تبدیلیاں ہر زمانے میں عوام کو شاق گذرتی ہیں، اور ان کی وجہ سے ہمیشہ کچھ نہ کچھ مصیبت رعایا کو برداشت کرنی پڑتی ہے۔ لہذا آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ جب پرانے نظام کو اچانک تبدیل کیا گیا تو عوام میں بے چینی پھیلی، اور یہ بے چینی قبطیوں کی پہلی بغاوت کی صورت میں رونما ہوئی۔

اس نئی تنظیم اور مردم شماری کے متعلق ایک روایت محفوظ ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کام کس طرح کیا گیا تھا۔ ابن[۹۶] عبدالحکم نے لیث بن سعد سے روایت کی ہے کہ جب ولید بن رفاعہ والیٔ مصر ہوا تو وہ ملک کی مردم شماری کے لئے نکلا، اور یہ بھی دیکھنا چاہا کہ خراج میں تعدیل سے کام لیا جارہا ہے یا نہیں۔ چنانچہ اس نے چھ مہینے مصر صعید کا دورہ کیا، اور اُسوان تک پہنچا۔ کاتبوں اور مددگاروں کی ایک جماعت اُس کے ساتھ تھی، جو اس کام کو بڑی تندہی سے جلدی جلدی انجام دیتے تھے۔ مصر اسفل میں اُس نے تین مہینے صرف کئے۔ اُس نے قریوں میں دس ہزار قریے شمار کئے، جن میں وہ گاؤں شامل نہیں تھے، جن کی آبادی پانچ سو سے کم تھی، اور جزیہ دینے والوں میں سے پچاس لاکھ آدمی شمار کئے۔ ابن رفاعہ کی یہ تحقیق اور مردم شماری کیا نئی چیز تھی، یا اس نے محض اس کام کو جاری رکھا تھا جو ابن الحبحاب شروع کرچکا تھا؟ قرین قیاس یہ ہے کہ ابن رفاعہ نے یہ کام جاری رکھا تھا، اور وہ یہ دیکھنے نکلا تھا کہ ابن الحبحاب کے بنائے ہوئے قواعد پر حسب احکام صحیح طور سے عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ مذکورہ بالا روایت کے الفاظ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے —— اس طرح ابن الحبحاب کے زیر نگرانی اسلامی خراج اور جزیہ کا نظام تکمیل کو پہنچا۔ جس تفصیل سے اس کے حالات محفوظ رکھے گئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تنظیم کے اثرات دور رس تھے۔

مصر کی جدید مردم شماری اور محاصل کی تنظیم —— عبید اللہ بن الحبحاب کا صرف یہی ایک کارنامہ

۹۶؎ فتوح مصر واخبارہا ص ۱۵۶ + خطط ج ۱ ص ۷۴ + سیوطی ج ۱ ص ۱۷ +

نہیں تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مصر کی فتح کے بعد جو عرب قبائل وہاں آباد ہوئے تھے، ان میں فہم اور عدوان کے سوا باقی سب قبائل کلبی تھے، اور چار مرتبہ کی تدوین میں کہیں بھی ان دو قبائل کے سوا کسی قیسی قبیلے کا نام نہیں آتا۔ گو یہاں بھی تفصیلات سے ہم ناواقف ہیں، لیکن یہ نتیجہ نکالنا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ اس مدت میں عرب قبائل یا ان کے افراد برابر مصر میں نقل مکان کرتے رہے ہوں گے۔ جب ایک قبیلے کے لوگ مصر میں بسے تو ظاہر ہے کہ اسی قبیلے کے یا دوسرے قبیلے کے افراد کو بھی وہاں آنے اور آباد ہونے کی ترغیب وتحریص ہوتی ہوگی۔ موجودہ اطلاعات کی بنا پر فیصلہ کرنا ناممکن ہے کہ اب تک اس نوآبادکاری میں حکومت کا ہاتھ کہاں تک کام کر رہا تھا، اور یہ کام کہاں تک اس کے زیر نگرانی ہوتا تھا۔ حسن اتفاق سے مصر میں وہ قیسی اور کلبی جھگڑے، جن کی وجہ سے مشرق میں عرب حکومت زوال پذیر تھی، پیدا نہیں ہوئے تھے، اور یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ والیان مصر اپنے قبیلہ قیسی یا کلبی افراد کو وادیٔ نیل کی برکات سے مستفید ہونے کی دعوت دیتے تھے، یا ان کے لئے خاص خاص علاقے محفوظ کر لیتے تھے۔ جوں جوں عرب وسیع پیمانے پر ملک میں آباد ہوتے چلے گئے، لازمی طور پر عربیت بھی وہاں پھیل گئی۔

بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۹ھ تک نئے آنے والے تمام عرب کلبی قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ کیونکہ اس سال نئی آبادکاری کی جو کوشش سرکاری طور پر کی گئی اس میں صراحت تھی کہ قیسی قبائل کو مصر کی برکات سے مستفید ہونے کا موقع دیا جائے۔ یہ کوشش بھی انہیں دو افسروں کی طرف سے ہوئی جو محاصل کی نئی تنظیم کے ذمہ دار تھے، اور عبید اللہ بن الحجاب اس کوشش میں پیش پیش تھا۔ الکندی[۱۵۰] نے لکھا ہے کہ ۱۰۹ھ میں ولید بن رفاعہ الفہمی کی ولایت مصر میں قیسی وہاں منتقل کئے گئے۔ تفصیل یہ ہے کہ عبید اللہ بن الحجاب خلیفہ ہشام سے

---

۱۵۰ کتاب الولاۃ والقضاۃ ص ۷۶ + خطط ج ۱ ص ۸۰ + البیان الاعراب ص ۵۰، ۵۱ +

ملنے کے لئے دمشق گیا، اور اس سے اجازت مانگی کہ قیسی قبائل کے چند خاندان (ابیات) مصر میں منتقل کر دیے جائیں۔ خلیفہ نے اسے تین ہزار قیسیوں کو لے جانے اور ان کا دیوان بھی وہیں منتقل کر دینے کی اجازت دی، بشرطیکہ انھیں نسطاط میں نہ رکھا جائے۔ عبید اللہ نے قیسیوں کے سامنے یہ تجویز پیش کی، اور انھیں ساتھ لا کر حوف الشرقی میں اتارا، اور وہیں منتشر کر دیا۔

ایک اور روایت الکندی نے ہیثم بن عدی کی معرفت بیان کی ہے، اور مقریزی نے بلا حوالے اسے نقل کیا ہے[۱۵۱]۔ عبید اللہ بن الحبحاب جب ہشام کی طرف سے مقرر ہو کر مصر آیا تو اس نے دیکھا کہ جُذیلہ (یعنی فہم وعدوان) کے سوا اس ملک میں قیس کا کوئی حصہ نہیں۔ اس نے خلیفہ کو لکھا کہ امیر المومنین نے قیس کو ہر طرح کا عز و شرف بخشا ہے، اور انھیں سرفراز کیا ہے لیکن مصر آ کر اسے معلوم ہوا کہ فہم کے چند گھرانوں (ابیات) کے سوا قیس کا وہاں کوئی حصہ نہیں۔ حالانکہ یہاں بعض اضلاع (کُوَر) غیر آباد پڑے ہیں، اور اگر قیس کو وہاں بسا دیا جائے تو باشندوں کا کوئی ہرج نہ ہوگا، اور نہ خراج میں کمی ہوگی۔ ایسا ہی ایک کورہ بلبیس ہے۔ اگر اجازت ہو تو قیس کو وہاں بسا دیا جائے۔ ہشام نے اجازت دی۔ ابن الحبحاب نے ریگستان (بادیہ) میں اس کا اعلان کیا۔ بنو مضر[۱۵۲] کے سو اور بنو سلیم[۱۵۳] کے سو گھرانے آئے انھیں اس نے بلبیس میں اتارا، کھیتی کرنے کا حکم دیا، اور عشر سے جو آمدنی ہوتی تھی ان پر صرف کی۔ ان لوگوں نے اونٹ خریدے اور اناج قلزم لے جانے لگے۔ ایک مہینے میں فی کس دس دینار انھیں وصول ہو جاتے تھے۔ پھر عبید اللہ نے انھیں گھوڑے خریدنے کا

---

۱۵۱ کتاب الولاۃ والقضاۃ ص ۷۶، ۷۷ + خطط ج ۱۔ ص ۸۰ +

۱۵۲ الکندی ص ۷۷۔ حاشیہ ۳ + البیان والاعراب (ص ۵۰) میں بجائے مضر کے نصر ہے۔

۱۵۳ البیان والاعراب (ص ۵۰) میں بنو سُلیم کی تعداد تین سو بیان کی گئی ہے۔

حکم دیا۔ ایک شخص ایک بچھیرا خرید تا تھا' وہ ایک مہینے میں سواری کے قابل ہو جاتا تھا۔ انہیں اونٹوں اور گھوڑوں کے چارے کی قیمت بھی نہیں دینی پڑتی تھی' کیوں کہ ان کی چراگاہیں بہت اچھی تھیں۔ جب ان حالات کی اطلاع ان کے اہل قوم کو ہوئی تو وہ بھی ان کے پاس آگئے۔ اس طرح قیس کے پانچ سو گھرانے بادیہ سے مصر پہنچ گئے۔ ان کی بھی اسی طرح مدد کی گئی۔ ایک سال بعد تقریباً پانچ سو گھرانے اور آئے۔ ہشام کی وفات کے وقت (۱۲۵ھ) بلبیس میں قیسیوں کی تعداد پندرہ سو تھی۔ خلیفہ مروان بن محمد نے حوثرہ بن سہیل الباہلی کو مصر کا والی مقرر کیا تو اس کی وجہ سے قیسی اور بھی بڑی تعداد میں مصر آئے۔ مروان کی وفات کے وقت تین ہزار قیسی وہاں موجود تھے۔ بادیہ سے آنے والوں کے علاوہ خود پرانے نوآبادکاروں کی اولاد وہاں خوب پھلی پھولی۔ محمد بن سعید (۱۲۵ھ سے ۱۳۱ھ) کے زمانے میں ان کی تعداد جن میں بالغ اور نابالغ دونوں شامل تھے' پانچ ہزار سے دو سو کم یا دو سو زیادہ تھی۔ ابن عبدالحکم[154] نے لکھا ہے کہ خلیفہ ہشام نے عبیداللہ کو پانچ ہزار فریضوں (عطیات) کی اجازت دی تھی اور یہ تمام فریضے اس نے قیس میں منتقل کر دئیے تھے۔ حوثرہ بن سہیل کے زمانے میں قیسیوں کی تعداد کے یکبارگی بڑھ جانے کا سبب تھا کہ وہ سات ہزار سواروں کے ساتھ مصر آیا تھا[155]۔

ان دونوں روایات میں ایک بین فرق ہے۔ پہلی روایت کے بموجب یہ نوآبادکاری یک بارگی شروع ہوئی اور تین ہزار یا پانچ ہزار قیسیوں کے مصر میں منتقل ہو جانے سے مکمل بھی ہو گئی۔ مگر ہیثم کے مطابق یہ عمل بتدریج ہوا' اور مصر کے حالات جوں جوں معلوم ہوتے گئے

۱۵۴؎ فتوح مصر واخبارہا۔ ص ۱۴۳ + خطط ج ۲۔ ص ۲۶۱ + فریضة :۔ الفرض العطیة وقیل ما اعطیتہ بغیر قرض + وافرضت الرجل : اذا اعطیتہ + الاصمعی: یقال فرض له فی العطاء وفرض له فی الدیوان یفرض فرضاً۔ لسان العرب۔ تحت فرض۔

۱۵۵؎ وزاد صاحب البغیة : ومعه سبعة آلاف فارس + ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۳۳۹ +

مزید قیس وہاں منتقل ہوتے گئے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ دونوں تحریکیں بوقت واحد شروع ہوئی ہوں۔ ایک طرف ابن الحبحاب کی سرکاری نو آبادکاری تھی، اور دوسری طرف خود قیس مصر میں توطن اختیار کر رہے تھے۔ لیکن ابن الحبحاب نے دونوں صورتوں میں قیسیوں کی سرپرستی کی، اور ہر دو صورت میں نو آبادکاروں کے ساتھ ایک ہی قسم کی مراعات برتی گئیں۔ قیس کو خاص طور پر منتخب کرنے، یا پانچ ہزار فرائض کو قیس کے ساتھ مخصوص کر دینے کی وجہ یہ تھی کہ ہشام کے عہد میں یہی قبیلہ پیش پیش تھا۔ پھر ایک اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان نئے عربوں کو مصر میں لانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ فوجی قوت میں اضافہ کیا جائے، بلکہ حکم دیا گیا تھا کہ انھیں فسطاط میں نہ بسایا جائے، اور زمینوں پر آباد کر کے زراعت پر لگایا جائے۔ سپاہیوں میں اضافہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی، بلکہ مصر میں عربوں کو آباد کرنا مقصود تھا۔ مقریزی[۱۵۶] کے مطابق اس کا ایک بدیہی نتیجہ یہ ہوا کہ اب تک تمام مصر میں، خواہ وہ مصر صعید یا ارض الاسفل، دیہات قبطیوں اور رومیوں سے بھرے ہوئے تھے، لیکن عبید اللہ کی نو آبادکارانہ جدوجہد کے بعد "مصر" اور اس کے نواح کے قریوں میں مسلمان پھیل گئے، اور قبطیوں کی طاقت کم ہوگئی۔ عرب اب پوری طرح زراعت پر قابض تھے۔ لیکن مصر اب تک قبائلی جھگڑوں سے آزاد تھا، وہاں بھی توازن قائم ہو جانے کی وجہ سے کلبی اور قیسی تنازعات شروع ہو گئے۔

ولید بن رفاعہ کے زمانے کا صرف ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ ۱۱۷ھ میں اس نے حمرا میں عیسائیوں کو ایک گرجا بنانے کی اجازت دی، جو بعد میں "ابومینا" یا "بومنا" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس پر مسلمان ناراض ہو گئے، اور وُھَیب الیحصبی نے ولید بن رفاعہ کو قتل کرنے کی کوشش کی مگر خود گرفتار ہوا اور قتل کیا گیا۔ بومنا کا گرجا سلطان الناصر محمد بن قلاؤن کے زمانے تک باقی رہا اور اس عہد میں جب مصر کے دوسرے گرجا منہدم کئے گئے ہیں تو

۱۵۶؎ خطط ج ۱۔ ص ۱۶۲ +

انھیں میں بُوسنا بھی شامل تھا۔[۱۵]

سات سال پانچ مہینے کی حکومت کے بعد ولید بن رفاعہ کا مصر میں انتقال ہوا۔ اس سے قبل ۱۱۶ھ میں عبید اللہ بن الحجاب افریقہ کی حکومت پر منتقل ہو چکا تھا۔

(۱۰)

عبید اللہ بن الحجاب اور ولید بن رفاعہ کی اصلاحات پہلی صدی ہجری کی آخری اصلاحات تھیں، اور یہی زمانہ مصر میں عرب حکومت اور عرب قوم کے انتہائی عروج کا بھی تھا۔ اسی وقت یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان اصلاحات کی وجہ سے جزیہ اور خراج میں فرق قائم کیا گیا، اور پرانے جزیہ یا خراج کو باقی رکھ کر، نئی پیمائش کے مطابق لگان اراضی عائد کیا گیا۔ اس کے بعد خلیفہ ہشام کے زمانے میں کسی بڑی تبدیلی کا ذکر نہیں آتا۔ خلیفہ کا انتقال ۱۲۵ھ میں ہوا، اور سات سال بعد ۱۳۲ھ میں بنو امیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ ان انقلابات سے مصر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ چنانچہ اسی سات سال کے عرصے میں ہمیں یہ عجیب و غریب بات دکھائی دیتی ہے کہ عرب خود اپنی ہی حکومت اور حاکم کے خلاف متعدد مرتبہ شورش اور فساد برپا کرتے ہیں، اور حالات میں سکون پیدا کرنے کے بجائے انتشار میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ خود بنو امیہ کے افراد بھی، جو مصر میں موجود تھے، نہایت ناعاقبت اندیشی سے ان شورشوں میں حصہ لیتے ہیں، اور مصر میں اپنے خاندان کی حکومت کو تباہ کرنے میں بہت نمایاں ہیں۔

خلیفہ ہشام کی وفات پر اس کا بھتیجا ولید بن یزید بن عبد الملک خلیفہ ہوا۔ پہلے تو اس نے پرانے والی حنص بن ولید الحضرمی کو، جو مصر میں حضرمیوں کا سب سے سربرآوردہ شخص تھا، اور جسے بنو امیہ کے خلفاء ولید بن عبد الملک کے بعد سے برابر مختلف حکومتوں پر

---

[۱۵] الکندی ص ۷۷، ۷۸ + خطط ج ۲۔ ص ۵۱۲ +

مقرر کرتے آئے تھے[۱۵۸]، بحال رکھا، بلکہ خراج کا کام بھی اس کے سپرد کر دیا۔ لیکن چار مہینے بعد عیسیٰ بن العطا، کو پھر الگ صاحب الخراج مقرر کیا۔ ولید بن یزید نے حفص کو حکم دیا تھا کہ اجناد شام کے جو لوگ مصر میں ہوں انھیں شام واپس بھیج دے۔ جب حفص نے اس حکم کی تعمیل کرنی چاہی تو ان شامیوں نے فساد برپا کیا، اور حفص کا اُسی کے گھر میں محاصرہ کر لیا۔ یہ شورش ان کے سرغنہ ربیعہ، مولائے اہل حمص، کی گرفتاری اور قتل سے فرو ہوئی، اور شامی اپنی اجناد کو واپس کئے گئے[۱۵۹]۔ یہ معمولی سا واقعہ آئندہ پیش آنے والے واقعات کا پیش خیمہ تھا۔

سلخ جمادی الآخر ۱۲۶ھ کو ولید بن یزید کو قتل کر کے 'یزید بن ولید' المعروف "بالناقص" خلیفہ ہوا۔ اُس وقت حفص بن ولید دمشق ہی میں تھا۔ نئے خلیفہ نے حکم دیا کہ وہ فوراً مصر جائے اور اُسے تیس ہزار فوج کے فریضوں کا حکم بھی دیا[۱۶۰]۔ الکندی[۱۶۱] کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ یزید کے اس حکم سے مطلب یہ تھا کہ نئی فوجی تنظیم کی جائے۔ چنانچہ حفص نے ان فریضوں سے نئے افسر (قواد) مقرر کئے جن کا نام اُس نے "اصحاب الندبہ" رکھا۔ نئی مرتب شدہ فوج میں موالی اور ان کے متوسلین (مقامصہ)[۱۶۲] بھرتی کئے گئے تھے۔ اس فوج کو الحفصیۃ کہتے تھے۔ ابھی بنو امیہ کا زمانہ ختم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ مصر کی فوج میں یہ زبردست

---

[۱۵۸] الکندی ص ۸۳، + خطط ج ۱۔ ص ۳۰۳ +

[۱۵۹] ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۳۲۴ +

[۱۶۰] ان یفرض للجند ثلاثین الفاً (ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۳۲۴) + الکندی (ص ۸۴) میں یفرض کے بجائے یعرض ہے + خطط (ج ۱۔ ص ۳۰۳): واَمَرَهُ علی ثلاثین الفاً وفرض فروضاً۔

[۱۶۱] کتاب الولاۃ والقضاۃ ص ۸۴ +

[۱۶۲] مقامصہ تحقیر کا لفظ ہے۔ الکندی (ص ۴۴۳) میں سعید بن کثیر کہتا ہے "واصلح اللہ الامیر ما بال ابنا الصباغین والمقامصہ یذکرون فی المواضع اللتی لم یجعل اللہ عزوجل لہا اہلاً۔ دیکھو الکندی کی فرہنگ پیرۂ ۲۱۲ کا حاشیہ۔

تبدیلی ہوئی۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے نو مسلم اہل الذمہ کو دیوان میں شریک کیا تھا اور اس طرح غیر عربی عنصر کو فوج میں جگہ دی تھی۔ اب یزید بن ولید کے زمانے میں یہ حالت ہو گئی تھی کہ وہ اور اس کے والیٔ مصر حفص بن ولید، اہل الدیوان عربوں کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے، بلکہ موالی اور مقامصہ کی ایک نئی فوج بھرتی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نئی فوج میں عربی عنصر بالکل غائب ہے، اور سپاہی اور افسر سب غیر عرب ہیں۔ اس فوج کی تعداد بھی قابل غور ہے تیس ہزار نئی فوج کا مطلب یہ تھا کہ پرانے عرب فوج کا اسے مدمقابل بنا دیا جائے۔ اس طرح ۱۲۶ھ میں فوجی خدمت، جو عربوں کے لئے مخصوص تھی، اب ان کے ہاتھ سے نکلنی شروع ہو گئی، اور وہ لوگ اس خدمت پر مامور ہونے شروع ہو گئے جنھیں عرب ذلیل سمجھتے تھے۔ یہ تھا نتیجہ اس فساد اور شورش کا جو اجناد شام کے افراد نے حاکم مصر کے خلاف برپا کی تھی۔

لیکن اس نئی فوج کا بھرتی کرنا بھی بذات خود خطرے سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ اس کے نتائج و عواقب فوراً ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔ یزید بن ولید کے انتقال پر ۱۲۷ھ میں مروان بن محمد نے ابراہیم کو الگ کر کے اپنی خلافت کا اعلان کیا۔ حفص بن ولید نے ولایت مصر سے استعفا دے دیا، اور مروان نے اسے منظور کر کے حسان بن العتاہیہ کو مقرر کیا۔ اس نے مصر آ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ حفص کے مقرر کردہ تمام فریضے یک قلم منسوخ کر دے۔ نئی فوج نے فوراً غدر کر کے مطالبہ کیا کہ حفص کو دوبارہ مقرر کیا جائے۔ ایک طرف تو اہل الندبہ کی یہ شورش تھی اور دوسری طرف مسودہ (عباسیہ کے ہمدرد) مصر میں اپنا دعویٰ پیش کرنے کے لئے وہاں پہنچ چکے تھے، اور مشرق سے بھی اہل مصر سے خط و کتابت کر رہے تھے۔ اہل مصر اس دعوے سے متاثر ہوئے۔ صرف ایک شخص یزید بن ابی امیہ المعافری نے خطرے کو محسوس کیا۔ مگر اس کی ایک پیش نہ گئی۔ آخر کار اہل الندبہ نے حسان بن العتاہیہ کو صرف سولہ دن کی حکومت کے بعد مصر سے چلے جانے پر مجبور کیا۔[۱۶۳] فوج نے حفص کو طوعاً و کرہاً تیسری مرتبہ مصر کا والی بنا دیا۔

---

۱۶۳ الکندی ص ۸۵-۸۸ + حسان بن العتاہیہ پر یہ بھی تہمت تھی کہ وہ عباسیہ کا ہمدرد تھا۔ دیکھو ابن تغری بردی ۱/۳۴۵ +

یہ ۱۲۷ھ کا واقعہ ہے۔ ۱۲۸ھ میں وہ معزول ہوا۔ اس کے جانشین حَوثرہ بن سُہَیل نے حالات کو بہتر بنانے کی انتہائی کوشش کی: مفسدوں کو قتل کرایا، شیعان مروان کو خاص فریضے دیے، اور ایک فوج سرحد کی حفاظت کے لئے روانہ کی۔ مگر یہ سب تدبیریں بیکار ثابت ہوئیں۔[۱۶۴] اس پر طرہ یہ کہ اس زمانے میں مشرق کی افراتفری اور بدنظمی کی وجہ سے مروان کو رقم کی شدید ضرورت ہوئی، اور اس نے مصر کے عطیات بالکل منقطع کر دیے۔ گو اگلے سال اس نے یہ عطیات پھر جاری کرا دیے، بلکہ گزشتہ سال کا بقایا بھی ادا کیا، اور اہل مصر سے معذرت بھی کی،[۱۶۵] لیکن اس طرز عمل سے مصر پر جو خراب اثر پڑا وہ مستقل ہو چکا تھا۔

حالات اس حد تک اور اس سرعت کے ساتھ بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے کہ آخر مروان نے ۱۳۱ھ میں عبد الملک بن مروان بن موسے بن نصیر کو وہاں کا والی علی الصلاۃ و علی الخراج مقرر کیا۔ مگر وہ بھی کوئی اچھا اثر پیدا نہ کر سکا۔ اول تو یُحَنّس نامی ایک قبطی نے ۱۳۲ھ میں سَمَنُّود میں شورش برپا کی۔[۱۶۶] یہ شورش فرو ہوئی ہی تھی کہ عمرو بن سہیل بن عبد العزیز بن مروان نے خلیفہ کے خلاف خروج کیا، اور دُماحس بن عبد العزیز الکنانی نے اس کا ساتھ دیا۔ عبد الملک بن مروان نے باغیوں کے خلاف ایک فوج روانہ کی۔ قصہ مختصر، یہ بغاوت بھی فرو ہوئی۔ عمرو بن سہیل کو گرفتار کر کے فسطاط میں قید کر دیا گیا۔[۱۶۷] عبد الملک بن مروان کا سب سے زیادہ نمایاں کارنامہ یہ تھا کہ اُس نے مصر کے تمام اضلاع (کور) میں منبر قائم کئے۔ اس سے قبل خطیب عصا ہاتھ میں لے کر قبیلے کی طرف رُخ کر کے خطبہ

---

۱۶۴ الکندی ص ۸۹ - الخ

۱۶۵ خطط ج ۱۔ ص ۳۰۲

۱۶۶ الکندی ص ۹۴ + خطط ج ۱۔ ص ۹۷

۱۶۷ الکندی ص ۹۴ +

خطبہ پڑھا کرتے تھے۔[۱۶۸]

اس عرصے میں مرکز خلافت کے حالات ناگفتہ بہ ہو گئے تھے، اور مروان کو کہیں پناہ نہیں ملتی تھی۔ دوسری طرف مصری فوج نے فیصلہ کیا کہ وہ خلیفہ کے مصر آنے میں مزاحم ہوں گے بہر حال ۲۲ شوال ۱۳۲ھ کو مروان مصر آیا۔ مگر اس وقت تک حوف الشرقی کے عرب جنھیں ابھی چند سال قبل مصر میں بسایا گیا تھا، علانیہ طور پر مسودہ میں شریک ہو چکے تھے۔ یہی حال اسکندریہ، مصر صعید اور اسوان کا تھا۔ مروان بالآخر جیزہ میں داخل ہوا۔ اب جو جد و جہد شروع ہوئی اُس میں خلیفہ کے خلاف عربوں کے علاوہ قبطیوں نے بھی حصہ لیا۔ ایک طرف یہ ابتری تھی، اور دوسری طرف ذی الحجہ ۱۳۲ھ میں صالح بن علی بن عبد اللہ بن عباس مصر میں داخل ہوا۔ مروان نے بوصیر کا راستہ لیا، اور صالح بن علی اُس کے پیچھے چلا۔ یہیں ۲۳ ذی الحجہ ۱۳۲ھ کو مروان اپنے چند وفادار ملازموں کے ساتھ قتل ہوا[۱۶۹]، اور مشرق میں بنو امیہ کا خاتمہ ہو گیا۔

(۱۱)

اس طرح ۱۳۲ھ میں اہل مصر نے برضا و رغبت اپنا ملک نئے خاندان خلافت کے سپرد کر دیا۔ بنو عباس اپنے آپ کو ابتدا ہی سے بڑی حد تک عربوں سے مستغنی سمجھتے تھے، اور عراق میں ان کی حکمت عملی شروع ہی سے یہ تھی کہ خراسانیوں یا عجمیوں کو عربوں پر ترجیح دی جائے۔ شروع میں مشرقی صوبوں کے حاکم ضرور خاندان خلافت سے ہوتے تھے، مگر ان سب کے مشیر اور مددگار عجمی تھے۔ مصر کے حالات اس سے مختلف تھے۔ اول تو وہاں عربوں کا اقتدار اس قدر مستحکم تھا کہ انھیں فوراً بے دخل کرنا ناممکن بھی تھا اور پر خطر بھی، دوسرے چند ہی سال قبل عربوں کی نو آبادی میں سرکاری اور غیر سرکاری طور پر جو اضافہ ہوا تھا

۱۶۸ھ الکندی ص ۹۳، ۹۴ + تفصیل کے لئے دیکھو ہمارا مضمون منبر و عصا۔ اورنٹیل کالج میگزین۔ اگست ۱۹۳۹ء

۱۶۹ھ الکندی ص ۹۴-۹۷ + ابن تغری بردی ج ۱ ص ۳۵۰-۳۵۲ +

اُس سے ان کی آبادی اتنی بڑھ گئی تھی کہ انھیں نظر انداز کرنا آسان نہیں تھا۔ لہذا کم وبیش سو برس تک بنو عباس نے عربوں کو ان کی جگہ پر قائم رکھا، اور مصر کے تمام ملازمین عرب ہی رہے۔ مگر ناممکن تھا کہ یہ حالات ہمیشہ باقی رہتے۔

مصر پر قبضہ کرنے کے بعد خلیفہ ابو العباس سفاح نے اپنے چچا صالح بن علی، فاتح مصر، ہی کو وہاں کا علی الصلاۃ والخراج حاکم مقرر کیا۔ اول تو اُس نے بنوامیہ کے ہمدردوں کو گرفتار کرا کے قتل کرایا، اور پھر بنوامیہ کے افراد کو، جن میں عبد العزیز بن مروان کی اولاد بھی شامل تھی، گرفتار کرایا، لیکن انھیں بجائے مصر میں قتل کرانے کے فلسطین کے شہر قلنسوہ میں لے جا کر قتل کیا گیا[۱۱۰]۔ اس سخت گیری کے ساتھ ساتھ صالح بن علی نے مقاتلہ اور ان کے خاندانوں میں عطیات، اور یتیموں اور مسکینوں میں صدقات تقسیم کئے، اور اب کہ ملک بنوامیہ کے ہمدردوں اور افراد سے پاک ہو چکا تھا، اس نے ان لوگوں میں قطائع بھی تقسیم کئے جنھوں نے سیاہ رنگ اختیار کر لیا تھا۔ یہ قطائع منیۃ بُولاق اور اھناس کے دیہات میمون اور سُوَید تھے۔ الکندی نے ان لوگوں کے نام بھی لکھے ہیں جنھیں یہ قطائع دئے گئے تھے[۱۱۱]۔ اب قطائع کی حیثیت وہ نہیں تھی جو ہم مروان بن عبد العزیز کے زمانے میں دیکھ آئے ہیں، بلکہ یہ ہر لحاظ سے باقاعدہ جاگیریں تھیں۔ صالح بن علی نے فسطاط کی مسجد میں بھی اضافہ کرایا۔ اسی عہد میں پہلی مرتبہ دیوان الجند کا بھی ذکر آتا ہے[۱۱۲]۔ غالباً یہ دیوان اُس نئی فوج کے سلسلے میں قائم کیا گیا تھا جو حفص بن ولید نے ترتیب دی تھی۔ صالح بن علی ۱۳۳ھ میں فلسطین کی حکومت پر منتقل کیا گیا، اور ۱۳۶ھ دوبارہ مصر بھیجا گیا۔

---

[۱۱۰] الکندی ص ۹۸ - ۱۰۰ + خطط ج ۱ ص ۳۰۴ + ابن تغری بردی ج ۱ ص ۳۰۶ +

[۱۱۱] کتاب الولاۃ والقضاۃ ص ۱۰۱ + خطط ج ۱ ص ۳۰۴ +

[۱۱۲] الکندی ص ۹۸ +

اس مرتبہ اُس نے مصر میں دو ہزار سپاہیوں کا اضافہ کیا، اور اہل مصر کے عطیات میں دس دس (دینار ؟) بڑھا دئے۔

خلیفہ ابو جعفر منصور کی طرف سے یزید بن حاتم المہلبی ذی القعدہ ۱۴۴ھ میں حاکم مقرر ہو کر مصر پہنچا، اور ۱۵۲ھ تک وہاں رہا۔ اس کے عہد کے دو واقعات قابل ذکر ہیں۔ اول تو مصر میں پہلی مرتبہ بنو علیؓ کی دعوت کا ظہور ہوا، اور بنو حسن میں سے علی بن محمدؒ بن عبداللہ بن حسن پہلے علوی تھے جو مصر میں داخل ہوئے[142]۔ مگر ذی الحجہ ۱۴۵ھ میں جب ابراہیم بن عبداللہ کا سر مصر میں گشت کرانے کے لئے بھیجا گیا تو یہ دعوت بالکل ختم ہو گئی۔ ۱۵۰ھ میں قبطیوں نے یزید بن حاتم کے خلاف خروج کیا۔ سخا، نابذوا، شبرا سنباط، بشرُود، اوسیہ اور بَجُوم میں یہ شورش پھیلی، اور جو فوج یزید نے ان کے خلاف بھیجی وہ ناکام رہی، اور قبطیوں کے لشکر کو آگ لگا کر فسطاط کو پسپا ہو گئی۔ ۱۵۶ھ میں موسیٰ بن عُلَیّ بن رباح کے زمانے میں بلہیت میں پھر قبطیوں نے نقض امن کیا۔ یہ شورش فرو کی گئی۔ مگر اس وقت عیسائیوں پر بڑی سختی گذری اور انھیں مردار کھانے پر مجبور ہونا پڑا، اور ان کے گرجا بھی منہدم ہوئے[143]۔

(۱۲)

اصل یہ ہے کہ اب تک مصر میں ایک بہت بڑی معاشری اور معاشی تبدیلی ہو چکی تھی۔ ابن الحبحاب کی کوششوں کا صریحاً نتیجہ یہ ہوا تھا کہ عرب باقاعدہ طور پر زراعت میں لگ گئے تھے، اور حکومت نے انھیں اس میں مدد دی تھی۔ گو ابتدائی عہد میں زراعت کرنا عربوں کے لئے قانوناً منع تھا، لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ اس طرف سے ہمیشہ غافل رہے تھے۔ بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ رفتہ رفتہ زمینوں پر قابض ہوتے جا رہے تھے، اور اس وقت تک باقاعدہ طور پر

---

۱۴۲ الکندی ص ۱۱۱-۱۱۵ +

۱۴۳ الکندی ص ۱۱۶، ۱۱۷ + خطط ج ۱- ص ۷۹ + ج ۲ ص ۴۹۳ +

زمینوں سے وابستہ ہو گئے تھے۔ جوں جوں عرب اراضی پر آباد ہوتے گئے اور جوں جوں اسلام اور عربی زبان پھیلتی گئی عرب عناصر کا زور ملک میں بڑھتا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ قبطیوں سے عربوں کا میل جول بھی بڑھا، اور آہستہ آہستہ دونوں قوموں کے مفاد، جو اب تک الگ الگ تھے، ایک ہوتے چلے گئے۔ دونوں میں اتحاد قائم ہوتا گیا اور امتیازات اٹھتے گئے۔ عربوں کے سیاسی اور معاشری تفوق کے خاتمے کا ایک بین ثبوت یہ ہے کہ عربوں نے ان محاصل کے خلاف احتجاج کیا جو خود انھیں کی حکومت نے عائد کئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب وہ حاکم اور مالک کی حیثیت نہیں رکھتے تھے، بلکہ عام آبادی کا ایک جزر بن گئے تھے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک عربی زبان نہیں پھیلی، اسلام کی اشاعت نہیں ہوئی، اور عربوں کی طرف سے مدد نہیں پہنچی، قبطیوں کو احتجاج کی ہمت نہیں ہوئی۔

عرب اب حکومت کے مددگار ہونے کے بجائے ایک مصیبت ثابت ہو رہے تھے۔ چنانچہ ۱۶۲ھ میں عربوں ہی کی وجہ سے ملک میں بدامنی کا اس حد تک دور دورہ ہوا، اور راستے اس قدر غیر محفوظ ہو گئے کہ ایک سخت گیر حاکم، یحییٰ بن داؤد الشہیر بابن ممدود ابو صالح، کو مصر بھیجا گیا۔ سخت گیری کے باوجود مورخ اس کی قابلیت کے ثنا خواں ہیں۔ اُس نے امن وامان قائم کیا، اور حکم دیا کہ رات کو کوئی شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے نہ سوئے، اگر چوری ہو گئی تو تمام مال کی واپسی کا وہ خود ذمہ دار ہے[۱۱۵]۔ لیکن ۱۶۷ھ میں پھر بدامنی کا دور دورہ ہوا، اور اس وقت بھی اس کی ذمہ داری عربوں پر تھی۔ موسے بن مُصّعَب حاکم تھا۔ اُس نے خراج وصول کرنے میں سختی برتی، فی فدان خراج دگنا کر دیا، اہل بازار اور بار برداری کے جانوروں پر بھی ایک درہم محصول لگا دیا، اور رشوتیں لینی شروع کیں۔ قیس اور یمانیہ (کلبی) نے بغاوت کی۔ ان مفسدوں نے اہل مصر کے ساتھ خط وکتابت کی اور سب موسے کے

---

۱۱۵ الکندی ص ۱۲۲ + ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۴۳۷ +

خلاف متحد ہو گئے۔ موسیٰ بذات خود یمانیہ اور قیسیہ سے لڑنے کے لئے نکلا لیکن عین وقت پر اہل مصر اُس سے الگ ہو گئے اور اُسے مفسدوں کے حوالے کر دیا۔ شوال ۱۶۸ھ میں اُسے قتل کیا گیا[۱۷۷]۔ یہاں عرب اور اہل مصر دونوں متحدہ محاذ پر لڑ رہے ہیں، اور دونوں کا مقصد نئے محاصل کے خلاف احتجاج ہے۔ پھر ایک بغاوت، جس کا سبب بھی خالص معاشی تھا ۱۷۸ھ میں شروع ہوئی، اور مامون کے زمانے تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔

اسحاق بن سلیمان عباسی امیر مصر نے ۱۷۸ھ میں مزارعین کے خراج میں اضافہ کیا۔ اس پر اہل حوف الشرقی نے بغاوت کی، اور اسحاق کے خلاف لشکر تیار کیا۔ اسحاق ان کے مقابلے میں ناکام رہا، اور بالآخر خلیفہ ہارون الرشید سے مدد مانگنے پر مجبور ہوا۔ خلیفہ نے ہرثمہ بن اعین کو مصر بھیجا، جس نے اہل حوف کو سمجھا بجھا کر مطیع کر لیا، اور انھوں نے خراج بھی ادا کر دیا[۱۷۸]۔ پھر ۱۸۶ھ میں لیث بن فضل کے خلاف اہل حوف نے بغاوت کی۔ وجہ یہ ہوئی کہ لیث نے اراضی کی نئی پیمائش کرائی تھی، اور پیمائش کرنے والوں نے قصبہ میں چند انگشت کی کمی کر دی تھی۔ اہل حوف نے شکایت کی اور جب شنوائی نہ ہوئی تو انھوں نے فسطاط پر چڑھائی کر دی۔ لیث مقابلے کے لئے نکلا۔ اس موقعے پر بھی مستقل فوج نے غداری کی۔ مگر اس کے باوجود وہ مفسدوں پر غالب آیا، اور اہل حوف ناکام اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ ۱۸۷ھ میں لیث بن فضل معزول ہوا، اور احمد بن اسماعیل امیر مصر مقرر کیا گیا[۱۷۹]۔ پھر ۱۹۱ھ میں ایک ایسی ہی بغاوت خراج کی ادائی کے متعلق حسین بن جمیل کے عہد ولایت میں نہ ہوئی۔ یہ بغاوت اتنی خطرناک تھی کہ اس کے اثرات شام تک پہنچے، اور بالآخر ہارون الرشید نے

---

۱۷۷ الکندی ص ۱۲۵، ۱۲۶ + المتوفی ص ۱۰۲ + خطط ج ۱ ص ۸۲ + ج ۲ ص ۳۹۴ + ابن تغری بردی ج ۱ ص ۴۴۷ +

۱۷۸ خطط ج ۱ ص ۸۰ + الکندی ص ۱۳۶ +

۱۷۹ الکندی ص ۱۴۳ + خطط ج ۱ ص ۸۰ +

اپنے ایک افسر یحییٰ بن معاذ کو مصر بھیجا، اور حسین بن جمیل کو معزول کر کے مالک بن دلہم کو مقرر کیا۔ یحییٰ بن معاذ نے بغاوت فرو کی، اور واپس جاتے وقت قیسہ اور یمانیہ کے دو رئیسوں کو قسطاط بلا کر دھوکے سے گرفتار کر لیا۔[۱۸۰] پھر ۲۱۴ھ میں ایک اور بغاوت صالح بن شیرزاد، عامل خراج، کے ظلم اور خراج میں اضافہ کرنے کی وجہ سے ہوئی۔ اسفل الارض میں نقض امن ہوا، اور باغیوں نے ایک فوج تیار کر لی۔ عیسیٰ بن یزید الجلودی حاکم مصر نے اپنے بیٹے محمد کو باغیوں کے خلاف بھیجا۔ مگر بلبیس کے مقام پر محمد نے ایسی شکست کھائی کہ صرف وہی میدان جنگ سے واپس پھرا، باقی تمام فوج کام آئی، یہ بغاوت جاری رہی، اور جو فوجیں باغیوں کے خلاف بھیجی گئیں سب کو شکست ہوئی، بالآخر ابو اسحاق بن رشید (معتصم) نے انھیں شکست دی، اور ان کے سر برآوردہ لوگوں کو گرفتار کر کے بغداد لے آیا۔[۱۸۱] اس موقع پر ابو اسحاق (معتصم) چار ہزار ترک فوج اپنے ساتھ لایا تھا، اور حوف الشرقی کے یمانیہ اور قیس کے اتنے آدمی اس نے قتل کئے تھے کہ وہ تقریباً فنا ہو گئے۔[۱۸۲]

۲۱۳ھ میں مامون نے مصر کو اپنے بھائی معتصم کے سپرد کر دیا تھا، اور اس سال سے معتصم ہی وہاں کا والی مقرر اور معزول کرتا تھا۔ صرف کیدر ایک والی تھا، جو مامون کی طرف سے مقرر ہوا تھا،[۱۸۳] اور ۲۱۴ھ میں جب معتصم مصر آیا ہے تو حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے آیا تھا۔ اس کے دو سال بعد ہی ۲۱۶ھ میں سب سے زیادہ خطرناک بغاوت ہوئی جس میں قبطیوں اور عربوں نے پھر متحدہ محاذ قائم کیا۔ معتصم کی طرف سے عیسیٰ بن منصور حاکم تھا، اور حوف الشرقی کی یہ

---

۱۸۰ الکندی ص ۱۸۳ + خطط ج ۱۔ ص ۸۰ +

۱۸۱ خطط ج ۱۔ ص ۸۱ + الکندی ص ۱۸۴-۱۸۸ + ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۶۲۵، ۶۲۶ +

۱۸۲ ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۶۲۶ +

۱۸۳ گروہان ص ۱۸۶ + لیکن المتونی (ص ۱۰۵) نے لکھا ہے کہ کیدر کو بھی معتصم ہی نے مقرر کیا تھا۔

بغاوت اس کے عمال کی سوء سیرت کا نتیجہ تھی۔ باغیوں نے عمال کو نکال دیا۔ حکومت اب بالکل مجبور تھی، اور ہر طرف فتنۂ فساد کا بازار گرم تھا۔ بالآخر مرکزی حکومت نے پھر دخل دیا۔ جمادی الآخر ۲۱۶ھ میں مشہور ترک سپہ سالار افشین فسطاط آیا، اور دریائے نیل کی طغیانی ختم ہوتے ہی بغاوت فرو کرنے میں مصروف ہوگیا۔ عیسیٰ بن منصور اور افشین نے فوج جمع کی۔ افشین کی کامیابیاں فوراً شروع ہوگئیں، اور اس نے شکست خوردہ باغیوں کا تعاقب کیا۔ اسکندریہ میں بھی بغاوت پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا بھی افشین نے انتظام کیا۔ ایک طرف افشین لڑ رہا تھا، اور دوسری طرف عیسیٰ بن منصور برسرپیکار تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ بغاوت فرو نہ ہوئی۔ بالآخر محرم ۲۱۷ھ میں خود مامون مصر آیا۔ عیسیٰ بن منصور اس وجہ سے معتوب ہوا کہ اس کے عمال شورش کا موجب ہوئے تھے، اور اس نے بروقت اس کا انسداد نہیں کیا تھا۔ خلیفہ نے مصر کے متعدد حصوں کا دورہ کیا۔ اس اثناء میں افشین نے قبطیوں کو شکست دے کر اس پر راضی کر لیا کہ وہ امیر المومنین کو اپنا حکم مقرر کریں۔ مامون نے فیصلہ صادر کیا کہ قبطی مرد قتل کئے جائیں، اور عورتیں اور بچے غلام بنائے جائیں۔ اس فیصلے پر عمل ہوا۔ اب امن قائم ہو چکا تھا۔ ۱۲ صفر ۲۱۷ھ کو مامون بغداد واپس چلا گیا۔[۱۸۴]

۲۱۸ھ میں مامون کی وفات پر معتصم خلیفہ ہوا۔ اس نے کیدر، حاکم مصر کو اپنی بیعت کی اطلاع دی اور ساتھ ہی حکم دیا کہ دیوان سے عربوں کے نام کاٹ دیئے جائیں اور ان کے عطیات بند کر دیئے جائیں۔ کیدر نے اس پر عمل کیا۔[۱۸۵] مگر خلیفہ کا یہ حکم بلا احتجاج نہ رہا۔ یحییٰ بن وزیر الجروی نے لخم اور جذام کو لے کر خروج کیا، اور کہا کہ یہ کام (بغاوت) ایسا ہے جس سے زیادہ حق بجانب کام پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ کیوں کہ اس نے ہمارا حق اور فَے ہم سے روک دیا

۱۸۴؎ الکندی ص ۱۹۰-۱۹۲ + خطط ج ۱۔ ص ۸۱ +

۱۸۵؎ الکندی ص ۱۹۳ + خطط ج ۱۔ ص ۹۴ +

سے صرف پانچ سو آدمی اس کے ساتھ ہوئے۔ بغاوت ناکام رہی، اور ۲۱۹ھ میں یحییٰ بن وزیر گرفتار ہوا، اور اُس کے ساتھی منتشر کر دیے گئے۔ اس کے بعد مقریزی[186] لکھتا ہے کہ

"انقرضت دولة العرب من مصر وصار
جندها العجم والموالی من عهد المعتصم
الی ان ولی ابو العباس احمد بن طولون مصر
فاستکثر من العبید ...."

مصر میں عربوں کی اصلی اہمیت قدرتی طور پر فوجی خدمت سے وابستہ تھی، اور جب یہ خدمت ان کے ہاتھ میں نہ رہی تو ظاہر ہے کہ وہ تمام سیاسی اقتدار بھی کھو بیٹھے اور عام مصریوں میں مل جل گئے۔

عربوں کی بغاوت فرو کرنے کے لئے معتصم ترکوں کی فوج اپنے ساتھ لایا تھا۔ بغاوت اُس وقت تک فرو نہ ہوئی جب تک ایک ترک سپہ سالار افشین مصر نہیں آیا۔ اب معتصم نے عربوں کے عطیات مسدود کرائے، اور اس سے بھی زیادہ دور رس تبدیلی یہ ہوئی کہ ۲۱۹ھ میں اُس نے ایک ترک امیر اُشناس کو ملک مصر جاگیر میں دے دیا، اور مصر میں منبروں سے اُس کے لئے دعا کی گئی[187]۔ یہ ایسی سرفرازی تھی کہ اس سے قبل کسی والیٔ مصر کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔ والی کا تقرر اور تعزل بھی اُسی کے سپرد کر دیا گیا۔ اس کی توثیق پھر ۲۲۷ھ میں واثق نے کی کہ جب اُس نے اُشناس کو "من بابه الی آخر عمل المغرب" کا والی مقرر کیا[188]۔ ۲۳۰ھ میں اشناس کا انتقال ہوا تو ایک اور ترک امیر ایتاخ مصر میں اس کا جانشین ہوا۔

---

۱۸۶ الکندی ص ۱۹۴ + خطط ج ۱۔ ص ۹۴ +

۱۸۷ الکندی ص ۱۹۴ +

۱۸۸ یعقوبی ج ۲۔ ص ۵۸۵ +

اب عربوں کا زوال مکمل ہو چکا تھا، اور مصر ترک امیروں کی جاگیر کی حیثیت رکھتا تھا پھر بھی سنہ ۲۴۲ھ تک عرب والی مقرر ہوتے رہے۔ آخری عرب حاکم مصر عنبسہ بن اسحاق الضبی تھا، اور وہی آخری حاکم تھا جس نے لوگوں کے ساتھ صلاۃ میں شرکت کی۔[۱۸۹]

اس وقت عرب قریوں میں آباد ہو کر عام آبادی کا ایک جز بن گئے تھے، اور ان میں اور قبطیوں میں شادی بیاہ کے تعلقات بھی قائم ہو چکے تھے۔ اسلام عام طور پر ملک میں پھیل گیا تھا۔ مقریزی[۱۹۰] لکھتا ہے کہ:۔

"(وکان من خبر اراضی مصر) بعد نزول
العرب بار یاخها و استیطانهم و اهالیهم
فیها و اتخاذهم الزرع معاشاً وکسباً
و انقیاد جمهور القبط الی اظهار الاسلام
و اختلاط انسابهم بانساب المسلمین
لنکاحهم المسلمات.........."

یہ اختلاط حسب و نسب اور تمدن و معاشرت آج تک جاری ہے۔

سنہ ۲۴۲ھ میں عربوں کے سیاسی اقتدار کا خاتمہ ہوا، اور اس کے بعد ترکوں کا دور شروع

---

۱۸۹ الکندی ص ۲۰۲۔ جس طرح عنبسہ آخری عرب والی تھا، اس طرح سنہ ۲۴۷ھ میں احمد (بن محمد) بن المدبر آخری عرب صاحب الخراج مقرر ہوا تھا۔ سنہ ۲۵۴ھ میں جب احمد بن طولون مصر کا والی مقرر ہوا ہے تو احمد بن المدبر وہاں موجود تھا۔ یہ شخص پرانے اور نئے حالات کے درمیان ایک حد فاصل ہے۔ تاریخ مصر کی تاریخ میں اسکی شخصیت اس قدر اہم ہے کہ ہم نے اس کے حالات ایک الگ مضمون میں تفصیل سے بیان کئے ہیں +

۱۹۰ خطط ج ۱۔ ص ۸۲۔

ہوا۔ عہد فاطمین میں ابتداً بربری قبیلۂ کتامہ کا زور رہا۔ مگر ان کی سرزوری سے خلیفہ العزیز مالیہ (۳۶۵ھ سے ۳۸۶ھ) کو مجبوراً توازن قوت قائم رکھنے کے لئے ترکوں کو مصر آنے کی دعوت دینی پڑی۔ اس کے بعد ترک مصر کی سیاسیات پر پھر غالب آئے۔ اگر اس مختصر سے زمانے کو نظر انداز کر دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ترک اب صدیوں سے ملک کے مالک اور حکمران ہیں۔ مگر عربوں نے اپنے جو آثار مصر میں چھوڑے، اور جو اب تک اپنا کام کر رہے ہیں، وہ اس قدر ظاہر و باہر ہیں کہ ان پر بحث کرنا تحصیل لاحاصل ہے۔

لٹریچر:-

ابن الاثیر، علی بن ابی الکرم محمد بن محمد ایشبانی المعروف بابن الاثیر: تاریخ الکامل۔ ج ۵، ۶۔ مصر ۱۳۰۱ھ۔

ابن تغری بردی، جمال الدین ابو المحاسن یوسف ابن تغری بردی: النجوم الزاہرہ فی ملوک المصر والقاہرہ۔ مصححہ ژون بال۔ لیدن ۱۸۵۵ء۔

ابن خرداذبہ: المسالک والممالک۔ لیدن ۱۸۸۹ء

ابن عبد الحکم، ابو القاسم عبد الرحمٰن بن عبد اللہ بن عبد الحکم بن اعین القرشی المصری: فتوح مصر واخبارہا۔ مصححہ ٹوری لیدن ۱۹۲۰ء۔

ابن العذاری المراکشی: البیان المغرب فی اخبار المغرب۔ جلد ۱۔ مصححہ رینحرٹ دُزی۔ لیدن ۱۸۴۸ء

ابن عساکر، ابو القاسم علی بن الحسن بن صبتہ اللہ بن عبد اللہ بن الحسن ابن عساکر الدمشقی: التاریخ الکبیر ج ۲ و ۳۔ دمشق ۱۳۲۹ھ و ۱۳۳۱ھ۔

ابن المماتی، ابو المکارم بن ابی سعید: کتاب قوانین الدواوین۔ مصر ۱۲۹۹ھ

ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم صاحب الامام ابی حنیفہ: کتاب الخراج۔ مصر ۱۳۴۶ھ

البلاذری، امام احمد بن یحییٰ بن جابر البغدادی الشہیر بالبلاذری: فتوح البلدان مصر ۱۳۱۹ھ۔

الجہشیاری، ابوعبداللہ محمد بن عبدوس الجہشیاری: کتاب الوزراء والکتاب۔ مصحح فون مزیک۔ لائپزگ ۱۹۲۶ء۔

حافظ ابی الفرج عبدالرحمٰن بن احمد بن رجب الحنبلی: الاستخراج الاحکام الخراج۔ مصر ۱۳۵۲ء

حسن ابراہیم حسن: تاریخ عمرو بن العاص۔ مصر ۱۹۲۲ء

الخوارزمی، ابوعبداللہ محمد بن احمد بن یوسف الکاتب الخوارزمی: مفاتیح العلوم۔ مصر ۱۳۴۹ء

السیوطی، جلال الدین السیوطی: حسن المحاضرہ فی اخبار مصر والقاہرہ۔ ۲۔ جلدیں مصر ۱۳۲۱ء

الشافعی، محمد بن ادریس الشافعی: کتاب الام۔ جلد ۴۔ بولاق ۱۳۲۲ء

القلقشندی، ابوالعباس احمد۔ صبح الاعشیٰ۔ ج ۳۔ قاہرہ ۱۳۳۳ء

الکندی، ابوعمر محمد بن یوسف الکندی المصری: کتاب والولاۃ والقضاۃ۔ مصحح رفن جست (اوقاف گب) بیروت ۱۹۰۸ء۔

المبرد، ابوالعباس محمد بن یزید المعروف بالمبرد۔ الکامل۔ مصر ۱۳۴۷ء

محمد کرد علی: خطط الشام۔ جلد ۵۔ دمشق ۱۳۴۶ء

المقریزی، تقی الدین احمد بن علی بن عبدالقادر بن محمد المعروف بالمقریزی: کتاب المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار۔ ۲ جلدین بولاق ۱۲۷۰ھ

———— البیان والاعراب عما بارض مصر من الاعراب۔ مصر ۱۳۵۶ھ

المنوفی، محمد بن عبدالمعطی بن ابی الفتح بن احمد بن عبدالغنی بن علی الاسحاقی المنوفی: کتاب اخبار الاول فیمن تصرف فی مصر من ارباب الاول۔ مصر ۱۳۱۰ء۔

Arnold, W. T., Roman System of Provincial Administration, Oxford, 1914.

Becker, Charles H., Beitrage Zur Geschichte Agyptens unter den Islam, Part II, Strassburg, 1903.

Butter, Alfred J., The Arab conquest of Egypt, Oxford, 1922.

Cambridge Medeaval History, Vol. I. Cambridge, 1911.

Grohmann, Adolf, Allgemein Einfuhrung in die arabichen Papyri, Wein, 1924

Lane-Poole, Stanely, History of Egypt in the middle Ages, London, 1914.

Milne, Egypt under the Roman Rule, Oxford, 1898..

Mommsen, Theodore, The Provinces of the Roman Empire, Vol. II. London, 1909

Reid, James S., Municipalities of the Roman Empire, Cambridge, 1913.

Wellhausen, Das Arabischen Reict and Stein sturse Berlin 1902. (English translation : The Arab Kingdom and its Fall, by Mrs. Weir, Calcutta, 1929).

Wustenfeld, F., Geschichte der Copten, Gottingen, 1845, Die Geographie and Verwaltung von Agypten, nach den Arabischen des Calcaschandi, Gottigen, 1879.

شہنشاہیت اور نسل

از

جناب عزیز احمد صاحب بی۔اے (آنرس) لندن، شعبۂ انگریزی جامعہ عثمانیہ۔

(۱)

ازمنۂ قدیم ہی سے ہم کو شہنشاہیت کی دو قسمیں ملتی ہیں۔ ایک تو وہ شہنشاہیت جس میں حاکم قوم اپنے آپ کو محکوم قوم سے اعلیٰ اور ممتاز رکھنے کی کوشش کرے۔ یہ امتیاز "نسل" یا "مذہب" یا زبان یا کسی اور ایسی ہی بنیاد پر مبنی ہوتا ہے۔ حاکم قوم اپنے افراد کو باور کراتی ہے کہ وہ محکوم قوم کے افراد سے نسلاً اعلیٰ ہیں، وہ منتخب ہیں اور خاصانِ خدا ہیں۔ اس وجہ سے ان کو محکوم اقوام سے نہ ملنا چاہیئے، ان کے ساتھ شادی بیاہ نہ کرنا چاہیئے اور اُن کو اپنے برابر نہ سمجھنا چاہیئے۔ اس کا معاشی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ محکوم قومیں حاکم قوم کی نظر میں خادم اور غلام بن جاتی ہیں۔ اس قسم کی شہنشاہیت کو ہم علحدگی پسند شہنشاہیت کہیں گے۔ اس کی اولین ترین مثال ہندوستان کی آریائی بولنے والی سلطنتوں میں ملتی ہے۔

دوسری قسم کی شہنشاہیت وہ ہے کہ حاکم قوم رفتہ رفتہ محکوم اقوام کو اپنے ساتھ حکومت میں شریک کرلیتی ہے، اگرچہ کہ ابتدا میں اس قسم کی شہنشاہیت کو بھی حاکم و محکوم کے امتیاز کے دور سے گزرنا پڑتا ہے؛ لیکن یہ شہنشاہیت ایسی ہوتی ہے کہ اس دور میں بھی محکوم اقوام سے مساوات برتتی ہے۔ اس شہنشاہیت کی بنیاد حاکم قوم کے تعصب اور علحدگی پسندی پر نہیں بلکہ محکوم اقوام کے اشتراکِ عمل اور تعاون پر ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ شہنشاہیت محکوم اقوام کو اپنے آپ میں جذب کرتی جاتی ہے۔ اگرچہ کہ شروع

شروع میں حاکم قوم اس طرح علاحدگی پسند شہنشاہیت کی طرح معاشی فائدہ نہیں اٹھاتی، لیکن اس کا دیرینہ اثر یہ ہوتا ہے کہ قوموں کے اشتراکِ عمل کی وجہ سے اس قسم کی شہنشاہیت بہت دیرپا ہوتی ہے۔ مساوات کے سلوک کے باعث، اور رواداری کی وجہ سے محکوم قوموں کو زیادہ شکایت نہیں ہوتی۔ اس قسم کی شہنشاہیت کو ہم جاذب شہنشاہیت کہیں گے۔

یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ ان دو قسم کی شہنشاہیتوں کے درمیان کوئی قطعی خطِ فاصل نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ایک ہی شہنشاہیت بعض قسم کے عناصر کے لئے جاذب ہو اور دوسرے قسم کے عناصر کے لئے علاحدگی پسند۔ مثلاً اسلامی شہنشاہیتوں میں سے اکثر ہر قوم، ہر نسل، اور ہر طرح کے مسلمانوں کے لئے جاذب رہیں لیکن غیر مسلموں کے لئے علاحدگی پسند۔ اسی طرح برطانوی شہنشاہیت جو دنیا کی غیر سفید نسلوں کے لئے علاحدگی پسند شہنشاہیت رہی ہے، سفید نسلوں اور زیادہ تر برطانوی نسلوں (کناڈا۔ آسٹریلیا وغیرہ) کے لئے جاذب شہنشاہیت رہی۔ اس لئے ضروری ہے کہ اگر ان دو قسموں میں دنیا کی شہنشاہیتوں کی تقسیم کی جائے تو عام رجحانات کا زیادہ تر خیال رکھا جائے اور اسی بنیاد پر تقسیم کی جائے۔

توریت اور دیگر صحائفِ آسمانی میں جس بخت نصر کا ذکر ہے وہ بابل کے عہدِ زرّین کا شہنشاہ تھا۔ اس کا خاندان اصل میں اشوری تھا۔ تِل گات پلے سر ثالث نے بابل کو فتح کیا۔ سارگون ثانی نے اہلِ بابل (کو جو مفتوح تھے) خوش کرنا اور وہاں کے باشندوں کو اپنی سلطنت کا جزو بنانا چاہا اور اس میں اسے کامیابی ہوئی۔ بخت نصر کے زمانے میں یہی مفتوح اہلِ بابل جو کلدانیوں کے ساتھ شریک تھے ہر طرح سے فاتح قوم کے برابر تھے اور ہر طرح انھوں نے بابل کے اس دوسرے ترقی کے دور (پہلا دور عکادیوں کا تھا) میں خود بھی بہت کچھ کیا۔ انھوں نے مصر کے فرعون کو دریائے فرات کے کنارے ۶۰۴ ق م

قبل مسیح میں اپنے اقبالمند شہنشاہ بخت نصر کی سرکردگی میں شکست فاش دی اور اُس کے بعد یہودیوں کو غداری کے جرم میں اسیر کرکے بابل لے آئے۔

بخت نصر کے بعد میڈوں اور ایرانیوں کے ہاتھوں اس سلطنت کی تباہی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ بابل کے مقتدر (پجاری) عناصر نے اس بات کو گوارا نہیں کیا کہ سلطنت کے تمام حصوں کے دیوتاؤں کے مندر بابل میں بنائے جائیں۔ بخت نصر کے جانشین نابونی ڈس نے یہ مندر اس لئے بنوائے تھے کہ دوسرے حصوں کی قوموں اور بابل کے درمیان رشتۂ اتحاد مضبوط ہو لیکن بابل کے خاص دیوتا "بل مردوک" کے پجاریوں کو یہ گوارا نہیں تھا۔ اور انھوں نے شمالی زبردست سلطنت کے ایرانی شہنشاہ کسریٰ کو تسخیر بابل کی دعوت دی۔ بابل کے بادشاہ اور پجاریوں کا یہ جھگڑا دراصل علٰحدگی پسند اور جاذب شہنشاہیت کے تصورات کا جھگڑا تھا۔

بابل کے شمال کی سلطنت یعنی میڈی ایرانی سلطنت بڑی زبردست تھی بخت نصر کی حکمت عملی کا دارومدار میڈیوں سے صلح، خوشگوار تعلقات اور تعاون پر تھا۔ میڈی سلطنت بابل کی سلطنت سے کہیں زیادہ وسیع اور کہیں زیادہ طاقتور تھی۔ اُس سے بھی بڑھ کے یہ کہ میڈی شہنشاہیت میں مختلف النوع قسم کی جنگجو قومیں بستی تھیں۔

انھیں جنگجو قوموں میں سے جنوبی ایرانی (فارسی) قوم کے سردار کسریٰ[1] نے میڈی شہنشاہ کو شکست دے کے ۵۵۰ء قبل مسیح میں ہخامنشی خاندان کی بنیاد ڈالی ۵۴۶ء میں اُس نے لیڈیا (مغربی ایشیائے کوچک) اور کئی یونانی جزیروں کو فتح کیا۔ ۵۳۹ء میں بابل کے پجاریوں کی دعوت پر اُس نے بابل کو فتح کیا اور بابل کی سلطنت کو فتح کرکے اپنی سلطنت کا ایک جزو بنالیا۔ فتح بابل کے بعد یہودیوں کو واپس فلسطین بھیجا

۱۔ Cyrus

اُس کے بیٹے کیمبی سس[1] نے شام، مصر اور شمالی سوڈان کو فتح کیا۔
خانہ جنگی کے ایک تھوڑے سے وقفے کے بعد ۵۲۱ء ق م میں یہ عظیم الشان سلطنت دارا کے قبضے میں آئی جس نے ہشتاسپ خاندان کی بنیاد ڈالی۔ دارائے اول کی سلطنت سے بڑی سلطنت دنیا نے اس وقت تک نہیں دیکھی تھی۔ دارائے اعظم کے کمزور جانشینوں کی سلطنت فتح کر کے سکندر نے جو سلطنت حاصل کی وہ بھی اس پرانی ایرانی سلطنت کے مقابل ہیچ تھی۔ ڈینوب کے دہانے سے لے کر دریائے سندھ تک اور ماوراالنہر سے سوڈان تک تمام ممالک اس کے مطیع تھے۔ عرب، ماوراالنہر، مغربی پنجاب اور جنوب مشرقی بلقان کے ممالک اس کے باج گزار تھے۔
یہ سلطنت قائم اس لئے رہ سکی کہ ذرائع حمل و نقل میں ترقی ہو گئی تھی۔ گھوڑے کو سواری کے لئے عام طور پر استعمال کیا جاتا تھا، سڑکیں تعمیر کی گئیں تھیں اور گھوڑے کی سواریاں دُور دُور تک سفر کر سکتی تھیں۔
لیکن محض ذرائع آمد و رفت اتنے پرانے زمانے میں اتنی بڑی سلطنت کو برقرار رکھنے کے لئے کافی نہیں تھے۔ دارائے اعظم نے اپنے پیشرو کسریٰ کی طرح محسوس کیا کہ محکوم اقوام کے ساتھ رواداری اور عزت کا سلوک کر کے اُن کو دوست بنانا چاہیئے۔ اس حکمت عملی کے تحت اُس نے غالباً دُنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اتنے بڑے پیمانے پر جاذب شہنشاہیت کے اصول پر عمل کیا۔ محکوم اقوام کو سلطنت میں جذب کرنے کی اُس نے دو تدبیریں سوچیں۔ ایک تو یہ کہ ایرانی مذہب کی بلا جبر و اکراہ تبلیغ کی جائے لیکن اُس سے بڑھ کر یہ کہ محکوم اقوام سے انتہائی رواداری کا سلوک کیا جائے[2]۔ اس کی سلطنت میں

---

[1] Cambyses

[2] Hermann Schneider; History of World Civilization.

ہر رنگ اور ہر نسل کے لوگ بستے تھے، گورے اور زرد رنگ کے، سیاہ فام اور سانولے (آج بھی دنیا کے ان ہی حصوں میں ان چاروں رنگ کے لوگ آباد ہیں) یہ لوگ ہزارہا مختلف زبانیں بولتے ہوں گے اور ہزارہا مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہوں گے۔ دارائے اول نے رواداری کو اپنا سب سے بڑا اصول بنایا اور اس مختلف النوع آبادی کو اپنی سلطنت میں جذب کر کے اس کا جزوِ لاینفک بنانا چاہا تاکہ سلطنت کی بنیاد محض حاکم قوم کی تلوار کے زور پر نہ رہے بلکہ حاکم اور محکوم دونوں اقوام کے معاشی مفاد پر سلطنت کی بنیاد ہو اور وہ پائدار ثابت ہو۔

کسریٰ اور دارائے اول نے جس طرح کی جاذب شہنشاہیت کی بنیاد ڈالی اس سے دوسری سلطنتوں نے بہت کچھ سیکھا۔ ہخامنشیوں اور دارا کی اختلاطِ نسل اور جاذب طرزِ حکومت کی حکمتِ عملی پر سکندر نے عمل کیا۔ سکندر کے اصول سے رومتہ الکبریٰ کی شہنشاہیت نے بہت کچھ سیکھا اور رومتہ الکبریٰ سے مسلمان سلطنتوں نے ایک طرف اور دوسری طرف مغربی بحیرۂ روم کے ممالک فرانس، اطالیہ اور اسپین نے دارائے اعظم کے اس طرزِ سلطنت کا ایک دوسرا سلسلہ ساسانیوں سے ہوتا ہوا مشرقِ وسطیٰ کی مسلمان سلطنتوں تک پہنچتا ہے۔

(۲)

سکندر، ارسطو کا شاگرد تھا، لیکن ارسطو کے استاد افلاطون کے فلسفے کو بھی وہ بالکل نہیں بھولا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ایرانی طرزِ حکومت اُسے پسند آیا۔ اور دارائے اول کی طرح اُس نے اپنی سلطنت کی بنیاد بھی حاکم اور محکوم اقوام کے اختلاط اور باہمی میل جول پر رکھی۔

ارسطو نے اُسے نصیحت کی تھی کہ ایشیا کی اقوام کمتر درجے کی ہیں اُن کو اپنے برابر نہ سمجھنا۔ سکندر نے اس نصیحت پر عمل کرنا تو ایک طرف اس کے برعکس ان کے ساتھ برابری کا سلوک کیا۔[۱] اُس نے ہر مفتوح قوم کو پوری مذہبی آزادی دی۔ خود ایک ایرانی

۱۔ H. A. L. Fisher: A History of Europe.

شہزادی سے شادی کی اور اپنی فوج کے سرداروں کی شادیاں ایرانی امرا کی لڑکیوں سے کرائیں۔ جس طرح دارائے اول نے اپنی سلطنت کو کئی صوبوں (ساٹرپوں) پر تقسیم کیا تھا اُسی بنیاد پر سکندر نے اُس سلطنت کی بھی تقسیم کی جو اُس نے دارائے ثالث سے چھینی تھی۔ ایران کے بڑے بڑے اُمراء اور زمینداروں کی صفات کی اُس نے قدر کی۔ باوجود اس کے کہ وہ پکا یونانی تھا (ہومر کی "ایلیڈ" ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی تھی) اُس نے مشرقی ٹھاٹ باٹ سے حکومت کرنی شروع کی۔ ادھر مشرق کو یونانی علوم وفنون سے روشناس کرایا، یونانی نمونے کے شہر بسائے، اُدھر محض اس کی وجہ سے یونان مشرق کے تمدن سے آگاہ ہو سکا اور مشرق ومغرب میں ربط وضبط کا سلسلہ شروع ہُوا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی قائم کی ہوئی حکومت (یعنی یونانی اور مقدونی گھرانوں کی حکومت) ایشیا میں صدیوں تک باقی رہی اور نپولین کی سلطنت اُس کی زندگی ہی میں ختم ہوگئی۔ ایرانی شاعر اور مورخین سکندر کو اپنا ہیرو مانتے ہیں نظامی گنجوی نے سکندر نامہ لکھا۔ بہت سے مورخین نے عام روایات (جو غلطی پر مبنی تھیں) پر بھروسہ کرکے اُسے ایرانی النسل قرار دیا۔ جو سلطنت اُس نے باقی چھوڑی وہ اگرچہ کہ اس کے بعد ہی کئی حصوں میں بٹ گئی مگر محض اس کی حکمت عملی کی وجہ سے اِن حصّوں میں یونانیوں کا راج رہا، یونانی تمدّن پرورش پاتا رہا اور یہی یونانی تمدّن اور علم پہلے اہلِ روما اور پھر عربوں کے لئے شمع ہدایت بنا۔

ایچ۔ اے۔ ایل۔ فشر نے صحیح لکھا ہے کہ "اس کی سلطنت کی بنیاد بنی نوعِ انسان کی مساوات کے نظرئیے پر تھی۔ اُس نے ایک ایسی سوسائٹی پیدا کرنے کی کوشش کی جو ایک عام معیار پر مبنی تھی۔ اور ایک ایسے بادشاہ کی مطیع تھی، جسے خلق خدا اپنا اتنا بڑا محسن سمجھ کے خدائی کا سا رتبہ دینے کو تیار تھی۔"

H. A. L. Fisher: A History of Europe. ؎



دارائے اعظم (اول) کی سلطنت

اور باج گذار ریاستیں (تقریباً سنہ ۵۲۱ قبل مسیح)

(اس وقت تک دنیا میں اس سے بڑی کوئی اور سلطنت نہیں ہوئی تھی
اور اس کے بعد سکندر اعظم کی سلطنت بھی رقبے میں اتنی بڑی نہیں
تھی۔ کئی رنگ، کئی نسلوں کئی قوموں کے لوگ اس سلطنت
میں آباد تھے۔)

سکندرِ اعظم کی سلطنت

۳۲۳ قبل مسیح

(سکندر نے دارا ے ثالث کی سلطنت فتح کر کے یہ سلطنت اُسکے نقوشِ قدم پر قائم کی)

مقدونیہ
لیڈیا
فرجیا
آرمینیا
شام
عراق
میڈیا
ایریا
فارس
جدرویہ
مصر
ہندوستان
سندھ



رومۃ الکبریٰ کی سلطنت کا انتہائی عروج
ٹراجن کا دور (سنہ ۱۱۷ قبل مسیح)

یہاں ہم اس امر کا بھی ذکر کئے دیتے ہیں کہ یونان میں نسلی اختلاط ہمیشہ ہوتا رہا۔ پروفیسر شنایڈر[1] نے یونانی نسلی اختلاط کے دو بڑے دور معتین کئے ہیں۔ پہلا دور تقریباً سنہ ۳۱۰۰ ق۔م سے شروع ہوا۔ اسی نسلی اختلاط کے دور میں جو صدیوں تک جاری رہا' جس میں مختلف نسلوں میں شادی بیاہ یا اغوا (ایلیڈ کا قصہ خود اس کی شہادت ہے) کا سلسلہ بڑے پیمانے پر جاری رہا۔ ہومر وغیرہ اسی دور کی یادگار ہیں۔ یہ نسلی اختلاط زیادہ تر ایشیائے کوچک میں ہوا ہوگا۔ یونان میں نسلی اختلاط کا دوسرا دور سنہ ۱۱۰۰ء قبل مسیح سے شروع ہوا ہوگا۔ اس دور میں نسلیں یونانی جزیروں اور جزیرہ نمائے یونان میں آپس میں ملی جلی ہوں گی۔

کئی لحاظ سے رومتہ الکبریٰ' یونان کا جانشین بنا۔ سکندر کی سلطنت بعض ایسے خطوں پر تھی جن میں سے ایک کا تمدن دوسرے سے بالکل مختلف تھا۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان اور مقدونیہ' باختر اور مصر کے تمدنوں میں بڑا فرق ہوگا۔ اگرچہ کہ رومتہ الکبریٰ کی حکومت بھی بہت سے مختلف النوع ملکوں پر تھی مگر وہ آپس میں ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف بھی نہیں تھے۔ بحیرۂ روم جس کے اطراف یہ سلطنت تھی رومتہ الکبریٰ سے پہلے بھی بحری تجارت کا مرکز تھا۔ فونیقی تاجروں اور ملاحوں کے بعد قرطاجنہ کی تجارتی بندرگاہیں بحیرۂ روم بھر میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اہل قرطاجنہ بحیرۂ روم سے بھی باہر نکل کر اٹلانٹک کے یورپی اور افریقی ساحل میں دور دور تک تجارت کرتے تھے۔ یونانی بھی اپنے عروج کے دور میں بحیرۂ روم کے کنارے دور دور تک پھیل گئے تھے۔ الغرض بحیرۂ روم میں پہلے ہی سے تجارت' اور اس کے سواحل پر بسنے والی قوم کے افراد میں آپس میں ربط و ضبط کا سلسلہ کافی فروغ پا چکا تھا۔

روما کی سلطنت پہلے پہل قرطاجنہ کے نقوشِ قدم پر پھیلی' اس کے بعد کچھ عرصے تک یونان کے نقشِ قدم پر (عراق فتح بھی ہوا اور رومیوں کے ہاتھ سے نکل بھی گیا)۔ مغربی

---

[1] Hermann Schneider; History of World Civilization. (Vol II).

اور جنوب مشرقی یورپ کو فتح کر کے روم نے پہلی مرتبہ ان کو بھی بحیرۂ روم (میڈی ٹرے نین) کے دائرے میں گھسیٹا۔

مسٹر ایچ۔جی۔ ویلس کا خیال سراسر غلط ہے کہ رومتہ الکبریٰ میں پہلی مرتبہ "آریائی" طرز پر حکومت کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ تاریخ نگاری سیکسن طرز کے ابتدائی غلط نظریوں کے اثرات کی گواہی دیتی ہے جن سے مسٹر ویلس جیسا بے تعصب مورخ بھی نہ بچ سکا۔ رومتہ الکبریٰ کی سلطنت میں اگر انگلستان اور وادیٔ راہین کے بہت سفید نما باشندے شامل تھے، تو دوسری طرف شمالی افریقہ کے ساحل کے باشندے بھی شامل تھے، اُن کا رنگ آج گورا ہے لیکن یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اس وقت بھی گورا ہوگا (اس وقت تک رومی، گاتھ، اور عرب اقوام سے نسلی اختلاط نہیں ہوا تھا، جو رومتہ الکبریٰ کی فتوحات کے بعد ہُوا)۔ اس کے علاوہ شام اور ایشیائے کوچک میں سانولے رنگ کی "سامی" اقوام بستی ہوں گی۔ ہنگری اور ٹرانسلوینیا کا وہ علاقہ جو اُس زمانے میں ڈاسیا کہلاتا تھا، ممکن ہے کہ زردی مائل رنگ کے لوگوں سے بھرا ہو۔

شروع شروع میں تو روما کی حکومت ضرور "علاحدگی پسند" شہنشاہیت کی حامی رہی۔ لیکن بہت جلد پہلے اطالیہ کے عام باشندوں اور پھر سلطنت کے دوسرے باشندوں کو حقوقِ شہریت (یا حقوقِ مساوات) دے دئیے گئے۔ اس طرح رومتہ الکبریٰ کی جاذب شہنشاہیت نے اِن تمام مفتوحہ ممالک کو حقیقی معنوں میں اپنے صوبے بنا لیا۔ ان صوبوں کے باشندوں کا تمدن روما کا تھا۔ اِن صوبوں نے ایسے افراد پیدا کئے جو روما کے نامور ترین شعرا، فلسفی اور بسا اوقات شہنشاہ بنے۔

اکثر لوگوں کے ذہن میں روما کی یہ تصویر ہے کہ سلطنت بھر میں روما کے دستے بھرے

لے H. G. Wells: A Short History of the world.

پٹے تھے' اور تلوار کی دو رسے سلطنت بھر میں امن قائم رکھتے تھے۔ روما کی بحری تجارت کی کشتیاں اور فوجی کشتیاں کھینے کو غلاموں کے ہزاروں گروہ تھے جن سے جانوروں سے بدتر سلوک کیا جاتا تھا۔ یہ تصویر جو شائد بعض جابر رومی شہنشاہوں کے زمانۂ حکومت کا مرقع ہے مجموعی طور پر بالکل غلط ہے۔ رومی فوج کے پڑاؤ زیادہ تر سرحد کی چوکیوں پر ہوتے تھے اور اس کا امکان تھا کہ اس زمانے میں کوئی شخص مارسئی سے لیکر بولون تک فرانس کے پورے طول کا سفر کرتا اور کسی رومی سپاہی کے خود کی جھلک تک نظر نہ آتی۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ روما کی اس عالیشان سلطنت کی بنیاد محض رضا اور رغبت اور آپس کی خوش اعتقادی اور خوش مزاجی پر ہے۔[1]

گبن کی تاریخ انحطاط و زوال روما چونکہ ڈیڑھ صدی قبل لکھی گئی۔ اس لئے بجائے اس کے کہ ہم رومتہ الکبریٰ کی سلطنت کے آئین مساوات اور نسلی اختلاط کی وہ تصویر پیش کریں۔ جو گبن نے کھینچی ہے' ہم انگلستان کے ایک جدید اور انتہائی مشہور مورخ مسٹر مسٹر ایچ۔ اے۔ ایل۔ فشر کی کھینچی ہوئی تصویر کے کچھ حصے پیش کرتے ہیں۔

"سلطنت[2] کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک باہمی خوشگوار تعلقات کا ایک ایسا سلسلہ قائم تھا جس میں عہد حاضر کے تعصبات مذہب و نسل' قومیت و زبان و رنگ کی تلخی بالکل نہیں تھی۔ رومتہ الکبریٰ کی خدمت کرنے کو شامی اور ہسپانوی' افریقی اور برطانوی سب بلا کسی مشکل کے اکٹھا ہوتے' اور اُن میں سے کسی کو اس طرح ممتاز نہیں سمجھا جاتا تھا کہ

---

1. H. A. L. Fisher: A History of Europe.

2. H. A. L. Fisher:- A History of Europe.

دوسروں کو ناگوار ہو سلطنت کے باشندے باعتبار نسل اہل روما سے
اتنے قریب تھے، اور اتنی آسانی سے انھوں نے روما کا تمدن
سیکھ لیا تھا کہ وہ کسی طرح بھی کمتر درجے کے نہیں سمجھے جاتے
تھے۔ شہروں کو حکومت خود اختیاری حاصل تھی اور وہ اپنے
کاروبار کے مختار تھے۔ مذہب کی کوئی سختی یا ممانعت نہ تھی اور
روما کے بڑے مندر میں ہر ملک کے دیوتا کے لئے جگہ موجود تھی۔
روما کا قانون اتنا ہمہ گیر اور جامع بنتا جاتا تھا کہ مختلف اقوام
کے رسوم و آئین کی اجازت تھی۔ دیسی زبانیں مثلاً قرطاجنی،
لیکونین اور کیلٹی بھی برابر رائج تھیں اور لاطینی کی حیثیت
ایک عام زبان کی تھی۔"

یہ تصویر تو رومتہ الکبریٰ کے انتہائی تمدن و شوکت یعنے انتونین[۱] کے دور کی تھی لیکن نسلی اختلاط کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح ہمیشہ اِس سلطنت میں جاری رہا۔ جب روما کی آبادی میں انحطاط ہونے لگا تو شمالی جرمانی اور غیر جرمانی وحشی قبائل کو فوج میں بھرتی کیا گیا اور یہ سلسلہ سلطنتِ روما کے کامل انحطاط تک جاری رہا۔ یہ باہر کے سپاہی امن کے زمانے میں شہریوں کی طرح اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔

روما کی جاذب اور مخلوط شہنشاہیت کی تعریف فشر ہی کی زبانی سنئے:۔

"اکثر[۲] یہ ہوتا کہ فوج اور سلطنت کی بڑی بڑی خدمات
ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہوتیں جن میں اطالوی خون کا ایک قطرہ بھی

۱۔ H. A. L. Fisher: A History of Europe.

۲۔ H. A. L. Fisher:- A History of Europe.

نہ تھا۔ (شہنشاہ) مارکس آرسے لی اس کے دو بڑے سپہ سالار
شام کے باشندے تھے۔ تیسری صدی میں ایک شہنشاہ شامی تھا
تو دوسرا عرب، اور تیسرا افریقی جو قرطاجنی زبان بولتا تھا۔ یہ
افریقی شہنشاہ سپ ٹی مس سے وے رس تھا جس کو فوجی دستوں
نے ۱۹۵ء میں تخت نشین کرایا۔ ۲۱۲ء میں وہ بمقام یارک
فوت ہوا۔ انگریزوں کو اس کا نام یاد رکھنا چاہئے کیونکہ سالوے
اور ٹائین کے درمیان اس نے دیوار ہیڈرین کی مرمت کرا کے
انگلستان کے لئے ایک صدی تک امن کا سامان مہیا کیا۔"
"تیسری صدی عیسوی دو بڑے رومی مقننوں ال پین[1]
اور پاپی نین کی وجہ سے یادگار رہے گی۔ یہ دونوں ایشیا کے
رہنے والے تھے۔"

اسی طرح تیسری صدی کا سب سے نامی فلسفی پلاٹی نس اگرچہ کہ یونانی تمدن اور علم کی پیداوار تھا لیکن اس کا وطن اسکندریہ (مصر) تھا۔

نہ صرف روم کی شہنشاہیت بلکہ روم کے تمدن کا دارومدار باہمی اختلاط اور ربط وضبط پر تھا اسی لئے روما کے شہنشاہوں نے یکے بعد دیگرے تقریباً تمام مفتوح ممالک کو مساوی حقوق شہریت عطا کئے۔ کلاڈیس نے یہ حقوق شہریت گال (موجودہ فرانس) کو عطا کئے، ویس پاسی اِن نے اسپین کو، ہیڈرین نے پے نونیا کو۔ یہاں تک کہ ۲۱۲ء میں کاراکالا نے پوری سلطنت روما کے تمام آزاد باشندوں کو برابر کے شہری حقوق عطا کئے اور تمام رعایا کا ایک درجہ ہو گیا۔

---

[1] H. A. L. Fisher:- A History of Europe.

غلامی کا اس سلطنتِ روما میں رواج تھا۔ غلام قدیم تمدن اور قرونِ وسطیٰ کے ایشیائی اور یورپی تمدن کا جزو تھے۔ یونانی جمہوریتوں اور مساوات پسند اسلامی سلطنتوں میں بھی غلام موجود تھے لیکن رومتہ الکبریٰ کی سلطنت میں غلاموں کا نظامِ سیاسی سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ اُن کو "شُدر" طبقہ بنایا گیا، ہر غلام اپنے آقا کی خانگی ملکیت تھا۔ اور غلام کسی بھی نسل یا کسی بھی رنگ کا ہوسکتا تھا۔ کوئی خاص قوم غلاموں کی قوم نہ تھی۔ ایک زمانے میں نوجوانوں کی اور لڑکوں کی تعلیم تک غلاموں کے سپرد تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رومتہ الکبریٰ کی سلطنت میں غلاموں سے ہمیشہ بُرا سلوک نہیں کیا جاتا تھا اور بہت سے غلام پڑھے لکھے اور عالم و فاضل ہوتے تھے۔ زیادہ تر جنگ کے قیدیوں کو غلام بنایا جاتا تھا، تمدن اور انسانیت کا زیادہ اثر تھا اس وجہ سے غلاموں کو انسان سمجھا جاتا تھا اور بہت سے غلام جلد ترقی کر کے آزاد و متمول شہریوں کا درجہ حاصل کر لیتے۔[1]

بہر حال اس عظیم الشان سلطنت کی بنیاد جاذب شہنشاہیت اور حاکم و محکوم قوموں کے باہمی ربط و ضبط اور تعاون پر تھی۔ یہ تعاون اتنا مکمل تھا کہ جلد حاکم و محکوم کا فرق مٹ گیا، اور کاراکالا نے ۲۱۲ئہ میں سرکاری طور پر اس کا اعلان کیا اور سب کو مساوات کا درجہ دیا۔ یہ سلطنت جو اپنی انتہائی وسعت کے زمانے میں خلیج فارس سے لیکر آبنائے آرستان تک اور یوکرین اور آرمینیا سے لیکر مراکو تک پھیلی ہوئی تھی، یہ سلطنت جس کے بیچ میں بحیرۂ روم ایک جھیل بن کر رہ گیا تھا، باہمی اخوت، باہمی اتحاد اور باہمی اختلاط پر قائم تھی اور اسی وجہ سے یہ اتنے دنوں تک قائم رہی بعد میں دو حصّے ہو گئے۔ لیکن اس کی روایات دونوں میں باقی رہیں۔ یہاں تک کہ یونانی وحشیوں نے مغرب کی سلطنتِ روما کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد انھیں وحشیوں نے مقدس سلطنتِ روما کی بنیاد ڈالی جس میں قدیم

ل Hermann Schneider: The History of World Civilization (Vol II).

رومی اتحاد بین الملل کے ساتھ عیسائی اُخوتِ انسانی کی روح عمل بھی شریک تھی۔ یہ ضرور ہوا کہ اس مقدس سلطنتِ روما (جو بقول والٹیر نہ مقدس تھی، نہ سلطنت تھی اور نہ رُومی) کے شہنشاہ بہت جلد راہِ مستقیم اور شارلیمین کی حکمتِ عملی کے راستے سے بھٹک گئے۔ رومتہ الکبریٰ کی سلطنت کی مشرقی یعنی بازنطینی شاخ نے پہلے عربوں اور پھر ترکوں کو اتحاد اور اختلاط بین الملل کا سبق دیا۔

یورپ کے جنوب مغربی ممالک یعنی فرانس، اطالیہ، ہسپانیہ، اور پرتگال، لاطینی ممالک کہلاتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ ان کی آج کل کی شہنشاہیت معاشی اور سرمایہ دارانہ ہے آج بھی رومتہ الکبریٰ کے تمدن اور روایات اور اثرات کے بدولت ان کی شہنشاہیت جاذب ہے اور ان کی نو آبادیات میں حاکم اور محکوم اقوام کے افراد کے درمیان زیادہ امتیاز نہیں۔

صرف یورپ کے لاطینی ممالک ہی نے رومتہ الکبریٰ کی روایات کو برقرار نہیں رکھا بلکہ عربوں اور مسلمان سلطنتوں نے جاذب شہنشاہیت کے اصول سیکھنے میں اگر ایک طرف ساسانیوں کی شاگردی کی تو دوسری طرف رومتہ الکبریٰ کی۔

(۴)

ساتویں صدی عیسوی میں ایک نئی طاقت نمودار ہوئی جس نے یورپ اور ایشیا کو ہلا دیا۔ اور سترھویں صدی عیسوی تک اس کا راج رہا۔ اسلام محض ایک مذہب نہیں تھا بلکہ سیاسیات، سلطنت، معاشی اور معاشری اُمور کا ایک نیا تصور بھی تھا۔

اسلام عرب میں پیدا ہوا۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب میں کس قدر فرقہ بندی تھی۔ ہر قبیلے کا بت جُدا تھا۔ اسی طرح ہر قبیلے کی یہ ذہنیت تھی کہ وہ دوسروں سے ممتاز ہے۔ دوسرے قبیلے والوں سے شادی بیاہ حتی الامکان نہیں ہوتا تھا۔ خونریزیوں اور باہمی عناد کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوتی کہ کسی قبیلے کا کوئی منچلا نوجوان کسی اور قبیلے کی لڑکی کو اُڑا لے جاتا۔ اس پر آپس کی دشمنی اور خونریزی کا سلسلہ پشتوں تک جاری رہتا جس گھرانے میں

پیغمبر اسلام پیدا ہوئے وہ خود اپنے نسلی امتیاز پر خاص ناز کرتا تھا، اور اپنا سلسلۂ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاتا تھا۔ اس لئے جب عرب طوفان کی طرح دنیا میں پھیلے تو کون کہہ سکتا تھا کہ جس شہنشاہیت کی بنیاد وہ ڈالیں گے اُس کا اساسی نظام اخوت اور رواداری، اختلاط اور ربط وضبط پر ہوگا۔

لیکن مذہب اسلام کی تعلیم کا بڑا جزو اخوت اور رواداری اور مروت تھی۔ عیسائیت نے اس سے پہلے بنی نوع انسان کی عالمگیر مساوات اور اخوت کی تعلیم دی تھی۔ یہ تعلیم آج تک اس لئے کامیاب نہیں ہوئی کہ یہ عالمگیر تھی۔ اسلام نے اِس احساس کے ساتھ کہ اگر بلا کسی لحاظ کے عام طور سے تمام انسانوں کے لئے اخوت سکھائی جائے گی تو کوئی اثر نہ ہوگا، پہلے یہ سکھایا کہ تمام بنی نوع انسان کے ساتھ مساوات کا سلوک کیا جائے۔ مساوات کے بعد اس قلبی تعلق کا سوال پیدا ہوتا ہے جس پر اخوت کی بنیاد ہے۔ اُس کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ پہلے دوسروں کو مسلمان کرو پھر اُن سے بھائیوں کا سا سلوک کرے اور بھائی سمجھو۔ وہ کسی نسل کے ہوں، کسی رنگ کے ہوں، کوئی زبان بولتے ہوں لیکن اگر مسلمان ہیں تو تمہارے بھائی ہیں۔ یہ تعلیم اُس ملک میں دی گئی جہاں نسل یا قوم تو ایک طرف ہر قبیلہ "علاحدگی پسندی" کی ایک چھوٹی سی مثال تھا، جہاں کے لوگ اپنی زبان کے گھمنڈ میں غیر عرب لوگوں کو عجمی (گونگا) کہتے تھے۔ جہاں "عرب" اور "شریف" تقریباً ہم معنی تھے۔

تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اسلامی جاذب شہنشاہیت پر دو بہت بڑے اثرات پڑے۔ پہلا اثر تو ایران کی ساسانی سلطنت کا تھا۔ عرب ایک طرح سے ساسانی حلقۂ اثر میں سمجھا جاتا تھا۔ بہت سے اسلامی مورخین نے اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ حضرت رسول مقبول صلعم، نوشیروان عادل کے زمانے میں پیدا ہوئے! جغرافیائی لحاظ سے عرب کے شمال میں، اور مشرق میں خلیج فارس کے اُس پار ساسانی سلطنت تھی۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں عربوں نے اپنی فتوحات کے زمانے میں ایرانیوں سے بہت کچھ سیکھا اور

اپنے طرز حکومت کی بنیاد ساسانی اصول پر رکھی۔

دوسرا اثر بازنطینی (مشرقی رومی) سلطنت کا تھا۔ بازنطینی شہنشاہ رومتہ الکبریٰ کے مشرقی جانشین تھے گاتھ اور جرمانی وحشیوں نے مغربی رومی سلطنت کو نیست ونابود کردیا۔ لیکن مشرقی رومی سلطنت باقی رہی اور اسی نے رومتہ الکبریٰ کی روایات کو زندہ رکھا۔ ان روایات کے سوا شام اور فلسطین اور مصر میں یونان اور روما کا ادب اور علم بھی محفوظ تھا جس سے عربوں نے آئین سلطنت بھی سیکھے تھے۔

اس طرح اسلامی جاذب شہنشاہیت کا سلسلہ ایک طرف تو ساسانیوں سے ہوتا ہوا دارائے اعظم کی جاذب شہنشاہیت سے، اور پھر سلسلہ بہ سلسلہ سکندر اعظم کی جاذب شہنشاہیت کے تصور سے ملتا ہے جو خود دارائے اعظم کی سلطنت کے نقوش قدم پر قائم تھی۔ اسلام کی جاذب شہنشاہیت کی اس تاریخی نشو ونما کی روح عمل اسلام کی تعلیم تھی جس میں مساوات اور اخوت، اختلاط اور رواداری کی انتہا درجے تعلیم دی گئی تھی۔

اسلامی سلطنت کے پھیلنے سے پہلے پیغمبر اسلامؐ کے زمانے میں ہی اسلامی مساوات اور اخوت کی روح عمل اچھی طرح سرایت کرچکی تھی۔ مثلاً صحابۂ نبوی میں حضرت بلالؓ حبشی کو بھی وہی حیثیت تھی جو انتہائی صحیح النسب قریشی کی تھی۔ علامہ شبلی مرحوم نے اس کی تصویر ایک نظم میں خوب کھینچی ہے:۔

بارگاہ نبویؐ کے جو موذن تھے بلالؓ — کرچکے تھے جو غلامی میں کئی سال بسر
جب یہ چاہا کہ کریں عقد مدینے میں کہیں — جا کے انصار و مہاجر سے کہا یہ کھل کر
میں غلام حبشی اور حبشی زادہ بھی ہوں — یہ بھی سن لو کہ مرے پاس نہیں دولت و زر
ان فضائل پہ مجھے خواہش تزویج بھی ہے — ہے کوئی جس کو نہ ہو میری قرابت سے عذر؟
گردنیں جھک کے یہ کہتی تھیں کہ "دل سے منظور" — جس طرف اس حبشی زادے کی اٹھتی تھی نظر
عہد فاروق میں جس دن کے ہوئی ان کی وفات — یہ کہا حضرت فاروق نے با دیدۂ تر

اُٹھ گیا آج نقیب حشم پیغمبر اُٹھ گیا آج زمانے سے ہمارا آقا

حضرت عمر فاروق کی حکمت عملی کا دار و مدار اس اصول پر تھا کہ پہلے جزیرہ نمائے عرب کو مسلمان بنایا جائے۔ اسی بنا پر اُنھوں نے خیبر کے یہودیوں اور نجران کے عیسائیوں کو ملک بدر کیا۔ اور مسلمان عربوں کو ایک فوجی قوم بنایا۔ حضرت عمر کی خلافت کا رجحان کسی قدر علٰحدگی پسند شہنشاہیت کی جانب تھا۔[1] اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ زمانہ اسلام کی ابتدا کا تھا اور اُن کو اس کا خوف تھا کہ ریگستانی عرب کہیں بہت جلد قیصر و کسریٰ کے تمدن کی عشرتوں میں ڈوب کر اپنے مذہب کو بھول نہ بیٹھیں۔ (خلفائے بنی امیہ کے زمانے میں وہی ہوا جس کا انھیں اندیشہ تھا)۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ عربوں کو اس کی بھی سخت ممانعت تھی کہ وہ عرب کے باہر کسی قسم کی زمین یا جائداد حاصل کریں۔[2] مفتوحہ علاقوں کے باشندے اپنی زمینوں اور اپنی جائدادوں کے مالک رہے۔ اور عرب فوجی سردار اور سپاہی خیموں میں بسر کرتے تھے۔[3] مفتوحہ علاقوں کا نظم و نسق انھیں اصول پر ہوتا رہا جیسے قیاصرہ بازنطینی یا ساسانی بادشاہوں کی حکومت کے دور میں ہوتا تھا۔ ذمیوں (یہودیوں اور نصرانیوں وغیرہ) کے ساتھ یہ رعایت تھی کہ اُن کے آپس کے تنازعات میں انھیں کے قوانین پر عمل کیا جاتا تھا۔ اور اُن کی عدالتیں علٰحدہ تھیں۔ یہاں اس امر کا بھی تذکرہ کر دینا ضروری ہے کہ مذہب اسلام نے یہودی اور نصرانی اور دیگر اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کی جو اجازت دی تھی اس پر شروع ہی سے عمل شروع ہو گیا۔ اور اس طرح نسلی اختلاط کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں تمام مفتوحہ سرزمین تمام مسلمانوں کی مشترک ملکیت تھی اور صرف مال غنیمت اور جنگ کے قیدی فرداً فرداً ہر شخص کو بطور حصے کے ملتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں عربوں کو مفتوحہ علاقوں میں جائدادیں حاصل کرنے کی اجازت دی گئی۔

---

[3] Philip Hitti : History of the Arabs.

حضرت عمرؓ کے زمانے میں اور اُس کے بعد بھی عرب غیر عرب مسلمانوں کو کچھ عرصے تک اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے۔ اس کی تین وجوہات تھیں ایک تو یہ کہ یہ نومسلم مذہب میں سمجھتے تھے دوسرے یہ کہ عربوں میں اسلام کی تعلیم سے پہلے نسلی امتیاز کا بڑا احساس تھا اور یہ کچھ دنوں تک باقی رہا۔ تیسرے یہ کہ یزید اور اس کے رنگیلے اُموی جانشین اپنی رنگ رلیوں کے لئے موالی (نومسلم) طبقے سے بھی خراج لیتے رہے۔ بنی اُمیہ ہی کے نیک نہاد خلیفہ عمر ثانی نے عربوں اور نومسلموں کی اس تفریق کو ہمیشہ کے لئے مٹایا۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عربوں اور موالی میں کوئی ایسا امتیاز تھا جس کی بنیاد محض "نسل" پر ہو۔ کیونکہ عربوں اور موالی میں بہت شدت سے شادی بیاہ کا سلسلہ شروع ہو گیا اور بہت جلد اس قدر نسلی اختلاط ہوا کہ نہ صرف مفتوحہ علاقوں میں بلکہ خود جزیرہ نمائے عرب میں بھی عرب اور موالی مل جل کر ایک ہونے لگے۔

اسپین کی فتح کے کچھ دنوں بعد تک عربوں، موالی طبقے (جو زیادہ تر بربر تھا)، اور ہسپانوی نومسلموں میں برائے نام امتیاز رہا[1] لیکن یہ بھی بہت جلد مٹ گیا۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ عربوں کا رجحان ہمیشہ نسل، اور تمدن کے اختلاط کی طرف رہا، اور اسپین میں بھی عربی، بربر، افریقی، گاتھ، لاطینی نسلوں کے باشندے گھل مل کر ایک ہونے لگے۔

خلفائے بنی امیہ میں سے اکثر و بیشتر شراب نوشی اور عیاشی میں مبتلا رہے اور وہی پیش آیا جس کا حضرت عمرؓ کو اندیشہ تھا۔ یعنی عرب آرام طلب بن گئے۔ خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں لیکن اسی عیاشی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں اور دوسری قوموں کی کنیزوں اور عورتوں میں جنسی ارتباط شروع ہوا۔ اور دوسری قوموں میں اسلام پھیلنے لگا۔ یہ نومسلم بہت جوشیلے نکلے اور بہت جلد اسلامی فتوحات کا سہرا انھیں کے سر بندھا۔ بربروں نے اسپین اور شمالی مغربی افریقہ کو

---

[1] E. Levi-Provencal : L'Espagne Musulmane au Xeme Siecle.

فتح کیا، ترکوں نے ماوراءالنہر اور ہندوستان کو، مغلوں نے جنوبی روس اور شمالی ایشیا کو اور عثمانی ترکوں نے ملتان اور وادی ڈینیوب کو فتح کیا۔

عہد بنی امیہ میں موالی کو خالص عربوں سے کچھ کم سمجھا جاتا تھا۔ عرب قوم کی نسلی امتیاز کی روایات اسلامی تعلیم کی خلاف ورزی کر رہی تھیں۔ اوائل عہد بنی امیہ کی اس افسوسناک غلطی کا نتیجہ اسلام کو اس طرح بھگتنا پڑا کہ ان موالی نومسلموں نے فرقہ وارانہ تحریکوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ اس طرح شیعیت کی تحریک عراق میں اور خارجیت کی تحریک ایران میں شروع ہوئی[1] لیکن اس امتیاز کا ردِعمل بھی باہمی شادیوں کی صورت میں بہت تیزی سے پھیل رہا تھا۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیز کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عرب اور موالی کی تخصیص کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیا۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے زمانے سے پہلے بھی سلطنت کے دور دراز صوبوں مثلاً ماوراءالنہر، سغدانیہ، مصر، افریقہ اور اسپین میں عربوں اور موالیوں کی تخصیص زیادہ نہیں تھی۔ اس کی خاص مثال ہمیں خراسان میں ملتی ہے جہاں نومسلم ترک عربوں کے دوش بدوش غیرمسلم ترکوں سے لڑتے تھے۔ عرب سردار بھی ترک سرداروں کی طرح "دہقان" کہلاتے تھے۔ اور ان کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ بسا اوقات غیرمسلم ترک (جو اہل کتاب بھی نہیں تھے) مسلمانوں کے دوش بدوش لڑتے اور انہیں حقوق کے مستحق سمجھے جاتے تھے[2]

حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے بہت شدت سے اس بدعت کی ممانعت کی جو ان کے رنگیلے پیشروؤں نے اپنے محاصل بڑھانے کے لئے رائج کی تھی یعنی نومسلموں سے بھی خراج لینا۔ اس امتناعی حکم کی وجہ سے نومسلم موالی معاشی حیثیت سے عربوں کے برابر ہو گئے اور چونکہ ان کا قدیم تمدن عربوں سے زیادہ پرانا تھا، وہ امور سلطنت پر بھی (عہد بنی عباس میں) حاوی ہو گئے۔

۱؎ Philip Hitti: History of the Arabs.

۲؎ Barothold: Turkestan.

اسپین میں بھی یہی ہوا۔ طارق بن عمرؔ کی فوج زیادہ تر نومسلم بربریوں کی تھی۔ موسیٰ بن نصیر نے جب بنفس نفیس خود اسپین کا رُخ کیا تب کہیں پہلی بار عرب فوجیں اسپین پہنچیں۔ یہاں بھی عربوں نے اسلامی تعلیم کے خلاف نسلی امتیاز جتانے کی کوشش کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بربریوں نے بغاوت کی۔ اگرچہ کہ یہ بغاوت فرو کردی گئی لیکن جس مقصد کے لئے یہ بغاوت کی گئی تھی وہ حاصل ہوگیا۔ اور اسپین میں تمام مسلمانوں کو مساوات کا درجہ حاصل ہوگیا۔ اگرچہ کہ اسپین میں مختلف نسل کے مسلمانوں کے الگ الگ نام تھے مگر ان میں شادی بیاہ اور ارتباط کا سلسلہ بہت گہرا تھا۔ اور عربوں سے کہیں زیادہ طاقت بربری یا اسپین کے نومسلموں کو حاصل تھی۔ باہر سے جو غیر عرب آئے تھے وہ موالی کہلاتے تھے (اُن میں بربر بھی شامل تھے) اسپین کے نومسلم "مسالمہ" اور ان کی اولاد "مولدون" کہلاتی تھی۔ اسپین کے عیسائی "عجمی" تھے[۱] امارت بنو امیہ کے زمانے میں "مولدون" سب سے زیادہ طاقتور تھے[۱]۔ ان میں سے بہت سے خاندانوں کے نام قبول اسلام کے بعد بھی ہسپانوی رہے مثلاً اشبیلیا کے بنو انجلینو اور بنو سباری کو مختلف ادوار میں موالی اور ثقالبہ (یورپی غلاموں) کا بھی بہت زور رہا۔ اس کے علاوہ اسپین کے مسلمان اور عیسائی شاہی گھرانوں اور رعایا کے گھرانوں میں شادی بیاہ کا سلسلہ ابتدا سے شروع ہوا اور جاری رہا۔ امیر عبداللہ کی شادی ڈوناانیگا اور المنصور کی سانکو ثانی شاہ نوار کی لڑکی سے ہوئی۔ لاکھوں کی تعداد میں جو ہسپانوی کنیزیں تھیں اُن کے ذریعے جو نسلی اختلاط ہوا وہ اس کے علاوہ تھا۔

جو حکمت عملی حضرت عمرؓ ابن الخطاب نے عرب کے لئے اختیار کی تھی حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک ہلکے پیمانے پر شروع کی یعنی اسلام کی تبلیغ اور غیر مسلموں پر پابندیاں لیکن غیر مسلموں پر جو پابندیاں عائد کی گئیں وہ کچھ تو اسلامی رواداری کی بڑھتی ہوئی روایات کی وجہ سے

---

[۱] E. Levi-Provencal : L'Espagne Musulmane au Xeme Siecle.

اور کچھ سلطنت کے معاشی حالات کے اقتضا سے عمرؓ ابن عبد العزیز کے انتقال کے بعد ہی اٹھا دی گئیں یا محض کاغذ پر باقی رہ گئیں۔

عہد بنی امیہ میں ذمیوں سے وہی سلوک کیا جاتا تھا جس کی مذہب نے ہدایت کی تھی۔ اُن سے ایک طرح کا جزیہ لیا جاتا تھا' اور اس کے معاوضے میں انھیں فوجی خدمات سے مستثنیٰ کیا گیا تھا (معاشی اور سیاسی لحاظ سے یہ شہنشاہیت کا ایک بہت کامیاب حربہ ہے۔ صدیوں بعد برطانوی شہنشاہیت نے ہندوستان میں یہی طریقہ اختیار کیا)۔ ذمی عورتوں سے شادی بیاہ کی صرف اجازت ہی نہیں تھی بلکہ بہت کثرت سے شادیاں کی جاتی تھیں۔ عدالت اور قانون کے اعتبار سے ذمیوں کو ان کے مذہب کے لحاظ سے پورے پورے اور جدا گانہ اختیارات دئے گئے تھے۔

مذہب اسلام نے تو صرف یہودیوں' عیسائیوں' اور سبائیوں کو اہل کتاب اور ذمی قرار دیا گیا تھا لیکن سیاسی اور معاشی نظام کا تقاضہ یہ تھا کہ مجوس (ایرانی آتش پرستوں) اور بربری بت پرستوں سے بھی ذمیوں کا سا سلوک کیا جائے۔ اور عہد بنی امیہ میں ان کو بھی ذمی قرار دیا گیا۔

معاشری لحاظ سے عیسائیوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جاتا تھا۔ امیر معاویہ کی ایک بیوی عیسائی تھی' ان کے دربار کے ایک شاعر' ایک طبیب اور ایک معتمد مالیات کا مذہب عیسائی تھا۔

اسلام نے غلامی کی ممانعت نہیں کی تھی لیکن انسدادِ غلامی کی بہت سی بنیادی تجویزیں اس کی تعلیم میں شریک تھیں۔ مذہباً کوئی مسلمان کسی اور مسلمان کو غلام کے طور پر نہیں رکھ سکتا تھا' ہاں اگر کوئی غیر مسلم غلام مسلمان ہو جاتا تو اُسے اختیار تھا کہ اُس غلام کو آزاد کرے یا نہ کرے۔ کسی کنیز کی اولاد اگر اُس کے مالک کے سوا کسی اور کے نطفے سے ہو تو غلام سمجھی جاتی' لیکن اگر اُس کے مالک کے نطفے سے ہوتی تو آزاد ہوتی۔ کسی

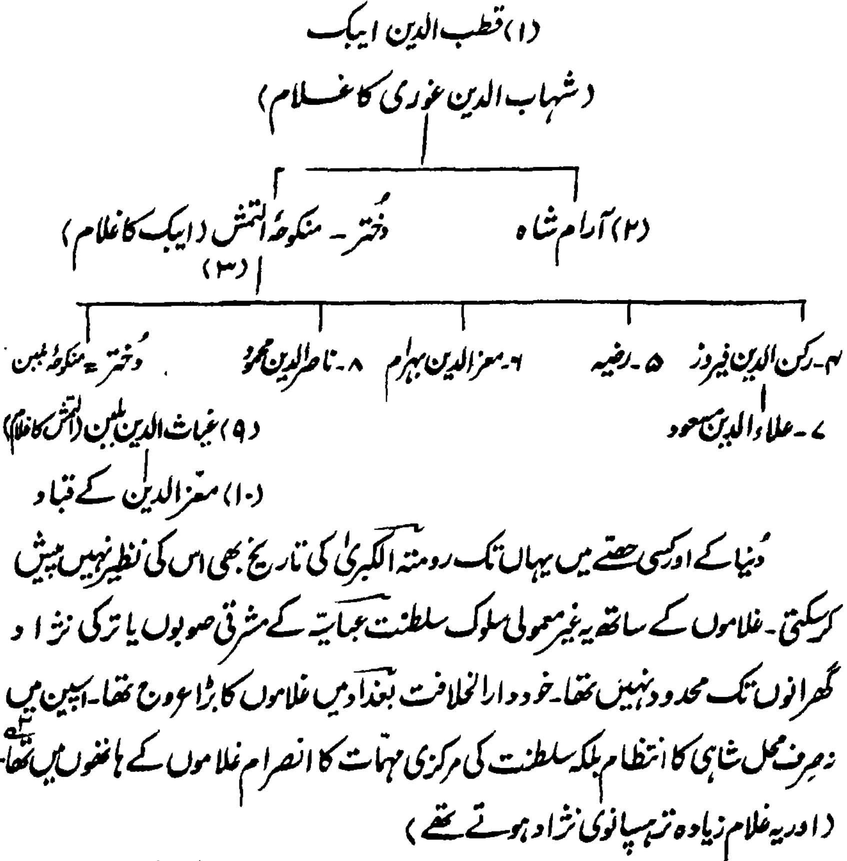
مرد غلام کے نطفے سے اگر کسی آزاد عورت کے اولاد ہوتی تو وہ بھی آزاد سمجھی جاتی۔ غلاموں کو آزاد کرنا بہت بڑے ثواب کا کام تھا۔ اگر کوئی غلام آزاد کیا جاتا تو اُس کا مالک اُس کا سرپرست بن جاتا۔ اور اگر سرپرست بے اولاد مرتا تو غلام اس کی جائداد کا مالک بنتا۔

اگرچہ کہ اسلام نے اس کی کوشش کی تھی کہ اس طرح غلامی کا انسداد ہو، عرب فتوحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیدی مرد اور عورتیں لاکھوں کی تعداد میں اسیر ہوتے اور غلام بنتے۔ رفتہ رفتہ بردہ فروشی تجارت کی بہت ہی فائدہ دینے والی شاخ بن گئی۔ بردہ فروشی زیادہ تر یہودیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اگرچہ کہ مسلمان بردہ فروشوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں تھی۔ پھر بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان ہمیشہ اپنے غلاموں سے بہت اچھا سلوک کرتے رہے۔ عباسیوں کی خلافت کے زمانے میں اُن غلاموں کا شمار جو خلیفہ کے پاس ہوتے درجۂ اول کے رؤساء میں تھا[1]۔ خُراسان میں غلاموں کی جس طرح تربیت ہوتی تھی اس کا نقشہ نظام الملک نے بہت اچھا کھینچا ہے جس کے حوالے سے بارتھولڈ[2] نے اس کو نقل کیا ہے۔ کہ کس طرح ایک غلام پہلے سائیس کی خدمت انجام دیتا، پھر رفتہ رفتہ اس کو ترقی ملتی جاتی اور اس کے مرتبے میں اضافہ ہوتا جاتا یہاں تک کہ ساتویں سال وہ وثاق باشی بنتا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ خیل باشی اور حاجب کے مراتب تک ترقی کرتا۔ قابل ترین غلام حاجب بُزرگ یا حاجب الحجاب ہوتا جو پورے درباری نظام کا افسرِ اعلیٰ ہوتا۔ سامانیوں کے دور میں اور ان کے بعد بڑے بڑے اہم صوبوں کی صوبہ داریاں اور سپہ سالاروں کے عہدے یا شاہزادوں کو دئے جاتے یا پھر تُرک غلاموں کو۔ چنانچہ خُراسان، ماوراء النہر، افغانستان اور شمالی ہندوستان میں بہت سے غلام ایسے گزرے ہیں جن کا نام تاریخ اسلام میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ جیسے اَلپ تگین

ا؎ Hitti: History of the Arabs.

۲؎ Barothold: Turkestan.

تاش، فائق وغیرہ۔ اسلام کی جاذب شہنشاہیت اور انتہائی مساوات و اخوت اور رواداری کا سب سے نمایاں نمونہ ہندوستان کے "شاہانِ غلاماں" کی مثال ہے۔ ذرا یہ خاکہ[1] ملاحظہ کیجئے۔



دُنیا کے اور کسی حصے میں یہاں تک رومتہ الکبریٰ کی تاریخ بھی اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔ غلاموں کے ساتھ یہ غیر معمولی سلوک سلطنت عباسیہ کے مشرقی صوبوں یا ترکی نژاد گھرانوں تک محدود نہیں تھا۔ خود دارالخلافت بغداد میں غلاموں کا بڑا عروج تھا۔ اسپین میں نہ صرف محل شاہی کا انتظام بلکہ سلطنت کی مرکزی مہمات کا انصرام غلاموں کے ہاتھوں میں تھا۔[2] (اور یہ غلام زیادہ تر ہسپانوی نژاد ہوتے تھے)

اس طرح عہد بنی عباس میں وہ مساوات جس کی اسلام نے تعلیم کی تھی مسلمانوں میں اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ حاکم اور محکوم قومیں تو ایک طرف، حاکم آقا اور محکوم غلام کے تعلقات

۱۔ S Lane Poole: Tne Mohammedan Dynasties

۲۔ E. Levi Provencal: L'Espagne Musulmane an Xeme Siecle.

باپ بیٹے کے سے ہوگئے تھے۔ کنیزیں جو پہلے خلفاؔ اور بادشاہوں کے محلوں کی زینت بنیں، خلفاؔ اور بادشاہوں کی مائیں بھی بنیں۔

عربوں اور محکوم قوموں کے اختلاط میں کنیزوں، غلاموں اور بردہ فروشی کے ساتھ ساتھ تعدد ازدواج کا بھی بہت بڑا حصّہ رہا۔ خلافتِ عبّاسیہ کے دور میں عربوں اور محکوم اقوام کا نسلی اور تمدّنی ملاپ مکمل ہوگیا۔ خلفائے عبّاسیہ کے وزیروں (البرامکہ) کا خاندان ایرانی تھا۔ برمکی اپنا سلسلۂ نسب ساسانی عہد کے فرضی وزیر بزرگ مہر سے ملاتے تھے۔ صُوبوں میں پہلے ایرانی اور پھر تُرک تمام اُمورِ سلطنت پر حاوی ہوگئے۔

عہدِ عباسیہ کا نسلی اختلاط کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ المنصور کی والدہ بربری تھی، مامون کی والدہ ایرانی تھی۔ اور اسی طرح واثق اور مہتدی کی مائیں ایرانی کنیزیں تھیں۔ المنتصر کی والدہ نیم یونانی نیم حبشی تھی۔ مستعین کی والدہ سلاف نسل کی تھی۔ مکتفی اور مُقتدر کی مائیں تُرک کنیزیں تھیں۔ ہارون الرشید کی ماں بھی بدیسی کنیز تھی۔[1]

عہدِ عباسیہ میں جب بغداد کی مرکزی حکومت کمزور ہونے لگی تو پہلے ایرانی اور پھر تُرک صوبہ دار خود مختار ہونے لگے۔ ان کے درباروں میں بھی عرب، ترک، ایرانی، مغل سب مِل جُل کر ایک قوم بنتے گئے۔

دورِ عباسیہ میں بھی تجارت نسلی اختلاط کا ایک بڑا ذریعہ تھی۔ عرب تاجر سیلون، مالابار، جزائرِ شرق الہند سے ہوتے چین تک پہنچتے تھے۔ انھیں نے جزائرِ شرق الہند اور ملایا میں اسلام پھیلایا، اور جو عرب وہاں بس گئے وہ وہاں کی آبادی میں گھُل مل گئے۔ تجارت کی ایک اور بہت بڑی شاہراہ بحیرۂ اخضر تھا، جہاں سے سُغدآنیہ، اور ماوراالنہر کی پیداوار یورپ کو جاتی تھی۔ ایک اور بحری شاہراہ بحیرۂ اسود تھا جہاں سے سویڈن کے تاجر وولگا اور ڈوان وغیرہ کے

---

[1] Hitti: History of the Arabs.

ذریعے عربی سلطنت کی پیداوار اور صنعتی اشیا اپنے وطن کو لے جاتے تھے چنانچہ بہت سے عربی سکّے اسکنڈی نیویا میں پائے گئے۔ انگلستان کے اینگلو سیکسن بادشاہ آوفا کا ایک سونے کا سکّہ برٹش میوزیم میں موجود ہے یہ ۷۷۴ء کے عرب دینار کی نقل ہے۔ اس میں ایک طرف کلمۂ شہادت ہے اور دوسری طرف اوفا کا نام جس زمانے میں بحیرۂ روم کے مغربی حصّوں میں عرب فتوحات اور عرب قزاقوں کی وجہ سے تجارت مشکل تھی، اسکنڈی نیویا سے تجارت کا سلسلہ اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ مشرقی بحیرۂ روم میں اسکندریہ اور وینس کے درمیان تجارت زوروں پر تھی، اور بردہ فروشی اس تجارت کا بہت اہم جزو تھی۔ل

اب ہم اگر صرف عہد بنی اُمیّہ اور بنی عباس میں سلطنت کی وسعت کو پیش نظر رکھیں اور اس زمانے کے نسلی اختلاط کا اندازہ کریں تو اس کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ اسلام "نسل" اور رنگ کے تصوّر سے اور جغرافیائی حدود سے کس قدر بے نیاز رہا۔ جن جن ملکوں پر اسلامی حکومت رہی اُن میں سے کوئی اپنے کو نسلاً خالص نہیں کہہ سکتا۔ ان ملکوں میں شمال مغربی چین، چینی ترکستان، ترکستان، جنوبی سائبیریا، جارجیا، آرمینیا، یوکرین، وسطی اور جنوبی روس، کریمیا، ہنگری، جنوب مشرقی پولینڈ، بسرے بیا، ہنگری، جنوب مشرقی آسٹریا، یوگوسلافیا، رومانیا، بلغاریہ، البانیہ، یونان، کریٹ، اٹلی کے بہت سے حصّے، سسلی، جزائر بالیارک، جنوبی اور مغربی فرانس، اسپین، پرتگال، افریقہ کا صحرائے اعظم، ریف، نائیجریا، مراکو، الجزائر، تونس، طرابلس، مصر، حبش، شمالی لینڈ، زنجبار، مدغاسکر، جزیرہ نمائے عرب، فلسطین، شام، ایشیائے کوچک، جزیرۂ قبرس، تھریس، کردستان، عراق، ایران، ماوراالنہر، سغدانیہ، خراسان، افغانستان، ہندوستان، جزیرہ نمائے ملایا اور اکثر جزائر شرق الہند شامل ہیں۔ ان سب ملکوں میں رنگ بہ رنگ کے، صدہا مختلف قسم کی زبانیں بولنے والے، مختلف

ل Henri Pirenne:- Mohamed at charlemagne.

نسلوں کے لوگ آباد ہیں لیکن سب آپس میں ملے جُلے، شادی بیاہ کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ اور اسلام نے "نسل" کے تصور پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ اسلامی ممالک میں یہ لفظ بے معنی سا ہو گیا۔

عہدِ بنی عباس میں مساوات کا تصور اس قدر حاوی تھا کہ ذمّیوں سے بھی برابری کا سلوک کیا جاتا تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں یہودی اور عیسائی مالیات، اور حکومت کے بہت بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ اگر کبھی کبھی مُسلموں اور ذمّیوں کے مابین امتیاز کے قوانین منظور بھی کیے گئے تو اُن کی حیثیت "کاغذ پر روشنائی" کی سی رہی اور کبھی وہ اچھی طرح نافذ نہیں ہونے پائے۔ خلفائے بنی امیہ کی طرح خلفائے بنی عباس بھی اسلام اور مسیحیت کے مناظروں میں شریک ہوتے۔ ساتویں صدی ہی میں انجیل کے بہت سے حصّے شامی اور یونانی زبانوں سے عربی میں ترجمہ کیے جا چکے تھے۔ اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں کئی عیسائی وزارت کے عہدوں تک پہنچے، جیسے عبدون ابن سعید، المتقی کا ایک وزیر مسیحی تھا۔ اور المعتضد کا میرِ عسکر ایک عیسائی تھا۔ خلفا کے اکثر و بیشتر اطبا اور معالج عیسائی تھے۔

عیسائیوں کو عہدِ بنی عباس میں تبلیغ کی بھی اجازت تھی اور انھوں نے بہت سے مبلغین کو ہندوستان اور چین بھیجا۔ (غالباً مسلمانوں میں مسیحیت کی تبلیغ کی اجازت ہو گی) بیانِ فو واقع چین میں اِن عیسائی مُبلّغین کی یادگاریں اب بھی موجود ہیں۔ انھیں عیسائیوں نے وسط ایشیا میں عیسائیت کی تبلیغ کی ہو گی۔

یہودی جن پر بخت نصر سے لے کر ہٹلر کے زمانے تک ہمیشہ ظلم و ستم ہوتا رہا اسلامی سلطنتوں میں ہمیشہ خوش حال رہے اور اُن پر ان کے مذہب یا اُن کی نسل کے جُدا ہونے کے

Hitti: History of the Arabs. [illegible]

جرم میں کبھی بیجا تشدد نہیں کیا گیا۔ قرون وسطیٰ میں اسپین کے مسلمان یہودیوں سے جس رواداری سے پیش آتے تھے اگر اُس کا مقابلہ اُن مظالم سے کیا جائے جو انھیں لوگوں پر اس زمانے کی عیسائی ریاستوں میں ہوتا تھا تو حیرت ہوتی ہے۔

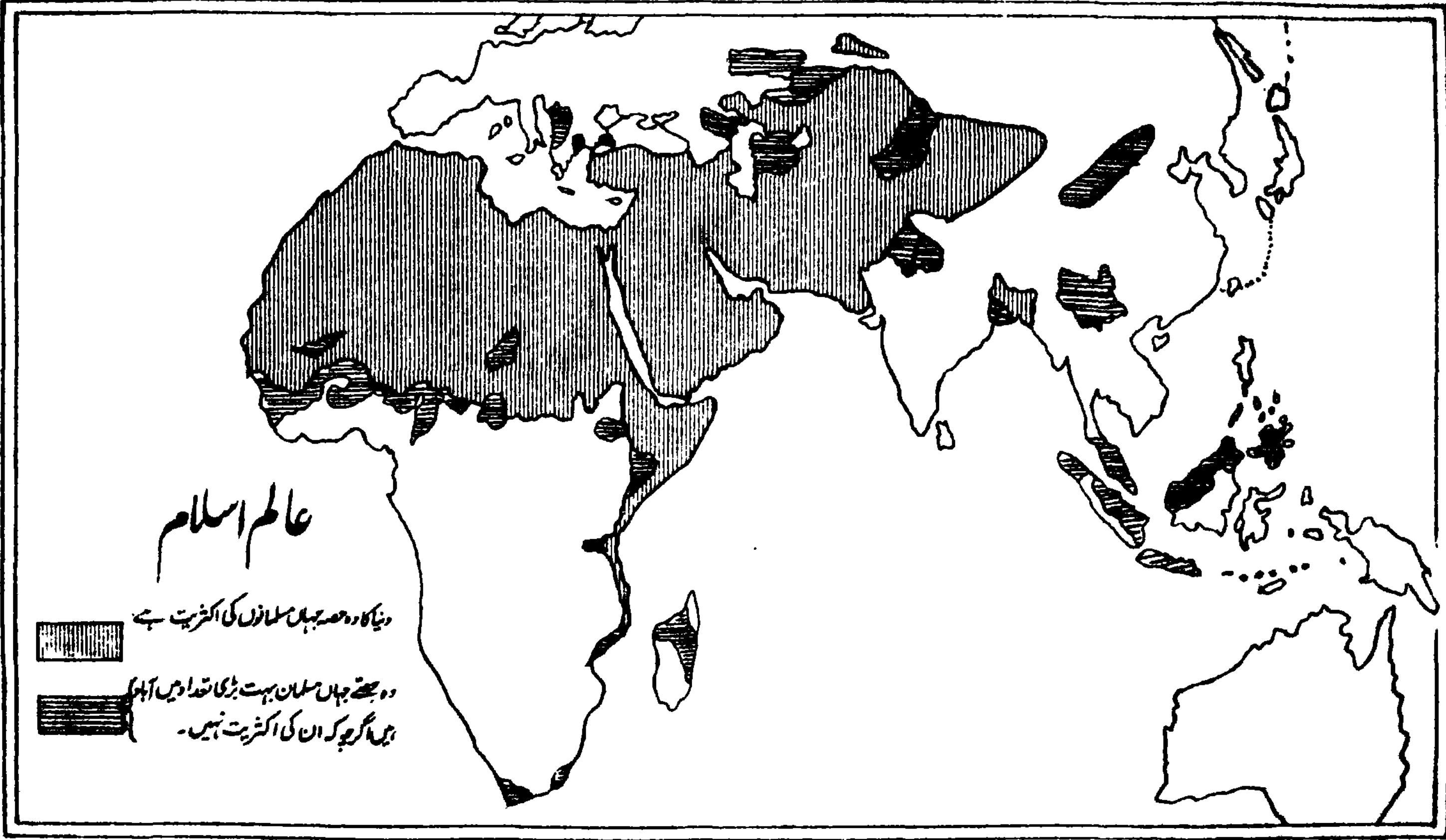
اِسلام کی تبلیغ میں جبر و تشدد سے کام نہیں لیا گیا۔ مذہبی تبلیغ کے علاوہ سیاسی اور معاشی حالات نے خلافت بنی عباس کے زمانے میں اسلام کے پھیلنے میں بہت مدد دی۔ اسلام قبول کرتے ہی ہر غیر مُسلم اُس کامل مساوات اور مرتبے کا اہل قرار دیا جاتا جو بحیثیت مسلمان اس کا قدرتی حصہ تھی۔ اسلام کی تبلیغ میں جبر و تشدد کے فقدان کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شام میں عرصے تک عیسائی اکثریت رہی حالانکہ شام خلفائے بنی امیہ کا دارالخلافہ تھا۔ عرب کی فتوحات کے تقریباً تین سو سال بعد کہیں ایران نے اپنا آبائی مذہب چھوڑا اور اب بھی فتح ایران کے تیرہ سو برس بعد ایران میں نو ہزار زرتشتی آباد ہیں۔ پارسیوں نے فتح ایران کے زمانے میں نہیں بلکہ اس کے بہت بعد آٹھویں صدی عیسوی میں ہجرت کی، اور ہندوستان آئے۔ ایران میں آتش پرستوں کو قانوناً ذمّی قرار دیا گیا تھا، انھیں ہر طرح کی مذہبی آزادی تھی اور نہ صرف ایران بلکہ عراق، اور ہندوستان میں بھی بہت سے آتشکدے اور زرتشتی معبد تھے۔ پارسیوں کی ہجرت کی اصلی وجہ عربوں کا تشدد نہیں بلکہ معاشی اور تجارتی اغراض تھے کیونکہ محمد بن قاسم کی فتوحات کے بعد ہندوستان سے تجارتی روابط بہت بڑھ گئے تھے۔ انھیں پارسیوں نے ہندوستان میں پھر شاہان گجرات، اور شاہان مغلیہ کی اسلامی سلطنتوں کا زمانہ دیکھا اور کسی کے تعصب کا یہ لوگ شکار نہیں بننے پائے۔

ایرانی زرتشتیوں کے علاوہ ایران کے اور بہت سے مذہبی فرقے عہد عباسیہ میں برابر باقی رہے مثلاً مانی کے پیرو۔ یا مزدکی مذہب کے پیرو۔ ہندوستان کے اسلامی صوبوں میں ہندو مذہب باقی رہا اور محمد بن قاسم یا اس کے جانشینوں نے کبھی مذہب کے معاملے میں سختی نہیں کی۔

اگر مسلمان سلاطین اور بادشاہ واقعتاً مذہبی سختی کرتے تو آج اسپین، جنوبی فرانس، بلقان، ہنگری، روس، ہندوستان کے تمام باشندے مسلمان ہوتے۔ نہ صرف عربوں بلکہ ترکوں اور تاتاریوں نے بھی کبھی مذہبی تشدد نہیں کیا۔ آلِ عثمان کی سلطنت کے زیادہ تر صوبوں کے باشندے عیسائی تھے اور عیسائی ہی رہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ایک ایسے صوبے (بنگال) میں ہے جو کبھی کسی بڑی اسلامی حکومت کا مرکز نہیں رہا۔

ہندوستان کی تاریخ میں اسلامی دور رواداری، اور نسلی اختلاط کی ہر ہر قدم پر شہادت دیتا ہے۔ ہندوستان میں اپنی سلطنت شروع کرتے ہی مسلمانوں نے ہندو تمدن سے بہت کچھ اخذ کرنا شروع کیا۔ قطب مینار کی تعمیر ہندو اثرات کی شاہد ہے۔ امتیازِ نسل وخون فاتح قوم میں بالکل نہیں تھا۔ اسی وجہ سے بہت جلد مسلمان بادشاہوں نے ہندو رانیوں اور راجکماریوں سے شادی بیاہ کا سلسلہ شروع کیا۔ علاء الدین خلجی کی شادی سیاسی اعتبار سے ہندوستان میں جاذب شہنشاہیت کی طرف پہلا قدم تھی۔ یہ ارتباط بہت جلد اس قدر گہرا ہوگیا کہ جب حسن نے دکن میں سلطنت قائم کی تو اس کا نام بہمنی سلطنت پڑا اور اس نے اپنے نام کے آگے اپنے ہندو سرپرست گنگو کا نام بڑھایا۔ بہمنی سلطنت کی رواداری کی روایات سلطنتِ آصفیہ میں آج تک موجود ہیں، جہاں سلطنت کا اعلیٰ ترین اعزازی عہدہ دار، پیشکار ہندو ہوتا ہے۔

اکبر کے زمانے میں ہندوستان میں جاذب شہنشاہیت، عروج کے انتہائی نقطے پر پہنچ گئی۔ اس نے پہلی مرتبہ اہل ہندوستان کو ایک قوم بنانے کی باقاعدہ کوشش کی۔ اس نے راجپوت شاہی گھرانوں میں شادی بیاہ کا سلسلہ ڈالا۔ اور جہانگیر اور شاہجہاں اگر نصف مغل تھے تو نصف ہندو، اگر نصف چغتائی تھے تو نصف راجپوت۔ سیاسی اور معاشی اعتبار سے، اور اس باعث معاشی اعتبار سے مسلمان اور ہندو برابر تھے اور ان میں کسی قسم کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ اسلام میں جاذب شہنشاہیت کا جو تصور مسلمانوں اور زیادہ تر


عالم اسلام
دنیا کا وہ حصہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے
وہ حصے جہاں مسلمان بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں اگرچہ کہ ان کی اکثریت نہیں۔

زیادہ اہل کتاب تک مخصوص تھا، اکبر نے اس کو تمام غیر مسلموں پر منطبق کیا۔ اور ایک نئے تمدن کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی۔ اس تمدن نے اپنی نشانیاں چھوڑیں مغل طرز تعمیر اور اردو زبان۔

اکبر کی جاذب شہنشاہیت کی روایات جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانے میں باقی رہیں۔ لیکن اورنگ زیب کے زمانے میں ایسے اسباب کی بنا پر جو زیادہ تر معاشی تھے شدید ردعمل شروع ہوا۔ شاہ جہاں کی بنائی ہوئی عمارتوں پر اس کثرت سے روپیہ خرچ کیا گیا تھا کہ اورنگ زیب کو اپنی فوجی مہمات کے لئے روپے کی سخت ضرورت ہوگئی۔ ملک کے محاصل اس کے لئے ناکافی ہوں گے، اس لئے جزیہ کا از سر نو رواج ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ مساوات کے سلوک کے باعث ہندوؤں کی طاقت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ بادشاہ کو اس سے اندیشہ سا پیدا ہونے لگا۔ ان سب معاشی حالات اور بادشاہ کے ذاتی مذہبی غلو نے آسان ترین تدبیر سوچ لی یعنی "علٰحدگی پسند شہنشاہیت" اس کی مثال ایسی ہی تھی، جیسے کسی ایسے جدید ملک میں جہاں کے معاشی حالات خراب ہوں، فاشزم کی مقبولیت۔ اکبر کی جاذب شہنشاہیت کی روایات کے بعد اورنگ زیب کی علٰحدگی پسند شہنشاہیت ایسی ہی تھی جیسے جرمنی میں وائمار جمہوریت کے بعد نازیوں کا عروج۔ اورنگ زیب کی حکمت عملی بعد از وقت تھی اور بہت جلد اس کی وجہ سے معاشی کشمکش فرقہ وارانہ کشمکش میں بدل گئی۔ اسی قسم کے حالات خلافت عثمانیہ کے آخری زمانے میں بھی پیش آئے جب یورپ کی سلطنتوں نے خلافت عثمانیہ کے عیسائی باشندوں کی جا و بیجا حمایت شروع کی۔ اور عیسائی صوبوں میں بغاوتوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو ۱۹۱۸ء تک جاری رہا۔

مجموعی طور پر اسلام نے ہمیشہ ہر ایسے کی مذمت کی جس کی بنیاد نسل، قوم، زبان، یا وطن پر ہو۔ اسی اصول پر پان اسلام ازم کی تحریک کی جمال الدین افغانی نے بنیاد ڈالی۔ اور یہی اصول اقبال کے فلسفۂ سیاست ملی کا رکن رکین ہے۔

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

ایک ہوں مُسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائیگا
تُرکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گُہر

نسل اگر مُسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی
اُڑ گیا دُنیا سے تُو مانندِ خاکِ رہ گزر

اسلام نے نسلی تعصبات پر جو کاری ضرب لگائی ہے اس کا اکثر مغربی مستشرقین اور مورخین نے اعتراف کیا ہے اور اُس کا مقابلہ یورپ کے تعصّبات سے کیا ہے۔



رفتار عالم

جنگ یورپ روس اور جرمنی کی دوستی گنٹھ کٹوں کی دوستی ثابت ہوئی۔ اب ڈیڑھ مہینہ ہونے آیا کہ روس پر جرمنی کے اچانک حملے نے اس بات کا ثبوت دے دیا، اگر اب بھی کسی ثبوت کی ضرورت تھی، کہ موجودہ سیاست اخلاق سے کوسوں دور ہے۔ وعدوں اور معاہدوں کی پابندی بس اس وقت تک ہے جب تک ان سے مطلب برآری ہوتی ہو۔ جب مطلب پورا ہوگیا یا مطلب حسب دلخواہ نہ نکلا تو آج کا دوست کل کا سب سے بڑا دشمن بن جاتا ہے۔ موجودہ جنگ کے شروع ہو جانے کے بعد جرمنی نے بعض خاص اور فوری اغراض کے تحت روس سے دوستی پیدا کرلی تھی اور انگریزوں اور فرانس سے اس کو توڑ لیا تھا۔ اول تو یہ کہ جرمنی جانتا تھا کہ ایک ہی وقت میں فرانس اور روس سے ٹکر لینے میں اس کا نقصان ہے، پھر یہ کہ جرمنی کو بعض ایسی اشیا کی سخت ضرورت تھی جو روس سے اس کو بآسانی مل سکتی تھیں۔ روس انگریزی حکومت کی ڈانواڈول حکمت عملی سے ایسا بیزار ہوا کہ اس نے جرمنی سے معاہدہ کرلیا۔ اس معاہدہ کی آڑ میں اس نے پولینڈ کا مشرقی حصہ، رومانیہ میں بس اربیبا، فن لینڈ اور بالٹک ریاستوں میں وہ سب علاقے حاصل کر لئے جو گزشتہ جنگ عظیم سے قبل اس کے تحت تھے اور جن سے اس کو اتحادی دول کی سیاست نے محروم کر دیا تھا۔ لیکن شاید روس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کو یہ سودا گراں پڑے گا اور جو کچھ اس نے ہڑپ کیا ہے وہ بہت جلد اگلوا لیا جائے گا۔

روس نے جو نئے علاقے حاصل کئے تھے ان کی قلعہ بندی کمزور تھی۔ جرمنوں کی میکانی

طریقِ جنگ کے مقابلے کے لئے جس تیاری کی ضرورت تھی وہ ان علاقوں میں ظاہر ہے چند ماہ میں نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ جرمن افواج دو ہفتوں کے اندر اندر کئی سو میل وندناتی ہوئی روس میں گھستی چلی گئیں اور روسی فوجیں انھیں بالٹک سے لے کر بحرِ اسود کے ڈیڑھ ہزار میل کے محاذ پر کہیں بھی نہ روک سکیں۔ جرمنوں نے اپنے حملے کے تین رخ متعین کر دئے۔ ایک لینن گراڈ کی طرف، دوسرا ماسکو کی جانب اور تیسرا کیو کی طرف جو کریمیا کے ساحلِ علاقہ کا صدر مقام ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ روسی فوجیں بڑی بے جگری سے مقابلہ کر رہی ہیں اور جوابی حملوں سے جرمنوں کو پریشان کر رہی ہیں لیکن یہ کہنا کہ جرمنوں کا اقدام رک جائے گا خواہش کو توقع کا روپ دینا ہے۔ لیکن اگر روسیوں نے جرمن اقدام کو وسط ستمبر تک روک لیا تو سمجھئے کہ انھوں نے پالا مار لیا۔ روسی موسم نپولین کو نیچا دکھا چکا ہے اس لئے اس پر تعجب نہ ہوگا۔ اگر تاریخ اپنے آپ کو دُہرائے اور جرمن فوجیں اقدام کے بجائے مورچہ بندی پر مجبور ہو جائیں۔ مورچہ بندی کی لڑائی اب پرانی ٹیکنک ہو چکی ہے اور موجود جنگ میں سوائے شمالی افریقہ کے جرمنوں نے کہیں اس طریقِ جنگ کو اختیار نہیں کیا۔ اگر انھوں نے مجبور ہو کر روس میں یہ طریقِ جنگ اختیار کیا تو وہ اس ملک کی دلدل میں بری طرح پھنس جائیں گے جس سے نکلنا ان کے لئے دشوار ہوگا۔ لیکن اگر ستمبر کے وسط تک جرمنوں نے روسی محاذ کو توڑ دیا اور روسی فوج کی ٹکڑیوں کو ایک دوسرے سے بے تعلق کر دیا جیسا کہ وہ ماسکو پر قبضہ کرنے کے بعد کرنا چاہتے ہیں، تو اکرین کے وسیع زرعی اور صنعتی وسائل انھیں حاصل ہو جائیں گے جو یقیناً انگلستان کے خلاف استعمال ہوں گے۔ ہماری رائے میں پیشتر اس کے کہ اس کی نوبت آئے انگلستان کو جرمنی کی مغربی سرحد پر فوجیں اُتار دینا چاہئے۔ لیکن بظاہر اس کی امید کم معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ انگریز مدبرین مشرقِ قریب میں جو طرزِ عمل اختیار کر رہے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں اس کا خوف ہے کہ جرمنی بہت جلد روس پر غلبہ حاصل کر لے گا۔

شام کی فوجیں انگریزی فوجوں کے مقابلے میں ہتھیار ڈال چکی ہیں اور ایک عارضی

صلحنامہ پر دستخط ہو چکے ہیں جس کی رو سے انگریزی فوجوں کا شام پر قبضہ ہو چکا ہے۔ صلحنامہ کی باضابطہ تکمیل اور نگرانی کا کام ایک کنٹرول کمیشن کے سپرد کر دیا گیا ہے جو بیروت میں قیام کرے گا اور جس کے ارکان کی تعداد پانچ ہوگی۔ اس معاہدہ کی بدولت مشرق قریب کا یہ علاقہ محوری دول کے اثر سے محفوظ ہو گیا ہے۔

پچھلے دنوں ایران کو انگریزی حکومت نے جو یادداشتیں بھیجی ہیں ان سے کچھ مترشح ہوتا ہے کہ شاید ایران پر بھی انگریزی حکومت اس وقت فوجی قبضہ ضروری خیال کرتی ہے۔ ہندوستان کے بچاؤ کے لئے ایران پر انگریزی اثر کا ہونا ضروری ہے۔ خاص طور پر اس حالت میں جب کہ جرمن فوجوں کے بحر کسپین تک پہونچنے کا اندیشہ ہو۔ جنرل ویول کو شمالی افریقہ سے بلا کر ہندوستان کا کمانڈر ان چیف بنانا اس بات کی دلیل ہے کہ اب جنگ ہندوستان سے قریب آتی جا رہی ہے۔

روس پر جرمنی کے حملے کے فوراً بعد جاپان کے سیاسی افق پر جنگ کے سیاہ اور ڈراؤنے بادل منڈلاتے ہوئے نظر آنے لگے۔ وزارت میں تبدیلی کی گئی اور ایسے ارکان کو شریک کیا گیا جو جنوب مشرقی ایشیا میں جاپان کے سیاسی تفوق کو قائم کرنے کے حامی ہیں۔ محوری دول نے جنوب مشرقی ایشیا میں جاپان کی سیادت تسلیم کرلی ہے اور دنیا کے اس حصہ کو جاپان کا حلقۂ اثر مان لیا ہے۔ یہ عجب بات ہے کہ بعض اوقات شیطان بھی اپنے کرتوتوں کی توجیہ کے لئے انجیل مقدس کے فقرے دہرایا کرتا ہے اور اپنی اخلاقی حیثیت کو مستحکم کرنے کی خاطر نیکی کی سندپیش کرتا ہے۔ چنانچہ جاپانی کہتے ہیں کہ ہم ایشیا کی جنوب مشرقی اقوام کی آزادی کے علمبردار ہیں اور انھیں یورپین استعمار کی زنجیروں سے رہائی دلانا ہمارا فرض ہے۔ اہل یورپ کو کیا حق ہے کہ وہ ہزاروں میل سے آکر ان کمزور قوموں کو ان کے پیدائشی حقوق سے محروم کریں اور ان کی بدحالی سے اپنا اُلّو سیدھا کریں۔ اس ہمدردانہ لب ولہجہ کے مخاطب ظاہر ہے کہ انڈوچین، تھائی لینڈ، ایسٹ انڈیز،

جزائر فلپائن، جزیرہ نمائے ملایا اور برما کے باشندے ہیں جو نسلی اعتبار سے بہ مقابلہ یورپینوں کے جاپانیوں سے زیادہ قریبی مناسبت رکھتے ہیں۔ چنانچہ انڈوچین میں جاپان نے پچھلے ہفتہ فوجی مرکزوں پر قبضہ کر لیا اور وشی کی حکومت سے ایک معاہدہ طے کر لیا جس کی رو سے شمالی انڈوچین کی طرح جنوبی انڈوچین پر بھی جاپانیوں کا فوجی قبضہ ہو گیا ہے۔ جاپان نے دوسری دول کی دیکھا دیکھی اس اندیشہ کا اظہار کیا تھا کہ انگریز انڈوچین پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اس واسطے انڈوچین کی حفاظت کرنا جاپان اپنا فرض تصور کرتا ہے۔ اسی قسم کے اندیشہ ہائے دور دراز کے تحت دیکھئے جنوب مشرقی ایشیا کے کن کن ملکوں پر جاپانی جھنڈا لہرایا جائے گا۔ اس جنگ میں اس قسم کا اقدام فوجی ضروریات کے تحت دوسرے ملکوں نے بھی کیا ہے۔ جرمنی نے اس کی ابتدا کی۔ بعد میں امریکہ اور برطانیہ نے اس کی تقلید کی۔ چنانچہ آیس لینڈ، گرین لینڈ اور شام کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ جدید دفاعی اقدام کے چنگل میں کمزور اور بے بس قومیں ایسی پھنسی ہوئی ہیں کہ چوں نہیں کر سکتیں۔ زبردستوں کی مصلحتوں کی خاطر انھیں اپنے مفاد قربان کرنے چاہیں۔ یہ ہے موجودہ سیاست کا اخلاقی ضابطہ۔ اقبال نے سچ کہا ہے۔

نماند ناز شیریں بے خریدار		اگر خسرو نماند کوہکن ہست

یہ ہے کمزوری کا خمیازہ جو بھگتنا پڑتا ہے۔

غالباً جرمنی کو اصرار ہو گا کہ جاپان روس کی مشرقی سرحد پر حملہ کر دے تاکہ مغربی محاذ پر اس کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔ لیکن جاپان بھی ایسی کچی گولیاں کھائے ہوئے نہیں ہے۔ وہ اس کا منتظر ہے کہ مغربی محاذ پر جرمنی روس کی قوت کو بالکل توڑ دے اس وقت وہ بھی اپنا حصہ لینے کے لئے مشرقی سائبیریا کے علاقوں پر یورش کر دے گا۔ اگر جرمنی کو روس میں کامیابی نہ ہوئی اور وہ وہاں کی دلدلوں میں پھنس گیا تو ممکن ہے جاپان روس سے جنگ نہ کرے اور دھونس میں جنوب مشرقی ایشیا کے مختلف چھوٹے چھوٹے ملکوں کو ہڑپ کر جائے۔ خیال تھا کہ اگر جاپان نے

انڈوچین پر قبضہ جمایا تو انگریز اور امریکہ اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیں گے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ملک اس وقت ایسے سراسیمہ ہیں کہ جنگ کو مشرقی ایشیا میں پھیلانے کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لینا چاہتے۔ برطانوی حکومت اور امریکی حکومت جاپان کی حرکت پر بہت چیں بجبیں ہیں۔ تجارتی تعلقات منقطع کر لئے ہیں لیکن کھلم کھلا جنگ کی نوبت نہیں آنے دیتے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر امریکہ جاپان سے بھڑ جائے تو وہ انگلستان کو نہ ہوائی جہاز بھیج سکے گا اور نہ ساز و سامان سے کسی قسم کی مدد کر سکے گا۔ برطانوی حکومت کی کامیابی کا دار و مدار اس وقت بہت کچھ امریکہ کی امداد پر ہے۔ دراصل خود انگلستان یہ نہیں چاہتا کہ اس وقت امریکہ جاپان سے جنگ کرے۔ خود انگریزوں کا اگرچہ مشرق بعید میں اس وقت مفاد متاثر ہو رہا ہے لیکن ان کی قوت ان علاقوں میں مدافعت کے لئے تو کافی ہے لیکن جاپان کے خلاف جارحانہ اقدام کے لئے کافی نہیں۔ وہ بہت کچھ امریکہ کی قوت پر بھروسہ کئے بیٹھے ہیں لیکن اپنے مخصوص حالات کے سبب سے یہ نہیں چاہتے کہ امریکہ کی توجہ انھیں امداد دینے کے سوا کسی دوسری طرف بٹے۔

ہندوستان

۲۱ر جولائی کو حکومت ہند کی جانب سے ایک کمیونکے شائع ہوا ہے جس میں وائسرائے کی مجلس عاملہ کی توسیع کا اعلان کیا گیا ہے۔ کمیونکے میں اور بعد میں مسٹر ایمری وزیر ہند کی تقریر میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اس توسیع کا مقصد اصل دستوری اور سیاسی تنقیح کو معرض التوا میں ڈالنا نہیں ہے اور نہ اس سے کسی جماعت کے حقوق و مطالبات متاثر ہونے چاہئیں۔ بلکہ یہ اقدام محض دوران جنگ کے لئے انتظامات جنگ میں سہولت بہم پہونچانے کے لئے کیا گیا ہے۔ اب وائسرائے کی مجلس عاملہ میں غیر سرکاری ممبروں کی تعداد بجائے ۲ کے ۸ ہو جائے گی جن کے ذمہ مختلف انتظامی شعبے ہوں گے۔ عام طور پر ہندوستان کے ترقی پسند رجحانات رکھنے والے افراد نے اس توسیع پر یہ اعتراض کیا ہے کہ دفاع (ڈیفنس) اور مالیات کے اہم شعبے غیر سرکاری ارکان کے

سپرد نہیں کیئے گئے جو مرکزی حکومت کے اہم ترین امور ہیں اور جن کا تجربہ حاصل کرنا غیر سرکاری ارکان کے لئے ضروری ہے تاکہ آئندہ یہ تجربہ کام آسکے غیر جماعتی معتدل خیال والے زعماء کی جو کانفرنس حال ہی میں پونا میں سر تیج بہادر سپرو کی سرکردگی میں منعقد ہوئی تھی اس میں بھی یہی اعتراض کیا گیا ہے۔ مسٹر ایمری نے حکومت ہند کے اس اقدام کو اپنی پارلیمنٹ کی تقریر میں سراہا اور یہ جتایا کہ انگریزی حکومت ہندوستان کے دستوری مسئلہ پر ہمدردانہ غور کرنے کے لئے آمادہ ہے بشرطیکہ اہم سیاسی جماعتیں آپس کے اپنے اختلافات کو دور کرکے کوئی متفقہ دستور تیار کریں۔ یہ دستور ایسا ہونا چاہیئے کہ ہندوستان کی مرکزیت اور وحدت بھی برقرار رہے اور صوبوں اور مختلف جماعتوں کے مطالبات بھی پورے ہوجائیں تاکہ وہ اطمینان سے نئے دستور کے تحت زندگی بسر کرسکیں۔ مسٹر ایمری کے بار بار اس بات کے اعادہ کرنے سے ہمارے مدبرین کو کچھ سبق لینا چاہیئے اور اپنے معاملات کو اس خوش اسلوبی سے طے کرنا چاہیئے کہ وزیر ہند کم از کم اس دلیل کو پھر اپنی تقریروں میں بلند آہنگی کے ساتھ نہ پیش کرسکیں۔ یہ دلیل آیا نیک نیتی کے ساتھ پیش کی جاتی ہے یا نہیں اس پر ہم یہاں بحث کرنا غیر ضروری سمجھتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اہل ہند کے پاس اس وقت اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ حکومت کو اس کا اچھی طرح علم ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلاف کی نوعیت ایسی ہے کہ اسی کی وجہ سے وائسرائے کی گزشتہ اگست والی پیش کش کامیاب نہ ہوسکی اور آج بھی ایک سال گزر جانے کے بعد صورت حالات میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں پیدا ہوئی اگر کوئی تبدیلی پیدا ہوئی ہے تو وہ معاملات کو خرابی کی طرف بڑھانے والی ہے

وائسرائے کی مجلس عاملہ کی توسیع کے ساتھ ایک ڈیفنس کونسل قائم کی گئی ہے جس کا اجلاس سال میں تین چار مرتبہ منعقد ہوا کرے گا۔ تاکہ جنگ کے متعلق مختلف معاملات پر غور و مشورہ ہوسکے۔ یہ جماعت محض ایک مشورہ دینے والی جماعت ہے جس کو کسی قسم کے عاملانہ اختیارات حاصل ہوں گے۔ اب چونکہ جنگ روز بروز ہندوستان سے

قریب آتی جارہی ہے اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ برطانوی ہند اور ریاستی ہند کے نمائندوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا جائے تاکہ جنگ کے متعلق حکومت مشورہ کر سکے اور اپنے اعتماد میں شریک کر سکے۔ ڈیفنس کونسل کے ارکان سے توقع کی جائے گی کہ وہ اپنے اپنے حلقوں میں جنگ کے متعلق صحیح معلومات بہم پہونچائیں اور ایسی فضا پیدا کرنے میں مدد دیں جو جنگ کو کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہونچانے کے لئے ازبس ضروری ہے۔



دوسرے رسائل

بابتہ اپریل — جون ۱۹۴۱ء The Indian Journal of Political Science.

اس اشاعت میں تیسری انڈین پولیٹیکل سائینس کانفرنس کے خطبۂ صدارت کے علاوہ دو مضامین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر ڈی این بنرجی نے اپنے مضمون ہندوستان میں پارٹی گورنمنٹ کے سلسلہ میں بتلایا ہے کہ پارٹی کابینا دی اصول یہ ہے کہ اس میں ہر فرقہ وملت، ہر قسم کے معاشی مفاد اور سوسائٹی کے ہر طبقہ کے لوگ شریک ہو سکیں۔ اگر ایسا نہیں تو کوئی اقلیت کبھی بھی اکثریت نہیں بن سکتی اور حکومت کی ذمہ داریوں کو نہیں سنبھال سکتی۔ پارلیمانی طرز حکومت میں جن مسائل کی نسبت پارٹیوں میں اختلاف ہوتا ہے وہ بنیادی نہیں ہوتے بلکہ فروعی ہوتے ہیں۔ سوسائٹی اور ہیئت سیاسی کی تشکیل کی نسبت پارٹیاں بالعموم متفق ہوتی ہیں۔ ان کا اختلاف اس پر ہوتا ہے کہ کن قوانین کے ذریعہ اس ہیئت سیاسی کا بقا ممکن ہے اور سوسائٹی کی عام ضروریات کن ذرائع سے اچھی طرح پوری کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً انگلستان میں قدامت پسندوں اور لبرلوں کے اختلاف کی نوعیت یہی رہی۔ لیکن یورپ کی اشتراکی پارٹی کے متعلق مندرجہ بالا اصول کا اطلاق نہیں ہو سکتا اس واسطے کہ وہ ہیئت سیاسی اور سوسائٹی کی تشکیل میں بنیادی تغیر کی خواہاں ہیں۔ لبرل ازم اور اشتراکیت کا فرق بنیادی ہے۔

مضمون نگار صاحب نے ہندوستان کے متعلق بھی بحث کی ہے اور بتلایا ہے کہ

جب تک طریق انتخاب نہ بدلا جائے اُس وقت تک مغربی طرز کی پارٹیاں یہاں قائم نہیں کی جاسکتیں۔ لیکن یہ نہیں بتلایا کہ طریق انتخاب کو اس وقت تک کیسے بدلا جاسکتا ہے جب تک کہ اس ملک کے مختلف فرقوں میں سمجھوتہ نہ ہو جائے اور وہ بنیادی امور کے متعلق متفق نہ ہو جائیں۔ ہندوستان کی سیاست ایک شیطانی چکر ہے جس میں سے نکلنے کے لئے اس ملک کے لوگ کسی خاص اسم اعظم کے منتظر معلوم ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں اس اسم اعظم کا سراغ لگ سکے گا یا نہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہذیبی اختلافات کی نوعیت ایسی ہے کہ دونوں گروہ اپنی ہستی کو کسی بالاتر نظام میں ختم کرنے کو کبھی بھی تیار نہیں ہوں گے۔ ایسی حالت میں طریق انتخاب فرقہ واری اصول ہی پر مبنی ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک جماعت کو دوسری جماعت پر دائمی سیاسی تفوق حاصل ہو جاتا ہے جو پارلیمانی طرز حکومت کی روح کے خلاف ہے جو ہر اقلیت کو حاکم بننے کا موقع عطا کرتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ پارلیمانی طرز حکومت اس ملک کے لئے موزوں نہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ کونسا طرز حکومت ایسا ہے جو سارے ملک کے لئے اور اس کے مختلف اجزاء کے لئے موزوں کہا جاسکے۔ پنجاب، صوبہ سرحد اور بنگال کے مسلمان پارلیمانی طرز حکومت کو اپنے لئے مناسب سمجھتے ہیں اور اپنے اثر و اختیار کی اخلاقی بنیاد اپنی اکثریت ہی کو قرار دیتے ہیں۔ یوپی، بمبئی، سی پی اور مدراس وغیرہ میں یہی حال ہندوؤں کا ہے۔ وہ بھی اپنی اکثریت کے بوتے پر سیاسی اختیار و اثر کے خواہاں ہیں لیکن ان سب صوبوں میں جو حکومتیں قائم ہیں وہ پارلیمانی طرز حکومت کے نقطۂ نظر سے بے بنیاد سی ہیں اس واسطے کہ اقلیت کبھی بھی اکثریت نہیں حاصل کر سکتی اور صوبہ کی حکومت کی ذمہ داری کو نہیں سنبھال سکتی۔ اگر کسی طرز حکومت میں اقلیت سیاسی طور پر ہمیشہ اقلیت رہنے پر مجبور ہو، اسے آپ چاہے جو کچھ کہیں پارلیمانی نہیں کہہ سکتے۔ ان حالات میں ہندوستان میں پارٹی کا مستقبل وہ نہیں ہو سکتا جو انگلستان میں رہا ہے۔ معاشی مفاد پر پارٹی کی تشکیل اسی وقت کسی معاشرہ میں ممکن ہے جبکہ لوگوں کے

محرک عمل خالص دنیاوی ہوں جنھیں جذباتی رنگ دیدیا گیا ہو۔ اگر محرک عمل دوسرے ہونگے تو پارٹیاں بھی انھیں محرکات کا عکس ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ کانگریس باوجود اپنے سارے اثر و تنظیم کے ملک کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتی وہ اس کی کامیابی میں اپنے مخصوص تصورحیات کی کامیابی تصور کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نقطۂ نظر جس میں اصلی محرک عمل تصورحیات ہو عملی دنیاوی سیاست سے الگ چیز ہے جس کی برائی بھلائی کے متعلق یہاں بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ مضمون نگار نے ہندوستانی مسئلہ کا حل پارٹی گورنمنٹ کے بجائے مخلوط کابینہ کی حکومت کو قرار دیا ہے جو قرین عقل ہے۔ لیکن اس مخلوط کابینہ کے تعین میں تعداد سے زیادہ سیاسی اہمیت کے اصول کی کارفرمائی لازم ہے۔ بغیر اس کے حکومتی کاروبار میں توازن ممکن نہ ہوگا۔

دوسرا مضمون ڈاکٹر اے بی رُوورا ' (ڈھاکہ یونیورسٹی) کا "ہندوستان میں وزراء کی حیثیت" پر ہے۔ یہ مضمون بڑی محنت و کاوش سے لکھا گیا ہے۔ کلکتہ ہائی کورٹ نے دو فیصلے کئے جن میں وزیروں کی عاملانہ حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا اس لئے کہ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کی رو سے صوبہ کا عاملانہ اختیار گورنر کی ذات سے وابستہ ہے۔ گورنر کے تحت عاملانہ اختیارات کو استعمال کرنے کے جو حکام مجاز کئے جاتے ہیں ان میں بھی وزیروں کا شمار نہیں اس لئے کہ وہ منتخب شدہ ہوتے ہیں۔ اس لئے تنقیح یہ تھی کہ اگر وزیروں کے خلاف نفرت پھیلائی جائے تو تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۴ (الف) کا اطلاق قانوناً نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ تعزیرات کی دفعہ ۱۷ کی رو سے لفظ "حکومت سے مراد وہ شخص یا اشخاص ہیں جنھیں برطانوی ہند کے کسی حصہ میں عاملانہ اختیار کے استعمال کا مجاز کیا گیا ہو"۔ کلکتہ ہائی کورٹ کے نزدیک بنگال کے وزیر نہ تو گورنر کے ماتحت حکام ہیں نہ وہ صوبہ کی عاملہ کے مترادف کہے جاسکتے ہیں۔ کلکتہ ہائی کورٹ کی اسپشل بنچ نے اس ضمن میں قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء اور دستاویز ہدایات (انسٹرومنٹ آف انسٹرکشنز) پر

بحث کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ "قانون حکومت ہند یا کسی دوسرے قانون میں اس کی صراحت موجود نہیں کہ وزارت کو عاملانہ اختیار حاصل ہوگا۔ برخلاف اس کے قانون حکومت ہند کی دفعہ ۴۹ کی رو سے عاملانہ اختیار کو گورنر براہ راست یا ایسے حکام کے ذریعہ سے جو اس کے ماتحت ہوں استعمال کرے گا۔ قانون مذکور کی دفعہ ۵۰ میں جو درج ہے کہ وزیر گورنر کی امداد (ایڈ) کریں گے اس کا یہ مطلب نہیں کہ وزیروں کو عاملانہ اختیار حاصل ہوگیا۔ یہ توجیہ دفعہ ۴۹ کے بالکل خلاف ہوگی۔ حکومت بنگال کے قواعد وضوابط جو دفعہ ۵۹ (۳) کے تحت وضع کئے گئے ہیں اُن سے قانون کی مذکورہ صریح دفعات میں قانونی طور پر ترمیم یا تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ پھر اس کے علاوہ یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ دستاویز شرکت میں بصراحت مذکور ہے کہ گورنر عاملانہ اختیار کو وزیروں کے مشورہ سے استعمال کرے گا۔ عاملانہ اختیار کے استعمال کے لئے دستاویز شرکت نے گورنر کو اپنے پیش نظر رکھا ہے نہ کہ وزیروں کو چنانچہ جب تک کہ وزیروں کو گورنر کے ماتحت حکام نہ تصور کیا جائے اس وقت تک وہ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کی دفعہ ۴۹ (۱) کی رو سے عاملانہ اختیار کے مجاز نہیں ہو سکتے۔ ہماری رائے میں وزیروں کو گورنر کے ماتحت حکام نہیں کیا جاسکتا جس کا اشارہ دفعہ ۴۹ میں ہے بلکہ وہ عوام کے منتخب شدہ نمائندوں میں سے چنے جاتے ہیں تا کہ جہاں تک ممکن ہو مقررہ حدود کے اندر اپنی خواہشات کو عملی جامہ پہنائیں اور گورنر کے مشیر کی حیثیت سے کام کریں۔ اس لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگرچہ رواج کے بموجب وزیروں کو گورنمنٹ کہا جاتا ہے لیکن تعزیرات ہند کی دفعات ۱۷، ۱۲۴ (الف) کی رو سے وہ گورنمنٹ کہے جانے کے مجاز نہیں ہیں۔ عملی طور پر چاہے کچھ ہو لیکن قانون میں وزیر گورنر کے مشیروں کے ماسوا کچھ نہیں۔"

کلکتہ ہائی کورٹ کے ان فیصلوں سے وزیروں کی حیثیت کے متعلق ایک بڑا دلچسپ قانونی مسئلہ پیدا ہوگیا ہے۔ جس کی مزید صراحت غالباً قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کی ترمیم کے وقت کرنا ہوگی۔

وزراء کی حالت پر غالب کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ ونام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

مضمون نگار نے انگلستان، کناڈا اور دوسری ڈومینینوں کی دستوری مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ منشار قانون کلکتہ ہائی کورٹ کی اسپیشل بنچ کے فیصلے کے خلاف ہے۔ اس ضمن میں جو بحث کی گئی ہے وہ مضمون نگار کے وسیع مطالعہ کی آئینہ دار ہے خود قانون حکومت ہند کی دوسری دفعات سے اس فیصلے کی تردید کی گئی ہے۔ مثلاً دفعہ ۵۹ کی ضمنی دفعہ ۳ و ۴ سے ثابت کیا گیا ہے کہ وزیروں کو عاملانہ اختیار حاصل ہے۔ دفعہ ۳ میں گورنر کا یہ فرض بتایا گیا ہے کہ وہ "وزیروں کے درمیان صوبہ جاتی حکومت (گورنمنٹ) کے کام کو تقسیم کرے۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ گورنر وزیروں کو عاملانہ اختیارات تفویض کرے گا نہ کہ سرکاری معتمدوں اور حکام کو وزیر ہی مختلف محکموں کے ہیڈ ہوں گے۔ اگر وزیر گورنر کے ماتحت حکام (آفسر) نہیں ہیں تو گورنمنٹ کے شعبے کس طرح ان کے تفویض کئے جا سکتے ہیں۔ وہ کس طرح اپنے اپنے شعبوں کے متعلق احکام صادر کر سکتے ہیں جن کے قانونی جواز کو کوئی عدالت تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتی۔ دراصل منشار قانون یہی ہے کہ وہ اپنے اپنے حدود میں گورنر کے اقتدار کو اسی طرح استعمال کرنے کے مجاز ہیں جس طرح انگلستان میں وزیر بادشاہ (تاج) کے اقتدار کو استعمال کرتے ہیں۔ دراصل صوبہ جاتی حکومت کا اقتدار قانوناً اسی طرح گورنر کی ذات سے وابستہ سمجھنا چاہیئے جس طرح انگلستان میں بادشاہ کی ذات سے۔ جس طرح انگلستان میں وزیر بادشاہ کے مشیر ہونے کے ساتھ اس کے ماتحت بھی ہوتے ہیں اسی طرح برطانوی صوبوں کے وزیر گورنر کے مشیر بھی ہیں اور اس کے ماتحت بھی اور اس لئے عاملانہ اختیار کو استعمال کرنے کے مجاز ہیں۔

لیکن غالباً کلکتہ ہائی کورٹ نے یہ نقطۂ نظر اس لئے اختیار کیا کہ وزارت پبلک

کی جانب سے تنقید ملک معظم کے خلاف نفرت پھیلانے کے ضمن میں شمار نہ کی جا سکے۔ انگلستان کی وزارت تنقید پر موقوف ہوتی ہے۔ چنانچہ چیف جسٹس نے اس کا اظہار بھی کر دیا گیا کہ گورنمنٹ سے کوئی اکثریت رکھنے والی پارٹی مراد ہے تو اس کے خلاف تنقید کو بغاوت انگیز (سے ڈی شن) نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ہاں یہ بات دل کو لگتی ہے کہ وزارت کا عاملانہ اختیار اگر تسلیم کر لیا جائے تو اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ انگلستان کی طرح اس پر تنقید کا پبلک کو حق حاصل ہے۔ میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو کی سیاست اصولاً صحیح نہیں اس لئے کہ اس سے زندگی کا توازن بگڑے گا 'بنے گا نہیں۔

(ی)

دی انڈین جرنل آف اکنامکس The Indian Journal of Economics بابت اپریل ۱۹۴۱ء

April 1941. معاشی انجمن ہند کا چوبیسواں سالانہ اجلاس بمقام میسور پروفیسر گاڈگل کی صدارت میں منعقد ہوا۔ کل ۳۷ مقالے پڑھے گئے جو کہ ان تین عنوانات سے متعلق تھے۔

(۱) اشتراکی معاشرہ میں مسئلہ قدر۔
(۲) ہندوستان میں قیمتوں کی سطح (بالخصوص زرعی نقطۂ نظر سے)
(۳) صوبہ جاتی اور ریاستی مالیات۔

یہاں ہم خطبۂ صدارت اور ایک اہم مقالہ کا خلاصہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

خطبۂ صدارت:۔

پروفیسر گاڈگل نے اپنے خطبہ میں حکومت ہند کے معاشی مسلک پر اصولی بحث کی اور یہ واضح کیا کہ آئندہ پالیسی کی تشکیل کن اصولوں کے تابع ہونی چاہیئے۔ آپ نے جا بجا تاریخ انگلستان و امریکہ سے موزوں مثالیں دیں اور اس طرح آپ کے

نظری مباحث خاصے دلچسپ بن گئے۔ آپ نے اس چیز پر زور دیا کہ اصول عدم مداخلت کے بنیادی مفروضات کی کافی تردید ہو جانے کے باوجود معاشی تخیل ہنوز ان کے اثرات سے آزاد نہیں ہوا ہے۔ لیکن یہ غنیمت ہے کہ پچھلے بیس سال کے حالات نے حکومتوں کو "مداخلت" کے اصول کو مان لینے پر مجبور کیا ہے کیونکہ عدم مداخلت کا نتیجہ اختلال، انتشار اور بدنظمی رہا ہے۔ نیز پچھلے دور میں یورپی حالات کی بنا پر قائم کردہ کلیات کو ایک عالمگیر حیثیت دینا فیشن میں داخل تھا۔ لیکن تجربہ کے بعد ان نظریوں کی اضافیت پر زور دیا جانے لگا۔ حکومت ہند کو بھی یہ چاہیئے کہ اپنی معاشی پالیسی مرتب کرتے وقت یہاں کے معاشرتی ماحول کو اپنی نظروں سے اوجھل ہونے نہ دے۔ اصول عدم مداخلت محض ایسے فضا میں کارآمد ثابت ہو سکتا ہے جہاں کہ بڑھتی ہوئی خوش حالی ہو، چنانچہ انیسویں صدی کے انگلستان کے لئے یہ موزوں رہا لیکن ہندوستان جیسے ملک کے لئے جو ایک دور عبوری سے گزر رہا ہے یہ مفید نہیں ہو سکتا۔ یہاں کے لئے تو ایسے لائحہ عمل کی ضرورت ہے جو کہ دور عبوری کے مسائل کو حل کر سکے۔ نئے معاشی نظام کی ترویج کی وجہ سے جو دقتیں اور تکلیفیں مختلف طبقوں کو برداشت کرنی پڑتی ہیں انھیں بالکلیہ دور نہ بھی کیا جائے تو کم از کم ان کی شدت میں کمی کی جائے یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ حکومت تغیرات کی رفتار پر قابو پا سکے۔ (ع۔ ق)

Journal of the Aligarh Historical بابتہ اپریل ۱۹۴۱ء
Research Institute علیگڑھ ہسٹاریکل ریسرچ انسٹیٹیوٹ مبارکباد

کا مستحق ہے کہ اس نے تاریخ کا نہایت مفید اور اعلیٰ معیار کا رسالہ جاری کیا ہے۔ اس وقت ہمارے پیش نظر اس رسالہ کا پہلا نمبر ہے۔ اس میں بعض مضامین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی کا مضمون "بہمنی سلطنت سے پیشتر"

تحقیق سے لکھا گیا ہے۔ مسٹر ایم بی احمد کا مضمون "عہد مغلیہ کے وقائع" پر ہے۔ ان وقائع سے طرزِ حکومت پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے۔ مضمون اس مسالے پر مبنی ہے جو دفتر دیوانی حیدر آباد (دکن) سے حاصل کیا گیا ہے۔ ایک مضمون "سلاطین دہلی کے حکومت مالوہ سے تعلقات" پر ہے۔ اس مضمون کی تیاری میں معاصر کتب سے مدد لی گئی ہے۔ ایک مضمون "تغلق بادشاہوں کے مذہبی نظم و نسق" پر ہے۔ "اورنگ زیب اور اس کی حکمت عملی" پر ایک مضمون ہے۔ یہ سب مضمون اعلیٰ تحقیق کے اچھے نمونے ہیں۔ لیکن تحقیق صرف بیان کرنے کا کام نہیں ہے بلکہ تنقید کا کام بھی ہے۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ اس رسالے کے آئندہ نمبروں میں جو مضامین شائع ہوں گے وہ تحقیق و تنقید دونوں پر پوری طرح حاوی ہوں گے۔ تاریخ سے زندگی کے مسائل سمجھنے میں اسی وقت مدد مل سکتی ہے جبکہ وہ نقد و نظر کے دامن کو اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑے ورنہ وقائع اور تاریخ میں کچھ فرق نہیں رہتا۔ اس رسالہ کا علمی معیار جیسا بلند ہے اسی طرح اس کی چھپائی وغیرہ بھی دیدہ زیب ہے۔ سالانہ قیمت سے۔ فی پرچہ ہے۔ اڈیٹر صاحب جنرل آف دی علیگڈھ ہسٹاریکل ریسرچ انسٹیٹیوٹ۔ ۸ شبلی روڈ۔ مسلم یونیورسٹی، علیگڈھ (یو۔ پی) سے طلب کیا جاسکتا ہے۔

مجلۂ نظامیہ کا خصوصی شمارہ :۔ مجریہ ادارۂ ترقی تعلیم اسلامی۔ حیدر آباد (دکن)

مجلۂ نظامیہ کے اس شمارۂ خصوصی میں ملا عبد القیوم صاحب مرحوم کی زندگی کے متعلق مختلف اصحاب کے مضامین شائع کئے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملا صاحب مرحوم کی زندگی میں موجودہ نسل کے حیدر آبادیوں کے لئے بہت کچھ سبق موجود ہے۔ مرحوم بڑے زبردست عالم اور حق پرست شخص تھے۔ باوجود اپنے سرکاری مشاغل کے انھوں نے خدمت خلق کے مختلف کاموں کو جاری رکھا اور اپنے سرکاری اثرات کو بھی قوم و ملت کی فلاح و بہبودی کے لئے استعمال کیا۔ ملا صاحب اتحاد اسلامی اور آزادیٔ وطن کے

تصورات کو ایک دوسرے کی ضد نہیں سمجھتے تھے بلکہ دونوں تصورات کو ایک دوسرے کا معاون سمجھتے تھے۔ اس ملک کے مختلف فرقوں کے باہمی اتحاد کو ضرور خیال کرتے تھے۔ قومی تعلیم کے متعلق بھی ملا صاحب کے خیالات نہایت وسیع تھے۔ زمانہ نے بتا دیا کہ مرحوم کی رائے اس باب میں کس قدر صحیح اور صائب تھی۔

اس شمارۂ خصوصی میں ملا صاحب مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر عمدہ مضامین شائع کئے گئے ہیں اور ان تقاریر کا خلاصہ بھی درج کیا گیا ہے جو جلسۂ یادگار میں مرحوم کے متعلق مختلف مشاہیر دکن نے کی تھیں۔

تنقید و تبصرہ

ہندوستانی ریاستوں کی مالیات — The Finances of Indian states
از ڈاکٹر پی۔ جے۔ طامس — by Dr. P. J. Thomas.

اس مقالہ میں ڈاکٹر طامس نے ہندوستان کی چند اہم ریاستوں کی مالیات کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں آپ نے حیدرآباد، میسور، ٹراونکور، کشمیر، بڑودہ، اندور، کوچن، بیکانیر کے مدات آمدنی و خرچ سے متعلقہ ضروری اعداو شمار فراہم کئے ہیں اور ان پر تبصرہ کیا ہے۔ آپ نے واضح کیا ہے کہ ان سب کی سالانہ آمدنی ۳۲۷،۳۲ کروڑ روپیہ ہے اور یہ جملہ ریاستوں کی ۴۱ فی صد آمدنی پڑتی ہے۔ اکثر ریاستوں کی اہم ترین ذریعہ آمدنی مالگزاری ہے۔ مالگزاری کا بار سب سے زیادہ اندور اور سب سے کم ٹراونکور کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مذکورۂ بالا ریاستوں میں کروڑگیری کے ذریعہ ۴ ½ کروڑ روپے وصول ہوتے ہیں۔ حیدرآباد، اندور اور بیکانیر میں انکم ٹیکس کا رواج نہیں ہے۔ اور جن ریاستوں میں کہ یہ عائد کیا جاتا ہے وہاں کی شرح کم ہے۔ چند ریاستوں میں تجارتی محکموں سے خاصی آمدنی ہوتی ہے۔ چنانچہ میسور کی آمدنی کا ۵،۲۵ فیصد اور بیکانیر کی آمدنی کا ۵،۳۹ فی صد تجارتی محکموں سے حاصل ہوتا ہے۔

جہاں تک کہ خرچ کا تعلق ہے مقالہ نگار نے یہ واضح کیا ہے کہ حیدرآباد میں آمدنی کا ۲۱ فیصد، میسور میں ۲۰ فیصد، اندور میں ۵،۳۲ اور کشمیر میں ۸،۳۰ فیصد حصہ نظم و نسق

پھرف ہوتا ہے۔ والئی ریاست اور اس کے خاندان پر سب سے زیادہ مصارف بیکانیر میں ہوتے ہیں یعنی کل آمدنی کا ۲۳ فیصد حصہ اس مد پر خرچ کیا جاتا ہے اور حیدر آباد میں اس پر صرف ۶،۶ فی صد خرچ ہوتا ہے۔ میسور نے چونکہ اپنی معاشی ترقی کے لئے بہت کچھ صرف کیا ہے۔ اس لئے وہاں قرضہ اور سود کی ادائی کے لئے آمدنی کا ۱۹ فی صد حصہ مختص کرنا پڑتا ہے۔ تعلیم پر ٹراونکور میں ۱۹،۷ کوچن میں ۱۹،۵ اور بڑودہ میں ۱۷ فی صد صرف ہوتا ہے۔ تعمیرات پر سب سے زیادہ حیدر آباد صرف کرتا ہے یعنی ۱۹ فی صد۔

ڈاکٹر طامس نے مزید کار آمد تفصیلات دئے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مالیاتی نقطۂ نظر سے ایک طرف اگر چند ریاستیں برطانوی ہند سے بڑھی ہوئی ہیں تو دوسری طرف ریاستوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جہاں کے حالات کچھ زیادہ تشفی بخش نہیں ہیں۔

(ع ۔ق)

Propaganda in International Politics. (بین الاقوامی سیاسیات میں پروپگنڈا کا کام از ای ایچ کار اکسفورڈ پمفلٹ نمبر ۱۶)

دنیا کے اہم سیاسی و معاشی مسائل کے متعلق اکسفورڈ سے جو مختلف پمفلٹ شائع ہوئے ہیں وہ سیاسیات کے ہر طالب علم کو ضرور پڑھنے چاہئیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے لوگوں نے سلیس اور آسان زبان میں لکھے ہیں جو اپنے اپنے مضمون پر زبردست محقق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی زیر نظر پمفلٹ ہے۔ اس میں پروفیسر کار نے بتایا ہے کہ سیاست میں رائے عامہ پر قابو پانا کس قدر اہم ہے۔ پروفیسر موصوف کا خیال ہے جو بڑی حد تک صحیح ہے کہ گزشتہ جنگ اگرچہ عسکری اور معاشی قوت کے بوتے پر جیتی گئی تھی لیکن اس کے جیتنے میں پروپگنڈا کا بھی بڑا حصہ تھا۔ آج یہ بات مسلم ہے کہ کسی مملکت کے قیام و بقا کے لئے منظم پروپگنڈا نہایت ضروری ہے۔ ریڈیو کے عام ہونے سے پروپگنڈے کی وسعت میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ کامیاب پروپگنڈا وہی ہو سکتا ہے

جو حقیقت اور صداقت سے تھوڑا بہت لگاؤ رکھے ورنہ محض ہوائی قلعے تھوڑے دنوں سے زیادہ نہیں چلتے۔ پروپگنڈا کی تاثیر کا انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ وہ کسی مسلمہ قدرحیات کی تائید میں کیا جائے اور سننے والوں کو باور کرا دیا جائے کہ پروپگنڈا کرنے والی جماعت ہی حق و صداقت کی شیدائی ہے۔ پمفلٹ کی قیمت ۳ پنس ہے۔

محشر خیال یہ سجاد علی انصاری مرحوم کے مضامین کا مجموعہ ہے جسے عرصہ ہوا پروفیسر خواجہ منظور حسین صاحب نے مرتب کیا تھا۔ اب اس مجموعہ کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے۔ سجاد مرحوم اُردو کے مایۂ ناز ادیبوں میں گذرے ہیں۔ افسوس ہے کہ عمر نے وفا نہ کی ورنہ وہ زبان و ادب کی بڑی خدمت کرتے۔ وہ ایک صاحب طرز لکھنے والے ہیں ان کے طرز میں حکیمانہ گہرائی اور نزاکت خیال، ادبی لطف اور طنز و ظرافت کی نہایت باکیف آمیزش ہے جس کے باعث ان کی تحریر میں بڑی دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ کوئی مضمون شروع کیجئے، جب تک ختم نہ کر لیجئے گا دل نہ مانے گا۔ جناب آلِ احمد صاحب سرور صدیقی نے "شعلۂ مستعجل" کے عنوان سے اس مجموعہ پر ایک مقدمہ لکھا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں سجاد مرحوم کے طرز تحریر اور ان کی تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتوں کا نہایت دلچسپ انداز میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ بقول موصوف۔

"سجاد انصاری نہ لیڈر تھے، نہ حاکم، نہ دولت مند۔ وہ پیشہ ور ادیب بھی نہ تھے عوام انھیں جانتے بھی نہیں۔ صرف خواص ہی ان سے واقف ہیں۔۔۔۔۔ ان کے یہاں فلسفہ اور ادب لطیف دونوں کا ایک حیرت انگیز امتزاج ملتا ہے۔ اس بنا پر وہ ادب لطیف کے فلسفی کہے جا سکتے ہیں۔ مگر ان کی رعنائی خیال آتش سیال اور ارتعاش رنگیں والی نہیں حقایق کو الٹنے پلٹنے اور ان کی رنگینی سے لطف اٹھانے سے پیدا ہوئی ہے۔ وہ اپنے اشائل کی وجہ سے اہم ہیں۔ مہدی افادی نے آزاد کے متعلق جو فقرہ کہا تھا وہ ان پر زیادہ صادق آتا ہے۔ یہ بھی صرف انشاپرداز ہیں" جنھیں کسی اور سہارے کی

ضرورت نہیں " ناشر خان الیاس احمد مجیبی صاحب۔ قرول باغ۔ نئی دہلی قیمت قسم اول سے قسم دوم بے جلد عہ؍ ۔ اور مجلد مع گرد پوش عہ ؍۸۔

تبویب حیدری یہ کتاب مولوی فضل اللہ احمد صاحب، بانی و مہتمم حیدری گشتی کتب خانہ حیدر آباد (دکن) نے جدید اصول کے مطابق کتابوں کی ترتیب اور فہرست سازی اور علوم وفنون کی تقسیم کے متعلق مرتب کی ہے۔ شروع میں مولوی حبیب الرحمٰن صاحب ناظم سررشتۂ معلومات عامہ سرکار عالی کا "پیش لفظ" ہے جس میں موصوف اس کی نسبت فرماتے ہیں۔ "جہاں تک میں غور کرسکا ہوں۔ مجھے یہ تبویب اتنی مفصل اور جامع معلوم ہوتی ہے کہ اردو زبان کا وسیع اور روز افزوں ذخیرہ اس میں بآسانی سما سکتا ہے۔ بڑی خوبی اس کی یہ ہے کہ اس میں ان طریقوں کی جو مغربی ملکوں میں رائج ہیں اندھی تقلید نہیں کی گئی ہے بلکہ اُردو زبان کی فطرت اور خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر مناسب تبدیلیوں کے ساتھ انھیں اپنا لیا ہے۔ حیدری گشتی کتب خانہ کے بانی اور مہتمم کی حیثیت سے مولوی فضل اللہ احمد صاحب کو کئی سال تک اس شعبہ پر غور کرنے کا موقع ملا ہے اور زیر نظر کتاب صاحب موصوف کے طویل عملی تجربہ کا نتیجہ اور اس وجہ سے خاص توجہ کی مستحق ہے" ہم موصوف کی اس رائے سے متفق ہیں۔ متعلقہ فن کے اصحاب کے لئے یقیناً یہ کتاب بیحد مفید ثابت ہوگی۔ قیمت ۸ ؍۔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد دکن۔

اُردو کا تدریجی قاعدہ مرتبہ محمد ہاشم (آئی ٹی سی) مددگار مدرس فوقانیہ عثمان آباد مطبوعہ انتظامی پریس۔ نظام شاہی روڈ۔ حیدر آباد (دکن)

اس قاعدہ کی بنیاد آواز اور اوزان پر رکھی گئی ہے اور کم وبیش سترہ سو الفاظ کو بلحاظ آواز و وزن ترتیب دیکر کتیس اسباق میں تدریجی تقسیم کیا گیا ہے۔ تدریج اس قاعدہ کی خاص خصوصیت ہے اور ہر سبق ایک خاص چیز کے لئے مخصوص ہے۔ امید ہے کہ یہ قاعدہ مبتدیوں کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

وشو وانڑی اس نام سے ابھی حال میں ہندی کا ایک ماہانہ رسالہ پنڈت سندر لال صاحب کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا، جس کا مقصد زیادہ تر سیاسی اور تمدنی مسائل کی عام فہم تشریح ہے۔ نیم علمی مضمونوں کے علاوہ اس رسالے میں کہانیاں نظمیں، کارٹون اور تصویریں بھی ہیں۔ البتہ انتخاب کا معیار بہت بلند ہے۔ طباعت بھی اچھی ہے، ایک رنگین اور کئی سادی تصویریں اور نقشے ہیں۔ زیر نظر رسالے میں "چینی تاریخ کا مقدمہ" اور "ہندوستان میں تاریخ کیسی لکھی جائے؟" اچھے مضمون ہیں۔ جناب منظر علی صاحب سوختہ کے مضمون کا عنوان ہے "آزاد ہندوستان میں نہ فوج ہوگی نہ ہتھیار رہوں گے" اس عنوان ہی سے لکھنے والے اور چھاپنے والے کی خوش اعتقادی کا پتہ چلتا ہے۔ لکھنے والوں میں سر سروپلی رادھا کرشنن، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر مہدی حسین، مہادیو دیسائی وغیرہ کے نام نظر آتے ہیں۔ رسالے کا سالانہ چندہ (ـے) ہے۔ ملنے کا پتہ: وشو وانڑی کاریالیہ، ساؤتھ ملاکا، الہ آباد۔

ہم سچے دل سے اس نئے رسالے کا خیر مقدم کرتے ہیں اور تمام تعلیمی اداروں سے اس کی سرپرستی کی توقع کرتے ہیں۔ یہ رسالہ یقیناً اس قابل ہے کہ تمام یونیورسٹیوں اور بڑے بڑے کالجوں کے کتب خانوں میں منگایا جائے۔ (ج)

ہندوستانی ادب یہ رسالہ ابھی حال میں مولوی غلام محمد خاں صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) کے زیر صدارت شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک مشترکہ زبان کی ضرورت کا اہل ملک میں احساس پیدا کیا جائے اور اس زبان کی جہاں تک ہو سکے خدمت کی جائے۔ یہ ایک مبارک مقصد ہے جو اس رسالہ کے مدیر نے اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ ہمیں پوری امید ہے کہ یہ رسالہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا۔ اس رسالہ کا اس وقت جولائی نمبر ہمارے سامنے ہے۔ مضامین میں علمی اور ادبی

دونوں ہیں اور ان کا معیار اچھا ہے۔ چندہ سالانہ للعہ ر ہے۔ قیمت ایک پرچہ ۶ر۔
پتہ (چینچل گوڑہ۔ حیدرآباد (دکن)

سریلے بول عظمت اللہ خاں مرحوم اردو زبان کے اعلیٰ پایہ کے نقاد اور شاعر تھے۔ شاعری میں انھوں نے اپنی راہ دوسروں سے الگ نکالی تھی۔ ان کی شاعری میں خاص طرح کی تازگی اور حقیقت پسندی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی شاعری کے لئے جو موضوع تلاش کرتے ہیں وہ بھی اچھوتے ہوتے ہیں۔ انھوں نے خود اپنے کلام کی سوغات آنے والی نسل کے نام جس طور پر پیش کی ہے اس کا اعادہ یہاں ضروری ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔
"اس آنے والی پود کے لئے جس کے ہونٹوں پر ابھی ماں کے دودھ کا مزہ کچھ یوں ہی سا باقی ہے، جس کی آواز میں ابھی لڑکپن کا سریلا پن گونج رہا ہے، یہ چند ایک نظمیں سوغات کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ اس پود کے پھلنے پھولنے کے بعد بڑا کام یہ ہوگا کہ اس کی نغمہ سرائی سے اُردو شاعری فطرت کی طرح وسیع ہو جائے اور فطرت ہی کی طرح گونج اُٹھے۔ اگر ان چند بولوں سے اس پود کو اُردو ادب کا ایک نیا دور طلوع کرنے میں ذرا سی بھی مدد ملی تو گویا ان ناچیز چیزوں کا صلہ مل گیا۔"

عظمت اللہ خاں مرحوم نے اُردو شاعری کو فطرت کی طرح وسیع کرنے میں پہلا قدم اٹھایا تھا۔ اس کام کی تکمیل ابھی باقی ہے۔

شائع کردہ عظمت زبیدہ بیگم۔ قیمت ۸عہ ر۔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن)۔

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز
مغلپورہ حیدرآباد دکن

سیاست، اپریل ۱۹۴۱ء

ہندی و یونانی نجوم کا مقابلہ

نظام عالم جنتری ۱۹۴۱ء مطابق ۱۳۵۰ف کے ملاحظہ سے بخوبی واضح ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں ہندی و یونانی ہیئت کے قواعد کی انتہائی چھان بین کرنے کے بعد علم ہیئت کو عملی جامہ پہنانے کی باکمال کامیاب کوشش کی ہے اور ہندی و یونانی حساب کے تحت علحدہ علحدہ سیارگان کا روزانہ استخراج مندرج ہے جس سے آپ ہندی و یونانی حساب کے باہمی تفاوت کو معلوم کر کے نہ صرف صحیح نتیجہ پر پہونچیں گے بلکہ مشہور و معروف جنتریوں کو قطعی بھول جائیں گے کیونکہ دیگر جنتریاں ایک فرسودہ اصول کے تحت تیار کی جاتی ہیں جس سے یہ بالکل مبرا ہے اور یہ بھی دعوی ہے کہ نظام عالم جنتری کے صحیح ہونے کی جانچ ماہرین علم ہیئت کے علاوہ دنیا کی رصدگاہیں بھی کریں تو انشاء اللہ تعالی سیارگان کے حساب میں کوئی فرق واقع نہ ہوگا۔ حاصل یہ کہ پبلک کو جنتری والوں کی اندھی تقلید سے بچانے کی خاطر علم نجوم کے کثیر الاستعمال محاورات و اصطلاحات وغیرہ کی وضاحت عام فہم الفاظ میں کی گئی ہے کہ وہ بلا امداد غیرے اپنا طالع و ستارہ اور تاریخ مطلوبہ پر نشست سیارگان کے نیک و بد نتائج معلوم کر سکیں بلکہ ہر شخص کو اپنی زندگی کا صحیح ماحول معلوم ہو گا مختصر یہ کہ نظام عالم جنتری شائقین کے لئے دعوت تحقیق اور فن دان منجمین کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہے۔ پس ان واقعات کی بنا پر نظام عالم جنتری کا ہر گھر میں رہنا لازمی ہے بظاہر یہ ایک جنتری ہے لیکن دو جنتریوں پر مشتمل ہے۔ قیمت فی جنتری ۸؍ علاوہ محصول ڈاک۔

مرتبہ۔ عالی حسین بخش منجم و ماہر علم الاحکام مصنف قواعد منجمین و نظام عالم جنتری۔ بازار صمصام الملک (حیدرآباد دکن)

ملنے کا پتہ

سید عبدالقادر اینڈ سنس تاجران کتب چارمینار حیدرآباد دکن — سید عبدالرزاق تاجر کتب عابد روڈ حیدرآباد دکن

کارنامہ حیدری — رائٹ آنریبل نواب سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم ملکت آصفیہ کی مکمل سوانح حیات مع خدمات و بیانات قلمبند کئے گئے ہیں جس میں متعدد تصاویر کاغذ اور چھپائی نفیس۔ قیمت مجلد (سے؍)

مشاہیر ہند — اس کتاب میں چھ مشاہیر ہندوستانی یعنی آغا خاں۔ اقبال۔ سر اکبر حیدری۔ بوس۔ ٹیگور اور جواہر لال نہرو کے سبق آموز سوانح حیات اور ان کے علمی ادبی کارناموں پر تبصرے قوم پرستی کے کارنامے اور ان کے پیغامات کو بہترین پیرایہ میں درج کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد (عہ؍)

المشتہر سید عبدالقادر اینڈ سنس تاجران کتب و پبلشرز مالک اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز

مکتبہ جامعہ کی نئی کتابیں

خطوط محمد علی:- یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا نے اپنے عزیزوں، دوستوں اور ملک کے سر برآوردہ حضرات کو لکھے تھے۔ ان میں سے چند خط اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور بقیہ "محمد علی میوزیم" کتب خانہ جامعہ سے لئے گئے ہیں۔

کسی شخص کے خط صحیح معنوں میں اس کی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ سوچتا ہے اور جو اس کے دل پر گزرتی ہے بلا تکلف اپنے دوستوں کو لکھ دیتا ہے۔ مرحوم کا تو یہ حال تھا کہ وہ سیاست تک میں زمانہ سازی اور ظاہر داری کے قائل نہ تھے اور اپنے دوستوں کو لکھنے میں تکلف نہ برتتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ خطوط ہندوستان کے ایک ہنگامہ خیز دور کی تاریخ کے ابواب ہیں اور مرحوم کی شخصیت کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ۔ حجم ۳۰۲ صفحات۔ قیمت عہ/

بحر الکاہل کی سیاست:- مصنفہ ابن خالدی۔ اس مقالے میں مصنف نے بحر الکاہل کی سیاسی اور معاشی اہمیت ظاہر کی ہے۔ موصوف نے امریکہ، جاپان، روس، انگلستان اور چین کے مفاد کے باہمی اتحاد اور ان کی ایک دوسرے سے ٹکر کے امکانات پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔ قیمت ۸؍ روپے۔

اسلامی ممالک کی سیاست:- مصنفہ عشرت علی مصنف نے اس کتاب میں مختلف اسلامی ملکوں کے سیاسی اور تاریخی ارتقا پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ جنگ عظیم سے پہلے مصر، ترکی، عراق، عرب اور ایران وغیرہ کی سیاسی اہمیت کیا تھی اور جنگ عظیم کے بعد ان ملکوں میں کس قسم کی نئی سیاسی تحریکیں اٹھیں، ان کا کیا حشر ہوا اور موجودہ وقت میں ان کی سیاسی اور جنگی حیثیت کیا ہے۔ قیمت عہ روپے۔

قومیت اور بین الاقوامیت:- مصنفہ محمد قاسم حسن۔ مصنف نے اس مقالے میں قومیت کے مفہوم کی تشریح کی ہے اور اس کے عناصر سے بحث کی ہے۔ نیز بتایا ہے کہ قومیت کا ارتقا کس طرح ہوا

مشرق میں قومیت کا تصور کیا ہے اور یورپ والے کس قسم کی قومیت کے قائل ہیں۔ اس مسئلہ کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ بین الاقوامیت کے تخیل کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ اس کا موجودہ تصور کیا ہے اور مستقبل میں اس کی کیا نوعیت ہوگی۔ آخر میں انجمن اقوام کی ہیئت اس کے ارتقاء، اس کی کارگزاریاں اور اس کی ناکامی کے اسباب پر بھی تبصرہ ہے۔ قیمت عہ روپے۔

نازیت:۔ مصنفہ شاہ حسین رزاقی۔ یہ سمجھنا کہ نازیت کا تخیل ہٹلر کی دماغی پیداوار ہے اور ہٹلر نہ رہے تو نازیت خود بخود ختم ہو جائے گی بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہٹلر نازیت کی پیداوار ہے اور یہ نظریہ دراصل ایک جدید ارتقاء کا نتیجہ ہے جسے ہٹلر نے پروان چڑھایا۔ مصنف نے آخر میں نازیت کے اچھے اور برے پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا ہے۔ قیمت عہ روپے۔

ناموران سیاست:۔ موجودہ جنگ کی وجہ سے ہر شخص کو سیاسی معاملات سے خاص دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ ہٹلر، مسولینی، روزولٹ، اسٹالن، چرچل اور عصمت انونو ہر شخص کی زبان پر رہتے ہیں۔ ان کے حالات سے ناواقفیت کی بنا پر معاملات صحیح طور پر سمجھنے میں کبھی کبھی دشواری پیدا ہوتی۔ اس کتاب میں ایشیا اور یورپ کے انھیں مسلمہ سیاسی رہنماؤں کے حالات درج ہیں۔ اس میں بہت سے ایسے لوگوں کے حالات بھی ملیں گے جو غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے لیکن اپنی ہمت کی رہنمائی سے آج بڑی بڑی سلطنتوں کے مالک ہیں اور چھوٹی سلطنتوں کی آزادی ان کے رحم و کرم پر موقوف ہے۔ قیمت حصہ اول ۶ر

حصہ دوم "مشاہیر عالم" زیر ترتیب ہے۔

ٹروٹسکی:۔ مترجمہ۔ ایم۔ ایم۔ جوہر۔ ٹروٹسکی کو کون نہیں جانتا۔ موجودہ روسی حکومت نے اسے باغی قرار دے دیا تھا۔ اس کے جو ساتھی اب تک روس میں موجود تھے ۱۹۳۶ء میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ ان مجرموں نے اپنے جرم کی ذمہ داری ٹروٹسکی پر ڈال دی۔ ٹروٹسکی کی صفائی اور غداری کی خاطر امریکہ میں ایک کمیشن بنایا گیا جس نے ٹروٹسکی کے بیانات لئے۔ یہ کتاب انھیں بیانات کا خلاصہ ہے اور یہ ان تمام کارناموں کا کچا چٹھا ہے جو روس میں اشتراکیت کے پردے میں کئے جا رہے ہیں۔

شروع میں روسی انقلاب کی مختصر سی تاریخ بھی آگئی ہے۔ زبان اتنی صاف اور سہل ہے کہ معمولی استعداد کا آدمی بھی اچھی طرح ذہن نشین کرسکتا ہے۔ قیمت دس آنے۔

بت تراش :- از پروفیسر اشتیاق حسین قریشی۔ اس ڈرامے میں مصنف نے ایک بت تراش کی نفسی کیفیات کی تصویر کھینچی ہے اور اسی سلسلے میں حسن و عشق اور دنیا کی تخلیق میں رنج و مسرت کے وجود پر ایک فلسفیانہ نظر ڈالی ہے۔ انداز تحریر اس قدر دلکش ہے کہ پڑھنے والا مصنف کی نظر سے دیکھتا ہے اور اسی کے دماغ سے سوچتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ قیمت ۴ر

صدر دفتر :- مکتبہ جامعہ، قرول باغ نئی دہلی

شاخیں :- (۱) مکتبہ جامعہ، جامع مسجد، دہلی (۲) مکتبہ جامعہ، بیرون لوہاری دروازہ، لاہور۔
(۳) مکتبہ جامعہ امین آباد، لکھنؤ (۴) مکتبہ جامعہ پرنسس بلڈنگ، بمبئی (۳)

سول ایجنسیاں :- کتاب خانہ عابد شاپ۔ حیدرآباد دکن (۲) سرور بک۔ ایجنسی بازار قصہ خوانی پشاور

فارمس درخواست ابتدائی وظیفہ مادر دکن

وظائف تعلیمی فنڈ

طبع ہو چکے ہیں۔ بقیمت (۶ر) پتہ ذیل سے طلب فرما سکتے ہیں۔

سید عبدالقادر اینڈ سنس تاجران کتب

چار مینار حیدرآباد دکن

پتہ میں ایشیا میرٹھ (یو۔پی) لکھنا نہایت ضروری ہے

ماہنامہ "ایشیا" میرٹھ کا مکاتیب نمبر

ہندوستان کے تمام مشاہیر ادب، شعراء، انشاپردازوں، افسانہ نگاروں اور مشہور ہستیوں کے خطوط کا غیر فانی مجموعہ

مرتبہ **حضرت ساغر نظامی**

اردو میں اس قسم کی کوئی مستند اور اعلیٰ کتاب اس وقت تک شائع نہیں ہوئی جس میں ترتیب اور لطیف حواشی کے ساتھ ملک کی مشہور ہستیوں کے سیاسی، علمی، ادبی، شعری اور اسلوبی خطوط بہ یک وقت جمع کر دیے گئے ہوں۔ "ایشیا" نے اپنا تازہ نمبر "مکاتیب نمبر" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یوں تو ہر لفظ جو کسی زبان سے نکلتا یا قلم سے لکھا جاتا ہے اپنے موضوع پر کم و بیش روشنی ڈالتا ہے لیکن خطوط اور خاص کر وہ خطوط جو بڑے آدمیوں کی طرف سے اپنے بے تکلف احباب کو لکھے جاتے ہیں زیادہ مفید ثابت ہوتے ہیں۔ ان سے طبیعت کی گہرائیوں اور حالات و واقعات کی اصلیتوں کا راز فاش ہوتا ہے جو سماجی رکھ رکھاؤ اور ادبی رسوم و تکلفات کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ مکاتیب کی مدد سے ہمیں لکھنے والوں کی پبلک زندگی سے لیکر خانگی حالات اور ذاتی رجحانات تک کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس طرح ان تمام افعال کی توجیہ میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے جو بادی النظر میں ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز معلوم ہوتے ہیں اور اصل میں احساسات کے نازک اور لطیف رشتوں سے منسلک ہیں۔

یہ نمبر کتابی صورت میں ۲۲×۱۸/۸ سائز کے ۳۰۰ صفحات پر شائع ہوا ہے۔ اس جنگ کے زمانے میں نہایت بہتر چھپائی، نفیس سپید کاغذ، شاندار سرورق، جدت نواز گردپوش اور اپنے خطوط کے لحاظ سے تو سینکڑوں جدتوں اور دلچسپیوں کا حامل ہے۔ اس نمبر کی مثال دنیائے ادب میں آسانی سے نہیں مل سکتی۔

مکاتیب نمبر کے چند مکتوب نگار

پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر سید محمود، جی۔بی کرپلانی، خواجہ حسن نظامی، ڈاکٹر عبدالحق، رشید احمد صدیقی، جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، حکیم آزاد انصاری، ڈاکٹر اشرف، اختر شیرانی۔ مانی جائسی، ارشد تھانوی، تاجور نجیب آبادی، شوکت تھانوی۔ حسرت موہانی۔ مجاز لکھنوی، ڈاکٹر تاثیر، سہا بی۔اے، آنند نرائن ملا۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی۔ احسن مارہروی، وقار انبالوی، ماہر القادری، عرش ملسیانی، الطاف مشہدی، ثاقب کانپوری۔ سید ضامن علی ایم۔اے، عسکری طباطبائی، فراق گورکھپوری۔ عبدالباری آسی۔ امین حزیں۔ سید مطلبی فرید آبادی۔ حامد اللہ افسر بی۔اے، سید عابد علی ایم۔اے، سر شاہ سلیمان مرحوم، سید راس مسعود، بشیر احمد بی۔اے (آکسن) منصور احمد، عزیز لکھنوی، فلک پیما، منظر تھانوی، مجنوں گورکھپوری، نیاز فتحپوری، سہیل عظیم آبادی۔

غرضکہ ہندوستان کا کوئی مشہور ادیب یا شاعر ایسا نہیں جس کے ایک دو خط اس نمبر میں نہ مل جائیں خطوط کے علاوہ خطوط پر دو شاہکار نظمیں اور چند علمی و تنقیدی مقالے جو مکتوب نگاری سے ہی تعلق رکھتے ہیں اس مجموعہ میں ہیں جنہوں نے اسکی اہمیت کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔

قیمت فی جلد ۸؍ مع محصول، جو صاحب ایشیا کی مستقل خریداری فرمائینگے وہ اسے

مفت

حاصل کر سکتے ہیں۔ قیمت ایشیا میرٹھ (سالانہ عہ)

مینجر رسالۂ "ایشیا" ادبی مرکز "میرٹھ"۔

جغرافیہ اور اٹلس تاریخی و جغرافیہ

(مرتبہ مولوی سید شرف الدین صاحب قادری - ایم - اے - بی - ٹی)

جدید اٹلس - یہ بالکل جدید طرز کا اٹلس ہے جس میں تمام ممالک کے (۳۳) عدد رنگین نقشے اور متعدد تصاویر شامل ہیں۔ اب اس کا نیا ایڈیشن طبع ہوا ہے۔ سائز بڑی اور واضح ہے۔ صرف ایک جلد کی خریداری پر اس کی خوبیوں کا اندازہ ہو سکتا ہے قیمت ۱۲؍ کلدار - ۱۴؍ سکہ ع

ارزاں اٹلس - اس میں (۱۷) عدد رنگین نقشے اور تصاویر ہیں اور قیمت میں بہت ہی سستی ہے ۶؍ کلدار یا ۷؍ ۶؍ حالی

تاریخی اٹلس - یہ اٹلس بہت ہی مقبول ہوا ہے۔ جس کے ہزاروں نسخے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو چکے ہیں۔ اب اس کا نیا ایڈیشن طبع و شائع ہو چکا ہے۔ اس میں تاریخ ہند کے ۲۱ عدد رنگین نقشے اور ہر نقشہ کے ساتھ تاریخ کے ضروری نوٹ بھی چھاپے گئے ہیں۔ طلباء کے مفید ہونے کے علاوہ عام لوگ بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ باوجود ان خوبیوں کے قیمت صرف ۷؍ کلدار یا ۸؍ حالی۔

جیبی اٹلس تاریخ و جغرافیہ - یہ اُردو زبان میں ایک پہلا اٹلس ہے۔ قریب قریب نصابی حیثیت سے مکمل ہونے کے علاوہ عام شائقین کے دلچسپی کا باعث ہے۔ طلبا کے لئے تو نہایت ہی مفید ہے۔ جس میں عکسی بلاکوں کے (۴۲) عدد نقشے رنگین اور بے شمار سادہ نقشہ جات و تصاویر کے علاوہ تاریخ اور جغرافیہ کے متعلق پوری پوری شرح موجود ہے۔ ضخامت ۱۸۵ صفحہ قیمت ۷؍ کلدار یا ۸؍ حالی۔

مصور جیبی اٹلس دنیا - یہ اٹلس شروع سے آخر تک عکسی بلاکوں کے ذریعہ قیمتی آرٹ پیپر پر نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ ابھی چند ہی روز ہوئے طبع و شائع ہوئی ہے۔ سب نقشہ جات و تصاویر رنگین بلاکوں سے چھپے ہیں جس کا مطالعہ طالب علموں کے لئے ہر حیثیت سے مفید اور کارآمد ہے۔ قیمت ۷؍ کلدار یا ۸؍ حالی۔

مرقع عالم۔ اس کو مؤلف نے برسوں کی محنت اور سالہا سال کے وسیع تجربے کے بعد اہل ملک کے سامنے پیش کیا ہے امید کی جاتی ہے کہ علم دوست حضرات شوق و ذوق اس کے مطالعہ سے دلچسپی لے کر مؤلف صاحب کی رہنمائی فرمائینگے یہ سہ حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں ہاف ٹون بلاک کی رنگین و سادہ ۴۰ تصویریں اور دوسرے حصے میں لائن بلاک کے ۴۶ رنگین نقشے ہیں۔ تیسرے حصے میں ہر دو کا خلاصہ بشکل مضمون دیا گیا ہے۔ آج تک تاریخ اور جغرافیہ عام معلومات کے لئے کوئی کتاب اس نوعیت کی شائع نہیں ہوئی۔

قیمت مجلد ۲/۸ کلدار یا ۲/۱۴ حالی۔

جدید تاریخ ہند ہندوستان کی ایک صحیح، مستند اور جامع تاریخ ہے۔ جو پانچ جلدوں میں **پانچ جلدوں میں** طبع اور شائع ہو رہی ہیں۔ اور ہر جلد اپنے مخصوص مضامین کے اعتبار سے ایک مکمل حیثیت رکھتی ہے۔ جلد دوم جلد سوم جو علی الترتیب سلاطین افغانیہ اور شاہان مغلیہ کے عہد ہائے حکومت ظاہر کرتی ہے۔ (یعنی ہندوستان میں مسلمانوں کے دور فرمانروائی کی تاریخ ہے) طبع ہوئے ہیں۔ جس میں تصاویر اور نقشے موزونیت کے لحاظ سے شریک کئے گئے ہیں۔ اور یہ عثمانیہ میٹرک سے لے کر بی۔ اے تک یہ کتابیں بڑی خوبی سے کام دے سکتی ہیں چونکہ یہ محدود تعداد میں طبع ہوئی ہیں۔ اس لئے ہم پبلک سے عموماً جامعہ عثمانیہ کے انڈر گریجویٹوں سے خصوصاً درخواست کرتے ہیں کہ یہ دونوں جلدیں اپنی اولین فرصت میں خرید کر فائدہ اٹھائیں۔ ہمارا یہ ایقان ہے کہ شائقین جدید تاریخ ہند کو خرید کر کبھی مایوس نہیں ہوں گے۔

قیمت ۱/۸ کلدار یا ۱/۱۲ حالی

ناشر

سید عبدالقادر اینڈ سنس تاجران کتب

حیدرآباد دکن

سیاست

جلد ۳ | اپریل ۱۹۴۲ عیسوی | نمبر ۲

فہرست مضامین

عہد نبوی کی سیاست خارجہ کا خاکہ

از

جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب

پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تاریخ عالم میں ایک انقلابی
اور ایک عہد آفریں دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایران اور روم کی سلطنتیں دنیا پر
جانے کی کوشش میں باہم زندگی و موت کی آویزش میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ اگرچہ چین اور ہند
بھی متمدن قومیں حکمران تھیں لیکن بحر متوسط اس زمانے میں بھی نہ صرف جغرافی اعتبار سے
سیاسی و معاشی حیثیت سے "وسط الارض" (دھرتی کا درمیان) تھا۔ یونان اسی سمندر پر آباد
ے تو روم بھی مصر و شام بھی اسی کے ساحل پر ہیں تو خود عرب کی شمالی سرحدیں اسی پر ختم
تی ہیں۔ ایران بھی اپنے حدود مملکت اس تک پہنچانے کی کوشش میں تھوڑی تھوڑی مدت
سے کئی بار کامیاب ہو چکا تھا۔ قدرت نے عرب کو ایشیا یورپ اور افریقا کے تینوں
عظموں کے بیچوں بیچ پیدا کیا ہے اور اس عرب میں بھی مکہ آباد ساحلی علاقے کے وسط
میں واقع ہے۔ اور یہ کوئی شاعری نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے کہ مکہ معظمہ ناف زمین پر آباد
ہے اور پرانی دنیا کی کوئی عالمگیر تحریک اس سے بہتر مرکز مشکل سے پا سکتی ہے یورپ
کی سردیوں افریقا کی گرمیوں اور ایشیا کی سرسبزیوں میں سے ہر ایک کا کچھ نہ کچھ حصہ حجاز کو
ملا ہے اور اس امر نے وہاں والوں کو تینوں براعظموں کی اخلاقی خوبیاں عطا
کی تھیں جنگی نقطۂ نظر سے بھی اس سے بہتر مقام کم مل سکتے ہیں۔

سنہ ۶۱۰ء میں پیغمبر اسلام نے اپنے آبائی شہر مکہ میں اصلاح دین کی کوشش شروع

فرمائی معدودے چند لوگوں کے ہم خیال ہونے کے ساتھ ساتھ عام اہل ملک کی دشمنی اور عملی مخالفت میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ آخر تیرہ کٹھن سالوں کے اختتام پر ۱ھ ۶۲۲ء میں آپ کو وطن سے بے وطن ہو کر مدینۂ منورہ جا رہنا پڑا جیسا کہ معلوم ہے نزاع میں آپ نے

حدود مملکت نبویہ بوقت صلح حدیبیہ ۶ھ

ونقشہ عرب

توسیع مملکت نبویہ :-

۱ھ مدینہ و ینبع — ۲ھ بدر

۳ھ قردہ (نجد) — ۴ھ فید (نجد)

۵ھ قبیلہ کلب و مقام عسفان — ۶ھ قبیلہ کلب و یمامہ

ایک تنظیم پیدا کرنے اور ایک شہری مملکت کے قائم کرنے میں کامیابی حاصل فرمائی جس کا تحریری دستور تاریخ نے آج تک (۵۲) دفعات کی ایک دستاویز کی صورت میں محفوظ رکھا ہے۔[1]

---

[1] اس پر میرا مضمون "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور" مجلہ طیلسانین حیدرآباد دکن، جولائی ۱۹۳۹ء

مدینہ آنے کے چند ہی مہینوں بعد آپ آس پاس کے قبائلی علاقوں کا دورہ فرمانے اور ان سے حلیفانہ تعلقات فرمانے لگے چنانچہ مدینے سے ینبع تک جو علاقہ ہے وہاں کے قبائل (بنی ضمرہ مُدلج وغیرہ) نے باوجود اسلام قبول نہ کرنے کے اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ اگر کوئی مدینے پر حملہ آور ہو تو یہ مسلمانوں کو مدد دیں اور اگر ان کے علاقے پر کوئی چڑھائی کرے تو مسلمان ان کو مدد دیں البتہ جارحانہ پیش قدمی میں غیر جانبداری برتی جائے[1]۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں سے کاروانی قافلے گزرا کرتے تھے اور مکے والے اگر شام، مصر یا عراق جانا چاہتے تو اسی راستے سے گزرتے تھے۔ اس راستے کی بندش قریش پر معاشی دباؤ ڈالنے میں اتنی موثر ثابت ہوئی کہ بدر کی فاش شکست بھی انھیں اتنا بے بس نہ کر سکی۔ ۳ھ میں اُحد میں مسلمانوں کو صدمہ پہنچا لیکن فوراً ہی انھوں نے اس کی تلافی یوں کی کہ نجد کے علاقے میں جو مدینے کے مشرق میں ہے، اپنے اثرات پھیلا دئے اور مکے والوں کو عراق جانے کا جو متبادل گو تکلیف دہ راستہ باقی رہ گیا تھا وہ بھی بند ہو گیا۔ اسی اثناء میں بنی قَیْنُقاع اور بنی النَضیر کے یہودی مضافاتِ مدینہ سے جلاوطنی پر مجبور ہوئے تو انھوں نے مدینے کے شمال میں خیبر وغیرہ کی یہودی بستیوں میں جا کر بسنا اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنی شروع کیں اور قریش و غطفان وغیرہ قبائل کو ورغلانا آغاز کیا۔ عرب کے شمال میں دومۃ الجندل ایک بڑا اہم کارروانی جنکشن تھا۔ مدینہ آنے والے کاروانوں کو یہاں چھیڑا جانے لگا[2] جو کوئی تعجب نہیں کہ یہودی سرمایہ اور ان کے اثرات ہی کے باعث ہو۔ اور انھیں یہودیوں کی کوشش سے غطفان و فزارہ نے ایک طرف سے اور قریش اور ان کے حلیفوں نے دوسری طرف سے خندق کے معرکے میں مدینے کا محاصرہ کیا اور انتظام کر لیا گیا کہ عین نازک لمحے میں مدینے کے اندر کے ما بقی یہودی یعنی

---

[1] ان کے متن کے لئے دیکھئے میری عربی تالیف الوثائق السیاسیہ (قاہرہ ۱۳۶۰ھ)

[2] التنبیہ والاشراف للمسعودی ص ۲۴۸

بنی قریظہ میں غداری کریں جب کسی طرح یہ بلا ٹلی اور بنی قریظہ کو اپنے کئے کی بھگتنی پڑی تو خیبر، اور وادی القریٰ و مقنا وغیرہ کے یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف نئے سرے سے جد و جہد کا آغاز کیا۔

یہ مسلمانوں کے لئے بڑا نازک زمانہ تھا۔ شمال میں خیبر وغیرہ یہودی قوت کے مرکز تھے۔ شمال مشرق میں فزارہ و غطفان کے قبایل خیبر والوں کے حلیف تھے اور ان کی مسلمانوں سے بنتی نہ تھی اور جب موقع ملتا یہ مسلمانوں کی تاخت کے در پے رہتے تھے[1]۔ جنوب میں مکہ تھا جس کی قوت چاہے معاشی طور سے متاثر ہوئی ہو، جنگی حیثیت سے برقرار تھی اور یہ سب کے سب غم و غصہ سے بے قرار اور مسلمانوں کے خلاف خار کھائے بیٹھے تھے اور سابقہ جلا وطنوں کی جلن الگ تھی۔ آثار یہ نظر آرہے تھے کہ خیبر میں جا بسے ہوئے (جلا وطنان مدینہ یعنی) بنی النضیر کی کوششیں رنگ لائیں گی اور یہود، غطفان اور قریش کی سہ گانہ قوت مدینے پر ہلہ بول دے گی جس کی مدافعت آسان نہ تھی۔ معرکۂ خندق میں دس ہزار کا لشکر مدینے پر چڑھ آیا تھا جس میں یہود شریک نہ تھے۔ مجوزہ حملے میں کچھ نہیں تو تین چار ہزار مزید سپاہیوں کا اضافہ ہو جاتا۔ خندق میں جوان اور بچے ملا کر مسلمانوں کے پاس کوئی تین ہزار آدمی تھے۔ اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔

ضرورت تھی کہ خیبر اور مکہ دونوں کی قوت کا استیصال کیا جائے مگر مسلمانوں کے پاس اتنی قوت نہ تھی کہ وقت واحد میں ان دونوں مرکزوں پر حملہ کر سکتے یا کم از کم مدینے کی مدافعت کے قابل محافظ دستہ چھوڑ کر کسی ایک مرکز کو تباہ کر سکنے والی فوج روانہ کر سکتے ساتھ ہی ان کا یہی خوف لگا ہوا تھا (جیسا کہ شمس الائمہ سرخسی نے کتاب المبسوط[2] میں نہایت بالغ نظری اور دور بینی سے واضح کیا ہے) کہ اگر مسلمان مکہ جاتے ہیں تو خیبر و غطفان مدینے پر چڑھ دوڑیں گے

---

[1] عیینہ بن حصن الفزاری کی تاخت مدینہ وغیرہ کی طرف اشارہ ہے۔ [2] جلد ۱۰ ص ۹

ور اگر مسلمان خیبر جائیں تو مکہ والے اپنے حواشی و موالی کے ساتھ آ کر مدینہ لوٹ نہ لیں۔ کیونکہ مدینہ بیچوں بیچ واقع ہے۔ خیبر اس کے شمال میں کوئی آٹھ منزل کی مسافت پہ ہے تو مکہ اس کے جنوب میں بارہ منزل پر ہے۔

ان حالات میں سیاست دانی کا اقتضاء یہی ہو سکتا ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک سے صلح کر کے دوسرے کے مقابلے میں اس کو دوست ورنہ کم از کم ناطرفدار بنا دیا جائے اور جب ایک سے فراغت ہو جائے گی تو دوسرا خود ہی ہتھیار ڈال دے گا اور پھر اسے مزوری کی جراءت نہ ہو گی۔ سوال یہ تھا کہ صلح مکے والوں سے کی جائے یا خیبر والوں سے۔ خیبر کے حلیف و معاون یعنی فزارہ و غطفان محض لوٹ مار کے شائق اور بالکل بے اصول خانہ بدوش عرب تھے۔ خیبر میں یہودی تھے جو تمدنی اور نسلی وجوہ سے عربوں سے الگ تھے۔ ان کو اپنی جلاوطنی اور جائداد کے لٹنے کا داغ تھا جو جائداد کی واپسی کے بغیر مٹ نہ سکتا تھا۔ سرمایہ داری کی وجہ سے کوئی معمولی "مابہ الاحتفاظ" ان کو مطمئن نہ کر سکتا تھا اور نہ ہی ان کی بات پر کوئی اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ خیبر کا مالدار مرکز ایک نسبتہً غیر جنگجو قوم کے قبضے میں ہونے سے آسان تر مال غنیمت بھی تھا۔

دوسری طرف مکہ مسلمانوں کے لئے بہت ہی رعایتوں کا متقاضی تھا۔ مسلمان مہاجر سب مکی ہی تھے اور اہل مکہ ان کے رشتہ دار۔ کعبہ مسلمانوں کی نماز کا قبلہ اور حج کی منزل مقصود تھا۔ اہل مکہ کی تباہی سے زیادہ ان کا اسلام زیادہ مفید ہو سکتا تھا۔ کیونکہ قریش کے معاشی اور تمدنی تعلقات تمام عرب سے تھے۔ اور ان کی صلاحیتیں پورے عرب میں سب سے زیادہ تھیں کیونکہ ان میں بات کا پاس تھا، وہ دھن کے پکے تھے، قومی مفاد کے لئے باہمی دشمنی سے الگ ہو جاتے تھے، طبیعت مہمات پسند تھی، ادبی ذوق اور انتظام ملک کی قابلیت و ملکہ بھی عام بدویوں کے مقابلے میں ان میں کہیں بڑھا ہوا تھا۔ اور شاید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے معاشی دباؤ کے باعث اب وہ واقعی صلح پر آمادہ بھی ہو چکے تھے اور صرف

لاج رکھنے کے لئے کسی اچھی شرط کے منتظر تھے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں حجاز میں سخت قحط پڑا تھا اور مکے والوں کی رسد کے مرکز یمامہ پر بھی مسلمانوں کا (ثمامہ بن اُثال کے اسلام لانے کے باعث) قبضہ ہو کر درآمد بند ہو گئی تھی[1]۔ رسول کریمؐ نے اس بندش کا اثر محسوس کرا دینے کے بعد اپنی مرضی اور اختیار سے ممانعت اٹھا کر[2] نیز مکے والوں میں سے غربا و فقراء کی امداد کے لئے سرمایۂ قحط میں اسی زمانے میں پانچ سو اشرفیاں روانہ کر کے[3] وہاں کے عوام کے دل موہ لئے تھے اور مکے کے سب سے بڑے اور با اثر سردار ابوسفیان کی لڑکی بی بی ام حبیبہؓ سے جو حبشہ گئی ہوئی تھیں، اسی زمانے میں عقد غائبانہ کر لیا تھا نیز مختلف سامان ضرورت (کھجور وغیرہ) ابوسفیان کو "ہدیہ" بھیج کر معاوضہ میں جانوروں کی کھالیں طلب کی تھیں[4]۔ غرض باوجود حالتِ جنگ قائم رہنے کے یہ خاموش دلدہی کے کام جاری تھے۔ قریش کے حج کا زمانہ بھی آگیا تھا جس میں وہ مسلسل تین ماہ تک لڑائی بھڑائی حرام سمجھتے اور اس میں ان کا سخت ترین دشمن بلکہ قابلِ قصاص ملزم بھی ان کے شہر میں انھیں ملتا تو اس پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ مسلمانوں نے بھی قریش ہی کے کعبہ کو اپنا قبلہ بنا لیا تھا اور حج کعبہ کو بھی اپنے دین کا جزو بنا لیا تھا جس کا نفسیاتی اثر قریش پر پڑے بغیر رہ نہ سکتا تھا۔

ان حالات میں معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریمؐ نے یہ سوچا کہ اگر حج کے مہینوں میں مکہ جائیں اور ارادہ طواف کعبہ اور قربانی وعمرہ کے لئے ہو اور قریش کو منہ مانگی شرطیں پیش کی جائیں تو کوئی تعجب نہیں جو وہ صلح پر آمادہ ہو جائیں۔ اور اتفاق سے اسی زمانے میں نینوہ کے مقام پر ایران و روم کی صدیوں سے چلی آنے والی جنگ ایران کی مکمل اور قطعی شکست پر

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص ۹۹۷ تا ۹۹۸۔ استیعاب ابن عبدالبر، سوانح عمری ص ۲۷۸

[2] ایضاً

[3] مبسوط سرخسی جلد ۱۰ ص ۹۱ تا ۹۲۔ شرح السیر الکبیر سرخسی جلد ۱ ص ۶۹

[4] مبسوط سرخسی جلد ۱۰ ص ۹۲۔ شرح السیر الکبیر سرخسی جلد ۱ ص ۷۰

منتج ہوئی تھی[1] اور کچھ اور نہیں تو عرب میں جو "لاوارث" ایرانی صوبے مثلاً یمن، بحرین اور عمان تھے ان کے متعلق حسب دلخواہ کارروائی کرنے کا اس بین الاقوامی صورت حال کے باعث ایک خداداد اور نادر موقع بھی ہاتھ آگیا تھا۔ یمامہ پر قبضہ کے باعث مسلمان پہلے ہی بحرین و عمان کے قریب پہنچ گئے تھے۔ قریش کا ہموار ہونا یمن کا راستہ بھی کھول دیتا تھا اور رومیوں کی نینوہ میں کامیابی ابھی فی الحال شمال میں کسی بڑی کارروائی میں مانع تھی۔

ہمیں معلوم ہے کہ مدینے میں قابل کار مسلمان مرد تقریباً تین ہزار تھے۔ اب ذی قعدہ کے مہینے میں رسول کریمؐ چودہ سو آدمیوں کے ساتھ مدینے سے چلتے ہیں۔ حج کا احرام بندھا ہوا ہے۔ ساتھ قربانی کے جانور ہیں۔ اور ارادہ محض مسالمانہ ہے اس لئے ساتھ جنگی ہتیار تک نہیں ہیں (البتہ کچھ دور جانے کے بعد حضرت عمرؓ کے مشورہ سے احتیاطاً مدینے سے فوجی مخزن منگالیا جاتا ہے[2] جو ساتھ تو رہتا ہے مگر بند حالت میں) مسلمان کافی فوج مدینے میں چھوڑ گئے تھے اور خاموشی کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں سے حدودِ حرم شروع ہوتے ہیں۔ جہاں سے ساحلی میدان ختم ہو کر دشوار گزار وادیاں اور پہاڑی سلسلے شروع ہوتے ہیں۔ مکے والوں کو اطلاع مل گئی تھی اور جنگی نقطۂ نظر سے حدیبیہ کے درّے کے وہانے پر حریف کو روکنے سے بہتر ان کے لئے کوئی اور مقام نہیں مل سکتا تھا۔ یہ جگہ مکہ سے صرف دس بارہ میل پر واقع ہے اور ایک طرح قریش اپنے گھر ہی میں رہ کر دور دراز سے آئی ہوئی اور ہر طرح کی رسد اور مدد سے منقطع اسلامی فوج سے لڑ سکتے تھے۔

حدیبیہ میں آتے ہی سفارتی سرگرمی شروع ہوگئی۔ قریش کے نمایندے اور کارندے آآ کر مقصد معلوم کرنے لگے۔ آخر رسول کریمؐ نے اپنے داماد حضرت عثمانؓ کو مکہ بھیجا کہ مختار کل کی حیثیت سے گفت و شنید کریں۔ مکے میں عجیب بدنظمی تھی اور کوئی مرکزیت نہیں پائی جاتی

---

[1] دیکھئے گرلانڈ کی جرمن کتاب "قیصر ہرقل کی جنگی مہیں"

[2] تاریخ طبری ص ۱۵۳۱

تھی۔ ان کا سب سے بااثر سردار ابوسفیان بھی کسی نامعلوم راستے سے چھپ چھپا اور بچ بچا کر ان دنوں شام گیا ہوا تھا۔ اسی لئے حضرت عثمانؓ نظر بند ہو گئے اور ان کی واپسی میں دیر ہوئی تو مسلمانوں کو خوف ہوا کہ کہیں انھیں شہید نہ کر دیا گیا ہو۔ اب مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور حدیبیہ میں انھوں نے مرنے مارنے کا اقرار کیا جس کا "اِذ یُبایعونك تحت الشجرۃ" کے الفاظ میں قرآن مجید میں بھی ذکر ہے۔ قریش کو خبر ملی تو وہ گھبرائے آخر صلاح کر کے انھوں نے سُہیل بن عمرو کو مختار کل کر کے سفیر بنا کر حدیبیہ بھیجا اور تھوڑی سی رد و قدح کے بعد صلحنامہ طے ہو گیا۔ قریش کو اطمینان ہو گیا کہ ان کا مطالبہ کہ :-

۱۔ مسلمان اس سال مکّہ آئے بغیر واپس ہو جائیں اور سال آیندہ عمرہ کرنے آئیں۔

۲۔ کوئی مسلمان بھاگ کر مکہ آئے اور پناہ گزیں ہو تو اس کی تحویل عمل میں نہ آئے لیکن کوئی مکی بھاگ کر آنحضرتؐ کے پاس آئے تو مطالبے پر اس کی قریش کے ہاتھ تحویل عمل میں آجائے۔

۳۔ دس سال تک باہم صلح رہے۔ ایک دوسرے کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں اور تجارت وغیرہ مسالمانہ ضرورتوں سے ایک دوسرے کے علاقے سے گزرنے کی اجازت ہو۔

اسے جب مسلمانوں نے منظور کر لیا اور معاہدہ کے متن میں بجائے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے خالص اسلامی فارمولے کے قریشی فارمولا "باسمك اللّٰھم" لکھا جانا اور "محمد رسول اللہ" کی جگہ "محمدؐ بن عبد اللہ" لکھا جانا طے ہوا تو گویا فتح قریش ہی کی ہوئی اور انھیں دبنا پڑا۔ اور بظاہر یہ صحیح بھی تھا، اور مسلمان سپاہیوں میں عام طور پر رنج کی لہر دوڑ گئی حتیٰ کہ حضرت عمرؓ جیسے دقیقہ رس مدبر بھی اپنی بے چینی کو چھپا نہ سکے لیکن مسلمانوں میں نظم و ضبط اتنا کچھ آچکا تھا کہ جب آنحضرتؐ نے فرمایا کہ یہ طے ہو چکا ہے اور آپؐ اس کو پسند کرتے ہیں تو پھر کسی کی مجال نہ تھی کہ سوائے خاموشی اور اطاعت شعاری کے کچھ اور کریں۔

حدیبیہ کی اس صلح (یا بقول قریش "شکست") کو قرآن مجید میں مسلمانوں کے لیے "فتح مبین" اور "نصر عزیز" کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ بادی النظر میں حیرت

نتی ہے کہ یہ "برعکس نہت نام زنگی کافور" کیوں؟ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلامی حکومت تو قریش کی
نہ مانگی شرطیں منظور کرنے تیار تھی صرف خیبر سے جنگ میں ان کی غیر جانبداری مطلوب تھی۔ اسے
یش نے منظور کر لیا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ رعایتیں منظور کر لی تھیں۔ "باسمك اللّٰهم" کے فارمولے
ں کوئی شرک یا بت پرستی نہیں ہے اور اس کو نیز "محمد بن عبد اللہ" کو منظور کرنے میں مسلمانوں کا
ئی نقصان نہ تھا۔ اسی طرح عمرے میں رکاوٹ معمولی امر ہے اور "مَن استطاع إليه سبيلاً"
ے باعث اس وقت وہ مسلمانوں پر فرض ہی نہ تھا۔ یک طرفہ تحویلِ ملزمین کی توجیہہ خود جناب
سالتؐ نے یہ فرمائی کہ ہمارے پاس سے بھاگ کر جانے والا کافر ہی ہوگا، ہمیں اس کی ضرورت
یں اور قریش کے پاس سے بھاگ کر آنے والا مسلمان ہی ہوگا اور اگر وہ اپنے ہموطنوں کے
ظالم پر صبر کرے گا تو خدا اسے اجر دے گا۔ یوں بھی چند ہی دنوں میں اسلامی عملداری سے باہر
سلموں نے قریشی کاروانوں کا کچھ وہ ناطقہ تنگ کیا کہ خود قریش نے جناب رسالتؐ سے التجا
ی کہ اس شرط کو منسوخ کر کے ان نومسلموں کو مدینہ بلالیں۔ اور تیسری شرط تو مسلمان خود ہی چاہتے
ھے کہ قریش مسلمانوں سے صلح کریں اور مسلمانوں کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں۔ اور اس میں
ابھی شبہ نہیں رہتا کہ مسلمانوں کے لئے سخت ترین نازک زمانے میں حدیبیہ میں قریش کا اس
لح پر آمادہ ہوجانا اسلامی سیاستِ خارجہ کی ایک واقعی "فتحِ مبین" "نصرِ عزیز" تھی،
ں کے باعث ان کے ہاتھ کھل گئے اور فوری خطرات پر نجات ملنے پر انھوں نے آزادی
ے ساتھ تین ہی سال میں پر امن ذرائع سے اپنی مملکت کو تقریباً دس گنا پھیلا کر پورے جزیرہ نمائے
ب کو اپنا مطیع بنا لیا اور وہاں سے رومی اور ایرانی اثرات بالکل خارج کر کے ایک ایسی محکم
ومت قائم کر دی جو پندرہ ہی سال میں تین براعظموں پر پھیل گئی۔ اور جو اس سے ٹکرایا پاش پاش
و کر رہ گیا اور جس نے سرِ تسلیم خم کیا وہ اسلام کے رنگ و زبان سے بالا قومیت میں برابری
ے حصے کے ساتھ شریک ہو گیا۔

یہی وہ صلح حدیبیہ ہے جسے عہدِ نبوی کی سیاست خارجہ کا شہ کار کہنا چاہیے!

اس معاہدہ کا متن عربی ماخذوں میں کہیں تو پورا پورا، کہیں جستہ جستہ ملتا ہے جس کی تفصیل میں نے الوثائق السیاسیۃ (مطبوعہ مصر ۱۹۴۱ء) میں دستاویز ۱۱ کے تحت دی ہے۔ یہاں اس کا ترجمہ کافی ہوگا:۔

معاہدۂ حدیبیہ

ف ۱۔ تیرے نام سے اے اللہ!

ف ۲۔ یہ وہ معاہدہ ہے جو محمدؐ بن عبد اللہ اور سُہیل بن عمرو میں طے ہوا۔

ف ۳۔ ان دونوں نے اس بات پر صلح کر لی ہے کہ دس سال تک جنگ روک دی جائے جس دوران میں لوگ امن سے رہیں۔ اور ایک دوسرے سے رُکیں رہیں۔

ف ۴۔ یہ کہ محمدؐ کے ساتھیوں میں سے جو حج یا عمرے یا تجارت کے لئے مکہ آئے تو اس کی جان و مال کا امان ہوگا اور قریش کا جو شخص تجارت کے لئے مصر یا شام ــــ (بروایت ابوعبید عراق یا شام) ــــ جاتے ہوئے مدینے سے گزرے تو اسے جان و مال کا امان حاصل ہوگا۔[1]

ف ۵۔ یہ کہ قریش کا جو شخص اپنے ولی (سرپرست) کی اجازت کے بغیر محمدؐ کے پاس آئے گا تو آپ اسے ان کے سپرد کر دیں گے۔ اور محمدؐ کے ساتھیوں میں جو شخص قریش کے پاس آجائے گا وہ اسے آپ کے سپرد نہیں کریں گے۔

ف ۶۔ یہ کہ ہم میں باہم سینے ہر طرح بند رہیں گے (جن میں باہر سے کوئی غداری داخل نہ ہو سکے گی) اور نہ تو خفیہ کسی دوسرے کو مدد دی جائے گی نہ علانیہ خود خلاف عہد دغا کریں گے۔

ف ۷۔ یہ کہ جو محمدؐ کے معاہدہ اور ذمہ داری میں داخل ہونا چاہتا ہے وہ بھی ایسا کر سکے گا۔

(اس پر قبائل خزاعہ نے اٹھ کر کہا کہ ہم محمدؐ کے معاہدہ اور ذمہ داری میں شریک ہوتے ہیں اور بنی بکر نے کہا کہ ہم قریش کے معاہدہ اور ذمہ داری میں شریک ہوتے ہیں)

---

[1] یہ دفعہ ابن اسحاق اور ابن ہشام میں نہیں ہے، نہ ہی تاریخ طبری میں۔ لیکن تفسیر طبری، ابوعبید کی کتاب الاموال، فتوح بلاذری اور بکری وغیرہ میں ہے۔

۸۔ یہ کہ تو اس سال ہمارے پاس سے واپس چلا جائے گا اور ہمارے ہاں مکہ نہ آئے گا البتہ سالِ آئندہ ہم باہر چلے جائیں گے اور تو اور تیرے ساتھی وہاں (مکے میں) داخل ہو کر تین راتیں ٹھیر سکیں گے۔ تیرے ساتھ سوار کا ہتھیار ہو گا یعنی تلوار میان میں پڑی ہوئی۔ اس کے سوا کوئی اور ہتھیار لے کر تو وہاں نہ آسکے گا۔

۹۔ یہ کہ یہ قربانی کے جانور وہیں رہیں گے جہاں ہم نے ان کو پایا (یعنی حدیبیہ میں) اور ان کو حلال کر دیا جائے گا اور ان کو ہمارے پاس (مکہ قربانی کے لئے) نہیں لایا جائے گا۔

(غالباً) مہر نبویؐ — اور صراحت کہ ہمارے اور تمہارے حقوق اور واجبات برابر کے ہونگے۔

(غالباً) مہر سُہیل بن عمرو

گواہان اسلام: ابو بکرؓ، عمرؓ، عبد الرحمٰن بن عوفؓ، عبد اللہ بن سُہیل بن عمروؓ، سعد بن وقاصؓ، محمود بن مسلمہؓ، ابو عبیدہ بن الجراحؓ وغیرہ۔

گواہانِ قریش: مکرز بن حفص، وغیرہ

کاتب: علیؓ بن ابی طالب

ماخذ ہائے متن:۔ تفسیر طبری ص ۲۶ ص ۶۱۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۷۴۷ تا ۸۴۷، فارسی ترجمۂ سیرۃ ابن اسحٰق ورق ۱۷۲/ب (مخطوطہ پاریس)۔ مغازی واقدی (مخطوطہ برٹش میوزیم) ورق ۱۴۰/ا۔ طبقات ابن سعد ج ۱ حصہ ۲ ص ۷۴ نیز ج ۲ حصہ ۱ ص ۷۰ تا ۷۱۔ تاریخ طبری ص ۱۵۴۶ تا ۱۵۴۷۔ سیرۃ طبری بروایۃ الکبریٰ (مخطوطہ آیا صوفیا) فصل حدیبیہ تاریخ ابن کثیر ص ۴ ص ۱۶۸ تا ۱۶۹۔ تاریخ الخمیس للدیار بکری ج ۲ ص ۲۳۔ تاریخ ابن الاثیر ج ۲ ص ۱۵۶۔ سیرۃ حلبی ج ۳ ص ۲۳۔

ماخذ ہائے اقتباس متن:۔ کتاب الاموال لابی عبید ص ۱۴۴ تا ۱۴۴۔ صحیح البخاری

۶۳/۴۳ ، ۶۳/(۱۹/۳۵) ، ۵۳/۴۶۹ ، ۵۴/۱ وغیرہ۔ من کتب سید المرسلین لابن طولون ؒ[۳۶]۔ فتوح بلاذری ص ۳۶۔ تاریخ الیعقوبی ج ۲ ص ۵۵۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد۔

جدید بحث و ترجمہ:۔ کائتانی کی اطالوی تاریخ اسلام حالات سنہ ۶ھ ص ۴۴۔ ہیفننگ کی جرمن کتاب "اسلام کا قانون خارجہ" ضمیمۂ دوم۔ اشپرنگر کی جرمن "سوانح و تعلیمات محمدی" ص ۳ ص ۲۴۶ جہاں تمیمی کے ایک اور متن کا ذکر ہے، نقل نہیں۔ مجید خدوری کی انگریزی کتاب "اسلام کا قانون جنگ و امن" ص ۸۹۔ مزید حوالے ونسنک کی مفتاح کنوز السنہ میں تحت عنوان حدیبیہ ہیں۔



مالیات عامہ اور ہندوستانی مالیات

از

جناب ڈاکٹر جعفر حسن صاحب ۔ پی ' ایچ ' ڈی صدر شعبہ عمرانیات
جامعہ عثمانیہ سرکار عالی

مالیات عامہ آمدنی کے ذرائع

جہاں تک کہ آمدنی کا تعلق ہے سرکاری مالیات (پبلک فینانس) اور خانگی مالیات (پرائیویٹ فینانس) میں یہ نمایاں فرق ہے کہ خانگی میں اہم ترین شئے آمدنی ہوتی ہے اور آمدنی کو اخراجات کا تابع رہنا پڑتا ہے یعنی یہ کہ خانگی معاملوں میں انسان کو آمدنی کی نسبت سے اخراجات کرنے چاہئیں ۔ اس کے برخلاف سرکاری مالیات میں اخراجات کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اور ضروری اخراجات کے اندازہ سے آمدنی حاصل کرتی چاہیئے ۔ عام طور پر (اور ہندوستان میں بھی حکومتوں کے ذرایع آمدنی چار ہوتے ہیں ۔

۱ ۔ سرکاری ملکیت مثلاً جنگل ' زمین ' تالاب ' آبشار ۔

۲ ۔ تجارتی کاروبار اور تجارتی اداروں کا منافع مثلاً ریل ' محکمۂ ڈاک و تلغراف ' سرکاری کارخانے ' کاروبار یا کمپنیوں کے حصے وغیرہ ۔

۳ ۔ تنظیمی محکموں کی آمدنی مثلاً عدالت ۔

۴ ۔ محصول یا ٹیکس ۔

جدید زمانہ میں حکومتوں کے فرائض

یہ جدید عہد ہی کی خصوصیت ہے کہ حکومتیں اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کی خاطر ہر امکانی ذریعے سے آمدنی حاصل

کرنا چاہتی ہیں، کمپنیوں کے حصے خریدنا، تجارتی کاروبار جاری کرنا اور نفع بخش اداروں کو قائم کرنا موجودہ عہد ہی کی خصوصیت ہے۔ آمدنی میں اضافہ کرنے کی خواہش، ہوس دولت نہیں ہے بلکہ ضرورت! گذشتہ زمانوں میں حکومت کے فرائض محدود تھے 'اب نظریہ سلطنت اور تخیل حکومت وہ نہیں رہا جو عہد قدیم یا قرون وسطیٰ میں تھا۔ اُس زمانہ میں حکومت کا اہم ترین فریضہ سپاہی یا پولیس والے کی خدمت انجام دینا اور ملک کو بیرونی حملوں اور اندرونی فسادوں سے محفوظ رکھنا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض دوربین' دردمند' عاقل حکمرانوں نے اس زمانے میں بھی ملک کی مرفہ الحالی کے لئے سرکاری طور پر بہت کچھ کیا تھا۔ مگر پھر بھی قرون وسطیٰ اور عہد قدیم میں وہ تنظیم نہیں تھی جو موجودہ زمانہ میں نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر بے روزگاروں کی امداد ہی کو لیجئے۔ بعض ہمدرد بادشاہوں نے گذشتہ زمانوں میں قحط سالی کے وقت لاکھوں روپیہ محض لوگوں کی جان بچانے کے لئے خرچ کیا تھا مگر پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ان کا آئینی فرض نہیں بلکہ ایک طرح کا احسان تھا برخلاف اس کے موجودہ زمانہ کے مہذب ملک مثلاً انگلستان' امریکہ اور جرمانیہ میں حکومتوں کا آئین سلطنت کے اعتبار سے یہ فرض ہے کہ وہ ہر اس شخص کی امداد کرے جو خود اپنی مدد نہ کرسکتا ہو چنانچہ بے روزگاروں کو اسی مقررہ ومعینہ اصول کے اعتبار سے ہفتہ واری رقمی امداد دی جاتی ہے۔

بہر طور حکومتوں کے فرائض کی تعداد میں اضافہ ہوگیا ہے اور ان کی اہمیت بھی بڑھ گئی ہے اس کا فریضہ نہ صرف ملک کی حفاظت کرنا ہے بلکہ قوم کی مرفہ الحالی کے لئے ان تھک کوشش کرنا ہے۔ موجودہ زمانہ میں تمام متمدن ملکوں کی حکومتیں قومی بہبودی کی ذمہ دار ہیں ان کا راہنما تارہ خدمت گزاری ہے اور ان کا نصب العین مرفہ الحالی ہے! ظاہر ہے کہ ان گوناگوں فرائض کی انجام دہی کے لئے اور اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے ان حکومتوں کو بھی کثیر آمدنی کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ آمدنی کیونکر حاصل کی جاتی ہے یا یہ کہ اس آمدنی کو کیونکر حاصل کرنا چاہیئے ؟ اضافہ آمدنی کے لئے متمدن ملکوں کی حکومتیں کیا کیا طریقے اختیار کرتی

ہیں ؟ حاصل کردہ آمدنی کو کس طرح خرچ کیا جاتا ہے اور اسے کس طرح خرچ کرنا چاہیئے ؟ اس قسم کے سوالوں پر مالیات میں بحث ہوتی ہے۔

اس مضمون میں میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ نظری مالیات کے اصول تفصیل سے پیش کئے جائیں، میرا مقصد صرف یہ ہے کہ مالیات عامہ کی روشنی میں ہندوستانی مالیات کی حقیقت و اصلیت بیان کروں اور ہندوستانی مالیات سے متعلقہ بعض مسئلوں پر اپنے مطالعہ کا ماحصل بیان کروں۔ صرف تسلسل بیان کی خاطر میں نے مختصر طور پر بیان کر دیا کہ موجودہ زمانہ میں حکومتوں کا مسلک قوم اور عوام کی ہر جہتی فلاح ہے اور اس غرض کی تکمیل کے لئے حکومتوں کو کثیر آمدنیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور عام طور پر حکومتوں کو (۱) سرکاری ملکیت (۲) تجارتی یا تجارتی نوعیت کے کاروبار (۳) نفع بخش تنظیمی اداروں اور محصول یا ٹیکس سے آمدنی ہوتی ہے۔

مرکزی حکومت ہند کی آمدنی موجودہ دستور کے مطابق مرکزی حکومت ہند کے ذرایع آمدنی میں کروڑگیری (درآمد و برآمد کا محصول) آبکاری، دیسی ریاستوں کا خراج، افیون، کرنسی اور سکہ سازی، ڈاک خانہ اور تار گھر، مالگزاری، اسٹمپ وغیرہ داخل ہیں۔ ان میں بھی اہمیت صرف کروڑگیری، آمدنی محصول، نمک، کارپوریشن ٹیکس، دیسی ریاستوں کے خراج اور ریلوں کو حاصل ہے۔

مرکزی حکومت ہند کی راست حکمرانی میں جتنے علاقے ہیں مثلاً دہلی اور نواح دہلی (صوبہ دہلی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے) بلوچستان، اجمیر وغیرہ ان سے جتنی آمدنی حاصل ہوتی ہے وہ بھی مرکزی حکومت کو ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مالگزاری، زراعت، عدالت، آبپاشی، رجسٹریشن، صنعت و حرفت وغیرہ سے بھی آمدنی وصول ہوتی ہے۔ یہ البتہ صحیح ہے کہ مرکزی حکومت ہند کے یہ غیر اہم ذرایع آمدنی ہیں۔

موجودہ دستور کے مطابق بعض ذرایع آمدنی مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت کے مشترک ذرایع آمدنی ہیں مثلاً آمدنی محصول جس سے ۳۷-۱۹۳۶ء میں مرکزی حکومت کو ۱۲½ کروڑ

اور صوبوں کو ۱½ کروڑ ملا تھا۔ اسی طرح آبکاری اور نمک کی آمدنی میں سے تقریباً ایک کروڑ صوبوں کو ۸½ کروڑ مرکزی حکومت ہند کو ملے تھے۔

خالص مرکزی حکومت کے ذرائع آمدنی صرف ریلیں، ٹپہ خانہ، تارگھر، افیون، سکہ سازی، کرنسی، پرواز اور ہندوستان کی دیسی ریاستوں کا خراج ہے۔

صوبائی حکومتوں کے خاص ذرایع آمدنی مالگزاری، عدالتی سٹمپ، آبکاری، جنگل، آبپاشی، رجسٹریشن ہیں مگر ان ذرایع سے مرکزی حکومت کو بھی آمدنی وصول ہوتی ہے۔ کیونکہ اُس کی راست حکمرانی میں جو علاقے ہیں ان کی کل آمدنی اسے بھی ملتی ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ جو ذرایع آمدنی صوبائی حکومت کے ہیں ان سے کچھ نہ کچھ آمدنی ہوتی ہے۔ پھر بھی یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ مالگذاری، جنگل، رجسٹریشن، زراعت، آبپاشی وغیرہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے مشترک ذرایع ہیں کیونکہ مرکزی اور صوبائی حکومتیں اپنے اپنے علاقوں کی متعلقہ آمدنی حاصل کرتی ہیں۔ اس کے برخلاف آمدنی محصول کا بہت بڑا حصہ مرکزی حکومت کو ملتا ہے۔

مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کے ذرایع آمدنی کی جدولوں پر نظر ڈالنے سے خاص اور مشترک ذرایع کا فرق زیادہ آسانی سے ذہن نشین ہو جائے گا اسی لئے ہم زیادہ تفصیل سے تشریح کرنے کی بجائے مرکزی حکومت ہند کی آمدنی بیان کرتے ہیں

مرکزی حکومت ہند کے متعلق جدید ترین اعداد ۱۹۴۱-۴۲ء کے بجٹ سے حاصل کئے گئے ہیں۔ اس بجٹ میں تین سالوں کے متعلق اعداد دئے گئے ہیں ۱۹۴۰-۴۱ء کے اعداد محض بجٹ کے مطابق اندازہ ہیں ۱۹۳۹-۴۰ء کے اعداد ترمیمی اندازہ کے اعداد ہیں اگرچہ ان اعداد میں بہت زیادہ رد و بدل عام طور پر نہیں ہوتا اور وہ اندازہ ختم سال کے قریب کیا ہوا ہونے کی وجہ سے زیادہ قرین حقیقت ہوتا ہے پھر بھی وہ قطعی طور پر صحیح نہیں ہوتا ۱۹۳۸-۳۹ء کے سال کے متعلقہ اعداد البتہ بالکل حقیقی ہیں۔ ہم نے اسی لئے ۱۹۳۸-۳۹ء کے اعداد اس جدول میں پیش کئے ہیں کیونکہ یہ اعداد اندازہ کے یا متوقع نہیں بلکہ ختم شدہ حساب کے

حقیقی اعداد ہیں۔

مرکزی حکومت کی آمدنی کے ذریعے (۳۹-۱۹۳۸ء کے حقیقی اعداد)

(ذرایع آمدنی کی ترتیب آمدنی کی رقمی اہمیت کے مطابق کی گئی ہے)

۱۔	کروڑگیری	۴۰،۵۰،۵۳،۰۰۰
۲۔	ریلوے	۳۱،۳۰،۰۹،۰۰۰
۳۔	محصول	۱۳،۱۷۴،۴۳،۰۰۰
۴۔	آبکاری (مرکزی حصہ)	۸،۶۵،۷۳،۰۰۰
۵۔	نمک	۸،۱۲،۰۴،۰۰۰
۶۔	فوج	۵،۸۸،۹۰،۰۰۰
۷۔	غیرمعمولی	۳،۰۰،۵۵،۰۰۰
۸۔	کارپوریشن ٹیکس	۲،۰۳،۷۲،۰۰۰
۹۔	محفوظے سے منتقلی	۱،۰۵،۸۰،۰۰۰
۱۰۔	ڈاک خانہ اور تارگھر	۹۲،۴۳،۰۰۰
۱۱۔	سود	۷۳،۷۵،۰۰۰
۱۲۔	متفرق	۶۶،۵۹،۰۰۰
۱۳۔	ہندوستانی دیسی ریاستیں	۶۰،۴۷،۰۰۰
۱۴۔	سکہ سازی اور کرنسی	۵۸،۱۶،۰۰۰
۱۵۔	افیون	۵۰،۸۹،۰۰۰
۱۶۔	اسٹمپ	۳۴،۷۴،۰۰۰
۱۷۔	سول کام	۳۲،۲۳،۰۰۰
۱۸۔	آبکاری (مرکزی علاقے کی)	۲۵،۷۷،۰۰۰

۱۹۔ چھپائی اور سٹیشنری	... ، ۳۲ ، ۲۳ ،
۲۰۔ بندرگاہیں اور ناخدائی	... ، ۹۰ ، ۲۱ ،
۲۱۔ ہندوستانی سٹور محکمہ	... ، ۱۰ ، ۲۱ ،
۲۲۔ جنگل	... ، ۹۱ ، ۱۹ ،
۲۳۔ متفرق محکمے	... ، ۹۹ ، ۱۸ ،
۲۴۔ مالگزاری (مرکزی علاقے کی)	... ، ۴۶ ، ۱۸ ،
۲۵۔ روشنی گھر اور روشن کشتیاں	... ، ۱۵ ، ۹ ،
۲۶۔ بڑھاپے کی امداد میں وصولیاں	... ، ۹۵ ، ۷ ،
۲۷۔ براڈکاسٹنگ (لاسلکی نشرگاہ)	... ، ۳۹ ، ۷ ،
۲۸۔ جانوروں کا علاج	... ، ۶۳ ، ۷ ،
۲۹۔ صحت عامہ	... ، ۳۷ ، ۴ ،
۳۰۔ زراعت	... ، ۰۱ ، ۴ ،
۳۱۔ علاج	... ، ۴۵ ، ۳ ،
۳۲۔ موٹرسواری محصول	... ، ۴۱ ، ۳ ،
۳۳۔ عدالت	... ، ۴۵ ، ۲ ،
۳۴۔ جیل خانے اور مجرم گاہیں	... ، ۲۱ ، ۲ ،
۳۵۔ تعلیم	... ، ۹۲ ، ۱ ،
۳۶۔ پرواز	... ، ۴۸ ، ۱ ،
۳۷۔ رجسٹریشن	... ، ۹۲ ،
۳۸۔ آبپاشی	... ، ۸۷ ،
۳۹۔ پولیس	... ، ۷۴ ،
۴۰۔ صنعت وحرفت	... ، [illegible] ،

مرکزی حکومت ہند کے ذرایع آمدنی کی طویل فہرست پر نظر ڈالنے سے یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے اور عام طور پر ہوتی ہے کہ مختلف سرچشموں سے مرکزی حکومت ہند کو آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ مالیاتی ادب کی ورق گردانی اور چند کتابوں کے دیکھنے سے میں نے یہ بات معلوم کی کہ سرکاری کتابوں، رودادوں اور موازنوں میں جسے آمدنی کہا جاتا ہے وہ صرف آمدنی نہیں بلکہ "وصولی" یعنی (ریسٹس) ہیں۔ اس میں آمدنی کے علاوہ عام طور پر منتقلیاں اور بسا اوقات قرض کی وجہ سے حاصل شدہ رقم بھی شامل ہوتی ہے۔ چنانچہ سرکاری "آمدنی" کے متعلق یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ وہ حقیقی آمدنی، منتقلی اور وصولی کا مجموعہ ہوتی ہے۔

آمدنی کی اصلی حقیقت معلوم کرنے کے لئے یہ دیکھنا چاہئے کہ سرکاری آمد میں

(۱) نئے قرض سے حاصل شدہ رقم ہے یا نہیں ؟

(۲) سابقہ قرض یا بچت سے منتقل شدہ رقم بھی شریک تو نہیں کی گئی ہے ؟

(۳) آمدنی حاصل کرنے پر کتنا خرچ ہوتا ہے ؟

آمدنی اور اخراجات کا مقابلہ کرنے سے یہ معلوم کرکے مجھے بڑا اچنبھا ہوا کہ بعض "آمدنی" کے ذریعے ایسے ہیں جن پر خرچ آمدنی سے زیادہ ہوتا ہے! اس پر طرہ یہ کہ پھر بھی ان کا شمار "ریونیو" کے اہم وسائل میں کیا جاتا ہے مثلاً مرکزی حکومت ہند کو ۳۹-۱۹۳۸ء میں جنگلوں سے ۱۹،۹۱،۰۰۰ آمدنی ہوئی تھی مگر اُن پر خرچ ۲۲،۶۵،۰۰۰ ہوا[1]۔ گویا دو لاکھ چوہتر ہزار کے گھاٹے کے باوجود جنگلوں کا شمار ریونیو میں کیا جاتا ہے اور ریونیو سے مراد عرف عام میں آمدنی لی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں!! ریونیو میں منتقلیاں اور بعض مرتبہ نئے قرضے بھی شامل کرلئے جاتے ہیں! بہرحال مالیاتی اصطلاحوں کی پبلک ناواقفیت اور اصطلاحی پیچیدگیوں کے نازک فرق سے فائدہ اٹھاکر عمداً یا کوشش یہ غلط فہمی پیدا ہونے دی جاتی ہے کہ کل ریونیو دراصل

---

[1] حکومت ہند کے محکمۂ فینانس کا شائع کردہ "۴۱-۱۹۴۰ء کا بجٹ" ناشر حکومت ہند (منیجر مطبوعات) نئی دہلی۔ [illegible] صفحہ ۷ اور صفحہ ۲۷۔

آمدنی ہے۔ بعض موازنوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ گذشتہ سال کی "بچت" سے منتقلی کرلی جاتی ہے اور وہ "بچت" بھی دراصل گذشتہ قرض عامہ کا جزو ہوتی ہے!! گویا آمدنی کا اصلی سرچشمہ بعض صورتوں میں قرض عامہ ہوتا ہے۔ خسارہ کو بچت میں "بدلنے" کے لئے یہ ترکیب کی جاتی ہے کہ سرکاری آمد یا ریونیو میں ایسی قابل لحاظ رقم شامل کرلی جاتی ہے جو "منتقلی" کے نام سے موازنہ یا حساب میں شریک رہتی ہے۔ یہ منتقلی بھی دراصل بسا اوقات گزشتہ سال یا پیوستہ سال میں حاصل کئے ہوئے قرض عامہ کا جزو ہے گویا آمدنی کا سرچشمہ قرض ہے۔ اصطلاحی زبان سے ہٹ کر اس مطلب کو ادا کرنا ہو تو یہ فارسی کہاوت کافی ہے۔ برعکس نہند نام زنگی کافور!!

غرض سرکاری "آمدنی" کی اصل حقیقت معلوم کرنے کے لئے کل حاصل (ٹوٹل ریونیو) منتقلی (ٹرانسفر)، کل وصولی (ٹوٹل ریٹیس) اور خالص آمدنی (نٹ ریونیو) کے نازک فرق کا اچھی طرح ذہن نشین کرلینا ضروری ہے۔

سرکاری مالیات کو بخوبی سمجھنے کے لئے "خالص آمدنی" کا لحاظ بہت ضروری ہے اور خالص آمدنی سے مراد وہ رقم ہے جو آمدنی حاصل کرنے کے اخراجات منہا کرنے بعد بچ جاتی ہے آمدنی حاصل کرنے کے اخراجات اتنے مختلف ہوتے ہیں کہ نہ صرف تعجب ہوتا ہے بلکہ آمدنی کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے اور بسا اوقات بڑا فرق ہوتا ہے۔ ہم نے جنگلوں کی کم آمدنی اور زیادہ خرچ کی حقیقی اعداد دے کر ثابت کردیا ہے کہ کم سے کم ۳۹-۱۹۳۸ء میں جنگل ذریعہ آمدنی نہیں بلکہ خرچ کی مدین گئے تھے۔ سابقہ جدول پر نظر ڈالئے سرکاری ذرایع آمدنی میں کروڑگیری کے بعد دوسرا نمبر ریلوں کا ہے۔ ریلوں کی آمدنی ...،۹،۰ ۳۰،۳۱ ظاہر کی گئی ہے مگر ریلوں میں کارفرما سرمایہ کا سود ...،۸،۰ ۱۴،۲۸ ہوتا ہے اور غیر معمولی متفرق خرچ کے ساتھ ...،۹،۰ ۳۰،۳۱ میں سے ...،۷۷،۹۲،۲۹ صرف ہوگئے اور ریلوں سے اکتیس کروڑ تیس لاکھ ۹ ہزار نہیں بلکہ صرف ...،۳۲،۳۷،۱ آمدنی ہوئی۔ یہی رقم ریلوں سے حاصل شدہ خالص آمدنی ہے اس مثال سے بھی ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ "کل وصولی" (ٹوٹل ریٹس) یا کل حصول (ٹوٹل ریونیو) میں سے

اخراجات سود وغیرہ نکالنے کے بعد جو خالص آمدنی رہ جاتی ہے اس کی کیا اہمیت رہتی ہے۔

تھوڑی سے دردسری گوارا کر کے میں نے مرکزی حکومت ہند کی "آمد" (ریونیو) کے ذرائع اور اس کے متعلق اخراجات نکال کر خالص "آمدنی" کے ذریعے معلوم کئے ہیں۔ تمام اعداد و شمار جدید ترین سرکاری مطبوعہ بجٹ بابت سنہ ۱۹۴۰ء سے لئے گئے ہیں اور بار بار حساب اور مقابلے کر کے انتہائی احتیاط سے یہ جدول تیار کی گئی ہے۔ تاہم بشریت کا تقاضہ ہے، جمع تفریق کوفت انگیز محنت ہے، کسی ہمدرد یا کرم فرما کی شرکت سے محرومی ہے لہذا غلطیوں کا امکان بہرحال ہے گر ان سے بچنے کی چونکہ مقدور بھر کوشش کی گئی ہے۔ اس لئے توقع ہے کہ جدول بجز غیر اہم جزئیات کے قابل بھروسہ ہے۔

سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء میں مرکزی حکومت ہند کی خالص آمدنی[1] کے ذریعے

---

(۱)	کروڑگیری۔	،۳۹،۳۰،۹۸،۰۰۰
(۲)	آمدنی محصول	۱۳،۰۷،۶۱،۰۰۰
(۳)	آبکاری کا مرکزی محصول	۸،۱۹،۹۶،۰۰۰
(۴)	نمک	۷،۰۸،۱۹،۰۰۰
(۵)	غیر معمولی	۲،۹۹،۳۷،۰۰۰
(۶)	کارپوریشن	۱،۹۴،۷۹،۰۰۰
(۷)	ریلیں	۱،۳۷،۳۲،۰۰۰
(۸)	دیسی ریاستوں کا خراج	،۶۰،۴۷،۰۰۰
(۹)	متفرق	،۳۹،۲۵،۰۰۰
(۱۰)	افیون	،۲۵،۳۳،۰۰۰
(۱۱)	کرنسی اور سکہ سازی	،۲۲،۴۱،۰۰۰

[1] (یہ نوٹ صفحہ ۱۶۳ پر ملاحظہ ہو)

۱۱)	صوبائی آبکاری	،۱۹،۵۵،...
۱۳)	ٹپہ خانہ اور تار گھر	،۱۸،۹۸،...
۱۴)	سٹمپ	،۱۷،۹۳،...
۱۵)	صوبائی مالگزاری	،۱۳،۵۵،...
۱۶)	موٹر سواری قانون	۱،۰۸،...
۱۷)	رجسٹریشن	،۸۳،...
		۷۷،۱۵،۵۸،...

اب آپ پھر سے ایک نظر پہلی جدول پر ڈالکر اس کے بعد خالص آمدنیوں کے ذریعوں کو دیکھیئے۔ آدھے سے زیادہ آمدنی کے ذریعے خود بخود غائب ہو جاتے ہیں اور رقمی اہمیت سے ذرایع آمدنی کی شماری ترتیب میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ ریلوں کا درجہ دوسرے نمبر سے گر کر ساتویں پر آجاتا ہے دیسی ریاستوں کے خراج کا درجہ ۱۳ سے ترقی پاکر آٹھویں پر آتا ہے۔ ٹپہ خانہ اور تار گھر جیسے تجارتی نوعیت کے محکمہ کی آمدنی دسویں نمبر سے گھٹ کر تیرھویں پر آجاتی ہے اور جن محکموں سے آمدنی ہونے کی توقع کی جاسکتی تھی یا جنھیں (بعض اور ملکوں کی طرح مثلاً امریکہ) نفع بخش بنانا چاہیئے اور بنایا جاسکتا ہے۔ ہماری فہرست سے نکل جاتے ہیں۔ مثلاً جنگل، سٹور کا محکمہ، براڈ کاسٹنگ، پرواز، آبپاشی، باہمی امداد وغیرہ۔

خالص آمدنی کا لحاظ نہ بھی کیا جائے۔ بلکہ سرکاری آمدنی میں ریلوں اور ٹپہ خانہ یا تار گھر کی خالص بچت (نٹ سیونگ) کو شامل کیا جائے جیسا کہ خود حکومت ہند کرتی ہے تب بھی[2] نٹ ریونیو تقریباً اسی کروڑ رہتی ہے۔

---

[1] خالص آمدنی سے مراد وہ رقم ہے جو آمد (ریونیو) میں سے آمد پر راست مطالبے منہا کرنے کے بعد بچے یعنی کل آمدنی کے حاصل کرنے کا خرچ منہا کرنے کے بعد یا اس پر خرچ ہونے والی رقم منہا کرنے کے بعد باقی بچے۔

[2] Net-Revenue

عام طور پر چونکہ سرکاری، درسی، علمی، اور حوالے کی کتابوں میں ریلوے کی آمدنی کو بھی شامل کیا جاتا ہے اور خام آمدنی کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ لہذا ہم بھی سرکاری روداوں اور علمی و درسی کتابوں کی تقلید میں کل سرکاری وصولی کو ملحوظ رکھتے ہوئے گذشتہ موازنوں کی آمدنیاں بیان کرینگے۔

سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء سے مرکزی حکومت ہند کی آمدنی یہ تھی۔

سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء	۱،۱۵،۲۲،۰۰،۰۰۰
سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء	۱،۲۱،۴۱،۰۰،۰۰۰
سنہ ۲۴-۱۹۲۳ء	۱،۳۲،۷۹،۰۰،۰۰۰
سنہ ۲۵-۱۹۲۴ء	۱،۳۷،۵۳،۰۰،۰۰۰
سنہ ۲۶-۱۹۲۵ء	۱،۳۳،۱۷،۰۰،۰۰۰
سنہ ۲۷-۱۹۲۶ء	۱،۳۱،۶۵،۰۰،۰۰۰
سنہ ۲۸-۱۹۲۷ء	۱،۲۷،۲۲،۰۰،۰۰۰
سنہ ۲۹-۱۹۲۸ء	۱،۲۸،۹۷،۰۰،۰۰۰
سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء	۱،۳۲،۷۰،۰۰،۰۰۰
سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء	۱،۲۴،۶۰،۰۰،۰۰۰
سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء	۱،۲۱،۶۵،۰۰،۰۰۰
سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء	۱،۲۵،۴۴،۰۰،۰۰۰
سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء	۱،۱۹،۳۷،۰۰،۰۰۰
سنہ ۳۵-۱۹۳۴ء	۱،۲۲،۱۲،۰۰،۰۰۰
سنہ ۳۶-۱۹۳۵ء	۱،۲۱،۰۷،۰۰،۰۰۰
سنہ ۳۷-۱۹۳۶ء	۱،۱۷،۸۳،۰۰،۰۰۰
سنہ ۳۸-۱۹۳۷ء	۱،۲۲،۵۸،۰۰،۰۰۰

سنہ ۱۹۳۷ء کی پہلی اپریل سے برما ہندوستان سے علحدہ کر دیا گیا۔ سنہ ۳۷-۱۹۳۶ء آخری مالی سنہ تھا (بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

۳۹-۱۹۳۸ء	۱،۲۱،۰۶،۰۰،۰۰۰
۴۰-۱۹۳۹ء (متوقع)	۱،۲۳،۹۶،۰۰،۰۰۰
۴۱-۱۹۴۰ء (بجٹ)	۱،۳۱،۷۳،۰۰،۰۰۰

ان اعداد سے ظاہر ہے کہ مرکزی حکومت ہند کی سالانہ آمدنی لگ بھگ ایک ارب ۲۳ کروڑ رہی۔

ہندوستان کے صوبوں کی آمدنی

ہندوستان میں گیارہ صوبے ہیں جو (آمدنی کی اہمیت کے لحاظ سے) مختلف حیثیتیں رکھتے ہیں سب سے زیادہ آمدنی مدراس کی ہے تقریباً ۱۶ کروڑ۔ بنگال۔ بمبئی۔ آگرہ و اودھ کے متحدہ صوبے اور پنجاب کی آمدنی بارہ تیرہ کروڑ ہے۔ اس کے بعد بہار کا نمبر آتا ہے جس کی آمدنی پنجاب کی نصف آمدنی سے کم ہوتی ہے۔

مدراس، بنگال، بمبئی، متحدہ صوبے اور پنجاب کی آمدنیوں میں نسبتہً تھوڑا فرق ہے۔ مگر پنجاب کے بعد آمدنیوں میں نمایاں کمی ہو جاتی ہے۔ اور بہار کے بعد دو، دو، ایک ایک کروڑ کم ہوتے ہوتے متوسط صوبے اور برار، سندھ، آسام، اڑیسہ، اور سرحدی صوبہ کا نمبر آتا ہے۔

۳۸-۱۹۳۷ء میں ہندوستان کے گیارہ صوبوں کی آمدنی یہ تھی۔

۱۔ مدراس	۱۶،۰۰،۶۲،۰۰۰
۲۔ بنگال	۱۳،۰۰،۸۵،۰۰۰
۳۔ بمبئی	۱۲،۴۳،۸۱،۰۰۰
۴۔ متحدہ صوبے (آگرہ و اودھ)	۱۲،۳۳،۷۸،۰۰۰

بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ:۔ جس میں برما کی آمدنی ہندوستان کی آمدنی میں شمار ہوئی تھی۔ ۳۶-۱۹۳۷ء کے قبل اور بعد کے اعداد میں (برما کی علحدگی کے باعث) کئی مرتبہ نمایاں فرق ہوتا ہے۔ اکثر کتابوں اور رسالوں میں اعداد و شمار دیتے وقت برما کی علحدگی کا خیال نہیں رکھا جاتا جس کی وجہ سے ایک ہی موضوع کے متعلق مختلف حوالے اور اعداد ملتے ہیں۔

۵ ۔ پنجاب	۱۱، ۹۸، ۳۵، ۰۰۰
۶ ۔ بہار	۵، ۰۳، ۲۷، ۰۰۰
۷ ۔ متوسط صوبے اور برار	۴، ۵۳، ۷۱، ۰۰۰
۸ ۔ سندھ	۳، ۹۲، ۰۳، ۰۰۰
۹ ۔ آسام	۲، ۷۳، ۶۱، ۰۰۰
۱۰ ۔ اڑیسہ	۱، ۸۴، ۶۶، ۰۰۰
۱۱ ۔ سرحدی صوبہ	۱، ۸۱، ۹۲، ۰۰۰
تمام صوبوں کی آمدنی	۸۵، ۶۶، ۶۱، ۰۰۰

گذشتہ سالوں میں ہندوستان کے تمام صوبوں کی آمدنی یہ تھی۔

۱۹۲۳-۲۴ء	۷۸، ۸۵، ۰۰، ۰۰۰
۱۹۲۴-۲۵ء	۸۱، ۲۸، ۰۰، ۰۰۰
۱۹۲۵-۲۶ء	۸۷، ۵۱، ۰۰، ۰۰۰
۱۹۲۶-۲۷ء	۸۶، ۴۳، ۰۰، ۰۰۰
۱۹۲۷-۲۸ء	۹۳، ۲۹، ۰۰، ۰۰۰
۱۹۲۸-۲۹ء	۹۱، ۴۸، ۰۰، ۰۰۰
۱۹۲۹-۳۰ء	۹۴، ۵۷، ۰۰، ۰۰۰
۱۹۳۰-۳۱ء	۸۳، ۰۸، ۰۰، ۰۰۰
۱۹۳۱-۳۲ء	۸۳، ۱۸، ۰۰، ۰۰۰
۱۹۳۲-۳۳ء	۸۴، ۳۴، ۰۰، ۰۰۰
۱۹۳۳-۳۴ء	۸۲، ۸۴، ۰۰، ۰۰۰
۱۹۳۴-۳۵ء	۸۶، ۲۹، ۰۰، ۰۰۰

۱۹۳۵-۳۶ء	۸۹٬۰۲٬۰۰٬۰۰۰
۱۹۳۶-۳۷ء	۹۲٬۳۳٬۰۰٬۰۰۰
۱۹۳۷-۳۸ء	۸۵٬۸۰٬۰۰٬۰۰۰
۱۹۳۸-۳۹ء	۸۵٬۶۰٬۰۰٬۰۰۰

ان اعداد سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کے صوبوں کی سالانہ آمدنی تقریباً ۸۵ کروڑ ہے۔

صوبائی حکومتوں کے ذرایع آمدنی موجودہ دستور کے مطابق صوبائی حکومتوں کے ذرایع آمدنی (اہمیت کے لحاظ سے) مالگزاری، آبکاری، عدالتی ٹکٹ (رسوم)، جنگلات، رجسٹریشن، زراعتی آمدنی پر محصول، موٹر ٹیکس، وغیرہ ہیں۔ مگر صوبہ کو زیادہ تر مالگزاری، آبکاری اور عدالتی رسوم سے آمدنی ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مرکزی حکومت کے اہم ترین ذرایع آمدنی کروڑ گیری، ریلیں اور محصول آمدنی ہے۔ ذرایع آمدنی مقرر کرنے سے آسانی تو ہوئی مگر بعض صوبوں کو بجا شکایت کا موقع ملا۔ ظاہر ہے کہ جس صوبہ میں صنعت وحرفت اور تجارت کی گرم بازاری ہوگی اور افراد یا کمپنیوں کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔ اس کا فائدہ زیادہ تر مرکزی حکومت کو ہوگا۔ کیونکہ بڑھتی ہوئی آمدنیوں سے محصول آمدنی زیادہ وصول ہوگا۔ اس کے برعکس جو صوبہ زراعتی نقطہ نظر سے سب سے بہتر ہوگا اس کی مالی حالت بہتر ہوگی کیونکہ مالگزاری صوبائی ذریعہ آمدنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوبہ بمبئی کی آمدنی سے مدراس کے صوبہ کی آمدنی زیادہ ہے۔ حالانکہ معاشی اعتبار سے بمبئی زیادہ تر ترقی یافتہ ہے۔ بمبئی کی صنعت وحرفت اور تجارت مدراس سے بہت زیادہ ہے۔ مگر محصول آمدنی اور کروڑ گیری چونکہ ذرایع آمدنی ہیں۔ اس لئے اپنے صوبہ کی گرم بازاری اور صنعت سے خود بمبئی کم مستفید ہوتا ہے۔ اسی لئے بمبئی کو شکایت ہے اور بمبئی والوں کا یہ کہنا معقول ہے کہ بمبئی کی صوبہ واری حکومت کو محصول آمدنی سے زیادہ حصہ ملنا چاہئے۔ اس کا جواب دیا جاتا ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے قانون اور اس کے اختیار کئے ہوئے طریقوں کی یہ عام خصوصیت ہے کہ ان سے کسی نہ کسی کو زیادہ اور

ا نہ کسی کو کم فائدہ ہوتا ہے۔ نیز بمبئی کے ترقی پذیر لوگوں کو چاہیئے کہ کل ہند کا خیال رکھیں۔ آخر
زی حکومت ہند بھی تو "اپنی ہی ہے" اعتراض کرنے والوں میں وسعت نظر ہونی چاہیئے صوبائی
ے نظری ٹھیک نہیں۔

جنگ کی وجہ سے اور اس خیال سے کہ موجودہ دستور میں فی الحال ترمیم یا تبدیلی کی کوئی
ا نہیں لوگ خاموش ہیں مگر آئندہ ذرائع آمدنی کی تقسیم پر ضرور سخت اختلاف ہوگا۔

امی حکومت کی آمدنی

مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت کے علاوہ مقامی سرکار بھی افراد اور گھرانوں سے ٹیکس وصول کرتی ہے۔ مقامی سرکار یا حکومت
مراد (۱) بلدیئے یا میونسپلٹیاں (۲) لوکل یا ڈسٹرکٹ بورڈ اور (۳) بندرگاہی ٹرسٹ ہیں۔
ا سمجھئے کہ مالدار لوگ جو محصول آمدنی ادا کرتے ہیں وہ مرکزی حکومت کو ملتا ہے۔ مقدمہ بازی
نے والوں سے صوبائی حکومت مستفید ہوتی ہے۔ اور مکان کا ٹیکس، موٹر کا سالانہ ٹیکس وغیرہ
پالٹی کو ملتا ہے۔ دیہات کی نمک حلال رعایا بہر حال نمک استعمال کرتی ہے اور نمک کی قیمت
محصول چھپا رہتا ہے۔ رعایا کو معلوم نہیں ہوتا مگر تھوڑا تھوڑا بہت ہوتا جاتا ہے اور
ے مرکزی حکومت کو نمک کا کل محصول ملتا ہے۔ (موجودہ زمانے میں تقریباً ۸، ۹ کروڑ سالانہ)
زمینوں پر کاشت ہوتی ہے اس کا لگان ادا کیا جاتا ہے یہ لگان درحقیقت محصول زمین ہے جو
ائی حکومت کو ملتا ہے اور جب بیوپاری پیداوار بیچنے منڈی جاتے ہیں تو انھیں کہیں "راستہ پٹی"
ستہ پر سے گزرنے کا محصول) ادا کرنا پڑتا ہے۔ کہیں منڈی میں مال لیتے ہوئے محصول ادا کرنا
ہے۔ مویشی بیچتے ہیں تو فی جانور تھوڑا بہت محصول ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ ڈسٹرکٹ بورڈ کا حق
ہے۔

اسی طرح بندرگاہوں کی سرکار مچھیروں اور کشتی رانوں اور چھوٹے بڑے جہازوں سے
ت ناموں اور مختلف طریقوں سے محصول لیتی ہے یہ سب "پورٹ ٹرسٹ" بندرگاہ کی مقامی
کو ملتا ہے۔

میونسپالٹیاں

میونسپالٹیوں کے متعلق جدید ترین اعداد ۳۷-۱۹۳۶ء تک مل سکے۔ وہ بھی "برطانوی ہند" کے دیسی ریاستوں کی میونسپالٹیوں اور ان کی آمدنی کا کچھ علم نہیں بجٹ ۳۷-۱۹۳۶ء کے اعداد کو پیش نظر رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ برطانوی ہند میں آٹھ سو سے زیادہ میونسپالٹیاں ہیں اور ان کی مجموعی آمدنی کروڑ ہوتی ہے۔

سب سے زیادہ آمدنی ظاہر ہے بمبئی، کلکتہ اور مدراس کی ہے۔ کیونکہ یہی ہندوستان کے سب سے بڑے شہر ہیں۔ دولت و حکومت راج اور سامراج کے یہ بڑے مرکز ہیں۔ باثر بیرونیوں اور پردیسی حاکموں کا یہاں اکثر قیام رہتا ہے۔ لہذا اور کچھ نہیں تو انہی کی خوشنودی اور حاکموں کے آرام کے لئے کم سے کم شہر کے کچھ حصوں کو بنا سجا کر رکھنا پڑتا ہے۔ ذاتی آمدنی ناکافی ہوتی ہے تو صوبائی حکومت سے امداد طلب کی جاتی ہے اور اکثر مل جاتی ہے۔ وہ بھی ناکافی ہو تو میونسپالٹیاں قرض لیتی ہیں۔ قرض لے لے کر اپنے ضروری اور من مانے اخراجات کو پورا کرنے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔

میونسپالٹیوں کے ذرائع آمدنی یہ ہیں:-

راہداری (شہروں میں مال لینے کا محصول)
مکان یا زمین کا ٹیکس (میونسپالٹی کے حدود میں مکانوں اور زمینوں کا ٹیکس)
جانوروں اور سواریوں پر ٹیکس۔
تاجروں اور بیوپاریوں پر ٹیکس۔
راستہ پٹی (راستہ پر سے گزرنے کا ٹیکس)
ناؤ پٹی (ندی کو پار کرنے کا ٹیکس)
واٹر ریٹ (پانی پہنچانے کا معاوضہ)
لائٹنگ ریٹ (بجلی روشنی کا معاوضہ)

ان محصولوں یا محصول نما معاوضوں کے علاوہ میونسپالٹی کے اسکولوں سے تھوڑی بہت

فیس مل جاتی ہے، حکومتوں سے تقریباً ایک کروڑ سالانہ امداد ملتی ہے، خانگی افراد اور سرکار سے قرض بھی لیا جاتا (اور ـــــ روشن خیالی ملاحظہ ہو ـــــ قرض کو بھی آمدنی میں شامل کیا جاتا ہے۔) غرض محصول وفیس، معاوضوں اور کرایوں وغیرہ سے برطانوی ہند کی تقریباً ۸۰۰ میونسپالٹیوں کو لگ بھگ ۴۰ کروڑ ملتے ہیں۔

۲۸-۱۹۲۷ء سے ۳۷-۱۹۳۶ء کے اعداد وشمار یہ ہیں۔

۲۸-۱۹۲۷ء میں تمام میونسپالٹیوں کی کل آمدنی
۲۹-۱۹۲۸ء " " " "
۳۰-۱۹۲۹ء " " " "
۳۱-۱۹۳۰ء " " " "
۳۲-۱۹۳۱ء " " " "
۳۳-۱۹۳۲ء " " " "
۳۴-۱۹۳۳ء " " " "
۳۵-۱۹۳۴ء " " " "
۳۶-۱۹۳۵ء " " " "
۳۷-۱۹۳۶ء " " " "

اس آمدنی میں قرض بھی شامل ہے۔ قرض کی رقم کم سے کم ایک کروڑ اور زیادہ سے زیادہ ۴ کروڑ سالانہ ہوتی ہے۔ لہذا یہ کہنا صحیح ہے کہ میونسپالٹیوں کی حقیقی سالانہ اوسط آمدنی ۳۹ یا ۴۰ کروڑ ہوتی ہے۔

ڈسٹرکٹ بورڈ اور لوکل بورڈ | برطانوی ہند میں ڈسٹرکٹ اور لوکل بورڈوں کی کل تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے اور ان کو مجموعی طور پر سالانہ پندرہ سولہ کروڑ روپیوں کی آمدنی ہوتی ہے۔

گذشتہ چند سالوں کے اعداد یہ ہیں۔

۱۹۲۷-۲۸ء میں تمام ڈسٹرکٹ اور لوکل بورڈوں کی آمدنی	۱۵،۵۶،۰۰،۰۰۰
۱۹۲۸-۲۹ء 〃 〃 〃 〃	۱۵،۹۸،۰۰،۰۰۰
۱۹۲۹-۳۰ء 〃 〃 〃 〃	۱۶،۳۶،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۰-۳۱ء 〃 〃 〃 〃	۱۶،۵۷،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۱-۳۲ء 〃 〃 〃 〃	۱۵،۵۲،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۲-۳۳ء 〃 〃 〃 〃	۱۵،۵۱،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۳-۳۴ء 〃 〃 〃 〃	۱۵،۹۶،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۴-۳۵ء 〃 〃 〃 〃	۱۶،۱۷،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۵-۳۶ء 〃 〃 〃 〃	۱۶،۲۱،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۶-۳۷ء 〃 〃 〃 〃	۱۶،۲۲،۰۰،۰۰۰

ان اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈسٹرکٹ بورڈ کی سالانہ اوسط آمدنی پندرہ سولہ کروڑ ہوتی ہے۔

بندرگاہی ٹرسٹ | ہندستان کی بڑی بڑی بندرگاہوں میں خصوصی انتظام کرنے کے لیے بندرگاہی ٹرسٹ قایم ہیں ان ٹرسٹوں کی تعداد صرف ۵ ہے یعنی کلکتہ۔ بمبئی۔ کراچی۔ مدراس اور چٹاگانگ۔ ان بندرگاہوں کی مجموعی آمدنی ہر سال تقریباً سات آٹھ کروڑ ہوتی ہے۔

گذشتہ چند سالوں کے اعداد یہ ہیں۔

۱۹۳۳-۳۴ء	۷،۲۸،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۴-۳۵ء	۷،۶۳،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۵-۳۶ء	۶،۷۴،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۶-۳۷ء	۶،۹۰،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۷-۳۸ء	۷،۳۲،۰۰،۰۰۰

مصر آل طولون کے عہد میں

(بسلسلہ جنوری ۱۹۴۲ عیسوی)

از
جناب محمد جمیل الرحمن ایم۔ اے۔ پروفیسر تاریخ۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

(۵)

مورخ اس بات پر متفق ہیں[۱۳۰] کہ احمد بن طولون عقلمند، محتاط اور سیاسی شخص تھا، دین دار تھا اور علماء و اہل دین کو عزیز رکھتا، خیرات و مبرات میں پیش پیش تھا؛ اور مصالح مسلمین ہمیشہ اس کے مدنظر رہتے تھے۔ عقاید کے لحاظ سے وہ شافعی مذہب کی طرف مائل تھا، اور اس مذہب کے لوگوں سے عزت و تکریم سے پیش آتا تھا، عادل، جواد، اور شجاع تھا، تمام کام بذات خود انجام دینے کا عادی تھا، اور اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتا تھا۔ چنانچہ مقریزی[۱۳۱] نے لکھا ہے کہ جہاں تک اسے علم ہے امراء مصر میں مظلوموں کی فریاد سننے اور ان کے مقدموں کا فیصلہ کرنے کے لئے بذات خود اجلاس کرنے والا پہلا امیر ابو العباس احمد بن طولون تھا، اور اس نے ہفتے میں دو دن اس کام کے لئے مخصوص کر رکھے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مورخ یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ خون ریزی میں جلدی کرتا تھا اور جب مصر و شام کا والی ہوا تو اس نے بہت مظالم کئے اور بے حد خون ریزی کی۔ چنانچہ قضاعی کی روایت نقل کی گئی ہے کہ اس کے قید و بند میں اور تلوار سے اٹھارہ ہزار انسانوں کا خون ہوا تھا۔ مگر ابو صالح الارمنی نے

---

۱۳۰ ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۴ + ابن تغری بردی ج ۲ ص ۱۲ + ابن الاثیر ج ۷، ص ۱۳۶ + ابن خلکان ج ۱۔ ص ۵۵۔

۱۳۱ خطط ج ۲۔ ص ۲۰۷۔

جس کی تاریخ ۵۶۴ھ میں لکھی گئی ہے' ان مقتولین کی تعداد صرف دو ہزار بتائی ہے۔[۱۲۳]

لیکن یہ حالات پڑھتے وقت اس کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ احمد بن طولون ایسے زمانے میں گذرا ہے جب کہ کوئی شخص جو اپنی قوت مجتمع کرنا اور بڑھانا چاہتا ہو خون ریزی سے گریز نہیں کرسکتا تھا' بلکہ اس سے محترز رہنا خودکشی اور مکمل تباہی کے مترادف تھا۔ اس افراتفری کے زمانے میں ہمیں متعدد شخصیتیں ایسی بھی ملتی ہیں جن میں احمد بن طولون کی تمام خوبیاں مفقود اور تمام برائیاں موجود تھیں۔ اصلی معیار جس سے ہمیں احمد بن طولون کے کارناموں کو جانچنا چاہیے یہ ہے کہ اس سولہ برس کے عرصے میں اہل مصر اس کی حکومت پر کہاں تک بھروسہ کرتے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ جب وہ مصر آیا ہے تو وہاں ہر طرف فساد پھیلا ہوا تھا' اور بالخصوص علویوں کی شورشیں جاری تھیں۔ ان فسادوں اور شورشوں کو اُس نے فرو کیا۔ اس کے بعد صرف اس کے بیٹے عباس کی وجہ سے مصر میں ایک مرتبہ فساد پھیلا۔ اہل مصر کے لئے بہت ہی اچھا موقع تھا کہ اگر وہ احمد بن طولون کی حکومت اور اس کے طرز عمل سے نالاں ہوں تو عباس کا ساتھ دے کر حکومت تبدیل کردیں۔ لیکن واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل مصر نے اس بغاوت سے کوئی دلچسپی نہیں لی' اور مجبوراً عباس کو مصر کے باہر ہمدرد تلاش کرنے پڑے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اس کی ناکامی کا بڑا سبب یہی تھا کہ اہل مصر اس سے بالکل الگ رہے' اور بقیۃ العمر اُسے قید و بند میں گزارنی پڑی۔ اس مدت میں بھی اہل مصر کی طرف سے کوئی کوشش عباس کو چھڑانے یا اپنے آپ کو احمد بن طولون کے پنجے سے نجات دلانے کے لئے نہیں ہوئی۔ عباس کی بغاوت بہت خطرناک بن سکتی تھی۔ اس نازک وقت میں احمد بن طولون کی کامیابی کے دو اسباب تھے: ایک اہل مصر کا اس شورش سے الگ رہنا' اور دوسرے اُس کی فوج کی وفاداری۔

حقیقت میں دیکھا جائے تو احمد بن طولون کی تمام کامیابیوں کا دارومدار اُس کی فوج پر تھا' اور یہ فوج نہایت ہی تندہی اور فراست سے جمع اور مرتب کی گئی تھی۔ یوں تو خلیفہ معتصم کے

---

[۱۲۳] ابو صالح الارمنی ص ۳۷۔

زمانے ہی سے مصری فوج میں ترکی عنصر بڑھنا شروع ہو گیا تھا، اور پھر اشناس کے حاکم مقرر ہونے سے سیاست اور شہری حکومت میں بھی ترکوں کو اثر و نفوذ حاصل ہو گیا تھا۔ لیکن ۲۴۲ھ میں جب عرب امراء آنے بند ہو گئے، اور ترکوں نے ان کی جگہ لی، تو یہ تبدیلی مکمل ہو گئی۔ ۲۵۴ھ میں جب احمد بن طولون نے وادیٔ نیل میں قدم رکھا ہے تو یہ تبدیل شدہ حالات مصری زندگی کا جزء بن چکے تھے، اور کوئی حوصلہ مند بالغ نظر حاکم ان ترکی عناصر کی مدد سے وہاں ایک مستقل جگہ پیدا کر سکتا تھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ مصر میں آنے کے بعد بہت جلد خلیفہ کے حکم سے اُسے مستقل فوج مرتب کرنے کا موقع مل گیا، اور مصر کے خزانے سے ضروری اخراجات کی پابجائی کر دی گئی تھی۔ اس سے احمد بن طولون نے پورا فائدہ اٹھایا۔ مقریزی[۱۴۳] کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ اُس نے مصری فوج کی بالکل نئی تنظیم کی تھی۔ یہ فوج چوبیس ہزار ترک غلاموں کے علاوہ چالیس ہزار سودانی غلاموں اور سات ہزار مرتزق سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ چالیس ہزار سودانی غلاموں میں غالباً یونانی (رومی) غلام بھی شریک تھے، جن کا ذکر مقریزی[۱۴۴] نے ایک موقع پر کیا ہے۔ غلام ہونے کی حیثیت سے ممکن ہے کہ سودانیوں اور یونانیوں کو تنخواہیں نہ ملتی ہوں، گو ان کے تمام اخراجات حکومت برداشت کرتی تھی۔ لیکن سات ہزار مرتزق سپاہی یقیناً تنخواہ دار تھے۔ ان کے علاوہ ضرور ہے کہ اس نئی فوج میں مصر کے تھوڑے بہت عرب بھی شریک کئے گئے ہوں، لیکن ان کی تعداد بیان نہیں ہوئی، اور حقیقت یہ ہے کہ فوج میں عربی اور مصری عناصر کو احمد بن طولون کے بیٹے خمارویہ نے شریک کیا تھا۔ یہ فوج ناآزمودہ کار تھی، اور اس قابل نہیں تھی کہ میدان جنگ میں بھیجی جائے۔ مگر حسن اتفاق سے ابن الشیخ کے خلاف کوئی جنگ پیش نہیں آئی اور اس نئی مرتب شدہ فوج کا کوچ محض ایک مناورہ ثابت ہوا۔ احمد بن طولون نے صرف فوج جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ سپاہیوں سے حلف لیا کہ وہ ہر حالت میں اس کے وفادار رہیں گے۔ اس کے بعد جب عباس کی بغاوت ہوئی تو ایک مورخ کے مطابق

---

۱۴۳ خطط ج ۱۔ ص ۳۱۵۔

۱۴۴ خطط ج ۱، ص ۹۴، ۳۱۵۔

ایک لاکھ سپاہی بھرتی کئے گئے۔ اگر یہ تعداد محض ایک اندازہ ہی تصور کیا جائے تب بھی یہ تو یقیناً معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے اپنی فوج میں اس موقع پر معتدبہ اضافہ کیا تھا۔[۱۲۵] اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ احمد بن طولون نے جب الموفق سے جھگڑا مول لیا ہے تو اُسے پورا اندازہ ہوگا کہ اگر جنگ کی نوبت آئی تو وہ حریف کا مقابلہ بلا کھٹکے کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ فوج کی وابستگی اور وفاداری کا سب سے اچھا مظاہرہ اس سے ہوتا ہے کہ تمام عہد امارت میں کہیں یہ پڑھنے میں نہیں آتا کہ مصری فوج میں کبھی کسی قسم کا غدر ہوا ہو، یا احمد بن طولون کو اپنی فوجوں پر ذرا سا شبہ بھی ہوا ہو۔ اس کے برعکس مرکز خلافت کی فوجوں کا حال ہم اوپر پڑھ آئے ہیں کہ الموفق کے اشارے سے جب موسیٰ بن بغا اُس کے خلاف فوجیں لے کر روانہ ہوا ہے تو رقم کی کمی کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکا، اور فوج کے غدر اور فساد سے یہ نوبت پہنچی کہ موسیٰ بن بغا کے کاتب کو جان بچانے کے لئے روپوش ہونا پڑا۔ فوج کے سپاہی منتشر ہو گئے، اور یہ زبردست ناکامی آخر موسیٰ بن بغا کی موت پر ختم ہوئی۔

اس زمانے میں فوج کے سپاہیوں کے دلوں میں جوش و خروش پیدا کرنے، ضبط و تنظیم برقرار رکھنے اور اُن میں وفاداری کے جذبات ابھارنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت تھی۔ اول تو یہ کہ سپاہیوں کو معلوم ہو کہ جس کے لئے وہ اپنی جانیں دے رہے ہیں وہ انھیں کی طرح جفاکش ہے، تمام تکلیف و آسایش میں اُن کا رفیق ہے، اور سپاہی ہونے کی حیثیت سے کسی طرح ان سے کم نہیں۔ احمد بن طولون، ابتدائی زمانہ میں خود معمولی سپاہی کی زندگی بسر کر چکا تھا، اور تمام نشیب و فراز سے واقف تھا۔ یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ وہ ہر مہم میں اپنی فوج کے ساتھ رہا تھا، اور ہر نرم و گرم تجربے میں سپاہیوں کا برابر کا حصہ دار تھا۔ دوسرے ضروری چیز یہ ہے کہ ان کی تنخواہیں باقاعدہ ملتی رہیں اور ان کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھا جائے۔ اس کا انتظام احمد بن طولون نے قطائع کی تعمیر سے کر دیا۔

ہم اپنے گزشتہ مضمون میں بیان کر چکے ہیں کہ جب فسطاط کی تخطیط کی گئی ہے تو ایک خطہ الحمراء القصوی کہلاتا تھا۔ بنو امیہ کے امراء مصر اسی خطے میں رہتے تھے، لیکن کوئی دارالامارۃ

۱۲۵ بیکر (بحوالہ جلال الدین) ص ۱۵۴ ا۔

نہیں تھا، بلکہ وہ اپنے گھروں میں رہتے تھے۔ ۱۳۲ھ میں مروان الجعدی کی تلاش میں سودہ مصر آئے ہیں تو یہ خطہ تباہ ہوگیا لیکن امراء مصر اب تک وہیں قیام کرتے رہے۔ پہلے عباسی امیر مصر صالح بن علی الہاشمی نے وہاں ایک دار الامارۃ تعمیر کرایا۔ ابوعون عبدالملک حاکم مصر (۱۳۲ھ سے ۱۳۶ھ اور بار دوم ۱۳۷ھ سے ۱۴۱ھ) نے اپنے ساتھیوں کو وہاں مکانات بنانے کی اجازت دی، اور اب یہ خطہ "عسکر" کہلانے لگا، اور عسکر اور فسطاط مل کر "مدینۃ الفسطاط والعسکر" ہوگیا۔ یزید بن حاتم (۱۴۴ھ تا ۱۵۲ھ) کے عہد امارت تک عسکر ہی امراء کا قیام گاہ رہا لیکن ۱۴۶ھ میں ایک بغاوت کی وجہ سے خلیفہ منصور نے حکم دیا کہ یزید فسطاط میں منتقل ہوجائے۔ ۲۵۴ھ میں جب احمد بن طولون مصر آیا ہے تو صالح بن علی کے تعمیر کردہ دار الامارۃ میں، جو عسکر میں تھا، ٹھیرا تھا۔[۱۲۶] لیکن ابن الشیخ کے مقابلے کے لئے جب نئی فوج بھرتی کی گئی اور اس میں برابر اضافہ ہوتا گیا تو عسکر اس فوج کے لئے کافی نہ ہوا، اور احمد بن طولون کو کسی ایسی جگہ کی تلاش ہوئی جہاں وہ خود اور اس کی نئی فوج اطمینان اور آرام سے رہ سکیں۔ ۲۵۶ھ میں پائین کوہ (سفح الجبل) کے مقام کو پسند کر کے اس نے حکم دیا کہ وہاں یہودیوں اور عیسائیوں کا قبرستان منہدم کر دیا جائے۔ اس جگہ کو اس نے مختلف خطوں میں تقسیم کیا، اور وہیں اپنا قصر تعمیر کرایا۔ اپنے اصحاب، غلمان اور اتباع کو اجازت دی کہ اس میدان میں اور قصر کے گرد اپنے مکانات بنالیں، یہاں تک کہ یہ عمارتیں فسطاط سے ملحق ہوگئیں۔ اس کے بعد قطائع بنائے گئے۔ ہر قطیعہ کا نام ان لوگوں پر رکھا گیا جو اس میں رہتے تھے۔ مثلاً قطیعۃ النوبہ، قطیعۃ الروم، قطیعۃ السودان وغیرہ۔ ان تمام عمارتوں، قصر اور قطائع کو ملا کر "میدان" کہتے تھے۔ اس کی مساحت میل در میل تھی۔ رفتہ رفتہ میدان ایک مستقل شہر بن گیا، جو دمشق سے زیادہ آباد اور خوبصورت تھا۔ گلیاں اور سڑکیں بن گئیں، اچھی اچھی مسجدیں تعمیر ہوگئیں، پن چکیاں، حمام اور تنور قائم ہوگئے۔ مختلف بازاروں کے باقاعدہ نام رکھے گئے، اور ہر حرفت کے لئے ایک بازار مخصوص کر دیا گیا تھا، مثلاً سوق العیارین، سوق الجزارین، سوق البقالین، وغیرہ۔ یہاں پولو کھیلنے کا میدان بھی تھا۔ پورے میدان کی کیفیت ایک فوجی

۱۲۶ خطط ج ۲۔ ص ۲۶۴ + ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۳۶۲، ۳۶۳ + القلقشندی ج ۳۔ ص ۵

چھاؤنی کی تھی۔ قضاعی نے بیان کیا ہے کہ میدان ہی میں فوجی قواعد اور مظاہرے کے لئے ایک منظر تعمیر کیا گیا تھا، اور یہ فوجی قواعد (عرض الخیل) اسلام کے چار عجائبات میں سے ایک عجوبہ تھا[۱۲۵]۔ حفاظت کے لئے میدان کے گرد ایک فصیل کھینچی گئی تھی، جس میں آٹھ دروازے تھے۔ سال میں صرف تین مرتبہ عید، فوجی قواعد اور صدقہ کے دن یہ تمام دروازے عوام کے لئے کھولے جاتے تھے۔ باقی ماندہ دنوں میں صرف ضرورت کے لحاظ سے فصیل کے دروازے کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ قصر میں ایک بلند نشست گاہ تھی، یوم العرض اور یوم الصدقہ کو احمد بن طولون خود بیٹھتا تھا، تاکہ آیندہ روند کو دیکھ سکے۔ باب السباع پر ایک اور نشست گاہ تھی جہاں وہ صرف عید کی رات کو غلمان کا معائنہ کرنے اور ان کی حاجتیں پوری کرنے کے لئے بیٹھتا تھا۔ اس تمام تعمیر پر، ابن تغری بردی کی روایت کے مطابق، اسی ہزار دینار خرچ ہوئے تھے۔ احمد بن طولون کے دو بیٹوں خمارویہ اور ہارون کے زمانے میں میدان کی چہل پہل برقرار رہی، بلکہ نئی عمارتیں بنتی گئیں اور آبادی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ۲۹۲ھ میں جب محمد بن سلیمان الواثقی کاتب نے خلیفہ مکتفی کے حکم سے آل طولون کا خاتمہ کیا ہے تو ان قطائع کو بھی برباد کر دیا اور قصر کو مسمار کر کے اُس کی بنیادیں تک کھود ڈالیں۔ اس کے بعد میدان پھر کبھی آباد نہیں ہوا[۱۲۶]۔ میدان کے اندرونی انتظام کے متعلق افسوس ہے کہ مزید اطلاعات نہیں ملتیں۔

احمد بن طولون سے قبل، مورخ متفق ہیں کہ مصر کی معاشی زبون حالی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور عام طور پر احمد بن المدبر کو اس کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ خلافت عباسیہ کی

---

۱۲۵ دیکھو ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۷۶ + قضاعی نے لکھا ہے کہ باقی تین عجائبات مکہ کا رمضان، طرسوس کی عید، اور بغداد کا جمعہ تھے۔ ان میں سے دو، یعنی مصر کی فوجی قواعد اور طرسوس کی عید، خود قضاعی کے زمانے میں ہی ختم ہو چکے تھے۔ اس پر ابن تغری بردی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ قضاعی کے بعد بغداد کا جمعہ بھی ختم ہو گیا تھا جب ہلاکو نے بغداد فتح کیا ہے اور خلیفہ مستعصم کو قتل کر دیا ہے۔ اس کے بعد عراق سے شعائر اسلام رخصت ہو گئے۔ اب صرف مکہ کا رمضان رہ جاتا ہے۔ نہ معلوم اس وقت اس کا کیا عالم ہے۔

۱۲۶ الکندی ص ۲۱۵ + خطط ج ۱۔ ص ۳۱۳ - ۳۱۶ + قلقشندی ج ۳۔ ص ۳۳۵، ۳۳۶ + ابن تغری بردی ج ۳۔ ص ۱۲، ۱۵ +

ابتدا ہی سے اس زبوں حالی کا آغاز ہو چکا تھا، اور اس کی تمام ذمہ داری مرکزِ خلافت پر تھی، نہ کہ کسی خاص شخص پر۔ ہم دیکھ چکے ہیں[129] کہ بنو امیہ کے آخری زمانے میں عبید اللہ بن الحبحاب نے مصر کے محاصل اور اراضی کی آخری تنظیم کی تھی، اور اس تنظیم کے بعد اس نے ستائیس لاکھ تیئس ہزار آٹھ سو اڑتالیس دینار بطور فاضل آمدنی دمشق بھیجے تھے۔ لیکن قبل اس کے یہ تنظیم پوری طرح بار آور ہو، اور اس سے کچھ نتائج مترتب ہوں مشرق کے انقلاب سے مصر کے حالات بھی تبدیل ہو گئے۔ عباسیوں نے معلوم ہوتا ہے کہ مصر کے ساتھ ہمیشہ سوتیلے بچوں کا سا سلوک کیا۔ ۱۴۲ھ کے واقعات میں بیان کیا گیا ہے کہ خلیفہ منصور نے محمد بن الاشعث بن عقبہ کو مصر پر علی الصلاۃ و الخراج مقرر کیا، اور جب اُس کے قدم وہاں جم گئے تو نوفل بن الفرات کو وہاں بھیجا کہ وہ محمد بن الاشعث کے سامنے خراجِ مصر کا ضمان پیش کرے۔ اگر وہ اُسے منظور کرے تو حسبِ دستور صاحب الخراج کے فرائض انجام دیتا رہے، ورنہ نوفل بن الفرات ان فرائض کا جائزہ لے لے۔ محمد بن الاشعث نے ضمان قبول کرنے سے انکار کیا اور نوفل نے خلیفہ کے حکم کے مطابق دواوین کا جائزہ لے لیا۔ اس کے بعد محمد بن الاشعث خراج کے ہاتھ سے نکل جانے پر برابر پچھتاتا رہا۔[130] یہ پہلا موقع ہے کہ مصر میں ضمان کا ذکر آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ اخراجات کی تکمیل کے بعد ایک مقررہ رقم بغداد کے سرکاری خزانہ میں داخل کرنے کی ضمانت دی جائے۔ اب یہ حالت ہو گئی کہ جو شخص صاحب الخراج مصر مقرر ہو وہ اس مقررہ رقم کی پابجائی کرتا رہے، اور اپنے لئے بھی کچھ نہ کچھ رقم پیدا کرلے، اور ان لوگوں کی خواہش اور مطالبات بھی پورے کرے جو اُس کے ساتھ مصر آئے تھے۔ اس کے بعد ایک اور قدم آگے بڑھایا گیا، اور اس مقررہ رقم کے متعلق ایک تحریری عہد نامہ ہونے لگا۔[131]

---

[129] "عرب مصر میں"۔ رسالہ سیاست (حیدر آباد دکن) جولائی ۱۹۶۱ء +

[130] ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۳۸۲، ۳۸۳ +

[131] بیکر ص ۱۳۸ +

یاد رہے کہ یہ ضمان ہے تقبیل نہیں۔ مصر کی معاشی زبوں حالی کا آغاز یہاں سے ہوا۔
۱۴۳ھ میں محاصل کی رقم میں اضافہ ہوا اور حمید بن قحطبہ کے عہد امارت میں اٹھائیس لاکھ چونتیس ہزار پانچ سو دینار وصول ہوئے[۱۳۲]۔ پھر موسیٰ ابن عیسیٰ کے زمانے میں، جو ۱۷۱ھ سے ۱۸۰ھ تک تین مرتبہ مصر کا والی مقرر ہوا تھا، یہ رقم اخراجات کی منہائی کے بعد اکیس لاکھ اسی ہزار ہوگئی[۱۳۳]۔ ۲۱۲ھ میں عبداللہ بن طاہر بن حسین کو جب مصر کا والی مقرر کیا گیا ہے تو محاصل کی مقدار تین لاکھ دینار تھی[۱۳۴]۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ محصول اراضی میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ چنانچہ مقریزی[۱۳۵] نے لکھا ہے کہ خلافت مامون اور اس کے بعد کے دور میں فی فدان (ایکڑ) دو دینار لگان عاید کیا جاتا تھا۔ ۲۱۳ھ میں جب مصر کے نظم و نسق میں پھر ایک دور اس تبدیلی ہوئی۔ اس سال مامون نے اپنے بھائی معتصم کو مصر کا ملک دے دیا۔ اب جاگیرداروں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ اشناس، ایتاخ، منتصر، فتح بن خاقان، باکباک اور یارجوخ اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ان میں سے معتصم اور اس سے قبل عبداللہ بن طاہر بن حسین دو ایسے شخص ہیں جو مصر میں تھوڑی مدت کے لئے رہے تھے۔ باقی ماندہ لوگوں کے لئے مصر کی حیثیت ایک دور افتادہ جاگیر سے زیادہ نہ تھی، جس سے وہ صرف مالی فائدہ اٹھانے کے متوقع تھے اور بس۔ اس تبدیلی کے شروع میں بھی مصر کا صاحب الخراج خلیفہ ہی کی طرف سے براہ راست مقرر ہوتا تھا[۱۳۶]۔ لیکن زمانۂ مابعد میں اس کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ گو صاف اور صریح روایات ہم تک نہیں پہنچیں لیکن یہ سمجھنا ہرگز بعید از قیاس نہیں کہ خالص آمدنی میں اب مرکزی خزانہ اور جاگیردار دونوں حصہ دار ہوتے ہوں گے، اور اس کے

[۱۳۲] بیکر (منقول از فون کریمر) ص ۱۳۸۔

[۱۳۳] خطط ج ۱، ص ۹۹۔

[۱۳۴] ابن تغری بردی ج ۱، ص ۶۱۰۔

[۱۳۵] خطط ج ۱، ص ۹۹۔

[۱۳۶] ابن تغری بردی ج ۱، ص ۶۶۱: وکان الخراج للخلیفة یولی علیه من شاء فی هذه السنین۔

علاوہ صاحب الخراج بدستور باقی رہا۔ ۲۵۰ھ میں سات لاکھ پچاس ہزار دینار بطور باج مرکزی خزانہ میں ادا کئے گئے، کیونکہ اس رقم کو اب باج کہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ اس طرح عربوں کی فیض رساں حکومت کے اٹھ جانے اور ترکوں کے مسلط ہو جانے سے ملک کا نظم ونسق خراب ہو رہا ہے۔ مذکورہ بالا تبدیلیوں کی وجہ سے ملازموں کی رشوت ستانی اور بد اطواری بھی بڑھ رہی ہوگی۔ محصول اراضی میں برابر اضافہ ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ ۲۵۴ھ میں ایک فدان پر چار دینار عائد کئے گئے ہیں[۱۳۷]۔ ان سب باتوں کا نتیجہ معاشی زبون حالی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟

اس موقع پر ۲۴۷ھ میں خلیفہ منتصر نے احمد بن المدبر کو مصر کا صاحب الخراج مقرر کیا۔ اُس نے مصر آ کر یہاں کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ آمدنی بڑھانے کے نئے وسایل دریافت کئے جائیں، اور اُس نے تین نئے محاصل عاید کئے۔ یہ سب غیر قانونی محاصل تھے، اور معاون و مرافق کہلاتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اِن کی وجہ سے عوام پر سختیاں ضرور ہوئی ہوں گی۔ مگر زمانۂ مابعد میں ابن المدبر کی معزولی کے بعد بھی ان محاصل کو مکمل طور پر منسوخ نہیں کیا جا سکا۔ چنانچہ مقریزی[۱۳۸] نے اعتراف کیا ہے کہ چراگاہوں، نطرون اور ماہی گیری کے محاصل مستقل (استمرّا) ہو گئے تھے۔

یہ حالات تھے جب ۲۵۴ھ میں احمد بن طولون مصر پہنچا، اور اُس کے ساتھ مصر کے بھلے دن بھی لوٹ آئے۔ مگر ۲۵۸ھ تک، معاشی معاملات میں اس کا کوئی دخل نہیں ہوا۔ کیونکہ یہ محکمہ حسب سابق احمد بن المدبر کے زیر اقتدار تھا۔ اس سال جب احمد بن المدبر کو شام میں منتقل کیا گیا تو اُسے شہری اور مالی حکومت کا پورہ جائزہ ملا۔ جس طرح مورخ احمد بن طولون سے قبل مصر کی زبون حالی پر متفق ہیں۔ اسی طرح اُس کے عہد میں ملک کی خوش حالی کے متعلق

---

۱۳۷ بیکر (منقول از کارل بکلر) ص ۱۴۱ + کارابکک نے یہ نہیں لکھا کہ کس پیداوار پر چار دینار فی فدان وصول کئے جاتے تھے۔ کیوں کہ مختلف پیداواروں کے محاصل بھی مختلف تھے۔ لیکن بیکر کا قیاس ہے کہ گیہوں کی پیداوار پر یہ محصول عائد کیا گیا تھا۔

۱۳۸ خطط ج ۱، ص ۱۰۳، ۱۰۴ +

یک زبان ہیں۔ اس سولہ سالہ مدت میں جو عام امن و امان ملک میں رہا وہی یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ ملک خوش حال تھا۔ مزید براں ہمیں اس کا بھی علم ہے کہ اس مدت میں کبھی ایسا موقع نہیں آیا جب احمد بن طولون مالی مشکلات میں مبتلا ہوا ہو۔ بلکہ وہ اتنا نقد چھوڑ گیا تھا کہ خمارویہ کی فضول خرچیوں کی وجہ سے معاشی حالات پھر خراب ہونے شروع ہوئے۔ اس سے ہم یقینی طور پر کہ سکتے ہیں کہ احمد بن طولون کا مالی نظم و نسق ضرور قابل تعریف ہوگا لیکن افسوس ہے جب ہم اس نظم و نسق کی تفصیل معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں مایوس ہونا پڑتا ہے کیونکہ اس کے متعلق ہماری معلومات بہت ہی تشنہ ہیں۔ مقریزی[۱۳۹] لکھتا ہے کہ ابن المدبر کے زمانے میں جب مصر کی مالی حالت تباہ تھی تو صرف آٹھ لاکھ خراج وصول ہوا تھا۔ پھر جب احمد بن طولون کو مالیات مصر پر تصرف حاصل ہوا ہے اور اس نے مصر کو خوشحال بنانے کی کوشش کی ہے تو سنہ ۲۶۳ھ میں خراج تینتالیس لاکھ تک پہنچ گیا تھا۔ اس سے قبل صرف ایک مرتبہ عبید اللہ بن الحبحاب کے زمانے میں خراج مصر میں اتنا معتد بہ اضافہ ہوا تھا۔ پھر یہ اضافہ اس طرح بھی نہیں ہوا تھا کہ عوام پر کسی طرح کی سختی گزری ہو، بلکہ دس اردب گیہوں کی قیمت ایک دینار، اور دس رطل روٹی کی قیمت صرف ایک درہم تھی[۱۴۰]۔ اس کے علاوہ محاصل میں اضافہ کرنے یا نئے محصول لگانے کے بجائے وہ تمام غیر قانونی محاصل (مکوس) جو ابن المدبر نے عائد کئے تھے، منسوخ کر دیے گئے تھے۔ مورخوں نے اُس کے اخراجات کی مدات بھی بیان کی ہیں جنھیں مختصر طور پر لین پول[۱۴۱] نے یک جا جمع کر دیا ہے۔ سنہ ۲۵۰ھ میں صاحب الخراج نے سات لاکھ پچاس ہزار دینار بطور خراج خلیفہ کے پاس بھیجے تھے، اور چار سال میں اس خراج کی مقدار بائیس لاکھ دینار تھی۔ قطائع پر اسی ہزار دینار، جامع ابن طولون پر ایک لاکھ بیس ہزار دینار، مارستان پر اسی ہزار دینار، اور قلعہ روضہ پر بھی اسی ہزار دینار خرچ ہوئے تھے۔ اُس کی ماہانہ خیرات

---

۱۳۹ خطط ج ۱۔ ص ۹۹ + ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۹۴ + ابن ایاس ج ۱۔ ص ۴۰ +

۱۴۰ بیکر (بحوالہ ویسٹن فیلڈ) ص ۱۹۶ +

۱۴۱ تاریخ مصر بعہد وسطیٰ (انگریزی) ص ۶۵، ۶۶،

یک ہزار دینار، اور مطبخ کا روزانہ خرچ ایک ہزار دینار تھا۔ اس کے علاوہ علما و فضلا کے انعامات، ںی زبردست فوج، لاتعداد خانگی ملازمین اور فوجی لحاظ سے مختلف قلعوں کی دیکھ بھال کے خراجات تھے۔ ابن ایاس[۱۴۲] نے لکھا ہے کہ اس نے دس لاکھ طلائی دینار، جواہرات کے سو صندوق، لاتعداد فروش و تحائف ترکے میں چھوڑے تھے۔ ضیاع و املاک اور باغ اس کے علاوہ تھے۔ ین پول لکھتا ہے کہ یہ تمام اخراجات صرف تینتالیس لاکھ دینار سالانہ محاصل سے پورے نہیں ہوسکتے تھے، اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ قبطیوں سے زبردستی رقمیں وصول کرتا تھا، جیسا کہ عیسائی ورخوں نے بیان کیا ہے۔ لیکن اس نے نہ کسی عیسائی مورخ کا حوالہ دیا اور نہ کسی مسلمان مورخ کا۔ جو ذرائع معلومات ہمارے پیش نظر ہیں ان سے بھی احمد بن طولون پر یہ الزام عائد نہیں ہوتا ۔ وہ مسلمانوں یا عیسائیوں سے اس معاملے میں سختی کرتا تھا۔ مصری مورخوں نے جس طرح اپنے الیوں کے تمام عیوب و محاسن بلا کم و کاست بیان کر دئے ہیں انھیں دیکھتے ہوئے یہ ناممکن علوم ہوتا ہے کہ وہ احمد بن طولون کے متعلق یہ لکھنا بھول جاتے کہ اس نے قبطیوں کو لوٹا تھا، غیر معمولی سختیاں ان پر روا رکھی تھیں۔

ایک روایت مقریزی[۱۴۳] نے ابن الدایہ (جامع السیرۃ) سے نقل کی ہے جس سے احمد بن لون کے عہد کی معاشی حالت پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب خلیفہ معتمد نے مصر ر ثغور الشامیہ کا خراج احمد بن طولون کے سپرد کیا تو اس نے تمام اعمال میں معاون و مرافق نسوخ کرنے اور متقبلین کو مزارعین کے پٹے فسخ کرنے کی ممانعت کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر مر کے معاون و مرافق منسوخ کرنے سے قبل اس نے عبداللہ بن دسومہ سے جو اس وقت ابوایوب نہ اخت الوزیر صاحب الخراج کا متولی (امین) تھا، اس بارے میں مشورہ کیا۔ ابن دسومہ نس و بدطینت شخص تھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ نہ صرف معاون و مرافق کو منسوخ نہ کیا جائے، بلکہ صرف مصر (فسطاط) سے ایک لاکھ دینار سالانہ اس مد میں وصول ہوتے ہیں، بلکہ چونکہ

---

۱۴۲ بدائع الزہور۔ ج ۱۔ ص ۴۴ +

۱۴۳ خطط ج ۲۔ ص ۲۶۶، ۲۶۷ +

یہ خشک سالی کا زمانہ ہے اس لئے متقبلین کے اجازت نامے اور امراء کی ضیاع بھی منسوخ کر دئے جائیں، تو اس سے ملک کی آمدنی میں بہت اضافہ ہوگا۔ احمد بن طولون نے اس مشورے کو فوراً قبول کرنے کے بجائے، جس سے فسخ شدہ اجازت ناموں کے بجائے زیادہ شرح پر نئے اجازت نامے جاری کرنا مقصود تھا، غور و فکر کیا۔ رات کو اُس کے طرسوس والے زاہد دوستوں میں سے ایک زاہد اُسے خواب میں نظر آیا، جس نے ہدایت کی کہ وہ عبد اللہ بن دسومہ کے مشورے پر عمل نہ کرے، بلکہ جو فیصلہ کر چکا ہے اُس پر بلا تامل کاربند ہو۔ اللہ اُسے اس کا عوض دے گا۔ صبح کو اس نے معاون و مرافق کی منسوخی کا حکم دے دیا، اور ابن دسومہ کو اس کی اطلاع دی۔ ابن دسومہ نے اب بھی اس کی مخالفت کی اور کہا کہ تم نے زندہ کی بات نہ مانی اور مردہ کے کہنے پر عمل کیا۔ لیکن اگلے دن صبح کو احمد بن طولون چند غلاموں کے ساتھ مصر صعید روانہ ہوگیا۔ صحرا میں اُس کے ایک غلام کے گھوڑے کا پاؤں ریت میں دھس گیا۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ وہاں ایک دفینہ ہے۔ خلیفہ کی اجازت سے یہ دفینہ مارستان پر خرچ کیا گیا۔ اسی قسم کے ایک اور دفینہ سے جامع ابن طولون تعمیر ہوئی۔ ابن دسومہ کو اُس نے پھر بلایا، اور کہا کہ مردے کی بشارت کی یہ پہلی برکت ہے۔ اگر میں وعدہ نہ کر چکا ہوتا تو تجھے قتل کر دیتا۔ چند روز کے بعد لوگوں کی شکایت پر کہ وہ ان پر بیجا سختیاں کرتا ہے، ابن دسومہ کو قید کر دیا گیا، اور مال و اسباب ضبط کر لیا گیا۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ خلیفہ منصور کے زمانے میں ہی ضمان کا طریقہ رائج ہو چکا تھا۔ مقریزی[۱۲۵] کے مطابق بعد کے زمانے میں ایک اور برا رواج پڑ گیا تھا کہ ضمان میں ایک بارگی تبدیلی

---

[۱۲۵] خطط ج ۱ ص ۸۴ ـ قال لما انتھی الی المامون ما یعتمد فی الدواوین من قبول الزیادات و فسخ عقود الضمانات وانتزاعھا من کابد فیھا المشقة والتعب وتسلیمھا الی باذل الزیادة من غیر کلفة ولا نصب انکر ذلك و منع من ارتکابھا ونھی عن الولوج فی بابه وخرج امرہ باعفاء الکافة اجمعین والضمناء والمعاملین من قبول الزیادة فیما یتصرفون فیه ویستولون علیه ما داموا مغلقین وبا قساطھم قائمین وتضمن ذلك منشور قری فی الجامعین الازھر بالقاھرة والعتیق بمصر

بقیہ برصفحہ آئندہ ملاحظہ ہو

کر دی جاتی تھی، اور تمام معاملہ اُس شخص کے سپرد کردیا جاتا تھا جو زیادہ رقم ادا کرنے کا وعدہ کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جو شخص تکلیف اٹھاتا تھا، اور ابتدائی اخراجات برداشت کرتا تھا وہ اس سے فائدہ اٹھانے سے باز رکھا جاتا تھا، اور کوئی دوسرا شخص اس کے کام سے مستفید ہوتا تھا خلیفہ الآمر کے وزیر مامون کو جب اس طرزِ عمل کا علم ہوا تو اُس نے اسے بہت بُرا سمجھا، اور حکم دیا کہ آئندہ ایسا نہ کیا جائے، اور ضمناء و معاملین سے ان زمینوں کے متعلق جن پر وہ متصرف ہیں زیادہ رقم کا مطالبہ اُس وقت تک نہ کیا جائے جب تک کہ وہ اپنے ضمان پر قائم ہیں اور اقساط باقاعدہ ادا کرتے ہیں۔ ابن دسومہ نے جو مشورہ احمد بن طولون کو دیا تھا وہ درحقیقت بھی بدعت سیئہ تھی۔ لیکن یہاں بھی مقریزی نے صرف ضمان کا ذکر کیا ہے، تقبیل کا عمل مامون کے زمانے میں بھی نہیں ہے۔ اب احمد بن طولون کے زمانے میں دو نئی باتیں سننے میں آتی ہیں: ایک تقبیل اور دوسرے ضیاع الامراء۔ ہم فی الحال نہیں کہہ سکتے کہ تقبیل کا طریقہ کب وجود میں آیا۔ تقبیل اور ضمان میں تھوڑا ہی سا فرق ہے۔ مگر تقبیل کے بعد حکومت مالیات میں اتنا دخل نہیں دے سکتی تھی جتنا کہ ضمان کی صورت میں۔ اس لئے متقبل اپنی ذاتی منفعت کی بناء پر مزارعین کے پٹوں کو فسخ کرکے زمین کسی اور کے حوالے کرسکتا تھا جو اُسے زیادہ رقم دے۔ حالانکہ متقبل کی واجب الادا رقم مقررہ تھی، اور اس میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی تھی۔ پھر ضیاع الامراء ہیں۔ خود مقریزی نے لکھا ہے کہ الپ ارسلان اور ملک شاہ کے زمانے میں سب سے پہلے نظام الملک طوسی نے ضیاع تقسیم کئے تھے۔ لیکن یہاں مصر میں احمد بن طولون کے عہد ہی میں ضیاع الامراء موجود ہیں، گو یہ تصفیہ کرنا مشکل ہے کہ امراء سے مراد یہاں فوجی افسر ہیں، جن کی خدمات کا صلہ ضیاع کی صورت میں دیا جاتا تھا، یا شہری امراء ہیں۔ بہرحال ابن دسومہ کے مشورے کو قبول نہ کرکے احمد بن طولون نے مصر کو ایک بہت

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) ودیوان المجلس والخاص الامر بابن سعید بن ونسختہ بعد التصدیر + یہاں مامون سے مراد محمد بن ابی شجاع البطائحی المامون، وزیر خلیفہ الآمر فاطمی سے ہے، اور یہ تنبیح ۵۱۷ھ میں عمل میں آئی ہے۔ جب المامون کو الافضل کے قتل کے بعد الآمر نے وزیر مقرر کیا ہے۔

۱۲۶ خطط ج ۱ ص ۹۵ +

بڑے معاشی انقلاب بلکہ معاشی تباہی سے بچا لیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں یہ بدعت آخر جاری ہو گئی تھی، جسے وزیر المامون نے منسوخ کیا۔

اب صرف یہ رہ جاتا ہے کہ ابن[147] ایاس کی روایت نقل کر دی جائے کہ جب احمد بن طولون کے حالات مستقل ہو گئے تو اُس نے مصر کو آباد کرنے اور خوشحال بنانے کی طرف خاص توجہ کی، اور اس غرض سے اُس نے پل (جسور و قناطر) تعمیر کرائے، نہریں (خلجان) کھدوائیں اور تالابوں کے بند بندھوائے۔ ان کاموں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصر کی بدحالی ختم ہو گئی اور خوش حالی کا دور شروع ہوا۔ ۲۶۶ھ میں مصر سے چار کروڑ تین لاکھ دینار وصول ہوئے۔ ضیاع الامراء اس کے علاوہ تھے[148]۔ ابن تغری بردی[149] نے لکھا ہے کہ ۲۵۹ھ میں احمد بن طولون نے خلیفہ متوکل کے مقیاس النیل کی، جس کی تعمیر ۲۴۷ھ میں ہوئی تھی، ایک ہزار دینار خرچ کر کے مرمت کرائی تھی[150]۔ اس سے زیادہ ہم احمد بن طولون کے مالی انتظامات اور دوسری تبدیلیوں کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔

(۶)

احمد بن طولون کی بعض عمارتوں کا، جو اُس نے مصر میں تعمیر کرائی تھیں، اور پرانے مقیاس کی مرمت کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ یہ عمارتیں زیادہ تر سرکاری اغراض کے لئے بنائی گئی تھیں لیکن ان کے علاوہ مصر میں اور اُس کے باہر احمد بن طولون نے رفاہ عام کے بہت سے کام انجام دیے تھے، اور زبردست عالی شان عمارتیں تعمیر کرائی تھیں، جن کی وجہ سے اُس کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔ یہاں ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان عمارتوں پر اثری نقطۂ نظر سے بحث کی جائے، اور ان کی تعمیری خصوصیات پر نظر ڈالی جائے۔ ان امور کی کافی تفصیل کاربٹ[151]، یوسف[152] احمد اور خصوصاً کریسول[153] نے

---

[147] بدائع الزہور۔ ج ۱۔ ص ۳۷ +

[148] دیکھو ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۴۹ +

[149] النجوم الزاہرہ۔ ج ۱۔ ص ۳۴ +

[150] تصاویر کے لئے دیکھو کریسول تصویر ۸۰۔ ا تا ج +

[151] لائف اینڈ ورک آف احمد بن طولون۔ از آسٹیس۔ کے۔ کاربٹ۔ جنرل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۹۱ء ص ۵۲۷۔ ۵۵۶ +

[152] جامع ابن طولون۔ از یوسف احمد۔

[153] ارلی مسلم آرکیٹکچر حصہ دوم ص [illegible]

اپنی تازہ ترین تصنیف میں کر دی ہے، اور نقشوں، خاکوں اور تصویروں کے ذریعے ان کی خصوصیات کو واضح کر دیا ہے۔ لہذا ان باتوں کا یہاں اعادہ کرنا تحصیل حاصل ہوگا۔

مصر کے باہر احمد بن طولون کی صرف دو عمارتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے ایک عکا کی بندرگاہ ہے۔ مقدسی کا دادا اس عمارت کا مہندس اور تعمیر کنندہ (البنّاء) تھا، اور اسی جغرافیہ نویس نے اس تعمیر کے حالات بیان کئے ہیں۔ مقدسی[۱۵۲] کی عبارت، جس نے اپنی کتاب ۳۷۵ھ میں لکھی ہے، ہم یہاں نقل کرتے ہیں، تاکہ اندازہ ہو جائے کہ اس قسم کی عمارتیں اُس زمانے میں کس طرح بنائی جاتی تھیں۔

عکا مدینة حصينة على البحر كبيرة الجامع؛ فيه غابة زيتون، تقوم بسراجه وزيادة۔ ولم تكن على هذه حصانة حتى زارها ابن طولون؛ وقد كان رأى صور ومنعتها واستدارة الحائط على مينائها۔ فاحب ان يتخذ لعكا مثل ذلك المينا۔ فجمع صُنّاع الكورة وعرض عليهم ذلك۔ فقيل لا يهتدى احد الى البناء فى الماء فى هذا الزمان۔ ثم ذكر له جدّنا ابوبكر البنّاء وقيل ان كان عند احد علم هذا فعنده۔ فكتب

عکا ساحل بحر پر قلعہ بند شہر ہے۔ یہاں کی جامع مسجد وسیع ہے۔ اس کے صحن میں زیتون کے درختوں کا ایک جھنڈ ہے، جس کے تیل سے مسجد کے چراغ روشن کئے جاتے ہیں اور پھر تیل بچ رہتا ہے۔ احمد بن طولون کے وہاں آنے تک شہر قلعہ بند نہیں تھا۔ اُس نے صُور کے استحکامات دیکھے کہ کس طرح ایک فصیل بندرگاہ کے گرد کھنچی ہوئی ہے۔ اُس نے چاہا کہ عکا میں بھی صُور کا سا بندرگاہ (مینا) تعمیر کرے۔ چنانچہ اُس نے صوبے کے صنّاع جمع کئے، اور اُن کے

---

[۱۵۲] احسن التقاسیم فی معرفة الاقالیم ص ۱۶۲-۱۶۳+

الی صاحبه علی بیت المقدس حتی
انهضهُ الیه - فلما صار الیه وذکر
له ذلک، قال "هذا امر هیّنٌ -
علی بفلق الجُمَّیز الغلیظة" فصفها
علی وجه الماء، بقدر الحصن البری
وَ خَیَّط بعضها ببعض - وجعلها
باباً من الغرب عظیماً - فبنی علیها
بالحجارة والشید؛ وجعل کلما
بنی خمس دوامس ربطها باعمدة
غلاظة لیشتد البناء - وجعلت
الفلق کلما ثقلت ونزلت حتی اذا
علم انها جلست علی الرمل، ترکها
حولاً کاملاً حتی اخذت قرارها -
ثم عاد، فبنی حیث ترک - وکلما
بلغ البناء الی الحائط القدیم داخله
فیه وخَیَّطَهُ - ثم جعل علی الباب
قنطرة - فالمراکب فی کل لیلة
تدخل المینا وتجر السلسلة مثل
صُور - قال فدفع الیه الف دینار
سوی الخلع وغیره من المرکوب
واسمهُ علیه مکتوب وکان العلاء

سامنے یہ مسئلہ پیش کیا۔ اُس سے کہا گیا کہ ان دنوں کوئی ایسا
نہیں رہا جو پانی میں عمارت بنا سکے۔ پھر احمد بن طولون
سے ہمارے دادا ابوبکر البنّاء کا ذکر کیا گیا کہ اگر کسی کے
پاس اس قسم کی تعمیر کا علم ہے تو وہ ابوبکر ہی ہے۔
احمد بن طولون نے اپنے حاکم بیت المقدس کو لکھا
اور اس نے ابوبکر کو بھیج دیا۔ جب وہ احمد بن طولون
کے پاس آیا اور یہ مسئلہ اُس کے سامنے پیش کیا گیا تو
اُس نے کہا کہ یہ آسان کام ہے۔ جتنے بڑے اور
مضبوط انجیر (جُمّیز) کے درختوں کے ہو سکیں لاؤ۔
انھیں اس نے سطح آب پر قطار در قطار (سمندر کی
سمت میں) فصیل شہر کی توسیع کی طرح پھیلا دیا، اور
سب کو ایک دوسرے سے باندھ دیا، اور مغرب
کی سمت ایک بڑے دروازے کا راستہ چھوڑ دیا۔
ان شہتیروں پر ابوبکر نے چونے پتھر سے ایک
عمارت اٹھانی شروع کی۔ ہر پانچ ردوں کے بعد
اُسے مضبوط کرنے کے لئے بڑے بڑے ستون لگائے۔
اس طرح بوجھ پڑنے سے شہتیر پانی کے اندر غرق
ہونے شروع ہوئے، جب اس نے جان لیا کہ شہتیر
ریت پر جم گئے ہیں تو پورے ایک سال تک عمارت
کو اُسی حالت میں چھوڑ دیا، تاکہ وہ مستقل طور پر ریت
میں جم جائے۔ پھر واپس آکر جہاں چھوڑا تھا وہاں سے

قبل ذلك يغير على المراكب +

تعمیر شروع کی۔ جب یہ تعمیر قدیم فصیل تک پہنچ گئی تو نئی تعمیر کو اس کے ساتھ جوڑ دیا۔ پھر (بندرگاہ کے مغربی) دروازے پر اُس نے ایک پل تعمیر کیا، ہر رات کو جب جہاز بندرگاہ (مینا) میں داخل ہو جاتے تھے تو صور کے بندرگاہ کی طرح ایک زنجیر اُن کے سامنے کھینچ دی جاتی تھی۔ اس کے صلے میں احمد بن طولون نے ابو بکر کو ایک ہزار دینار دئے، خلعتیں اور گھوڑے اس کے علاوہ تھے، اور اُس کا نام عمارت پر لکھا گیا۔ اس بندرگاہ (مینا) کی تعمیر سے قبل دشمن ان جہازوں کو جو وہاں ٹھیرتے تھے لوٹ لیا کرتا تھا۔

حکیم ناصر خسرو[155] نے پانچویں صدی کے نصف میں اس نواح کا سفر کیا ہے، اور اس بندرگاہ کے مختصر حالات لکھے ہیں۔ پھر یاقوت کی کتاب معجم البلدان چھٹی صدی کی تصنیف ہے۔ وہ مقدسی کی عبارت اُسی کے حوالے سے حرف بحرف نقل کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ ابو بکر کا نام اس عمارت پر اُس وقت تک موجود تھا[156]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی صدی تک یہ تعمیر اچھی حالت میں تھی۔ لی اسٹرینج[157] نے بیان کیا ہے کہ عکا کی اس بندرگاہ کے آثار اب تک باقی ہیں گو تہ آب ہیں۔ کریسول[158] نے لکھا ہے کہ ستونوں کے ذریعے تعمیر کی بندشوں کو مستحکم کرنے کی یہ پہلی مثال ہے، ورنہ عہد اسلام میں یا اس سے قبل ایسی مثال شام میں دیکھنے میں نہیں

155 سفرنامہ ص ۲۲، ۲۳ +

156 معجم البلدان تحت عکہ : واسمه عليه مكتوب الى اليوم +

157 پلسٹائن انڈر دی مسلمز ص ۳۲۹ +

158 ارلی مسلم آرکی ٹیکچر ص ۳۶۰ +

ڈی۔ ٹی۔ اسٹرینج کا قول ہے کہ حروب صلیبیہ کے دوران میں ابو بکر کے طرز تعمیر کی نقل یورپ کے معماروں نے قلعوں کی تعمیر میں اکثر کی ہے۔

مقدسی نے اس کی صراحت نہیں کی کہ یہ بندرگاہ کب تعمیر ہوئی تھی، اور نہ کسی اور مصنف نے اس کا ذکر کیا ہے۔ مگر اپنی زندگی میں احمد بن طولون دو مرتبہ شام گیا تھا، پہلی مرتبہ ۲۱ شعبان ۲۶۴ھ میں اور رمضان ۲۶۵ھ میں مصر واپس آیا تھا۔ دوسری مرتبہ صفر ۲۶۹ھ میں شام گیا اور ۱۹ جمادی الثانی ۲۷۰ھ کو مصر واپس آیا[۱۵۹]۔ ان دو سفروں میں سے ایک سفر میں عکا کی بندرگاہ تعمیر ہوئی ہوگی۔

بیرون مصر احمد بن طولون کی دوسری تعمیر یافہ کا قلعہ ہے۔ اس کا ذکر متعدد مورخوں نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس سے قبل وہاں قلعہ نہیں تھا[۱۶۰]۔ مگر اس عمارت کے تفصیلی حالات نہیں مل سکے۔ عکا کی طرح یافہ بھی ساحل بحریہ واقع ہونے کی وجہ سے فوجی اہمیت رکھتا تھا، ورنہ خود شہر میں کوئی خوبی نہیں تھی۔ چنانچہ یاقوت[۱۶۱] نے ابن بطلان کے ۴۴۲ھ میں لکھے ہوئے ایک رسالہ کے الفاظ نقل کئے ہیں کہ:

"ویافا بلد القحط والمولود فیھا قلّ ان یعیش حتی لا یوجد فیھا معلم للصبیان"۔

ممکن ہے کہ احمد بن طولون نے عکا کی طرح یہاں بھی بندرگاہ تعمیر کرایا ہو، اور ممکن ہے کہ ان مورخوں نے عکا اور یافہ کو خلط ملط کیا ہو۔ مگر یہ محض قیاسات ہیں۔ ان دو کے علاوہ احمد بن طولون کے تمام باقی ماندہ رفاہی عمارتیں مصر میں تعمیر ہوئی تھیں۔

غالباً احمد بن طولون کا سب سے زیادہ نمایاں رفاہی کام سقایہ ہے۔ اس سقایہ کے ذریعے برکۃ الحبش سے، جو فسطاط کے جنوب مشرق میں خطۂ معافر میں واقع تھا، پانی بلند کیا جاتا تھا، اور اس پانی کو شمال کی طرف قرافۃ الکبریٰ (بڑے قبرستان) کے پاس ایک مسجد تک پہنچایا جاتا

[۱۵۹] الکندی ص ۲۱۹، ۲۲۱، ۲۲۴، ۲۳۱ +

[۱۶۰] ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۴ + ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۳۶ + ابو الفداء ج ۲۔ ص ۵۳ +

[۱۶۱] معجم البلدان تحت یافہ +

تھا۔ یہ سقایہ قناطر ابن طولون اور اس کے کنویں کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی تعمیر کی وجہ مقریزی[۱۶۲] نے 'بحوالہ قضاعی' یہ بیان کی ہے کہ ایک مرتبہ احمد بن طولون سوار ہو کر سیر و شکار کے لئے نکلا' اور مسجد اقدام[۱۶۳] کے پاس گزرا' جو خطۂ مغافر میں واقع ہے۔ لشکر کے آگے بڑھ جانے کی وجہ سے وہ اپنے سپاہیوں اور ساتھیوں سے الگ ہو گیا تھا' اور سخت پیاسا تھا۔ مسجد اقدام میں اُسے ایک درزی دکھائی دیا۔ اُس نے درزی سے پانی مانگا۔ وہ پیالے میں پانی لایا اور ساتھ ہی یہ تاکید کی کہ زیادہ نہ پی جانا۔ یہ سن کر احمد بن طولون مسکرایا' اور خوب سیر ہو کر پانی پینے کے بعد درزی سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ پانی بھی پلاتے ہو اور تاکید بھی کرتے ہو کہ زیادہ نہ پینا؟ درزی نے جواب دیا کہ خدا تمہارا بھلا کرے' ہمارے ہاں پانی نہیں ملتا۔ اب یہ اطمینان کر کے واقعی وہاں پانی کی قلت ہے احمد بن طولون آگے بڑھ گیا' اور قصر میں پہنچ کر مسجدِ اقدام کے درزی کو بلایا اور ایک ہزار دینار دے کر اُس سے کہا کہ مہندسوں کو ساتھ لے جائے تاکہ وہ سقایہ کی تخطیط کریں' اور خود درزی کے لئے بھی دس دینار ماہانہ مقرر کر دیا۔ درزی کو حکم دیا کہ جب پانی تم تک پہنچ جائے تو مجھے بھی خوش خبری سنانا۔ یہ مژدہ لانے والے کو اُس نے مالا مال کر دیا۔ احمد بن طولون کو مشورہ دیا گیا تھا کہ عین ابی خُلَیْد المعروف بالنعش سے اس سقایہ کے لئے پانی لے۔ مگر اُس نے کہا کہ یہ چشمہ ہمیشہ عین ابی خُلَیْد ہی رہے گا' اور میرا نام کہیں نہیں ہو گا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک کنواں کھدوایا گیا اور اس کا پانی قناطر کے ذریعہ سے درب السالم تک پہنچایا جاتا تھا۔ یہ ایک خیر جاریہ تھی جس سے امیر و غریب یکساں مستفید ہوتے تھے۔

سقایہ کا مہندس ایک نصرانی تھا' جس سے غالباً قبطی مراد ہے' کیونکہ اگر وہ یونانی ہوتا تو صراحت کے ساتھ رومی لکھا جاتا۔ احمد بن طولون نے اُسے حکم دیا تھا کہ جب تعمیر مکمل

۱۶۲؎ سقایہ کے متعلق حوالہ جات: مقریزی ج ۱ ص ۲۹۸ + ج ۲ ص ۴۵۱، ۴۵۷، ۴۵۸ +

۱۶۳؎ اس مسجد کی وجہ تسمیہ اور حالات کے لئے دیکھو خطط ج ۲ ص ۴۴۵ +

ہو جائے تو اُسے اطلاع دی جائے تاکہ وہ بذات خود تمام کام کا معائنہ کرے۔ یہ دن بھی آ گیا۔ احمد بن طولون کنویں اور قناطر کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اتفاقاً اُس کے گھوڑے نے چونے اور اینٹوں کے ایک ڈھیر سے ٹھوکر کھائی۔ احمد بن طولون شکی مزاج تو واقع ہوا ہی تھا۔ اُسے معاً یہ شبہ ہوا کہ نصرانی مہندس کی نیت بخیر نہیں۔ چنانچہ اسے فوراً گرفتار کر لیا گیا، اور اُس کے کپڑے اتار کر پانچ سو چابکوں کی سزا دی گئی۔ یہ بیچارہ اتنے ہی دیناروں کے صلے کی امید میں تھا۔ اس کے بعد یہ مہندس جامع ابن طولون کی تعمیر شروع ہونے تک برابر مطبق (قید خانے) میں رہا۔

روایت ہے کہ سقایہ کی تعمیر کے بعد احمد بن طولون نے سنا کہ ایک جماعت ایسی ہے جو اس کا پانی پینا جائز نہیں سمجھتی۔ محمد بن عبد اللہ بن عبد الحکم بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رات کو اچانک انھیں امیر کے حکم سے صحرا لے جایا گیا، اور خود امیر بھی وہاں مقیم تھا۔ "امیر کا خادم جو میرے ساتھ تھا اُس نے بتایا کہ ممکن ہے کہ تم سے سقایہ کے متعلق کچھ دریافت کیا جائے۔" وہ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ احمد بن طولون گھوڑے پر سوار سقایہ کے دروازے پر کھڑا ہے، اور سامنے شمع روشن ہے۔ "میں نے فوراً کہا کہ آپ کا خادم مجھے ایسی تیز رفتاری سے لایا ہے کہ میں بہت تھک گیا ہوں۔ اور پانی پینا چاہتا ہوں۔ غلاموں نے پانی دینا چاہا، مگر میں نے کہا کہ میں خود ہی پی لوں گا، اور وہیں سقایہ کا پانی لے کر خوب سیر ہو کر پیا، اور امیر کو دعا دی کہ اللہ اُسے جنت کا پانی پینا نصیب کرے۔ اس پر امیر نے میری طرف دیکھا اور کہا کہ مجھے تم سے ایک کام تھا، مگر اس کا یہ موقع نہیں۔ انھیں واپس لے جاؤ۔" احمد بن طولون کا مقصد پورا ہو چکا تھا اور اب کسی کو اعتراض کی ہمت نہ ہو سکتی تھی۔

جب دولت طولونیہ برباد ہوئی تو سعید القاص نے آل طولون کا ایک مرثیہ کہا۔ اس مرثیے میں سقایہ کے متعلق کہتا ہے[۱۶۴]؎

۱۶۴؎ الکندی ص ۲۵۵، ۲۵۶ + خطط ج ۲۔ ص ۲۵۸ +

وعین مَعِینُ الشرب غیر زَکِیَّةٍ — وَغیر اُجاجٍ لِلرُّ واۃ و للمُطھرِ

کانّ وفود النیل فی جنباتھا — تروح وتغدی بین مَدٍّ الی جَزْرِ

فارفاھا مستنبطاً لمُغِیبِھا — من الارض من بطن عمیق الی ظہرِ

بناء لوان الجن جاءت بمثلہٖ — بقیلی لقد جاءت لمستفظع نکرِ

بہا علی ارض المغافر کلھا — وشعبان والاحمود والحی من الحشرِ

قبائل لونوٗ السحاب یمُدُّھا — النیل یرویھا ولاجدول یجری

یہ سقایہ اب تک موجود ہے گو کھنڈر ہو گیا ہے، اور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ اُس کی مرمت بھی ہوئی تھی۔ کنواں جبل مقطم کے دامن میں ایک ٹیلے کے نیچے کھدوایا گیا تھا، اور جیسا کہ مصر میں عام دستور ہے، رہٹ کے ذریعے اُس کا پانی اوپر پہنچایا جاتا تھا، اور وہاں سے ایک مرتفع نالی کے ذریعہ سے شمال تک پہنچتا تھا۔ یہ نالی شروع میں زمین سے چھ میٹر بلند ہے، لیکن جوں جوں زمین اونچی ہوتی جاتی ہے نالی نیچی ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ آخر زمین کے برابر آگئی ہے۔ نالی کو ایک پل پر بنایا گیا ہے، جس کی محرابیں نوک دار ہیں اور شکل و صورت میں جامع مسجد کی محرابوں سے ملتی ہیں۔ اصل تعمیر میں سرخ اینٹ اور چونا استعمال ہوا ہے، اور اینٹوں کا قد و قامت وہی ہے جو جامع مسجد کی اینٹوں کا ہے[165]۔ ایسا ہونا تعجب خیز بھی نہیں کیونکہ سقایہ اور جامع ابن طولون کا مہندس ایک ہی تھا۔

احمد بن طولون کی سب سے زیادہ مشہور عمارت جامع ابن طولون ہے۔ الکندی[166] نے لکھا ہے کہ اہل مصر (فسطاط) نے احمد بن طولون سے شکایت کی کہ جمعہ کے دن اس کی فوج اور حبشی غلاموں کی وجہ سے مسجد تنگ ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس نے جبل یشکر پر نئی جامع مسجد بنانے کا حکم دیا، جس کی تعمیر ۲۶۴ھ میں شروع ہوئی اور ۲۶۶ھ میں مکمل ہوئی۔ فتح کے بعد دیار مصر میں سب سے پہلی مسجد عمرو بن العاص نے فسطاط میں تعمیر کرائی تھی، اور جوں جوں

---

۱۶۵ کاربٹ ص ۵۳۲ + ۱۶۶ کتاب الولاۃ ص ۲۱۹ +

ضرورت پڑتی گئی اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ پھر بنو عباس کے آغاز خلافت میں فسطاط کے باہر عسکر میں بستی بسائی گئی تو علی بن صالح الہاشمی حاکم مصر نے ۱۶۹ھ میں وہاں ایک نئی جامع مسجد بنوائی جو جامع العسکر کہلاتی تھی۔[167] یہی ابن طولون کے وقت تک جامع مسجد کا کام دیتی رہی۔ لیکن ۲۶۹ھ میں دوسری مرتبہ اسکندریہ سے واپس آنے پر احمد بن طولون نے نئی مسجد بنانے کا حکم دیا[168] جس کی وجہ اوپر بیان کی گئی ہے۔ اس کی جا، وقوع جبل یشکر پر ہے۔ یہ پہاڑ قاہرہ اور مصر (فسطاط) کے درمیان واقع ہے، اور عرب قبیلہ، یشکر بن جدیلہ یا جزیلہ کے نام پر جبل یشکر کہلاتا ہے۔ قطع نظر اس کے یہ پہاڑی اجابت دعا کی وجہ سے مشہور تھی اور یہ بھی روایت بیان کی جاتی تھی کہ اللہ نے حضرت موسیٰؑ سے یہیں باتیں کی تھیں، یہ مقام اس کام بھی آتا تھا کہ منجنیقوں کو ثغور پر بھیجنے سے قبل ان کی آزمایش یہیں کی جاتی تھی۔[169] قطائع کی تعمیر کے بعد ۲۶۳ھ میں جامع ابن طولون کی تعمیر پر غور کیا۔ اس پر وہ دفینہ خرچ کیا گیا تھا جو احمد بن طولون کو تنور فرعون کے مقام پر ملا تھا۔ جب مسجد کا نقشہ تیار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس عمارت میں تین سو ستونوں کی ضرورت ہوگی، اور احمد بن طولون کو بتایا گیا کہ ان کے حاصل کرنے کی صرف یہی ایک سبیل ہے کہ ارياف اور ضیاع کے تباہ شدہ گرجاؤں سے انہیں لیا جائے۔ مگر اس نے ایسا کرنے سے انکار کیا، اور بہت دن تک اس معاملے پر غور کرتا رہا۔ آخر اس نصرانی مہندس کو جس نے سقایہ تعمیر کیا تھا اس کی اطلاع ہوئی۔ وہ ابھی تک مطبق ہی میں تھا۔ اس نے وہیں قید خانے سے احمد بن طولون کو لکھا کہ امیر کی مرضی کے مطابق میں مسجد کو بے ستونوں کے تعمیر کرسکتا ہوں، صرف قبلے کے لئے دو ستون درکار ہوں گے۔ احمد بن طولون نے اسے قید خانے سے بلوایا اور دریافت کیا کہ کیا واقعی وہ ایسا کرنے پر قادر ہے۔ نصرانی مہندس نے کھالوں کے ذریعہ تمام نقشہ تیار کرکے دکھایا۔ امیر نے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا، اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ

---

[167] خطط ج ۲۔ص ۲۴۶، ۲۶۴، ۲۶۵ +   [168] الکندی ص ۲۱۶ +

[169] خطط ج ۱ص ۱۲۵ + ج ۲۔ص ۲۶۵ +

بجائے ستونوں کے مسجد کی چھت کھمبوں پر قائم کی جائے۔ اسی طرح مسجد کے مینار کے متعلق بھی ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ احمد بن طولون کبھی کوئی کام بے کار نہیں کرتا تھا۔ ایک دن وہ کاغذ ہاتھ میں لئے ہوئے اُسے لپیٹ رہا تھا کہ اچانک اُسے خیال آیا کہ یہ عبث کام ہے، مگر اُس نے فوراً مسجد کے معمار کو بلا کر حکم دیا کہ مسجد کا مینار اس شکل کا بنایا جائے۔ بہرحال اُس نے مہندس کو خلعت سے سرفراز کیا، اور ایک لاکھ دینار اس کے حوالے کئے کہ تعمیر شروع کر دے اور باقی ماندہ رقم حسب ضرورت مہیا کر دی جائے گی۔ احمد بن طولون کا خیال تھا کہ مسجد کی عمارت ایسی بنائی جائے کہ اگر شہر جل جائے یا غرقاب ہو جائے تو مسجد کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ چنانچہ اسے مشورہ دیا گیا کہ رُخام کے ستون استعمال نہ کئے جائیں، اور تمام عمارت جیر (کھریاٹی) اور راکھ (رماد) سے تیار کی جائے۔ کیونکہ پتھر آگ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اصلی عمارت میں میضاۃ تعمیر نہیں کیا گیا تھا۔ مسجد کے آخری حصے میں مشروبات اور ادویہ کا ایک ذخیرہ رہتا تھا، اور جمعہ کے دن مسجد میں ایک طبیب مقرر تھا کہ اگر کسی نمازی کو حادثہ پیش آجائے تو فوراً اس کا تدارک کیا جا سکے۔ جب مسجد تیار ہو گئی تو تانبے کی زنجیروں میں فانوس (مفرغہ؟) اور قندیلیں آویزاں کی گئیں عبدالیہ اور سامانیہ چٹائیوں کا فرش کیا گیا۔ قرآن شریف کے متعدد صندوق مہیا کئے گئے، اور قُرّاد اور فقہا مسجد کے لئے مقرر کئے گئے۔ پہلے جمعہ کو قاضی ابوبکرہ بکار بن قتیبہ نے نماز پڑھائی اور ربیع بن سلیمان نے اس حدیث نبویؐ پر ایک تقریر کی :-

من بَنی للّٰہ مسجداً ، ولو کمفحص قطاۃ ، بنی اللّٰہ لہٗ بیتاً فی الجنۃ "۔

ختم نماز کے بعد خیرات کا سلسلہ شروع ہوا، احمد بن طولون نے بہت بڑی رقم صدقہ کی اور فقرا و مساکین کو کھانا تقسیم کیا" وکان یوماً عظیماً حسناً۔" اس پہلی نماز جمعہ کے موقع پر ایک عجیب واقعہ پیش آیا کہ ابو یعقوب البلخی نے خلیفہ معتمد اور اس کے بیٹے کے لئے تو دعا کی مگر احمد بن طولون کو بھول گیا، اور منبر پر سے اتر آیا۔ احمد نے نسیم خادم کی طرف اشارہ کیا کہ اسے

پانچ سو چابک لگائے جائیں۔ اب خطیب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ پھر منبر پہ آیا اور کہا کہ: ولقد عاہدنا الی آدم من قبل ولم نجد لہ عزما[170]۔ اس کے بعد احمد بن طولون کی تعریف اور دعا میں ایک پورا خطبہ کہہ ڈالا۔ اس پر احمد بن طولون نے نسیم کو حکم دیا کہ خطیب کو پانچ سو دینار انعام دئے جائیں۔

تعمیر مسجد کے دوران میں احمد بن طولون نے دیکھا کہ ماہ رمضان میں صناع عشا کے وقت بھی کام میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر اُس نے کہا کہ یہ ضعفا اپنے بال بچوں کے لئے افطار کا سامان کب خریدتے ہوں گے؟ انھیں عصر کے وقت چھوڑ دیا جائے۔ رمضان گزر گیا تو اُس سے درخواست کی گئی کہ پرانا قاعدہ پھر جاری کر دیا جائے۔ لیکن اُس نے کہا کہ مجھے ان کی دعاؤں سے برکت حاصل ہوئی ہے، اس لئے رمضان کا عمل جاری رہے۔ اس کے بعد مصر میں یہ عام قاعدہ ہو گیا تھا کہ مزدوروں کو عصر کے وقت چھوڑ دیا جاتا تھا۔ مسجد کی تعمیر رمضان سنہ ۲۶۵ھ میں مکمل ہوئی، اور اس پر ایک لاکھ، یا بقول ابن تغری بردی ایک لاکھ بیس ہزار دینار خرچ ہوئے تھے[171]۔ ابن عبد الظاہر نے بیان کیا ہے کہ جب مسجد تیار ہو گئی تو احمد بن طولون نے جاسوس مقرر کئے کہ وہ دیکھیں کہ لوگ مسجد کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ عام طور پر تین اعتراض مسجد پر کئے جا رہے ہیں۔ ایک تو کہا جاتا ہے کہ محراب چھوٹی ہے، دوسرے مسجد میں ستون نہیں، اور تیسرا اعتراض یہ تھا کہ میضاۃ نہیں ہے۔ اس پر احمد بن طولون نے لوگوں کو جمع کیا اور انھیں بتایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تھا اور آپ نے بنفس نفیس محراب کا خط کھینچا تھا۔ رہ گئے ستون، میں نے یہ مسجد مال حلال یعنی دفینے سے تعمیر کی ہے، اور ستون کو حاصل کرنے کا صرف یہی ایک ذریعہ تھا کہ وہ کسی پرانی مسجد یا کسی منہدم شدہ گرجا سے لئے جاتے۔ لیکن میں نے اسے پسند نہیں کیا۔ میضاۃ سے مسجد میں صرف نجاست پھیلتی ہے۔ اس لئے میں نے اسے تعمیر نہیں کرایا۔ اب میں

---

۱۷۰ سورۂ طٰہٰ آیت ۱۱۴ +

۱۷۱ النجوم الزاہرہ۔ ج ۲۔ ص ۸ +

مسجد کے پیچھے اُسے تعمیر کرادوں گا۔[۲۲]

جامع ابن طولون کی محراب کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ قبلے سے منحرف ہے۔ اس بارے میں مقریزی نے دو روایتیں نقل کی ہیں۔ ایک تو کہا جاتا ہے جب اس کی تعمیر شروع ہوئی ہے تو احمد بن طولون نے خاص طور پر ایک شخص مدینہ بھیجا تھا کہ مسجد نبوی کی سمت دیکھ کر آئے، اور اُس نے اسی سمت کا اقتدا کیا تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور آپ نے بہ نفس نفیس محراب کی تخطیط فرمائی تھی۔ بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ یہ محراب اکثر معرض بحث میں آئی تھی اور بالآخر قاضی القضاۃ عزالدین عبد العزیز بن محمد بن جماعۃ کے زمانے میں علمائے نے آخری فیصلہ کیا تھا کہ محراب واقعی قبلہ سے منحرف ہے۔ مگر اس کا کوئی تدارک نہیں کیا گیا۔[۲۳]

اس جامع کے متعلق تین روایتیں اوپر کے صفحوں میں بیان ہوئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کی تعمیر اُس دفینے سے ہوئی تھی جو احمد بن طولون کو تنور فرعون میں ملا تھا۔ دوسرے ستونوں کا مسئلہ پہلے ناقابل حل معلوم ہوتا تھا، اور بالآخر نصرانی مہندس نے اُسے حل کیا۔ تیسری روایت یہ ہے کہ احمد بن طولون کو محض کاغذ لپیٹتے لپیٹتے یہ خیال آیا تھا کہ مینار پیچ کش نما بنایا جائے۔ کاربٹ اور کریسول دونوں نے ان روایات کو ناقابل اعتبار اور محض افسانہ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک احمد بن طولون کو جامع کی تعمیر کے لئے کسی دفینے کی ضرورت نہیں تھی۔ کاربٹ کا خیال ہے کہ یہ رقم ظلم و تعدی سے وصول کی گئی تھی، اور لین پول نے لکھا ہے کہ اُس کے اور احمد بن طولون کی دوسری عمارتوں کے لئے

---

[۲۲] مقریزی (خطط ج ۲۔ ص ۲۶۵ + ۲۶۹) نے جامع ابن طولون کی تعمیر کے حالات اور اس کی جامع و مانع تاریخ بیان کی ہے۔ القلقشندی (ج ۳۔ ص ۳۴۴) نے اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا، اور نہ کسی اور مورخ نے کوئی نئی بات لکھی ہے۔ مقریزی اور ابن زولاق ہی دو مصنف ہیں جن میں تفصیلی حالات ملتے ہیں۔

[۲۳] مقریزی (خطط ج ۲۔ ص ۲۵۶-۲۶۴) نے مصر کی محرابوں پر تفصیل سے بحث کی ہے، اور ان کے متعلق جو اختلاف واقع ہوئے ہیں ان کا ذکر کیا ہے۔

عیسائیوں کو لوٹا گیا تھا۔ ہم پہلے ہی لکھ آئے ہیں کہ یہ تمام خیالات ان مصنفوں کی ایجاد ہیں۔ ورنہ تاریخوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ دفینے کا ملنا بجائے خود اتنی اچھنبے کی بات نہیں کہ اسے باور نہ کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ مصر میں کھمبوں پر عمارت کی تعمیر ضرور نئی بات تھی۔ لیکن احمد بن طولون سامرا کا رہنے والا تھا، اور وہاں کی جامع مسجد میں یہ طرز تعمیر پہلے استعمال ہو چکا تھا۔ اس کی تصدیق مقریزی[۱۷۵] سے بھی ہوتی ہے جس نے لکھا ہے کہ جامع ابن طولون میں جامع سامرا کے نقشے کی نقل کی گئی تھی۔ پھر یہ بھی یاد ہوگا کہ احمد بن طولون ایسی عمارت بنانا چاہتا تھا کہ جس پر آگ اور پانی کا اثر نہ ہو اور اسے مشورہ دیا گیا تھا کہ رخام استعمال نہ کرے۔ ممکن ہے کہ مصر میں چونکہ پہلے ایسی عمارت نہیں بنی تھی اس لئے سمجھنے اور سمجھانے میں دقت پڑی ہو، اور نصرانی مہندس نے اس مشکل کو حل کیا ہو۔ یہی حال مینار کا ہے۔ اس کا نمونہ بھی احمد بن طولون کے وطن سامرا میں پہلے سے موجود تھا، اور یہاں بھی ممکن ہے کہ معماروں اور مہندسوں کو سمجھانے کے لئے احمد بن طولون نے کاغذ لپیٹ کر معماروں کو تعمیر و شکل کا نمونہ دکھا دیا ہو۔

جہاں تک ہمیں علم ہے ادریسی[۱۷۶] ہی ایک ایسا مصنف ہے جس نے لکھا ہے کہ احمد بن طولون نے شہر فسطاط میں دو جامع مسجدیں تعمیر کرائی تھیں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

وبها اى مصر مسجدان جامعان	مصر (فسطاط) میں جمعہ اور خطبہ کے لئے دو جامع مسجدیں
للجمعة والخطبة احدهما بناه	ایک جامع مسجد عمرو بن العاص نے بنوائی تھی، اور چاروں
عمرو بن العاص فى وسط اسواق	طرف بازاروں سے گھری ہوئی تھی۔ یہ جامع پہلے رومیوں
الفسطاط ... وكان قبل ذلك	کا ایک گرجا تھا جسے عمرو بن العاص کے حکم سے
كنيسة للروم ...	مسجد میں تبدیل کیا گیا۔ دوسرے جامع مسجد
... والجامع الثانى	موقف کے اوپر ہے۔ اس کا بانی ابوالعباس

۱۷۵ خطط، ج ۲ ص ۲۶۶

۱۷۶ نزہۃ المشتاق ص ۱۴۳

وھو باعلیٰ الموقق۔ بناہ ابو العباس احمد بن طولون۔ ولاحمد بن طولونؒ ایضاً جامع اُخری۔ بناہٗ فی القرافۃ۔ وھو موضعٌ یسکنہ العباد وجمل من اھل الخیر والعفاف۔

احمد بن طولون ہے۔ احمد بن طولون کی ایک اور بھی جامع مسجد ہے، جو اُس نے قرافہ (قبرستان) میں تعمیر کرائی تھی۔ یہاں عبّاد وصالحین رہتے تھے۔

یہاں ادریسی کو مغالطہ ہوا ہے، اور اس کی تصحیح ابن حوقل[176] سے ہوتی ہے۔ اُس نے فسطاط کے حالات میں جامع عمرو بن العاص اور جامع ابن طولون کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ جب قاہرہ بسایا گیا تو قائد جوہر نے ایک تیسری جامع مسجد تعمیر کرائی۔ یہ جامع الازہر ہے۔ اس کے بعد سیدۃ المعزیہ نے قرافہ میں چوتھی جامع مسجد تعمیر کرائی۔ اسی قرافہ والی جامع مسجد کو ادریسی نے احمد بن طولون کی تعمیر کردہ جامع مسجد سمجھ لیا ہے۔ مقریزی[177] سے پتہ چلتا ہے کہ السیدۃ المعزیہ تغرید نام ایک عرب کنیز تھی، ورزان کہلاتی تھی، اور خلیفہ العزیز باللہ نزار کی والدہ تھی۔ قرافہ میں اُس نے ۳۶۶ھ میں ایک جامع مسجد تعمیر کرائی تھی، اور مقریزی[178] کے زمانے میں یہ جامع الاولیا کہلاتی تھی۔ اس سے ادریسی کے اس بیان کی توثیق ہوتی ہے کہ یہ مسجد عباد وصالحین کا مرکز تھی۔

احمد بن طولون کی ایک اور تعمیر کردہ مسجد تنور فرعون میں قلعۃ الجبل کے عقب میں جبل مقطم کی چوٹی پر واقع تھی[179]۔ تنور فرعون کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ قدیم زمانے میں جب

[176] کتاب المسالک والممالک ص ۹۷۔

[177] خطط ج ۲۔ ص ۳۱۸۔ یہاں یہ نام تغن ید لکھا گیا ہے۔ لیکن دوسری جگہ (خطط ج ۲۔ ص ۴۵۳) تغرید (بالغار) ہے۔ ہم نے اسی املا کو ترجیح دی ہے۔ تغن ید غالباً طباعت کی غلطی ہے۔

[178] حالات کے لئے دیکھو خطط ج ۲۔ ص ۴۴۴۔ یہ مسجد دراصل اہل فسطاط کی نزہت گاہ تھی۔

[179] خطط ج ۲۔ ص ۴۵۵۔ الکندی ص ۲۵۵۔

فرعون سفر پر روانہ ہوتا تھا یا سفر سے اپنے دارالسلطنت کو واپس آتا تھا تو یہاں آگ روشن کی جاتی تھی تاکہ گرد و نواح کے لوگ اُس کے استقبال کے لئے تیار ہو جائیں۔ اس کے بعد حضرت یوسف کے بھائی یہودا نے یہاں قیام کیا تھا۔ اس لئے تنور فرعون کو قابل احترام جگہ سمجھ کر ۲۵۹ھ میں احمد بن طولون نے وہاں ایک مسجد تعمیر کرا دی تھی، جسے مسجد تنور کہتے تھے، اور اس کے ساتھ ایک صہریج (حوض) بھی تعمیر کرایا تھا۔ مارستان اور قناطر کی طرح اس مسجد کے بھی اوقاف تھے۔ لیکن یہ مسجد زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہی۔ احمد بن طولون کے بعد اُس کے ایک قائد وصیف بن قاطر میز نے اس لالچ میں اُسے کھدواڈالا کہ اس کی بنیادوں میں مال ملے گا۔ مگر کچھ حاصل نہ ہوا، اور مسجد تنور اور تنور فرعون دونوں تباہ ہو گئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس مسجد کے قندیل سے اب بھی بھولے بھٹکے مسافر کو راستہ معلوم کرنے میں آسانی ہوتی تھی۔ کیونکہ سعید القاص، جس کے چند اشعار ہم پہلے بھی نقل کر چکے ہیں، اُسی مرثیے میں کہتا ہے :-

وتنور فرعون الذی فوق قُلّةٍ	علی شاهق عالٍ علی جبل وعْرِ
بنا مسجداً فیه یفوق بناءهُ	ویهدی به فی اللیل ان ضلّ من یسری
تخال سنا قندیله وضیاءهُ	سهیلاً اذا ما لاح فی اللیل للسفرِ

احمد بن طولون کی ایک اور عمارت دارالامارت ہے۔ یہ عمارت جامع مسجد کے جوار میں تھی، اور اُسی کے ساتھ تعمیر ہوئی تھی۔ جامع کی طرح یہ بھی قبلے کی سمت واقع تھی۔ اس میں سے ایک دروازہ مسجد کی دیوار میں کھلتا تھا، اور اس سے داخل ہو کر محراب و منبر کے پاس مقصورہ میں پہنچ جاتے تھے۔ احمد بن طولون نے یہاں ہر طرح کا ساز و سامان اور فروش اور پردے مہیا کر رکھے تھے۔ چونکہ یہ عمارت قصر اور میدان کے درمیان واقع تھی اس لئے جمعہ کے دن احمد بن طولون اپنے محل سے آکر یہیں آرام کرتا اور وضو کی تجدید اور لباس تبدیل کرتا تھا۔ خلیفہ المعزلدین اللہ کے افریقیہ سے آنے تک یہ عمارت باقی تھی، اور اس میں اموال الخراج کا دفتر تھا۔ ابن زولاق نے بیان کیا ہے کہ ۳۶۳ھ میں جب المعز نے ابوالفرج یعقوب بن یوسف بن

بکلیس اور عسلوج بن حسن کو اموال کا والی مقرر کیا ہے تو انھوں نے اسی دار الامارۃ میں اجلاس کیا تھا۔[۱۸۰]

اب احمد ابن طولون کے صرف مارستان کا ذکر کرنا باقی رہ جاتا ہے۔ مقریزی[۱۸۱] نے اس کا موقع محل بیان کیا ہے، مگر لکھا ہے کہ اُس کے زمانے میں وہ ایسا برباد ہوگیا تھا کہ کھنڈر بھی باقی نہیں رہے تھے۔ یہ مارستان احمد بن طولون کے حکم سے 'الکندی کے مطابق ۲۵۹ھ میں اور صاحب السیرۃ الطولونیہ کے مطابق ۲۶۱ھ میں تعمیر ہوا تھا' اور اس پر ساٹھ ہزار دینار خرچ ہوئے تھے۔ تکمیل کے بعد دار الدیوان، اساکفہ (کفشگروں کا بازار) قیساریہ[۱۸۲] اور سوق الرقیق کی آمدنی اس کے لئے وقف کی گئی تھی۔ اس سے قبل مصر میں کوئی مارستان تعمیر نہیں ہوا تھا۔ احمد بن طولون نے لازمی قرار دیا تھا کہ اس میں کسی سپاہی یا مملوک یا امیر کا علاج نہیں کیا جائے گا۔ اس لحاظ سے یہ حقیقی طور پر ایک رفاہ عام کا کام تھا۔ مارستان سے متعلق دو حمام تھے' ایک مردانہ اور دوسرا زنانہ۔ قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی مریض اس شفا خانے میں آئے تو اپنے کپڑے اور نقدی امین مارستان کے پاس امانت رکھ دے۔ اس کے بعد شفا خانے سے اُس کے لئے کپڑے اور بستر مہیا کئے جاتے تھے' اور غذا اور دوا کے تمام اخراجات بھی شفا خانہ برداشت کرتا تھا۔ اطبا معالجے کے لئے مقرر تھے۔ صحت یاب ہونے پر جب مریض معمولی کھانا کھانے لگتا تھا تو شفا خانہ سے رخصت کر دیا جاتا تھا اور کپڑے اور نقدی اُسے واپس مل جاتی تھی۔ احمد بن طولون کو اس مارستان سے اتنی دلچسپی تھی کہ وہ ہر جمعہ کو خود معائنہ کے لئے آتا تھا' اس کے ذخائر دیکھتا'

---

[۱۸۰] خطط ج ۱ - ص ۸۲، ۳۹۷ + ج ۲ - ص ۲۶۹ +

[۱۸۱] خطط ج ۲ - ص ۴۰۵ + القلقشندی ج ۳ - ص ۳۴۷ +

[۱۸۲] مقریزی (ج ۲ - ص ۸۶ - ۹۱) نے فسطاط و قاہرہ کے متعدد قیاسر کا ذکر کیا ہے - ان میں سے ایک قیساریہ (ص ۹۱) احمد بن طولون کے زمانہ کا ہے اور "قیساریۃ الجامع الطولونی" کہلاتا ہے - یہ قیساریہ قصر سے متعلق عمارتوں میں شمار ہوتا تھا اور احمد بن طولون ہی کا بنایا ہوا تھا - یہاں اسی قیساریہ سے مراد لی گئی ہے' جس کی آمدنی مارستان کے لئے وقف تھی۔

اطبائے ملتا اور مریضوں سے بات چیت کرتا۔ اسی مارستان کے ایک حصے میں پاگل خانہ بھی تھا۔ ایک جمعہ کو وہ حسب دستور معائنہ کے لئے آیا، اور ایک دیوانے نے جسے اُسی کی خواہش پر امیر کے سامنے ایک انار مہیا کیا گیا تھا، اُسے غافل پاکر انار اُسے کھینچ مارا۔ اس کے بعد احمد بن طولون نے وہاں آنا چھوڑ دیا۔ افسوس ہے کہ مارستان کے اندرونی انتظامات کی پوری تفصیل بیان نہیں کی گئی۔ مگر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ مریضوں کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ اس کے تقریباً چار سو برس بعد ۶۸۳ھ (م ۱۲۸۴ء) میں ملک المنصور قلاؤن نے ایک مارستان القدیم المنصوری قاہرہ میں تعمیر کرایا تھا۔ مقریزی[۱۵۳] نے اس کے حالات بہت تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ ان کے پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم موجودہ زمانے کے کسی اعلیٰ درجے کے شفاخانے کے حالات پڑھ رہے ہیں، اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اُس وقت تک مارستان اسلامی دنیا میں عام ہو چکے تھے۔

(۷)

ذکر ہو چکا ہے کہ احمد بن طولون نے وفات سے قبل اپنے موالی اور خیرخواہوں کو جمع کر کے ان کے سامنے اپنے بیٹے ابوالجیش خمارویہ کو جانشین مقرر کیا تھا۔ وفات کے بعد تمام اہل دولت، جن کا سرگروہ احمد بن محمد الواسطی تھا، جمع ہوئے، اور مشورہ کر کے سب نے بالاتفاق خمارویہ کو جانشین بنانا منظور کیا۔ اس امر پر متفق ہونے کے بعد عباس کو، جو اُس وقت تک قید میں تھا اس مجلس میں لائے جہاں خمارویہ بھی موجود تھا۔ الواسطی نے رسم تعزیت ادا کی، اور پھر عباس سے کہا کہ اپنے بھائی خمارویہ کے ہاتھ پر بیعت کرو۔ مگر عباس نے انکار کیا۔ اس پر موالی میں سے سعد الابسر دیا الآیس یا الاعسر اور طبارجی کھڑے ہوئے اور عباس کو قصر کے ایک کمرے میں لے گئے جہاں سے دوسرے دن اُس کی لاش ہی برآمد ہوئی۔ اس کے بعد احمد بن طولون کو دفن کیا گیا، اور اور خمارویہ کی حکومت مستحکم ہو گئی۔ جُند نے بھی اُس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ یہ ۱۰ ذی قعدہ ۲۷۰ھ کا

[۱۵۳] خطط ج ۲۔ ص ۴۰۶۔

واقعہ ہے۔[۱۸۴] قطع نظر اس کے کہ احمد بن طولون بستر مرگ پر خمارویہ کو نامزد کر چکا تھا، عباس کا اپنے باپ کی جگہ لینا اس وجہ سے بھی ناممکن تھا کہ ارباب حل وعقد میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو عباس کی بدخوئی، بدطینتی اور مذموم عادتوں سے نالاں نہ ہو۔ بغاوت کے دوران میں یہ مخاصمت اور بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ اس وقت گو عباس قید میں تھا، لیکن جب تک وہ زندہ تھا تمام قائد اور موالی اطمینان کا سانس نہیں لے سکتے تھے۔ اس لئے ضروری تھا کہ اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔ احمد الواسطی خاص طور پر گزشتہ واقعات میں پیش پیش رہا تھا، اور یقیناً اسے عباس سے بدسلوکی کا خوف سب سے زیادہ ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس قتل کے موافق تھا، اور در حقیقت اسی کے مشورے سے عباس کا خاتمہ کیا گیا تھا۔

ان واقعات میں کہیں ان کا پتہ نہیں چلتا کہ خمارویہ کی جانشینی کے متعلق مرکز خلافت سے استصواب کیا گیا ہو، یا جانشینی کے بعد بھی خلیفہ کی منظوری حاصل کی گئی ہو۔ کیونکہ احمد بن طولون کے انتقال کے وقت سیاسی حالت یہ تھی کہ اگر نویری کے مطابق اُس میں اور موفق میں صلح کے متعلق گفت وشنید ہوئی تھی تو اس کی تکمیل سے قبل احمد بن طولون کا انتقال ہو گیا تھا۔ مزید برآں آئندہ واقعات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مصر میں موفق پر لعنت بھیجنے کا حکم ابھی منسوخ نہیں ہوا تھا۔ جو فتوی کہ دمشق سے شائع کیا گیا تھا اس کے مطابق خلیفہ مجبور ومقہور تھا، اور الموفق ولی عہدی سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ مرکز خلافت سے کسی قسم کا استصواب بے معنی تھا، اور احمد بن طولون کے جانشین اور الموفق میں قانوناً جنگ بدستور جاری تھی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ احمد بن طولون کے بعد گفت وشنید کا سلسلہ یک لخت ہی کیوں منقطع ہو گیا، اور خمارویہ سے کیوں صلح نہیں کر لی گئی۔ اس میں خمارویہ کا قصور نہیں تھا، کیونکہ وہ ایک تن آسان اور آرام طلب شہزادہ تھا، اور اسی وقت لڑتا تھا جب اسے جنگ پر مجبور کر دیا جائے۔

---

[۱۸۴] ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۵ + ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۵۰، ۵۱ +

یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ بغداد میں اس وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ طولونیہ کو ختم کرنے کا وقت اب آگیا ہے، اور خمارویہ کی ناتجربہ کاری اور آرام طلبی کی وجہ سے یہ کام اور بھی آسان معلوم ہوتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ خمارویہ کو باپ کا جانشین ہونے کے بعد ہی ان معاملات کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ یاد ہوگا کہ جب اسحاق بن کنداج نے خلیفہ معتمد کو مصر جانے سے روکا ہے تو اُس کے صلے میں اُسے باب الشماسیہ سے برقہ تک تمام علاقوں کا حاکم مقرر کیا گیا تھا، اور اس طرح احمد بن طولون کو معزول کر دیا گیا تھا۔ یہ حکم ابھی تک منسوخ نہیں ہوا تھا۔ جب تک احمد بن طولون زندہ رہا اسحاق بن کنداج اُس کے علاقوں پر قابض اور متصرف ہونے کی ہمت نہ کر سکا۔ لیکن اب خمارویہ کو اُس نے قابل اعتنا نہ سمجھا، اور محمد بن دیوداد، المعروف بہ ابن ابی الساج، حاکم کوفہ کو ساتھ ملا کر شام فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ دونوں متحدین نے موفق سے اس کی اجازت چاہی، اور الموفق نے نہ صرف اجازت دی بلکہ مدد کا بھی وعدہ کیا۔ ابتدا میں دونوں کو بڑی کامیابی ہوئی۔ اسحاق بن کنداج اپنے مستقر سے روانہ ہو کر پہلے رقہ اور عواصم گیا، اور احمد بن طولون کے عامل ابن دعباش سے یہ علاقے لے لئے، پھر حمص، انطاکیہ اور حلب آیا، اور اس کے بعد دمشق پر بھی قابض ہو گیا۔ یہ حالت دیکھ کر خمارویہ نے ایک فوج تیار کی اور الواسطی کی سرکردگی میں اُسے شام روانہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور فوج سعد الابسر کی ماتحتی میں ۶ ذی الحجہ ۲۷۰ھ کو براہ بحر روانہ کی۔[۱۵۵] اس دوران میں الواسطی نے، جو فلسطین میں مقیم تھا، اس خوف سے کہ کہیں خمارویہ اپنے بھائی عباس کا بدلہ اُس سے نہ لے، الموفق سے خط و کتابت شروع کی، اور خمارویہ کے متعلق یقین دلایا کہ اگر اُس کے خلاف نقل و حرکت کی جائے تو اُس کا خاتمہ کر دینا آسان ہوگا۔ بہرحال خمارویہ کی فرستادہ فوج کو اتنی کامیابی ہوئی کہ دمشق پر دوبارہ قبضہ کر لیا گیا، اور وہاں کا نقض عہد کرنے والا حاکم فرار ہو گیا۔ پھر لشکر شیزر گیا۔ اس مقام پر اسحاق بن کنداج اور ابن ابی الساج قابض تھے، اور الموفق کی موعودہ امداد کا انتظار

۱۵۵۔ الکندی ص ۲۳۳، ۲۳۴ + ابن تغری بردی ج ۳۔ ص ۵۱، ۵۲ +

کر رہے تھے۔ لیکن چوں کہ سردی کا موسم شروع ہو چکا تھا اس لئے خمارویہ کی فوج شہر کے گھروں میں منتشر ہو گئی۔ اس اثنا میں ابو العباس احمد بن الموفق کی سرکردگی میں، جو بعد کو معتضد کے لقب سے خلیفہ ہوا، عراق کا لشکر وہاں پہنچ گیا، اور خمارویہ کے سپاہیوں کو چن چن کر قتل کرنا شروع کیا۔ بقیۃ السیف نے نہایت بری حالت میں دمشق میں پناہ لی۔ مگر معتضد تعقب میں تھا، اور خمارویہ کے سپاہی دمشق میں بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ شعبان ۲۷۱ھ میں معتضد نے دمشق پر قبضہ کر لیا۔ اب خمارویہ کی فوج رملہ میں ٹھیری اور خمارویہ کو صورت حال کی اطلاع دی۔[۱۸۶] معتضد اب تک ان کا تعقب کر رہا تھا۔ اُدھر خمارویہ بذات خود مصر سے لشکر لے کر روانہ ہوا۔ اس دوران میں ایک نیا واقعہ پیش آیا کہ اسحاق بن کنداج اور ابن ابی الساج جنھوں نے الموفق کی مدد کی امید پر جنگ شروع کی تھی، اس وجہ سے الموفق سے بے زار ہو گئے کہ الموفق نے ان پر بزدلی کا الزام لگایا تھا۔ ایک طرف تو ان دونوں ترک امراء کی عراقی فوج سے علٰحدگی، اور دوسری طرف یہ خبر کہ خمارویہ بہت بڑی فوج لے کر مصر سے آرہا ہے، معتضد کو بے چین کر دینے کے لئے کافی تھیں۔ اُس نے چاہا کہ عراق واپس ہو جائے۔ مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔ آخر کار خمارویہ اور معتضد کی فوجوں کا مقابلہ رملہ میں نہر فُطرس (یا بُطرس) کے کنارے اُس جگہ ہوا جہاں پن چکیاں تھیں، اور اسی وجہ سے یہ جنگ واقعۂ طواحین کہلاتی ہے۔ خمارویہ کی فوج گو تعداد میں ستر ہزار تھی اور معتضد کے پاس صرف چار ہزار سپاہی تھے۔ لیکن مصری فوج میں زیادہ تعداد ایسے سپاہیوں کی تھی جنھیں اب تک جنگ کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے پہلے ہی حملے میں اس فوج کے پیر اکھڑ گئے، اور خمارویہ بے سروسامانی کی حالت میں میدان جنگ سے ایسا بھاگا کہ پھر مصر ہی میں آ کر دم لیا۔ معتضد نے اسے اپنی فتح سمجھا اور خمارویہ کی چھاؤنی پر قبضہ کر لیا۔ اُدھر جنگ سے قبل خمارویہ نے سعد الایسر کی ماتحتی میں ایک فوج کمین گاہ میں مقرر کی تھی۔ سعد الایسر نے

---

۱۸۶ ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۳۷ (حوادث ۲۷۱ھ) + ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۵، ۳۰۶ + مروج الذهب ج ۲۔ ص ۲۱۶ +

کمین گاہ سے باہر نکل کر عراقی فوج پر حملہ کر دیا۔ لیکن سعد کو خمارویہ کے فرار ہونے کی اطلاع نہ تھی۔ یہ حملہ بہت کامیاب رہا، اور نہ صرف خمارویہ کی چھاؤنی پر دوبارہ قبضہ کر لیا گیا، بلکہ بارہ میل تک معتضد کا تعقب بھی کیا گیا۔ معتضد نے دمشق میں پناہ لینی چاہی، مگر اہل شہر نے شہر کے دروازے نہ کھولے۔ اب سعد الایسر کو خمارویہ کے میدان جنگ سے بھاگ جانے کی خبر ملی۔ اب فوج کا کوئی امیر نہیں تھا۔ اس لئے سعد الایسر نے وقتی طور پر خمارویہ کے بھائی ابوالعشائر کو امیر فوج بنا دیا، اور میدان جنگ سے آگے بڑھ کر اُس نے اور الواسطی نے دمشق پر قبضہ کر لیا۔ یہ آخری موقع ہے کہ تاریخ میں الواسطی کا ذکر آتا ہے۔ اس کے بعد معلوم نہیں کہ اس کا کیا انجام ہوا۔ دوسری طرف معتضد جب دمشق سے مایوس ہوا تو طرسوس چلا گیا۔ مگر یہاں بھی یازمار مزاحم ہوا۔ مجبوراً معتضد نے شام و فلسطین کو خیرباد کہا اور بغداد واپس چلا گیا۔ یہاں معتضد کا شام سے تعلق بھی ختم ہو گیا، اور یہ ایسی فیصلہ کن جنگ تھی کہ شام و فلسطین پر خمارویہ کا قبضہ مستحکم اور مستقل ہو گیا۔[۱۸۷]

واقعہ طواحین سے بھاگ کر جب خمارویہ مصر پہنچا ہے تو اُس نے کمال چالاکی سے جنگ میں اپنی فتح کا اعلان کر دیا تھا۔ جب حقیقی فتح کا مژدہ اُس نے سنا تو اسے اور بھی خوشی ہوئی، اور اس نے بہت سا مال خیرات کیا۔ جو اسیران جنگ مصر آئے تھے ان کے ساتھ غیر معمولی طور پر نیک سلوک کیا گیا۔ پہلے تو خمارویہ نے انھیں اپنے پاس مہمان رکھا، اور اُس کے بعد جنھوں نے واپس جانا چاہا انھیں بڑی عزت و احترام کے ساتھ واپس کر دیا۔[۱۸۸] اب خمارویہ دوبارہ ذی القعدہ ۲۷۲ھ میں مصر سے روانہ ہو کر ۷ محرم ۲۷۳ھ کو فلسطین پہنچا۔

---

[۱۸۷] مقریزی ج ۱۔ ص ۳۲۱ + ابن تغری بردی ج ۲ ص ۵۱، ۵۲ + ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۳۸، ۱۴۰ + ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۵، ۳۰۶ + مروج الذہب ج ۲۔ ص ۳۱۸ + الکندی ص ۱۸۲ + طبری ج ۱۱۔ ص ۳۳۰، ۳۳۱ + الیافعی ج ۲۔ ص ۱۸۶ +

[۱۸۸] ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۴۰ +

اس دوران میں یہاں یہ تبدیلی ہوئی کہ سعد الایسر نے غالباً جنگ طواحین میں خمارویہ کے فرار کو اس کی بزدلی پر محمول کیا، اور مقبوضہ علاقوں پر خود قبضہ جمانے کی فکر کرنے لگا۔ یہی خبر خمارویہ کو مصر سے فلسطین لائی تھی۔ لیکن سعد الایسر زیادہ دن تک خمارویہ کا مقابلہ نہ کر سکا، اور بلا کسی بڑے واقعے کے اُسے گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ اور ۷ محرم کو خمارویہ دمشق میں داخل ہو گیا۔[189] لیکن ابھی تک اسحاق بن کنداج اور ابن ابی الساج کا خطرہ باقی تھا۔ ان دونوں ترک امرا کو عراقی فوج سے جس مدد کی اُمید تھی وہ جنگ طواحین کے بعد بالکل ہی ختم ہو گئی۔ مگر خمارویہ سے ان کی مخالفت بدستور جاری رہی، اور خمارویہ کو بھی ان کی طرف سے اطمینان نہیں ہوا۔ سعد الایسر کے خاتمے کے بعد ہی رافقہ کے علاقے میں باجروان کے مقام پر اُس کا مقابلہ اسحاق بن کنداج سے ہوا۔ ایک مرتبہ پھر مصری فوج ثابت قدم نہ رہی لیکن جو کار آزمودہ سپاہی خمارویہ کے ساتھ تھے انھوں نے شکست ماننے سے انکار کیا اور خمارویہ کے ذاتی تہور سے انھیں اور بھی مدد ملی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسحاق بن کنداج نے شکست کھائی اور خمارویہ نے شکست خوردہ فوج کا سامرا تک تعقب کیا۔[190]

اسحاق بن کنداج کی یہ شکست خمارویہ کے لئے بڑی کارآمد ثابت ہوئی۔ واقعۂ طواحین سے عام طور پر خمارویہ کو حقیر سمجھا جانے لگا تھا لیکن اب دوبارہ اس کی ہیبت لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گئی۔ اس طرح اپنی حالت کو مستحکم کرنے کے بعد خمارویہ نے الموفق سے صلح کرنے کا ارادہ کیا۔ اور اس معاملے میں خط و کتابت کر کے جو علاقے اُس کے سپرد کئے جائیں ان کے متعلق مال ادا کرنے کا وعدہ کیا۔[191] ادھر الموفق کو بھی پورا اندازہ ہو گیا تھا کہ ابھی آل طولون کو مصر سے بے دخل کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس لئے یہ درخواست

---

۱۸۹ مقریزی ج ۲۔ ص ۳۲۱ + ابن تغری بردی ص ۵۳ + الکندی ص ۲۳۶ +

۱۹۰ الکندی ص ۲۳۶ +

۱۹۱ خطط ج ۱۔ ص ۳۲۱ + ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۵ + الکندی ص ۲۳۷ +

منظور کی گئی، اور رجب ۲۷۳ھ میں فائق خادم خلیفہ کا فرمان لے کر فسطاط آیا، جس کے مطابق خمارویہ اور اُس کی اولاد کو تیس برس کے لئے مصر و شام اور ثغور کا حاکم مقرر کیا گیا تھا اور صلاۃ و خراج و قضا بھی اس کے سپرد کئے گئے تھے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ فرات سے لے کر برقہ تک کے تمام علاقے آل طولون کو دے گئے تھے۔ فائق نے خمارویہ کو یہ بھی اطلاع دی کہ یہ فرمان معتمد، الموفق اور ابو العباس احمد بن الموفق (معتضد) نے "تعظیماً لخمارویہ" اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ خمارویہ کو اس عزت افزائی سے اور بھی خوشی ہوئی۔ سلخ رجب ۲۷۳ھ کو خمارویہ مصر واپس آیا۔ الموفق کو ولی عہدی سے الگ کرنے کا فتویٰ واپس لیا گیا، اور اُس پر جو لعنت بھیجی جاتی تھی اُسے بھی منسوخ کر دیا گیا۔ الکندی اور ابن تغری بردی دونوں اس پر متفق ہیں کہ یہ موقع تھا کہ جب لعنت بھیجنے کا عمل موقوف کیا گیا ہے۔[۱۹۲]

خلیفہ کی اس منظوری اور خمارویہ کے اس تقرر سے آل طولون کی وہی حیثیت باقی رہی جو احمد بن طولون کے وفات کے وقت تھی۔ اب خمارویہ کو باغی اور غیر قانونی عامل مصر نہیں کہا جا سکتا تھا، بلکہ اُسے قانونی طور پر احمد بن طولون کا جانشین تسلیم کر لیا گیا تھا۔ صرف تیس برس ہی کے لئے کیوں نہ ہو، لیکن امارت مصر آل طولون میں موروثی قرار دے دی گئی تھی، اور اس کا امکان تھا کہ آیندہ حالات اور واقعات کے لحاظ سے اس مدت میں توسیع کر دی جائے۔ خمارویہ بھی اپنے باپ کی طرح اب المفوض کے ممالک مفوضہ کا محض ایک وکیل تھا۔ اس لحاظ سے سکوں پر خمارویہ کے علاوہ اب بھی صرف المفوض کا نام مسکوک ہوتا تھا، مگر خطبوں میں المفوض اور الموفق کا نام بحیثیت ولی عہد خلافت لیا جانے لگا تھا۔ اس تقرر کی منظوری کے متعلق ایک اور امر بھی قابل غور ہے۔ فائق خادم جو یہ فرمان لے کر مصر آیا تھا، اُس نے خمارویہ کو اطلاع دی تھی کہ فرمان خلیفہ، الموفق اور معتضد نے بدست خاص لکھا ہے۔ صرف اتنی سی بات کو خمارویہ نے اپنی عزت افزائی سمجھا تھا، اور اُسے بہت خوشی ہوئی تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ گو خلفا

---

۱۹۲ کتاب الولاۃ ص ۲۳۷، ۲۳۸ + النجوم الزاہرہ ج ۳ ص ۵۴، ۵۵ +

عباسیہ اس وقت بڑی حد تک اپنا سیاسی اقتدار کھو چکے تھے، اور انھیں مجبور ہو کر امراء صوبہ جات کے تقرر کی منظوریاں دینی پڑتی تھیں لیکن اسلامی سیاسی اتحاد کا تخیل زندہ تھا، اور خواہ ذاتی طور پر امراء کیسے ہی تمرد کا اظہار کریں، مگر وہ ہر حالت میں اپنے آپ کو خلافت سے وابستہ، اور خود کو خلیفہ کا مولیٰ ہی سمجھتے تھے۔ اس سے بھی زیادہ نمایاں مثال بیکر[193] نے نقل کی ہے کہ اخشید نے خلیفہ متقی سے مدد کی درخواست کی تھی، اور متقی نے جو محض برائے نام خلیفہ تھا، اس درخواست کے جواب میں اُسے بجائے نام کے کنیت سے مخاطب کیا تھا، اور اخشید نے اس معمولی سی بات کو بھی اپنی عزت افزائی سمجھا تھا[194]۔

اب خلیفہ کے اس تقرر سے اسحاق بن کنداج اور ابن ابی الساج بھی خمارویہ کے خلاف بے دست و پا ہو گئے تھے، اور قانوناً وہ یہ نہیں کر سکتے تھے کہ اُسے برطرف کرنے کے لئے اپنی جد و جہد جاری رکھیں۔ ایسی صورت میں ان کا اتحاد بھی قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ ابن الاثیر[195] کے مطابق ۲۷۳ھ ہی میں اُن کے آپس میں بگاڑ شروع ہوا۔ وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ابن ابی الساج تقدم حاصل کرنا چاہتا تھا، اور اسحاق بن کنداج اس کا مخالف تھا۔ آخر کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن ابی الساج نے رُخ بدل دیا، اور خمارویہ سے خط و کتابت کر کے اس کی اطاعت قبول کر لی، اپنے زیر تصرف علاقے قنسرین میں اس کے نام کا خطبہ پڑھوایا، اور اپنے بیٹے دیوداد کو بطور یرغمال خمارویہ کے پاس بھیج دیا۔ اس کے بدلے میں خمارویہ نے ابن ابی الساج اور اس کے قائدوں کے لئے بہت بڑی رقم (مالاً جزیلاً) اُس کے پاس بھجوائی۔ اس کے علاوہ خمارویہ بذات خود

193۔ بیکر، تراگ ص ۱۸۴ +

194۔ گولڈ زیہر (محمد انشٹے استودین ج ۲ ص ۲۶۷) نے اس پر بحث کی ہے کہ کسی شخص کو کنیت سے مخاطب کرنا باعث عزت سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً خلیفہ الواثق اسحاق بن ابراہیم موصلی کو ہمیشہ کنیت سے مخاطب کیا کرتا تھا "دفعالہٗ" (اغانی ج ۵ ص ۶۰) اور ہارون رشید نے ابراہیم موصلی کی کنیت ابو صفوان مقرر کی تھی۔

195۔ تاریخ کامل ج ۷ ص ۱۴۱ +

شام روانہ ہوا، اور بالس کے مقام پر اُس کا اور ابن ابی الساج کا اجتماع ہوا۔ اب ابن ابی الساج دریائے فرات کو عبور کر کے رقہ آیا، اور اسحاق بن کنداج سے اس کا مقابلہ ہوا۔ اسحاق بن کنداج نے شکست کھائی اور ابن ابی الساج نے اُس کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ خمارویہ بھی دریائے فرات عبور کر کے رافقہ پہنچا۔ ابن کنداج نے ماردین میں پناہ لی۔ ابن ابی الساج نے اُس کا محاصرہ کیا اور ابن کنداج مجبور ہو کر وہاں سے موصل چلا گیا پھر دونوں کا مقابلہ برقعید میں ہوا۔ انجام کار ابن ابی الساج جزیرہ اور موصل پر قابض ہو گیا اور ان علاقوں پر خمارویہ اور پھر ابن ابی الساج کا نام خطبے میں لیا جانے لگا۔[196] مگر یہ کامیابی ابن ابی الساج اور خمارویہ میں بگاڑ کا باعث ہوئی ۲۷۳ھ میں خمارویہ پھر مصری لشکر کے ساتھ ابن ابی الساج کے مقابلے کے لئے آیا، اور محرم ۲۷۵ھ میں ثنیۃ العقاب میں ابن ابی الساج کو شکست دے کر اُس کا جو مال حمص میں تھا اُس پر بھی قبضہ کر لیا، اور اس کے تعقب میں مدینۃ بلد تک پہنچا۔[197] اس جھگڑے کا آخر خاتمہ یوں ہوا کہ ابن ابی الساج کو خلافت کی طرف سے آذربائی جان کا والی مقرر کر دیا گیا۔ اسحاق بن کنداج نے خمارویہ سے صلح کی سلسلہ جنبانی شروع کی، اور آخر دونوں میں مصاہرت کے تعلقات قائم ہو گئے، اور اُس کے علاقوں میں خمارویہ کا نام خطبوں میں لیا جانے لگا۔[198] ابن کنداج کا انتقال ۲۷۸ھ میں [illegible] میں ہوا [illegible] محمد بن اسحاق بن کنداج اس کے عمال پر اُس کا جانشین ہوا۔[199] اپنے باپ کی طرح وہ بھی مصر میں رہا۔

۲۷۹ھ تک خمارویہ اپنے تمام منصوبوں میں کامیاب رہا تھا۔ خلیفہ نے مصر و شام و ثغور پر اس کو موروثی حق والیت عطا کر دیا تھا، اس کے دو حریف ابن ابی الساج اور

---

[196] ابن الاثیر ج ۷ ص ۱۴۱ (حوادث ۲۷۲ھ) + ابن تغری بردی ج ۲ ص ۷۵، ۷۶ + ابن خلدون ج ۳ ص ۳۱۳ + ج ۴ ص [illegible] ۳۰۳، ۳۰۴ + طبری ج ۱۱ ص ۳۴۲ +

[197] ابن الاثیر ج ۷ ص ۱۴۲ (حوادث ۲۷۵ھ) + الکندی ص ۲۳۸ +

[198] الکندی ص ۲۳۷ +

[199] طبری ج ۱۱ ص ۳۳۰ +

اسحاق بن کنداج، جنھیں مرکز خلافت ہی سے اس کے خلاف آمادہ پیکار کیا گیا تھا، زیر ہو چکے تھے اور ان میں سے ابن کنداج اب اس کے دربار کا درحقیقت ایک امیر بن گیا تھا۔ اس طرح اس آل آل طولون کا موقف پہلے سے کہیں زیادہ مستحکم اور مستقل معلوم ہوتا تھا۔ اس کے بعد خمارویہ کو ایک اور بڑی کامیابی طرسوس میں ہوئی۔ یاد ہوگا کہ سنہ ۲۷۰ھ میں احمد بن طولون طرسوس سے بے نیل مرام واپس ہوا تھا، اور مازیار وہاں بدستور قابض رہا تھا۔ اس دوران میں ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جنگ طواحین کے بعد سنہ ۲۷۱ھ میں جب معتضد نے طرسوس میں پناہ لینی چاہی تھی تو پھر مازیار مزاحم ہوا تھا اور معتضد کو مجبوراً بغداد واپس جانا پڑا تھا۔[۲۰۰] اس واقعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مازیار نے یہ محسوس کیا تھا کہ وہ یکہ و تنہا تمام مصائب اور حوادث کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تفصیلات سے ہم بے خبر ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی نجات صرف اس میں دیکھی تھی کہ خمارویہ سے صلح کر کے طرسوس اس کے حوالے کر دے۔ فریقین میں نامہ و پیام کا بھی ہمیں علم نہیں۔ ابن تغری بردی نے[۲۰۱] صرف اتنا لکھا ہے کہ خمارویہ نے اسے اپنی طرف مائل کر لیا، اور اس سے لطف و کرم سے پیش آیا۔ بطور امداد یا بطور تحائف خمارویہ نے تیس ہزار دینار، پانچ سو زرنگار چادریں (مُطرف)، پانچ سو مویشی اور بے شمار اسلحہ اس کے پاس بھیجے۔ اس پر مازیار نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور ثغور میں خمارویہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ مازیار نے ان تحائف کے بدلے میں پچاس ہزار دینار خمارویہ کے پاس بھجوائے۔ الکندی کے مطابق یہ جمادی الآخر سنہ ۲۷۷ھ کا واقعہ ہے۔[۲۰۲] اس طرح

---

۲۰۰ ابن الاثیر ج ۷، ص ۱۴۹ (حوادث ۲۷۱ھ) +

۲۰۱ النجوم الزاہرہ ج ۲، ص ۸۲، ۸۳ +

۲۰۲ ابن خلدون ج ۷، ص ۳۰۷ + ابن الاثیر ج ۷، ص ۱۴۶ (حوادث ۲۷۰ھ) + ص ۱۴۹ (حوادث ۲۷۱ھ) + الکندی ص ۲۳۹ + طبری ج ۱۱، ص ۳۴۳ + ابن خلدون اور ابن الاثیر نے مُطرف (چادر خز چہار گوشہ نگار ریں) اور طبری نے ممطر (ما یلبس فی المطر یتوقی بہ) لکھا ہے۔ مگر یہاں بجائے ممطر کے مطرف زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ تحائف کی تعداد میں بھی طبری اور دوسرے مورخوں میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔

بغیر لڑے خمارویہ ثغور کا مالک ہو گیا۔

بہتر ہے کہ طرسوس کی باقی ماندہ تاریخ بھی سلسلے کی غرض سے یہیں بیان کر دی جائے۔ اس میں ہمیں سب سے زیادہ مدد ابن الاثیر[۲۰] اور ابن خلدون[۲۱] سے ملتی ہے۔ اطاعت قبول کر لینے کے بعد ۲۷۵ھ میں مازیار صائفہ پر گیا، جہاں زخمی ہوا اور جاں بر نہ ہو سکا۔ اس کی موت پر ابن عُجیف، جسے ابن الاثیر نے عجیفی لکھا ہے، طرسوس کا حاکم ہوا، اور خمارویہ نے بھی اس تقرر کی منظوری دے دی۔ لیکن بعد میں اُسے معزول کر کے اپنے برادر عمزاد محمد بن موسیٰ بن طولون کو مقرر کیا۔ اس اثنا میں ثغور میں ایک اور تبدیلی ہوئی۔ ۲۷۸ھ میں الموفق کا انتقال ہوا۔ اُس کا ایک خادم راغب نامی نے آقا کی وفات پر جہاد فی سبیل اللہ کے ارادے سے طرسوس میں مستقل قیام کا ارادہ کیا۔ شام پہنچ کر راغب نے گھوڑے، مویشی اسلحہ، اور خیمے تو آگے طرسوس بھیج دئے اور خود خمارویہ سے ملنے اور اُسے اپنے ارادے کی اطلاع دینے کی غرض سے دمشق چلا گیا۔ خمارویہ نے حسب عادت اس کی بڑی خاطر و مدارات کی، اور راغب اس سے اتنا متاثر ہوا کہ رخصت کی اجازت لینے میں اُسے شرم آئی۔ دمشق میں طویل قیام کی وجہ سے اس کے ساتھیوں کو طرسوس میں یہ خیال ہوا کہ خمارویہ نے اُسے گرفتار کر لیا ہے اور وہ اس لئے اور بھی زیادہ رنجیدہ ہوئے کہ خمارویہ نے ایک ایسے شخص کو گرفتار کیا ہے جس کا مقصد صرف جہاد فی سبیل اللہ تھا۔ آخر شورش ہوئی اور اہل طرسوس نے حاکم شہر محمد بن موسیٰ بن طولون کو یہ کہہ کر گرفتار کر لیا کہ جب تک خمارویہ راغب کو نہ چھوڑے گا تو بھی قید رہے گا۔ ان لوگوں نے محمد بن موسیٰ کا گھر بھی لوٹ لیا اور اس کی عورتوں کی فضیحت بھی کی۔ خمارویہ کو جب اس کا علم ہوا تو اُس نے راغب کو اس سے مطلع کیا۔ راغب وہاں سے رخصت ہو کر جب طرسوس پہنچ گیا تو لوگوں نے اپنے امیر محمد بن موسیٰ کو رہا کر دیا۔ مگر محمد بن موسیٰ ایسا دل برداشتہ ہوا کہ وہ وہاں سے اہل طرسوس سے یہ کہہ کر "قبّح اللہ جوارکم" بیت المقدس چلا آیا۔ اب ابن عجیف پھر خمارویہ کی طرف سے طرسوس کا حاکم مقرر ہوا، اور ۲۸۱ھ میں

---

[۲۰] تاریخ کامل۔ ج ۷۔ ص ۱۴۹۔ (حوادث ۲۷۵ھ)

[۲۱] تاریخ ج ۴۔ ص ۳۰۷، ۳۰۸

طُغج بن جُف الفرغانی کو صائفہ کا افسر مقرر کیا گیا۔ اس ترک امیر کا نام آئندہ اکثر سننے میں آئے گا۔ خمارویہ اور اُس کے بیٹے جیش کے مرنے کے بعد ۲۸۳ھ میں راغب نے طرسوس پر غلبہ پاکر ابن عُجَیف کو حکومت سے الگ کر دیا۔ اور ہارون طولونی کے لئے دعا کرنی بند کر کے بدر مولائی معتضد کے لئے دعا کرنی شروع کی۔ اس طرح طرسوس اور اعمال ثغور طولونی حکومت سے الگ ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ ہارون نے معتضد سے ایک نیا معاہدہ کرنے کی درخواست کی تھی، جس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

اس دوران میں اہم واقعات دار الخلافہ بغداد میں پیش آ رہے تھے۔ ۶ شوال ۲۷۵ھ کو الموفق نے اپنے بیٹے ابو العباس احمد (المعتضد) کو حکم عدولی کی بناء پر گرفتار کرایا۔ معتضد سپاہیوں میں اتنا ہر دل عزیز تھا کہ اُس کی گرفتاری کی وجہ سے فوج میں شورش پھیلی، اور بالآخر الموفق نے بذات خود یہ فتنہ فرو کیا۔[۲۰۵] ۲۷۰ھ میں آخر کار الموفق نے صاحب الزنج کا فتنہ ختم کیا۔[عسہ] اور ۲۷۸ھ میں ابھی معتضد معتوب اور قید ہی تھا کہ الموفق بیمار ہو کر بغداد واپس آیا۔ یہ اس کا مرض الموت تھا۔ اسی بیماری کے دوران میں الموفق کی اجازت کے بغیر معتضد کے موالی اُسے الموفق کے پاس لے آئے۔ باپ بیٹے میں دوبارہ ملاپ ہوا، اور الموفق نے اُسی کو اپنا جانشین بنایا۔ ۲۲ صفر ۲۷۸ھ کو الموفق کا انتقال ہو گیا۔ اسی دن قواد اور غلمان نے ابو العباس احمد کے ہاتھ پر المفوض کے بعد ولی عہدی کی بیعت کی، اور معتضد اُس کا لقب

---

۲۰۵ طبری ج ۱۱، ص ۳۳۳ + ابن الاثیر ج ۷، ص ۱۴۴ (حوادث ۲۷۵ھ) +

عسہ۔ اس مضمون کی پہلی قسط (سیاست جنوری ۱۹۴۲ء ص ۷۵) میں ہم نے بیان کیا ہے کہ الموفق کو صاحب الزنج کے خلاف فوج کشی پر مقرر کیا گیا ہے تو اسی وقت معتمد نے اُسے الناصر لدین اللہ کا خطاب دیا تھا۔ لیکن تغری بردی (ج ۲ ص ۸۵) نے لکھا ہے کہ یہ خطاب اُسے ۲۷۰ھ میں اُس وقت دیا گیا تھا جب اُس نے صاحب الزنج کا خاتمہ کیا ہے۔ اور یہی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے +

مقرر ہوا۔ جمعہ کے خطبے میں پہلے معتمد پھر المفوض اور اس کے بعد معتضد کا نام لیا گیا۔[206] لیکن معتضد کی بہ اولعزمی سپاہیوں میں برابر بڑھتی چلی گئی اور معتمد کو بہت جلد محسوس ہوا کہ الموفق کی موت سے اُس کے موقف میں کوئی فرق نہیں پڑا، بلکہ باپ کی طرح معتضد اُس پر حاوی ہے۔ آخر اس دباؤ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۲۲ محرم ۲۷۹ھ کو المفوض کو ولی عہدی سے خلع کرا دیا گیا، اور خلیفہ کا فرمان شہروں میں نافذ ہوا کہ معتضد کو براہ راست ولی عہد مقرر کیا گیا ہے۔ جمعہ کے خطبے میں بھی اب معتمد کے بعد صرف معتضد کا نام لیا جانے لگا۔ معتضد نے بھی اپنی طرف سے تمام عمال کو اطلاع دی کہ امیر المومنین نے اسے اپنا ولی عہد مقرر کیا ہے، اور تمام امر و نہی اور ولایت و عزل اس کے سپرد کر دیے ہیں۔[207] چند ہی مہینے گزرے تھے کہ ۲۰ رجب ۲۷۹ھ کو معتمد کا انتقال ہو گیا اور ۲۸۰ھ میں المفوض نے بھی وفات پائی۔[208]

یہ تمام سیاسی تبدیلیاں، عزل و نصب اور بالآخر معتضد کی خلافت کا اثر آل طولون پر بہت گہرا پڑا۔ نیا خلیفہ اب صاحب اقتدار تھا۔ وہ بات نہیں رہی تھی کہ خلیفہ مجبور و مقہور رہے اور تمام امور بجائے خلیفہ کے کسی دوسرے شخص سے کرنا پڑے۔ معتضد کی بیعت کے بعد ہی خمارویہ نے اس کی خدمت میں تحائف پیش کیے، پرانے فرمان کی تجدید چاہی اور یہ درخواست کی کہ اُس کی بیٹی قطر الندی کا نکاح خلیفہ کے بیٹے مکتفی سے کر دیا جائے۔[209] مگر معتضد نے کہا کہ خمارویہ اس رشتے سے شرف حاصل کرنا چاہتا ہے اور ہم اس کے شرف میں اس طرح اضافہ کرتے ہیں کہ قطر الندی سے ہم خود نکاح کریں گے۔[210] یہ تحائف اور پیغام حسین بن عبد اللہ بن منصور الجوہری

---

۲۰۶ طبری ج ۱۱، ص ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷ + ابن الاثیر ج ۷، ص ۱۴۶ (حوادث ۲۷۸ھ)

۲۰۷ طبری ج ۱۱، ص ۳۴۰ + ابن الاثیر ج ۷، ص ۱۴۹ (حوادث ۲۷۹ھ)

۲۰۸ ابو الفداء ج ۲، ص ۶۰ +

۲۰۹ طبری ج ۱۱، ص ۳۴۱ + طبری نے تحائف کی مکمل فہرست بھی نقل کی ہے

۲۱۰ مروج الذہب ج ۲، ص ۳۲۹ +

المعروف بہ ابن الجصاص[۲۱۱] کے ہاتھ بھیجے گئے تھے۔ دونوں درخواستیں منظور ہوئیں' اور ۲۵ ربیع الاول ۲۸۰ھ کو معتضد کا فرمان مصر آیا جس کے مطابق خمارویہ اور اُس کی اولاد کو تیس برس کے لئے فرات سے برقہ تک تمام علاقوں کا حاکم قرار دیا گیا' اور صلاۃ' خراج اور قضا اُس کے سپرد کئے گئے۔ ساتھ ہی یہ بھی شرط کی گئی کہ دو لاکھ دینار سالانہ گزشتہ زمانے کے لئے اور تین لاکھ دینار آیندہ سالانہ ادا کئے جائیں[۲۱۲]۔ نظم و نسق کے تمام اخراجات ظاہر ہے کہ خمارویہ کو برداشت کرنے پڑتے تھے۔ فرمان کے جو الفاظ نقل کئے گئے ہیں اُن سے اس کا پتہ نہیں چلتا کہ گزشتہ زمانے کا تعین کس طرح کیا گیا تھا' اور خمارویہ سے کتنے گزشتہ برسوں کی رقم وصول کی گئی تھی۔ خلیفہ نے رمضان ۲۸۰ھ میں سیف خادم کے ہاتھ بارہ خلعتیں' ایک تلوار' تاج اور جواہرات کا ایک ہار (وشاح) اس کے پاس بھجوائے[۲۱۳]۔

خلیفہ معتضد سے قطر الندی کی شادی کے حالات اکثر مورخوں نے تفصیل سے لکھے ہیں۔ سیوطی[۲۱۴] نے جہیز کی پوری کیفیت بیان کی ہے' اور ابن تغری بردی[۲۱۵] نے دوسری تفصیلات بیان کی ہیں۔ شادی کے تمام انتظامات ابن الجصاص کے سپرد تھے اور مورخ اس پر متفق ہیں کہ بعد کے زمانے میں اس شخص کی لاتناہی دولت کا مبدا یہی شادی تھی۔ جہیز پر کل دس لاکھ دینار خرچ ہوئے تھے۔ خمارویہ کا بھائی خزرج' بہن عباسہ اور ابن الجصاص قطر الندی کے ساتھ گئے تھے' اور یہ انتظام کیا گیا تھا کہ سفر میں جہاں کہیں قطر الندی کا قیام ہو وہاں فرش و فروش اور پردوں سے آراستہ اُسے ایک محل تیار ملے۔ چنانچہ ہر جگہ قطر الندی کو

۲۱۱؎ اس شخص کے حالات کے لئے دیکھو نشوار المحاضرہ۔ للتنوخی ص ۲۶۰-۲۶۳ +

۲۱۲؎ الکندی ص ۲۴۰ + خطط ج ۱ ص ۳۲۱ + ابن تغری بردی ج ۲ ص ۵۵ + اصل الفاظ یہ ہیں: علی ان یحمل فی کل عام من المال مائتی الف دینار عن ما مضی وثلاثمائة الف دینار عن کل عام للمستقبل + ابوالفداء ج ۲ ص ۵۶ +

۲۱۳؎ الکندی ص ۲۴۰ + ابن تغری بردی ج ۲ ص ۵۵ + ۲۱۴؎ تاریخ الخلفاء ص ۲۴۷ +

۲۱۵؎ ابن تغری بردی ج ۲ ص ۶۸' ۶۹ +

یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے باپ کے محل میں بیٹھی ہے، اور پھر سفر بھی ایسے کیا گیا تھا کہ جیسے کوئی شیر خوار بچہ پنگوڑے میں لیٹا ہو۔ مصر و شام کی سرحد پر جہاں عباسہ کے خیمے نصب کئے گئے تھے وہاں ایک گاؤں عباسہ کے نام پر آباد ہو گیا۔ جوہر قطر الندیٰ کے ساتھ تھا اُسے ایک لاکھ درہم انعام دیا گیا تھا[۲۱۶]۔ ۲ محرم ۲۸۲ھ کو یہ شاہانہ قافلہ بغداد میں داخل ہوا۔ معتضد اس وقت دار الخلافہ سے باہر موصل میں تھا اس لئے قطر الندیٰ کو ابن صاعد کے محل میں ٹھیرایا گیا۔ ۴ ربیع الاول کو معتضد واپس آیا تو اُسے خلیفہ محل میں منتقل کیا گیا۔ اس کے لئے بھی خاص اہتمام کیا گیا تھا جس کی تفصیل طبری نے بیان کی ہے[۲۱۷]۔ ابن الجصاص نے جواہرات کا ایک بڑا حصہ قطر الندیٰ سے یہ کہہ کر اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا کہ بوقتِ ضرورت اس کے کام آئے گا۔ مگر اس کی نوبت نہ آئی، کیونکہ پانچ برس بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ ۲۸۷ھ میں قطر الندیٰ کا انتقال ہو گیا اور اور اُسے قصر اصافہ میں دفن کیا گیا[۲۱۸]۔

مورخ قطر الندی کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ چنانچہ ابن خلدون لکھتا ہے کہ

"وکانت اکمل النساء عصرہا فی الجمال والآداب"۔[ع]

اس شادی کے متعلق علی بن عباس الرومی نے کہا ہے[۲۱۹]؎

یا سیدَ العرب الذی زُفّت لہ　　بالیمن و بالبرکات سیدۃ العجم

---

۲۱۶ الیافعی ج ۲۔ ص ۱۹۴، ۱۹۶ + خطط ج ۱۔ ص ۲۳۲ + مقریزی نے اس شہر کی مختصر تاریخ بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ مقام بادشاہوں کی نزہت گاہ بن گیا تھا۔

۲۱۷ تاریخ الرسل والملوک ج ۱۱۔ ص ۳۴۵، ۳۴۶ +

۲۱۸ طبری ج ۱۱۔ ص ۳۶۷ + مروج الذہب ج ۲۔ ص ۳۲۸ +

ع تاریخ ج ۴۔ ص ۳۰۷ +

۲۱۹ مروج الذہب ج ۲۔ ص ۳۴۴ +

اسعد بها کسعود هابك انها ظفرت بما فوق المطالب والهمم
ظفرت بملای ناظر بها بهجة وضمیرها نبلاً وکفیها کرم
شمس الضحی زفت الی بدر الدجی فتکشف بهما عن الدنیا ظلم

یہاں خط کشیدہ الفاظ خاص طور پر قابل غور ہیں جن میں شاعر نے معتضد اور خمارویہ کو مساویانہ درجہ دے دیا ہے اور ہمیں اس کا علم نہیں کہ ان الفاظ پر کوئی اعتراض کیا گیا تھا۔

اس شان و شکوہ کی شادی کے حالات صرف ایک مرتبہ اس سے قبل تاریخ اسلام میں اس موقعے پر ملتے ہیں جب مامون نے حسن بن سہل کی بیٹی بُوران سے فم الصلح میں شادی کی ہے۔ لیکن مصر کا ملک اس قسم کی فضول خرچی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مورخوں نے لکھا ہے کہ اس شادی سے خلیفہ معتضد کا حقیقی مقصد ہی یہ تھا کہ آل طولون کو اس بہانے سے بالکل فقیر کر دیا جائے۔ اب یہ حالت ہوگئی تھی کہ اگر خمارویہ کو ایک شمع بھی درکار ہوتی تھی تو وہ بھی اُسے دستیاب نہ ہو سکتی تھی[۲۲۰]۔ ابن تغری بردی[۲۲۱] نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ ۲۸۲ھ میں خمارویہ کا انتقال عین وقت پر ہوا، کیونکہ اگر اس نازک زمانے میں اتفاق سے کوئی بڑی مہم پیش آجاتی تو اموال کی کمی کی وجہ سے خمارویہ اس کا انتظام کرنے سے بالکل قاصر رہتا، اور نہ آئندہ وہ اپنی فضول خرچیاں جاری رکھ سکتا تھا۔

اب خمارویہ کے زمانے کا آخری واقعہ بیان کرنا رہ جاتا ہے۔ ۲۸۰ھ میں خمارویہ کی طرف سے احمد بن آبا (یا احمد بن ابالی) نے اور پھر ۲۸۱ھ و ۲۸۲ھ میں خمارویہ کے حاکم دمشق طُغج بن جُفّ نے یونانی سرحد میں داخل ہوکر فتوحات حاصل کیں[۲۲۲]۔ اس کے بعد ۲۸۲ھ میں قیدیوں کی فدائی کے لئے

---

[۲۲۰] نشوار المحاضرہ ص ۲۶۲ + اس کے علاوہ دیکھو الیافعی ج ۲ ص ۳۲۸ +

[۲۲۱] النجوم الزاہرہ ج ۲ ص ۹۵:- وقال بعضهم: فمات حتفاً حين حاجته الى الموت لانه لو عاش اكثر من هذا حتى يلتمس ما كانت جرت عادة لاستصعب ذلك عليه لو نزلت به ملمة لانفضم۔

[۲۲۲] ابو الفداء ج ۲ ص ۵۶ + طبری ج ۱۱ ص ۳۴۳، ۳۴۴ +

یونانیوں اور مسلمانوں میں ایک عارضی صلح (ھدنہ) قرار پائی۔ مگر قبل اس کے کہ یہ فدا مکمل ہو ذیقعدہ ۲۸۲ھ میں خمارویہ کو دمشق میں قتل کر دیا گیا اور فدا کی تکمیل جیش بن خمارویہ کے زمانے میں ۲۸۳ھ میں ہوئی۔ اس موقع پر جو مسلمان مرد اور عورت قید سے آزاد کرا دیے گئے ان کی تعداد دو ہزار چار سو چورانوے اور بروایتے تین ہزار تھی۔ یونانیوں اور مسلمانوں میں قیدیوں کا یہ چوتھا تبادلہ تھا[۲۲۳]

خلیفہ کے ساتھ مصاہرت کے تعلقات پیدا کر لینے کے بعد خمارویہ کے لئے بالکل امن چین کا زمانہ شروع ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن یہ اس کے نصیب میں نہ تھا۔ جمعرات کے دن ۸ رشعبان ۲۸۲ھ کو خمارویہ دمشق روانہ ہوا اور اسی سفر میں ۲۸ ذی قعدہ ۲۸۲ھ کو خمارویہ اپنے بستر پر اپنے ہی غلاموں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اس کی مدت ولایت بارہ سال اٹھارہ دن ہے[۲۲۴]، اور اس نے صرف بتیس برس کی عمر پائی۔ قتل کے اسباب کے متعلق مختلف روایات نقل کی گئی ہیں[۲۲۵]۔ مگر ان کی تفصیل یہاں بیان کرنا بے سود ہے۔ خلیفہ کو قتل کی اطلاع خمارویہ کے کاتب ابراہیم بن احمد الماذرائی نے دی تھی جس نے اسی غرض سے دمشق سے بغداد تک کا سفر صرف گیارہ دن میں کیا تھا۔ اس سے قبل معتضد خمارویہ کے لئے تحائف اور ایک سفیر ابن الجصاص کو مصر روانہ کر چکا تھا۔ مگر جب خمارویہ کے قتل کی خبر ملی تو ابن الجصاص کو واپس بلا لیا گیا۔ جن غلاموں پر خمارویہ کے قتل کا الزام تھا ان کی تعداد بیس تھی[illegible] اور انھیں قصاص میں قتل کر دیا گیا[۲۲۶]۔ اس کے دفن کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ ابن عساکر[۲۲۷] نے ایک روایت یہ بیان کی ہے کہ اسے حوران میں دفن کیا گیا تھا۔

۲۲۳ کتاب التنبیہ والاشراف ص ۱۹۲ + مروج الذہب ج ۲ ص ۳۴۵ +

۲۲۴ الکندی ص ۲۴۱ + ابن خلدون (ج ۴۔ ص ۳۰۸) کے مطابق قتل کی واردات ذی الحجہ میں پیش آئی تھی۔ طبری (ج ۱۱۔ ص ۳۴۷) کی ایک روایت ہے کہ خمارویہ کے قتل کی تاریخ ۳ ذی الحجہ ہے۔

۲۲۵ طبری ج ۱۱۔ ص ۳۴۷ + ابن عساکر ۲۔ ص ۱۰۲ +

۲۲۶ ابن عساکر ۵۔ ص ۱۰۸ +

۲۲۷ تاریخ الکبیر ۵۔ ص ۱۷۸

لیکن ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے اُس کا جنازہ تابوت میں مصر لے جایا گیا تھا اور اُسے اُس کے باپ کے پہلو میں دفن کیا گیا تھا۔ اسی موخر الذکر روایت کو دوسرے مورخوں نے صحیح سمجھا ہے جس دن اس کا جنازہ فسطاط پہنچا ہے وہ وہاں ماتم کا دن تھا جس میں خمارویہ کے غلمان، موالی اور ہر مرد و عورت نے حصہ لیا[۲۲۸]

(۸)

خمارویہ نے دو خصائل اپنے باپ سے ورثے میں پائے تھے۔ ایک تو بذل و نوال اور دوسرے تعمیرات کا شوق۔ جہاں تک بذل و نوال کا تعلق ہے یہ چیز فضول خرچی کی حد تک بڑھی ہوئی تھی، اور اس کی متعدد مثالیں تاریخوں میں جابجا مذکور ہیں۔ اس معاملے میں احمد بن طولون اور ابو الجیش خمارویہ میں جو فرق تھا وہ ابن عساکر نے ایک موقع پر خوب ظاہر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی نے ابن مہاجر سے پوچھا کہ احمد اور خمارویہ میں کون زیادہ وسیع النفقہ تھا۔ اس نے جواب دیا کہ خمارویہ زیادہ کشادہ دل اور وسیع النفقہ ہے۔ لیکن احمد بن طولون مناسب موقعہ اور محل پر خرچ کرتا تھا اور خمارویہ کے اخراجات بے تکے ہوتے تھے۔[۲۲۹] اس کے اخراجات کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ ابن تغری بردی[۲۳۰] کے مطابق خمارویہ کی فوج کے سالانہ اخراجات نو لاکھ دینار اور مطبخ کے ماہانہ اخراجات تیئیس ہزار دینار تھے۔ حرم اور جواری اور ان کے متعلقات کے اخراجات اس کے علاوہ تھے۔ افسوس ہے کہ خمارویہ کی تعمیر کردہ نہ اب کوئی عمارت موجود ہے اور نہ کسی عمارت کے تفصیلی حالات ہی ملتے ہیں۔ بہرحال ابن تغری بردی[۲۳۱] نے ان عمارتوں کے نام اور بہت ہی مختصر حالات یکجا جمع کر دیئے ہیں۔ اپنے باپ کے تعمیر کردہ قصر اور اس کے مکانات میں اضافہ کرنے کے علاوہ خمارویہ نے قصر کے سامنے ایک حوض (فسقیہ) بنوایا تھا جسے بجائے

---

۲۲۸ دیکھو مسعودی۔ مروج الذہب ج ۲۔ص ۳۳۳ +

۲۲۹ ابن عساکر ج ۵۔ص ۱۷۷۔ کان ابوالجیش اوسع صدرا و اکثر نفقة و احمد کان یجد فی نفقته و ابوالجیش کان یهزل فیها +

۲۳۰ النجوم الزاہرہ ج ۲۔ص ۶۴ +

۲۳۱ النجوم الزاہرہ ج ۲۔ص ۵۵ - ۶۴ + اس کے علاوہ دیکھو خطط ج ۱۔ص ۳۱۶ +

پانی کے پارے سے بھر اگیا تھا۔ اس کی تعمیر کی وجہ یہ ہوئی کہ خمارویہ کو نیند نہیں آتی تھی، اور طبیب نے یہ علاج تجویز کیا تھا کہ ایک حوض کو پارے سے بھرا جائے، پارے کو مسلسل ہلایا جاتا رہے، اور خمارویہ اس حوض میں سوے۔ چنانچہ اس بات کا خاص طور پر انتظام کیا گیا تھا کہ پارہ متحرک رہے۔ اس حوض کا رقبہ پچاس در پچاس درع تھا، اور اس پر بے انتہا مال خرچ کیا گیا تھا۔ چاندنی رات میں جب چاند اپنی پوری روشنی دے رہا ہو یہ پارے کا حوض بڑا پرلطف نظارہ پیش کرتا تھا۔ قضاعی کی روایت ہے کہ قصر کی تباہی کے بعد مدتوں تک لوگ حوض کی درازوں میں تلاش کرکے پارا نکالا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ قصر ہی میں ایک قبۃ الحوا، تعمیر کرایا تھا۔ اس قبے کو ہر موسم کے لئے موزوں بنانے کے واسطے پردوں کا انتظام تھا، اور جا، وقوع ایسی رکھی گئی تھی کہ وہاں سے تمام محل، بستان، صحرا، دریائے نیل، پہاڑ اور پورا شہر نظر آتا تھا۔ قصر میں ان اضافوں کے علاوہ اس نے احمد بن طولون کے میدان سے بھی ایک بڑا میدان بنوایا تھا، جس میں درندوں کے رہنے کے لئے ایک مقام (دار السباع) تھا۔ اس کی طرز تعمیر اور دیگر انتظامات ابن تغری بردی نے بیان کئے ہیں۔ باپ کی خواصوں کے لئے ایک الگ محل بنوایا، جس کے انتظامات اس قدر مکمل تھے کہ ان عورتوں کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ خمارویہ کو مویشی اور گھوڑوں کا شوق تھا۔ ہر قسم کے مویشی کے لئے الگ الگ اصطبل اور تھان تھے، اور پرانے اصطبلوں کو بھی وسیع کیا گیا تھا۔ فسطاط کے علاوہ جیزہ، نہیا، سفط، اور طھر مس میں بھی الگ اصطبل تھے۔ ان ضیاع میں سوائے ترتل کے اور کسی چیز کی کاشت نہیں ہوتی تھی تاکہ مویشی اور گھوڑوں کو برابر آذوقہ میسر آتا رہے۔ یہ اصطبل تو خمارویہ کے تھے۔ ان کے علاوہ خلیفہ کے گھوڑوں کے اصطبل الگ تھے، جن میں گھڑ دوڑ کے گھوڑے بھی رہتے تھے اور رباط کے لئے بھی۔ ہر اصطبل کے ملازم الگ الگ تھے، اور اچھی تنخواہیں پاتے تھے۔ خمارویہ کو شکار اور گھڑ دوڑ سے شغف تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ گھڑ دوڑ اسی منظر میں ہوتی تھی جو احمد بن طولون نے فوج کی پریڈ کے لئے بنوایا تھا۔ اس موقعے پر خمارویہ تمام خدم وحشم اور مسلح فوج کے ساتھ گھڑ دوڑ کے

میدان میں آتا تھا۔ اہل فسطاط یہ دن عید کی طرح مناتے تھے اور فوج اور گھڑ دوڑ دیکھنے کے لئے جمع ہوتے تھے۔[۲۳۲]

اوپر بستان کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہی بستان خمارویہ کا سب سے بڑا کام سمجھا جاتا ہے، اور اسی کی سب سے زیادہ تفصیل سے ہم واقف ہیں۔ اس کے حالات ابن تغری بردی اور مقریزی دونوں نے بیان کئے ہیں، اور فون کریمر نے اپنی کتاب میں بھی اس عبارت کا ترجمہ کیا ہے۔ فون کریمر کے مضمون کا ترجمہ اردو میں شائع ہو چکا ہے، اور اسی ترجمے سے ہم یہ حالات نقل کرتے ہیں[۲۳۳]۔ خمارویہ جب اپنے باپ کا جانشین ہوا تو جامع مسجد کے قریب کے میدان میں اس نے باغ لگوایا۔ اس میں طرح طرح کے خوشبودار پھول اور انواع و اقسام کے درخت لگوائے تھے۔ اس باغ کے لئے اس نے عجیب وغریب درخت اور مختلف قسموں کے گلاب دور دور سے منگائے تھے۔ باغ میں زعفران کی کاشت بھی ہوتی تھی۔ کھجور کے درختوں کے تنوں پر بڑی صناعی سے تانبے کے پترے لپیٹے تھے، اور ان پر سونے کا ملمع کیا تھا۔ ان پتروں اور درختوں کے تنوں کے درمیان سیسے کی نالیاں تھیں۔ جب پانی چھوڑا جاتا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کھجور کی جڑوں سے پانی ابل رہا ہے۔ پانی ایک حوض میں جمع ہوتا تھا، اور نالیوں کے ذریعے تمام باغ میں تقسیم ہوتا تھا۔ کیاریوں میں خوشبودار پھولوں سے طرح طرح کے نقش و نگار بنائے جاتے تھے۔ اکثر کیاریوں میں ان ہی پھولوں سے عبارتیں لکھی گئی تھیں۔ مالی ہر وقت ان پودوں کو تراشتے رہتے تھے کہ پتے حد سے نہ بڑھنے پائیں اور عبارتیں نمایاں رہیں۔ اس باغ کے لئے کھجور کے درخت اور سبز، زرد اور نیلے رنگ کے نیلوفر خراسان وغیرہ سے لائے گئے تھے، جو دوسرے علاقوں میں کمیاب تھے۔ زرد آلو کے بہت سے ایسے درخت تھے جن میں بادام کا پیوند لگایا گیا تھا۔ خاص طور پر قابل دید چیز باغ کی بارہ دری تھی جو ساگوان کی لکڑی سے

---

۲۳۲ ابن تغری بردی ج ۳۔ ص ۴۶۔

۲۳۳ سلسلہ فون کی صنعت و حرفت ' زراعت و تجارت ' مترجمہ محمد جمیل الرحمن۔ الہ آباد ۱۹۳۶ء۔ ص ۱۲۳ تا ۱۲۵۔

بنائی گئی تھی۔ اس پر عجیب و غریب نقش و نگار تھے۔ اس کے اندر کا حصہ بہت شاندار تھا، اور اس پر مختلف رنگوں سے نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ اس کا فرش سنگ مرمر کا تھا۔ ستونوں سے پانی کی چھوٹی چھوٹی آبشاریں بہتی رہتی تھیں۔ خوش الحان چڑیاں بارہ دری کی دیواروں میں کھلے گھونسلوں میں رہتی تھیں، اور بارہ دری کے اندر آزاد پھرتی تھیں۔ باغ میں جگہ جگہ مختلف قسم کے مور، مرغ حبشی (دجاج الحبشی) اور ان کے علاوہ دوسرے کم یاب پرندوں کی ایک بڑی تعداد پلی رہتی تھی۔[۲۳۴]

لازمی طور پر احمد بن طولون کی طرح خمارویہ نے بھی فوج کی طرف خاص توجہ کی تھی۔ حوف الشرقی کے عرب، جنھیں بنو امیہ کے زمانے میں وہاں لا کر بسایا گیا تھا، اب اپنی سب روایات بھول چکے تھے، اور رہزنی اور لوگوں کو اذیت دینے کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ مگر یہ شجاعت اور ہیبت میں مشہور تھے۔ خمارویہ نے حوف الشرقی کے ان عربوں کو جنھیں شناترہ کہتے ہیں، فوج میں بھرتی کیا، انھیں بڑی بڑی تنخواہیں دیں، اور حریر و دیباج کی بھڑک دار وردیاں، پٹکے اور تلواریں عطا کیں۔ شناترہ کی اس نئی فوج کا نام اس نے "مختارہ" (چیدہ فوج) رکھا۔ اس عمل سے اس نے ان مفسدوں کی شجاعت سے بھی کام لیا اور انھیں اذیت دینے اور رہزنی سے بھی باز رکھا۔ بیان کیا گیا ہے یہ شناترہ جب خمارویہ کے ساتھ چلتے تھے تو کندھوں پر تلواریں رکھ کر چلتے تھے، اور جب جنگ میں شریک ہوتے تھے تو فوج کے آگے لڑتے تھے اور دوسرے سپاہیوں کے مقابلے میں داد شجاعت دیتے تھے۔ ان عربوں کے علاوہ خمارویہ کی فوج میں ایک ہزار حبشی تھے۔ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ حبشی خمارویہ کی ذات سے وابستہ تھے۔ سوائے تلواروں اور خودوں کے، جو ان کے عماموں کے نیچے ہوتی تھیں، ان حبشی سپاہیوں کی پوری وردی سیاہ ہوتی تھی، اور جب یہ فوج چلتی تھی تو یہ معلوم

---

۲۳۴ خطط ج ۱، ص ۳۱۶ + النجوم الزاہرہ ج ۲، ص ۶۴، ۶۵ +

ہوتا تھا کہ جیسے سیاہ سمندر موجیں لے رہا ہے۔ خمارویہ خود بھی بلند و بالا شخص تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی چٹان سے اُسے کاٹا گیا ہے۔ اُس کے موکب میں انتہا درجے کی خاموشی رہتی تھی "کانما علی رؤسہم الطیر" کھانسنے اور چھینکنے تک کی آواز نہیں آتی تھی۔[235]

افسوس ہے کہ خمارویہ کے وقت میں مصر کی معاشی حالت کے متعلق کوئی خاص بات نہیں ملتی۔ اس لئے قیاس یہ ہے کہ احمد بن طولون کے زمانے کے معاشی انتظامات بدستور جاری رہے تھے۔ لیکن اول تو خمارویہ کی فضول خرچیاں، جن کے بعض کوائف اوپر بیان ہوئے، اور اُن کے علاوہ دو آفات سماوی ایسی چیزیں ہیں جن سے صرف یہی نتیجہ نکالا[236] جاسکتا ہے کہ مصر کی معاشی حالت اس دور ولایت میں ضرور بگڑتی گئی ہوگی۔ ۲۷۲ھ میں طبری کے مطابق، مصر میں ایک زبردست زلزلہ آیا تھا، جس سے مکانوں کے علاوہ جامع مسجد کو بھی نقصان پہنچا تھا، اور جانی نقصان کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک ہزار جنازے ایک دن میں شمار کئے گئے تھے۔ اس کے بعد ۲۷۶ھ میں نیل میں طغیانی نہ آنے کی وجہ سے ملک میں سخت قحط پڑا تھا۔[237]

۹

خمارویہ کا قتل آل طولون کے خاتمے کا آغاز تھا۔ اس موقعے پر اُس کا بیٹا ابوالعساکر جیش دمشق میں اُس کے ساتھ تھا۔ ۲۸ ذی القعدہ ۲۸۲ھ کو جیش کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ چند روز دمشق میں قیام کرنے کے بعد وہ مصر واپس آگیا اور پھر وہیں رہا۔ جیش کم سن ناآزمودہ کار لڑکا تھا۔ "وکان صبیاً غراً"[238]۔ واقعہ یہ ہے کہ خمارویہ کے انتقال کے وقت ہی بڑے بڑے قوادکی ایک جماعت نے اس بنا پر جیش کو جانشین بنانے میں پس و پیش کیا تھا کہ اس کے پاس

---

[235] ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۶۴۔ الخ + مقریزی ج ۱۔ ص ۳۱۸ + دونوں مورخوں کی عبارت حرف بحرف ایک ہے +

[236] تاریخ الرسل والملوک۔ ج ۱۱۔ ص ۲۳۱ + [237] ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۸۴ +

[238] ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۵۷ + ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۹۴۔ حاشیہ ۲ +

انعام واکرام دینے کے لئے کوئی مال نہ تھا، کیونکہ خمارویہ بیٹی کی شادی میں خزانہ خالی کر چکا تھا۔ مگر جیش ان کے ساتھ تلطف و مدارات سے پیش آیا اور انھیں اپنی طرف مائل کر لیا۔ اس پر بھی بہت جلد جیش کی طرف سے سب کو بے اطمینانی ہوئی۔ حکمران ہونے کے بعد حکومت کے کاموں سے بے خبر ہو کر وہ لہو ولعب اور شراب خوری میں پڑ گیا۔ اوباش لوگ اُس کے مصاحب تھے۔ ان میں ایک رومی غلام بندقوش اور دو معمولی درجے کے لوگوں خضر اور ابن البواش کا نام خاص طور پر لیا گیا ہے[۲۳۹]۔ بڑے بڑے امراء اور قواد کو چھوڑ کر انھیں اوباشوں کی صحبت کو اُس نے ترجیح دی، بلکہ ان پر علانیہ یہ ظاہر بھی کر دیا۔ اور یہ بھی کہا، اور تمام حکومت کا کام وہ انھیں کے سپرد کر دے گا۔ ان امراء کی یہ حالت تھی کہ یہ لوگ زبردست شان وشوکت کے مالک تھے، اور ان میں سے ہر ایک شجاعت اور ریاست میں یکتا تھا۔ خمارویہ نے اُن کے ساتھ نیک سلوک کر کے انھیں اپنا بنا رکھا تھا۔ لیکن جیش کی کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ ایک مرتبہ نبیذ میں مدہوش ہو کر اس نے اپنے اوباش مصاحبوں سے کہا کہ ان کتوں (ھولاء الکلاب) سے تم زیادہ تعظیم وتکریم کے مستحق ہو۔ اُس کے یہ الفاظ ان قواد تک پہنچے اور انھوں نے تصفیہ کیا کہ جیش کو حکومت سے الگ کر دیا جائے۔ مگر وہ اس پر بھی باز نہ آیا، اور قواد کو علانیہ دھمکیاں دیں۔ جیش تفریح کی غرض سے منیۃ الاصبغ جا رہا تھا اور یہ قواد ہم رکاب تھے کہ انھیں ان دھمکیوں کی اطلاع ہوئی۔ اُسی بے سروسامانی کی حالت میں اپنے اہل وعیال اور مال ومتاع کو مصر میں چھوڑ کر خاقان المفلحی یا البلخی، محمد بن اسحاق بن کنداج، وصیف بن صوارتکین، بندقہ بن لمجور اس کا بھائی محمد بن لمجور اور طغج بن جُف کا بھائی یمن جف، اور اسی طرح کے اور بڑے بڑے قواد تین بتقدیر تین سو غلام ساتھ لے کر خشکی کے راستے مصر سے چل کھڑے، چند روز صحرا میں سرگرداں

[۲۳۹] مسعودی (مروج الذھب ج ۲۔ ص ۳۴۵) نے لکھا ہے کہ یہ صاحب تجح المعروف بہ طولونی اور سلامہ المعروف بہ موتمن تھے، اور اس کے بعد سلامہ قاہر اور راضی وغیرہ کا مقرب رہا تھا + تجح طولونی کا نام ہم آیندہ بھی پڑھیں گے۔

رہے، اور ان کی ایک جماعت پیاسی مرگئی۔ آخر ہزاروں تکلیفیں اٹھا کر وہ کوفہ کے راستے پر نکلے، معتضد کو ان کے آنے کی اطلاع ملی تو صاحب الجیش محمد بن سلیمان نے کوفہ میں ان کا استقبال کرکے ان کے نام خلیفہ کے پاس بھیجے، اور کوفہ سے ان کے لئے وظائف مقرر کئے۔ جب یہ لوگ بغداد پہنچے تو معتضد نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور طعام، وظائف اور خیمے ان کے پاس بھیجے۔ قواد کو گھوڑے زین اور لگام اور باقی آدمیوں کو خلعتوں سے سرفراز کیا۔ اب تلف ہونے کے بعد ان کی تعداد صرف ساٹھ رہ گئی تھی۔ اس واقعے کا اثر جو آلِ طولون پر پڑا اس کا اندازہ ہم اس طرح کرسکتے ہیں کہ ۲۹۰ھ میں جب خلیفہ مکتفی نے قرامطہ کے خلاف فوجیں بھیجی ہیں تو خاقان المفلحی اور محمد بن لجور ان جنگوں میں حصہ لے رہے تھے[۲۴۰]۔ اس دوران میں مصر سے دور طغج بن جف حاکم دمشق اور ابن طغان حاکم ثغور نے جیش کی اطاعت سے انحراف کیا اور اس کا نام خطبوں سے حذف کردیا۔ یہ ۲۸۳ھ کا واقعہ ہے۔ اُدھر جو قواد اور امراء مصر میں باقی رہ گئے تھے انھوں نے جمع ہو کر تمام حالات پر غور کیا، اور یہ فیصلہ کیا کہ جیش جیسا شخص مسلمانوں کے امور کا والی بننے کے قابل نہیں ہے۔ لیکن کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے۔ ان درباری جھگڑوں کے متعلق ابن تغری بردی[۲۴۱] نے تین روایتیں بیان کی ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ سب جیش کے بہی خواہ تھے۔ لیکن اس بہی خواہی کے باوجود ہر شخص اپنا بھلا کرنا چاہتا تھا۔ آخری نتیجہ یہ نکلا کہ فوج میں غدر ہوا، اور سپاہیوں نے جیش پر ہجوم کرکے مطالبہ کیا کہ وہ حکومت سے برطرف ہو جائے اور اس کے چچا نصر کو اس کی جگہ حکمران بنایا جائے۔ جیش کے کاتب، یا جیسا کہ مسعودی نے لکھا ہے اُس کے وزیر، علی بن احمد الماذرائی نے ایک دن کی مہلت مانگی۔ رات کو جیش نے نصر اور ایک اور چچا کو قتل کرادیا، اور صبح کو جب فوج جواب کے لئے حاضر ہوئی تو ان کے سر پھینک کر سپاہیوں کے سامنے پھینک دیے گئے کہ لو یہ تمہارے امیر ہیں۔ اس پر فوج نے یکبارگی دھاوا کرکے اس کی والدہ کو قتل

---

[۲۴۰] طبری ج ۱۱ ص ۳۸۷ [۲۴۱] النجوم الزاہرہ ج ۲۔ ص ۹۸ - ۱۰۱ +

کردیا' اس کا گھر لوٹ لیا اور جلا ڈالا' اور اُس کے بھائی ہارون کی حکومت کا اعلان کردیا۔ پھر علی بن احمد الماورائی کی تلاش ہوئی' اور اُسے بھی قتل کیا گیا۔ جیش کی خلع کا واقعہ ۱۰ ر جمادی الآخر ۲۸۳ھ کو پیش آیا۔ چند دن کے بعد جیش کو قید خانے میں قتل کیا گیا۔[242] اس کا زمانۂ ولایت ۹ مہینے اور بارہ دن ہے۔

۱۰ ر جمادی الآخر ۲۸۳ھ کو ابو موسیٰ ہارون اپنے بھائی جیش کا جانشین ہوا۔ اس کی کوئی مخالفت نہیں کی گئی' بلکہ سب نے متفقہ طور پر اُسے حکمران تسلیم کیا' اور ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ فوج نے عطا کا مطالبہ نہیں کیا۔[243] اب اختلال ختم ہوکر پھر ایک مرتبہ ملک کو امن چین نصیب ہوا۔ ہارون بھی جیش کی طرح ناتجربہ کار تھا' اور تمام امور حکومت پر جعفر بن اُبالی (یا ابن اُبا) جو احمد اور خمارویہ کے زمانے میں با اختیار رہ چکا تھا' حاوی اور مستولی تھا۔ اس نے ربیعہ بن احمد بن طولون کو حکم دیا کہ وہ مع اپنے حرم اور اہل و عیال کے ساتھ اسکندریہ میں رہے۔ وہاں جند کے اس حصے نے جو ہارون کے خلاف تھا ربیعہ کو سمجھایا کہ حکومت دراصل اسی کا حق ہے' اور ربیعہ بھی ان کے کہنے میں آگیا۔ باوجود ذاتی تہور کے آخر وہ گرفتار ہوا' اور اُسے چابکوں کی سزا دی گئی جس سے جاں بر نہ ہوسکا۔ اب مصر میں امن و امان تھا۔ ہارون کی حکومت مستقل ہوگئی تھی۔ مگر مصر کے باہر حالات بدستور خراب ہوتے چلے جارہے تھے۔ دمشق میں طُغج بن جُف کی مخالفت جاری تھی۔ آخر ابن ابالی نے احمد بن طولون کے غلام بدر الحمامی

---

[242] النجوم الزاہرہ ج ۲۔ ص ۹۸۔ ۱۰۱ + ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۸ + طبری ج ۱۱۔ ص ۹۴ + طبری اور ابو الفداء (ج ۲۔ ص ۵۷) نے بیان کیا ہے کہ اسی ہنگامے میں جیش قتل ہوا تھا۔ الکندی ص ۲۴۱' ۲۴۲ + مروج الذہب ج ۲۔ ص ۵۴۲ + جیش کی جانشینی سے اس کی موت تک حساب لگایا جائے تو پورے نو مہینے اور بارہ دن نہیں ہوتے۔ لیکن مورخ اس پر متفق ہیں کہ اس کی مدت حکومت اتنی ہی تھی۔

[243] ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۹ + ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۱۰۶۔ ۱۱۸ + الکندی ص ۲۴۳ +

اور حسن بن احمد الماذرائی کو وہاں بھیجا اور انجام کار یہ تصفیہ ہوا کہ طغج بن جف کو بدستور دمشق کا حاکم رہنے دیا جائے۔ اس کے علاوہ ان دونوں نے دوسرے اعمال پر بھی ہارون کی طرف سے عامل مقرر کئے لیکن اب مصر میں ابن ابالی کی وجہ سے فتنے شروع ہوئے۔ بدر الحمامی، فائق اور صافی تین امراء کو تشویش پیدا ہوئی، اور وہ ابن ابالی سے بیزار ہو کر ملک کے مختلف حصوں پر قابض اور متصرف ہو گئے۔ یہ تشویش اس وجہ سے اور بڑھی کہ ابن ابالی معمولی شکائتیں کر کے ہارون کے درباریوں کو قتل کرا رہا تھا۔ بالآخر ایک معمولی درجے کے قائد کو ترقی دے کر اس نے اسے بدر الحمامی کے برابر بنا دیا۔ اس واقعے سے یہ لوگ اور بھی ناراض ہو گئے، اور جب صافی کو مصر سے رملہ جلاوطن کیا گیا تو یہ ناراضگی بالکل مکمل اور پختہ ہو گئی۔[244]

یہ واقعات ۲۸۳ھ کے ہیں، جب انھیں امراء کی ناراضگی کی وجہ سے ہارون برابر کمزور ہوتا جا رہا تھا اور مملکت میں اختلال واقع ہو رہا تھا۔[245] طغج بن جف ہارون کی طرف سے ابھی تک دمشق کا والی تھا۔[246] طرسوس کے حالات ہم بیان کر چکے ہیں کہ کس طرح وہاں برابر انقلاب برپا ہو رہے تھے۔ ۲۸۴ھ میں یہ کیفیت ہوئی کہ اہل طرسوس نے ہارون کے والی کو نکال دیا، اور یہ بھی دھمکی دی کہ جو کوئی والی ہارون کی طرف سے آئے گا اس کے ساتھ یہی سلوک ہوگا۔ ہارون نے چاہا کہ خمارویہ کی طرح وہ بھی تلطف اور مدارات سے انھیں زیر کر لے۔ مگر یہ بھی ممکن نہ ہوا، اور اسی سنہ میں اہل طرسوس نے حکومت (سلطان) کو لکھا کہ ان کے لئے کوئی والی مقرر کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کے شہر میں کوئی والی نہیں ہے (ان بلدھم بغیر والی)۔ خلیفہ معتضد نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ۱۲ ربیع الاول ۲۸۵ھ کو اہل طرسوس کی یہ استدعا منظور کر کے ابن الاخشاد کو وہاں کا والی مقرر کر دیا۔[247] اس کا

---

[244] ابوالفداء ج ۲۔ ص ۵۸ [245] ایضاً

مطلب یہ تھا کہ ثغور پر ہارون کا قبضہ نہیں رہا۔ اب ہارون کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ باضابطہ طور پر ثغور سے دست بردار ہو جائے۔ چنانچہ ۲۸۵ھ میں اُس نے وصیف قاطرمیز کی سرکردگی میں مصری قواد کا ایک وفد خلیفہ کی خدمت میں بھیجا اور درخواست کی کہ مصر و شام اُسے عطا کر دئے جائیں اور قنسرین' عواصم' دیار ربیعہ اور دیار مضر سے وہ دست بردار ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ بھی وہی مراعات برتی جائیں جو اُس کے باپ خمارویہ کے ساتھ مرعی رکھی گئی تھیں۔ یہ درخواست منظور کی گئی' اور ہارون نے وعدہ کیا وہ سالانہ چار لاکھ پچاس ہزار دینار بغداد کے خزانے میں ادا کرتا رہے گا۔ یہ شرائط طے کر ۲۸۶ھ میں خلیفہ کے خادم بدر القدامی اور عبد اللہ بن فتح مصر پہنچے۔ اسی سال ان کی تکمیل کی گئی اور ہارون کو خلعت عطا کی گئی۔ جمادی الاول میں یہ تمام باتیں تکمیل کو پہنچیں اور ۲۳ جمادی الآخر ۲۸۶ھ کو ان صوبہ جات کی حوالگی عمل میں آئی' اور انھیں خلیفہ کے عمال کے سپرد کیا گیا۔ معتضد نے اپنے بیٹے علی المکتفی کو ان علاقوں کا والی مقرر کیا۔[۲۴۷]

اب حالت یہ تھی کہ ۲۸۶ھ میں ہارون کی حکومت تو صرف مصر و شام تک محدود رہ گئی تھی' مگر سالانہ رقم ادا شدنی میں اضافہ کر دیا گیا تھا' اور خمارویہ کے زمانے کے برعکس اس نئی درخواست کو منظور کرتے وقت یہ کہیں ذکر نہیں کیا گیا تھا کہ آل طولون کی ولایت تیس برس یا اس سے کم عرصے کے لئے برقرار رکھی جائے گی۔ لہذا آل طولون کے لئے حالات اب بہت ہی مخدوش تھے کہ ۲۸۹ھ دو اہم واقعات پیش آئے۔ اس سال ربیع الآخر میں خلیفہ معتضد کا انتقال ہوا' اور علی المکتفی اس کا جانشین ہوا۔ اس سے بھی بڑا انقلاب یہ ہوا کہ ۲۸۹ھ ہی میں قرامطہ شام میں ظاہر ہوئے[۲۴۸]۔ ہارون کے والی دمشق طغج بن جف نے

---

۲۴۷ طبری ج ۱۱۔ ص ۳۶۳' ۳۶۴ + ابو الفداء ج ۲۔ ص ۵۸ + ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۶۲' ۱۶۳ + النجوم الزاہرہ ج ۲۔ ص ۱۲۵ +

۲۴۸ ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۱۱۲' ۱۳۴۔۔۔۱۳۷ + ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۹ + ابو الفداء ج۔ ص ۵۹ + طبری ج ۱۱۔ ص ۳۷۷' ۳۷۸' ۳۸۰ +

یہ غلطی کی کہ قرامطہ کے اس ظہور کو عربوں کا معمولی سا خروج سمجھ لیا، اور کافی تیاری کے بغیر ان کا مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ ہارون نے فوراً بدر الحمامی اور ایک قائد کے ماتحت ایک زبردست فوج شام بھیجی۔ اس کو اتنی کامیابی ضرور ہوئی کہ انھوں نے قرمطی سردار کو قتل کر دیا لیکن فساد برابر جاری رہا، کیونکہ ان لوگوں نے مقتول سردار کی جگہ اُس کے بھائی کو اپنا سرگروہ بنا لیا۔ ۲۸۹ھ اور ۲۹۰ھ میں یہ جنگیں جاری رہیں، اور ہر موقع پر یحییٰ بن زکرویہ بن مہرویہ کے قرامطہ نے حکومت کی فوجوں کو شکست دی، بلکہ خود دمشق کا بھی محاصرہ کر لیا، اور طغج بن جف ان کا مقابلہ نہ کر سکا۔ بالآخر ۲۹۰ھ میں یحیی بن زکرویہ کو باب دمشق پر قتل کیا گیا۔[۲۴۹]

بالآخر جب حالات کسی طرح نہ سنبھلے تو ۲۹۱ھ میں مکتفی نے صاحب الجیش محمد بن سلیمان کو فوج دے کر شام بھیجا اور اس فوج نے قرامطہ کی شورش فرو کی۔ اس کے بعد ۲۹۱ھ ہی میں مکتفی نے محمد بن سلیمان اور قواد کی ایک جماعت کو خلعتیں عطا کر کے حکم دیا کہ وہ مصر و شام جائیں اور یہ اعمال ہارون سے لے لیں۔[۲۵۰] آل طولون کے خلاف حالات کے اس طرح پلٹا کھانے کی کوئی وجہ صریحاً بیان نہیں کی گئی لیکن اس کے مختلف اسباب قرار دیے جا سکتے ہیں۔ ابن الاثیر[۲۵۱] نے لکھا ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہارون قرامطہ کی شورش فرو کرنے سے عاجز رہا تھا۔ الیافعی[۲۵۲] نے بالکل صراحت سے بیان کیا ہے کہ "خرج صاحب مصر هارون بن خمارویه عن الطاعة" خواہ قرامطہ کے خلاف اظہار عجز ہو یا خلیفہ کی اطاعت سے انحراف دونوں اسباب ایسے ہو سکتے تھے کہ جن کی بنا پر مکتفی مصر پر فوج کشی کر دے لیکن یہ بھی یاد

---

۲۴۹ ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۱۱۳ +

۲۵۰ ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۷۵ +

۲۵۱ تاریخ کامل۔ ج ۷۔ ص ۱۷۵ +

۲۵۲ مراۃ الجنان۔ ج ۲۔ ص ۲۲۰ +

رکھنا چاہئے کہ خلفاء عباسیہ نہ بھولتے تھے اور نہ معاف کرتے تھے۔ معتمد کے زمانے سے آل طولون کے خلاف کارروائیاں جاری تھیں، مگر خلافت کے کارکنوں کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اب قرامطہ کے مقابلے میں ہارون کا عاجز رہنا کافی ثبوت تھا اس امر کا کہ انھیں برباد کر دینا آسان ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ مصر میں درباری سازشیں، اور امراء کا مختلف گروہوں میں تقسیم ہو کر ان کی ہارون سے بے زاری بھی اس فوج کشی کا سبب ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ابن الاثیر[۲۵۳] نے لکھا ہے کہ قرامطہ کا قلع قمع کرنے کے بعد محمد بن سلیمان شام سے عراق واپس ہونے کا ارادہ کر رہا تھا کہ فائق اور بدر الحمامی کے خطوط اُسے ملے کہ وہ اگر بلاد مصر پر حملہ کرے تو وہ فتح میں اُسے مدد دیں گے۔ محمد بن سلیمان نے بغداد آ کر خلیفہ کو اس کی اطلاع دی اور اُس نے فوراً اس سے فائدہ اُٹھایا۔

محمد بن سلیمان دیار مصر کے شہر رقہ کا رہنے والا تھا۔ جوانی کے زمانے میں تلاش معاش میں مصر آیا، اور چند روز سرگرداں رہنے کے بعد احمد بن طولون کے غلام لؤلؤ کا کاتب مقرر ہوا۔ احمد بن طولون نے بھی اُس پر احسان کیا۔ لیکن جب اُسے لؤلؤ پر شبہ ہوا تو اس نے صرف محمد بن سلیمان بلکہ اُس کے اعزا و اقرباء کا مال و اسباب ضبط کر لیا۔ محمد بن سلیمان جان کے خوف سے بغداد بھاگ آیا۔ یہاں اس کی ترقی مسدود نہیں ہوئی بلکہ اُس کی عزت و توقیر میں اضافہ ہوا۔ معتمد اور پھر معتضد کے زمانے میں اسے بڑی بڑی خدمتوں پر مامور کیا گیا، یہاں تک کہ وہ جیش کا کاتب مقرر ہوا، اور مکتفی کے زمانے میں "اعظم قواد" میں اُس کا شمار ہونے لگا۔ اس دوران میں وہ آل طولون کو نہیں بھولا، بلکہ مسلسل خلفاء کو اُن کی طرف متوجہ کرتا رہا۔ آخر ہارون کے زمانے میں اُسے موقع ملا اور اُس نے مکتفی کو آمادہ کر لیا کہ مصر پر حملہ کیا جائے[۲۵۴]۔ چنانچہ رجب ۲۹۱ھ وہ بارہ ہزار فوج لے کر بلا تاخیر

---

۲۵۳ تاریخ کامل ج ۷، ص ۱۷۶۔

۲۵۴ ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۱۰۔

بسرعت تمام مصر روانہ ہوگیا۔ اور شام و فلسطین پر مستولی ہونے کے بعد محرم ۲۹۲ھ میں حدود مصر میں پہنچ گیا۔[۲۵۵] حملے کا انتظام اس طرح کیا گیا تھا کہ بری فوج محمد بن سلیمان کے ماتحت تھی، اور مازیار کے غلام امیر البحر دمیانہ کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ کشتیوں کے ذریعے دریائے نیل میں پہنچ کر مصر (فسطاط) کے سامان رسد (مواد) کے راستے مسدود کردے۔ دمیانہ نے یہ فرض انجام دیا، اور اہل مصر اپنی زندگی سے تنگ آگئے۔ فائق اور بدر الحمامی پہلے ہی محمد بن سلیمان کو مدد کی امید دلا چکے تھے۔ اب اس نے پھر ان لوگوں سے خط و کتابت کی، اور بدر الحمامی پہلا مصری امیر تھا جو اس سے مل گیا۔ اس شخص کے اس طرح محمد بن سلیمان کے ساتھ شریک ہوجانے سے اہل مصر کی رہی سہی امید بھی جاتی رہی، اور باقی ماندہ قواد بھی امان لے لے کر محمد بن سلیمان کے ساتھ شریک ہونے لگے۔ یہ حالات دیکھ ہارون بھی یکم ذی الحجہ ۲۹۱ھ کو اپنی باقی ماندہ فوج لے کر فسطاط سے نکلا، اور مصر و شام کے سرحدی شہر عباسہ میں قیام کیا۔ یہاں سے اس نے فائق اور بدر کو لکھا کہ وہ اس کے وفادار رہیں اور وصیف قاطرمیز کو خصیب البربری اور حماد الخشی کے ساتھ جنگی جہاز دے کر حکم دیا کہ وہ دریائے نیل میں دمیانہ کو روکیں۔ تنیس میں وصیف قاطرمیز کا مقابلہ دمیانہ سے ہوا، جس میں ہارون کے امیر البحر کو شکست ہوئی اور دمیانہ نے تنیس میں داخل ہو کر اہل شہر کو امان دی اور سکون پیدا کیا۔[۲۵۶]

ایک طرف یہ ہو رہا تھا، اور دوسری طرف ہارون اپنے اعمام اور اہل و عیال کو لئے عباسہ میں مقیم تھا۔ لیکن بیکاری کی وجہ سے فوج کے سپاہی روز بروز بددل ہوتے جا رہے تھے، اور لازمی طور پر شر و فساد کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ فوج کی تعداد

---

[۲۵۵] ابن الاثیر ج ۷ ص ۱۷۵ + ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۱۰ + الکندی ۲۴۲ +

[۲۵۶] ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۷۶ + ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۱۰ + ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۱۱۶ + الکندی ص ۲۴۴-۲۴۶ +

میں بھی برابر کمی ہوتی جارہی تھی۔ لیکن ہارون دنیا وما فیہا سے غافل لہو ولعب میں مشغول تھا۔ اب یہاں ابن تغری بردی[257] نے تین روایتیں بیان کی ہیں۔ ہارون کے اعمام کو اپنی اپنی جان کا خوف تھا۔[258] آخر عدی اور شیبان ابنا احمد بن طولون نے اس کے قتل کا فیصلہ کیا، اور ۱۹ صفر ۲۹۲ھ کو اسے مدہوشی کی حالت میں قتل کر دیا۔ ایک اور روایت سبط بن الجوزی کی کتاب سے نقل کی گئی ہے کہ جو فوج اب ہارون کے پاس باقی رہ گئی تھی اس کے سپاہیوں میں عصبیت کی وجہ سے مختلف اقوام کے گروہوں میں فساد اور جنگ تک نوبت پہنچی۔ ہارون بذات خود اس شورش کو فرو کرنے کے لئے نکلا اور مغاربہ کے ایک سپاہی کے تیر سے قتل ہوا۔ تیسری روایت یہ ہے کہ مصر کے قریب پہنچ کر محمد بن سلیمان نے ہارون کو لکھا کہ خلیفہ مکتفی نے اسے مصر کا حاکم مقرر کیا ہے۔ اور ہارون کو دربار خلافت میں حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔ ہارون جنگ کا فیصلہ کر چکا تھا، مگر قواد کو یہ شبہ ہوا کہ وہ آخر میں خیانت کر کے انھیں چھوڑ دے گا۔ اس لئے ایک خادم نے اُسے قتل کر دیا۔

۲۰ صفر ۲۹۲ھ کو ابوالمقانب شیبان بن احمد بن طولون ہارون کا جانشین ہوا، اور ۲۳ کو واپس فسطاط پہنچا۔ لیکن خمارویہ کے ان قواد کو جو اب تک باقی رہ گئے تھے، اور جن میں طُغج بن جُف بھی شریک تھا، ہارون کا قتل ناگوار گزرا۔ انھوں نے حسین بن حمدان بن حمدون کو، جو محمد بن سلیمان کے ممتاز مشیروں میں تھا، لکھا کہ ان کے لئے امان حاصل کرے اور اُسے فسطاط آنے پر آمادہ کرے۔ اب محمد بن سلیمان کے لئے راستہ بالکل صاف تھا۔ ایک طرف سے تو وہ فسطاط کی طرف بڑھا اور دوسری طرف سلخ صفر ۲۹۲ھ کو دمیانہ دریائے نیل کے راستے سے فسطاط پہنچا۔ یکم ربیع الاول کو شیبان نے آخری جد وجہد کے لئے عین شمس میں

---

[257] النجوم الزاہرہ۔ ج ۲ ص ۱۱۶ – ۱۱۹ + ۱۴۱۔

[258] الکندی ص ۲۴۶ +

اپنی چھاؤنی قائم کی۔ لیکن اب لوگ عام طور پر امان حاصل کر کے محمد بن سلیمان کے ساتھ شریک ہوتے جارہے تھے۔ شیبان نے مقابلہ بے سود جان کر اپنے اور اپنے بھائیوں کے لئے امان طلب کی اور جمعرات کے دن یکم ربیع الاول ۲۹۲ھ کو محمد بن سلیمان فسطاط میں داخل ہوا۔[۲۵۹] شیبان کی مدت حکومت صرف بارہ دن ہے۔

فسطاط میں داخلے کے بعد محمد بن سلیمان کی فوج میں جو خراسانی عرب شریک تھے انھوں نے عوام الناس کے گھروں میں گھس کر انھیں لوٹا، اور ہر قسم کے جرائم و معاصی کے مرتکب ہوئے جو قیاس میں آسکتے ہیں: "وفعلوا فی مصر مالا یحل اللہ من ارتکاب المآثم"[۲۶۰] فتح کی خبر جب بغداد پہنچی تو وہاں سے حکم آیا کہ تمام آل طولون کو گرفتار کر لیا جائے۔ ان کی تعداد دس سے بیس تک بیان کی گئی ہے۔ انھیں بغداد لایا گیا اور ابن صاعد کے گھر میں قید کر دیا گیا۔ صرف اسی پر اکتفا نہ کر کے احمد بن طولون کا عظیم الشان میدان جلا دیا گیا۔ بدر الحمامی کو دمشق کا والی مقرر کیا گیا، اور ابن ابالی کو گرفتار کر کے محمد بن سلیمان نے اس سے پانچ لاکھ دینار وصول کئے۔ لیکن آل طولون —— لم یبق بمصر منهم احد یذکر وخلت منهم الدیار وعفت منهم الآثار وتعطلت منهم المنازل وحل بهم الذل بعد العز والتطرید والتشرید بعد اجتماع الشمل ونضرة الملك ومساعدة الایام

فاصبحوا لا ترى الا مساكنهم   كانها من زمان غابر ذهبا[۲۶۱]

---

۲۵۹ الکندی ص ۲۴۶، ۲۴۷ + کتاب التنبیہ والاشراف ص ۳۷۳ +

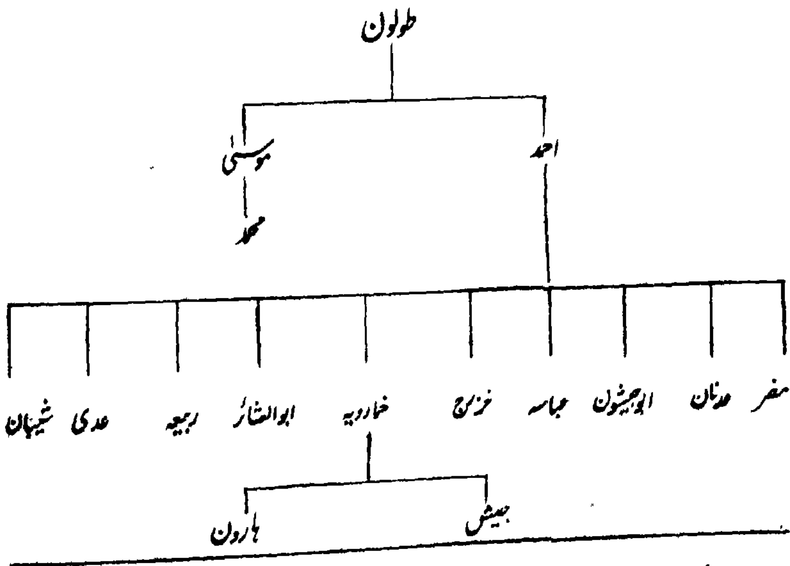
۲۶۰ ابن تغری بردی ج ۲ ـ ص ۱۴۵ +

۲۶۱ ابن الاثیر ج ۷ ـ ص ۱۷۶ + ابن خلدون ج ۴ ـ ص ۳۱۰ + ابن تغری بردی ج ۲ ـ ص ۲۴۸ ـ ۲۴۹ +

طبری ج ۱۱ ـ ص ۳۹۲ +

اس طرح سینتالیس سال اور چند مہینے کی ولایت کے بعد آل طولون کا یہ عبرتناک انجام
ا۔ بیکر[۲۶۲] نے تعجب ظاہر کیا ہے۔ اور اس کے لئے یہ سیاسی مظہر ناقابل فہم ہے کہ کس طرح خلافت
عباسیہ کی تباہی کے بغیر طولونی سلطنت قائم ہوگئی۔ لیکن اوپر کے صفحات میں ہم نے دیکھا ہے کہ
طولونی "سلطنت" کبھی قائم ہی نہیں ہوئی، اور باوجود خلافت کی ابتر حالت کے قانون
ور سیاسی دستور برابر اپنا کام کر رہے تھے، اور آل طولون خلیفہ کے مقرر کئے ہوئے
الیان مصر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ ہر فریق خلاف قانون قدم اٹھانے
سے محترز تھا، اور آل طولون میں خودمختاری کا شائبہ تک نہیں تھا۔ خلافت وسلطنت
کا سوال کم از کم مصر میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ ایسی حالت میں سوائے اس کے اور کیا ہوسکتا
ہے کہ ہم بیکر جیسے عالم کے تعجب پر تعجب کا اظہار کریں۔

آل طولون کا شجرۂ نسب



---

۲۶۲ بائی ترگ ص ۱۸۹ +

لٹریچر:

ابن الاثیر، ابوالحسن علی بن عبدالکرم محمد بن عبدالکریم بن عبدالواحد الشیبانی المعروف بہ ابن الاثیر الجزری الملقب بعزالدین: تاریخ کامل ۔ج ۷، مطبوعہ مصر۔

ابن تغری بردی، جمال الدین ابی المحاسن یوسف ابن تغری بردی الاتابکی، النجوم الزاہرہ فی ملوک مصر والقاہرہ۔ لیدن ۱۸۵۵ء۔ ج ۱، ۲ +

ابن ایاس، محمد بن احمد بن ایاس الحنفی المصری: بدائع الزہور فی وقائع الدہور۔ جلد اول بولاق ۱۳۱۱ھ۔

ابن عساکر، ابوالقاسم علی بن حسین بن ہبۃ اللہ بن عبداللہ بن الحسین ابن عساکر الشافعی: تاریخ الکبیر ج ۲، ۴، ۵۔ دمشق ۱۳۳۲ھ۔

ابن خلدون، عبدالرحمٰن بن خلدون المغربی: کتاب العبر و دیوان المبتدا والخبر۔ طبع بولاق۔ ج ۳، ۴۔

ابن الطقطقی، محمد بن علی بن طباطبا المعروف بہ ابن الطقطقی: الفخری۔ مصر ۱۳۳۹ھ۔

ابن خلکان، قاضی احمد الشہیر بہ ابن خلکان: وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان۔ ج ۱، مصر ۱۳۱۰ھ۔

ابن حوقل، ابوالقاسم ابن حوقل: کتاب المسالک والممالک۔ لیدن ۱۸۷۲ء۔

ابن جبیر: رحلۃ۔ مصحح ولیم رائٹ (اوقاف گب)

ابوالفداء، عمادالدین اسماعیل ابی الفداء: کتاب المختصر فی اخبار البشر۔ ۴ جلدین۔ مصر ۱۳۲۵ھ۔

السیوطی: جلال الدین السیوطی الشافعی: تاریخ الخلفاء۔ مصر ۱۳۵۱ھ۔

———— حسن المحاضرۃ فی اخبار مصر و القاہرہ۔ جلد اول و دوم مصر ۱۳۲۱ھ۔

الشریف الادریسی: صفۃ المغرب و ارض سودان و مصر و الاندلس۔ لیدن ۱۸۶۶ء۔

الطباخ الحلبی، محمد راغب بن محمود بن ہاشم الطباخ الحلبی: اعلام النبلاء بتاریخ حلب الشہباء۔ جلد اول حلب ۱۳۴۲ھ۔

الطبری، ابو جعفر محمد بن جریر الطبری: تاریخ الرسل و الملوک۔ ج ۱۱ مطبوعہ مصر۔ الطبعۃ الاولیٰ۔

القلقشندی، ابو العباس احمد القلقشندی: صبح الاعشیٰ۔ جلد ۳۔ قاہرہ ۱۳۳۲ھ۔

الکندی، ابو عمر محمد بن یوسف الکندی المصری: کتاب الولاۃ (اوقاف گب) بیروت ۱۹۰۸ء۔

محمد کرد علی: خطط الشام۔ جلد اول۔ دمشق ۱۳۴۳ھ۔

المسعودی: ابو الحسن علی بن الحسین بن علی المسعودی: کتاب التنبیہ والاشراف۔ لیدن ۱۸۹۴ء

———— : مروج الذہب و معادن الجوہر۔ مصر ۱۳۰۳ھ۔

المقدسی، شمس الدین ابی عبد اللہ محمد بن احمد بن ابی بکر البنّار الشامی المقدسی۔ المعروف بالبشاری: احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم۔ لیدن ۱۸۷۷ء

المقریزی، تقی الدین احمد بن علی عبد القادر بن محمد المعروف بالمقریزی:

کتاب الخطط و الآثار۔ ۲۔ جلدیں بولاق ۱۲۷۰ھ۔
ناصر خسرو : سفر نامہ۔ مطبعۂ کاویانی۔ برلین ۱۳۴۱ھ۔
الیافعی، ابوعبداللہ بن اسعد بن علی بن سلیمان عفیف الدین الیافعی :
مرأۃ الجنان و عبرۃ الیقظان۔ چار جلدیں حیدرآباد دکن ۱۳۳۷ھ
الیعقوبی، احمد بن ابی ایوب جعفر بن وھب ابن واضح الکاتب العباسی
المعروف بالیعقوبی : تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ لیدن ۱۸۸۳ء۔

Becker, Carl H., Beitrage zur Geschichte Agyptens unter den Islam. Strassburg, 1903. (Die Stellung der Tuluniden).

Creswell, K.A.C., Early Muslim Architecture (Umayyads, Early Abbasids, and Tulunids). Part II. Oxford, 1940.

Goldziher, Ignaz, Muhammedanisohe Studien, 2 Vols. Halle, 1890.

Lane-poole, Shanely, History of Egypt in the Middle Ages. London, 1914.

Le Strange. Guy. Palestine under the Muslims. London, 1890.

Weil, Gustao, Geschichte der Chaliphen, vol. II. Mannheim, 1848.

جمہور کا زمانہ

از

جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب، پرنسپل، جامعہ ملیہ، دہلی

(یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو سے ۲۲ر جنوری ۱۹۴۲ء کو نشر کی گئی تھی)

آدمی نے اس دنیا میں جب سے قدم رکھا ہے پیٹ کی چاکری سے فرصت کبھی نہیں ملی۔ اس کی خاطر ہمیشہ طرح طرح کے جتن کرنے پڑے ہیں۔ بعض لوگ تو کہتے ہیں کہ اسی جتن کرنے سے اِس کی زندگی کا کوئی خاص رنگ بنتا ہے۔ اسی سے اس کی سماج کا کوئی خاص ڈھنگ قایم ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ اسے نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ زندگی کی شکل آدمی کے خیالوں سے بنتی ہے۔ اس کے ارمانوں اور آرزوؤں سے بنتی ہے۔ یہ پیٹ کی فکر چاکر ہے۔ زندگی آقا ہے۔ وہ غمِ روزگار سے غمِ عشق کو اونچا درجہ دیتے ہیں۔ لیکن پھر بھی غمِ روزگار سے آزاد کون ہے۔ یہ پیٹ کا چکر، یہ رہنا سہنا، یہ کھانا پینا، خادم ہو کہ آقا سبب ہو کہ نتیجہ، ہیں اس کے چکر میں سب۔ ہاں اس کا انداز کبھی کچھ ہوتا ہے کبھی کچھ۔ اور اس میں عام انسانوں کے میلانوں، ان کے ارادوں، ان کی عادتوں، ان کی فکروں اور بے فکریوں، ان کی طبیعت کے جمود اور ان کے مزاج کی طغیانیوں کا بڑا اثر ہوتا ہے۔

مثلاً دنیا کی تاریخ میں چند آخری صدیوں کو چھوڑ دیجئے اور سرمایہ داری سے پہلے کے دور پر نظر ڈالیئے تو آدمی کی ساری معاشی زندگی میں باوجود اس کی رنگا رنگی کے ایک بات برابر نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ آدمی ابھی قدرتی آدمی ہے۔ ایسا جیسا کہ خدا نے اسے

بنایا تھا۔ ابھی اپنے کو اپنے سر پر نہیں سادھتا۔ نہ دونوں ہاتھوں سے دوڑتا یا اڑتا ہے۔ بلکہ اپنے پیروں پر جم کر کھڑا ہوتا ہے اور ابھی انھیں سے چلتا پھرتا ہے۔ بیشک یہ بھی پیٹ کے چکر میں گھرا ہوا ہے۔ مگر اس چکر کا مرکز ابھی یہ خود ہی ہے۔ اس کے معاشی آرتھک کاموں کا تعلق ابھی اسی کی ضرورتوں اور احتیاجوں سے ہے۔ کوئی پوچھے کہ احتیاج کی بھلا حد کیا۔ سو یہ قدرتی انسان اسی کی حد بھی یوں مقرر کر لیتا ہے کہ ہر فرقہ ان احتیاجات کا یقین نہیں کرتا بلکہ زمانے کے ساتھ وہ گروہ کر دیتا ہے جس میں اسے زندگی کاٹنی ہے۔ بس ہم چشموں کی طرح زندگی گزر جائے۔ یہ اس کا ارمان ہے۔ بیشک مختلف گروہوں کا طور طریقہ، رہن سہن الگ الگ ہے۔ امیر کا اور ہے، اور شریف کا اور۔ تاجر کا اور۔ دستکار کا اور، کسان کا اور۔ مگر سب کو اپنے اپنے گروہ کا معیار بھاتا ہے۔ جسے اس سے زیادہ کا لالچ ہو وہ عام کاروبار کو اس کے لئے کام میں نہیں لاتا۔ اس فالتو دولت کی تلاش کاروبار سے باہر ہی کی جاتی ہے۔ کوئی گڑے خزانوں کے کھوج میں لگ جاتا ہے۔ کوئی جادو طلسمات اوراد و وظائف کی مدد سے دولت پانے کی راہیں نکالتا ہے۔ کوئی کیمیا بنانے لگتا ہے۔ کاروبار سے بس وہی حیثیت کے مطابق زندگی گزارنا مقصود ہے۔ کام چونکہ بس اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہے۔ اس بے حساب کتاب کا بھی کچھ بہت زور نہیں۔ بس تقریباً یہ کام چل جاتا ہے۔ کام کی رفتار میں کچھ بدحواسی نہیں۔ مزے مزے میں آہستہ آہستہ جلدی کا کام شیطان کا۔ چھٹی کا ذرا بہانا ملا۔ اور چھٹی۔ کام چونکہ شخصیت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس لئے شخصی تجربہ اور روایت پر مبنی ہے۔ جیسے اوروں کو کرتے دیکھتے ہیں۔ اسی طرح کرتے ہیں جیسا بزرگوں سے ہوتا چلا آیا ہے، ویسا ہی برابر ہوتا ہے یہ نہیں کہ ضرورت بے ضرورت عقل پر زور دے دے کر نئی نئی تدبیریں سوچی جائیں۔ زندگی باوجود ساری تبدیلیوں کے ابھی قدرتی انسانی زندگی ہے۔ بوجھل، باوقار، پرسکون۔

لیکن انسانی دنیا میں اگر ساحل کا سا سکون ممکن ہے تو سمندر کا سا طوفان بھی

ں میں آسکتا ہے۔ نہ جانے کیا کیا اسباب ملے کہ معاشی زندگی کا یہ سکون بے تابی میں بدلا۔ جماعت ٹوٹی۔ اور فرد فرد ہو گئی۔ ضرورت کی جگہ نفع کا بھوت انسان کے سر پر سوار ہو گیا۔ چنگاریاں تو ظاہر ہے پہلے سے موجود ہونگی۔ مگر نہ جانے کیا ہوا چلی کہ یہ بھڑک اٹھیں روپے کا لالچ۔ خالص روپے کی آرزو۔ حوصلہ مندی، نئی نئی ایجادوں کا ولولہ، حساب کتاب پر زور، عقل کی فرمانروائی، سب نے مل کر وہ ذہنیت عام کر دی، جس نے سرمایہ داری کے نفع پرست نظام کی بنا ڈالی۔ اور اسے دیکھتے دیکھتے سفری دنیا پر مسلط کر دیا۔ روایت کی جگہ عقل نے لی۔ صنعت بھی عقلی بنی اور کام کرنے کے طریقوں میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ نئی نئی کلیں نئے نئے اسلوب کار ایجاد ہوئے۔ زندہ فطرت چونکہ نامی قانونوں کی پابند ہے۔ اس پر وقت اور جگہ کی جو پابندیاں ہیں وہ اس نئی ہر آن منقلب صنعت پر گراں گزریں تو اُس نے بیل اونٹ اور گھوڑے کی جگہ بھاپ اور بجلی سے کام لیا۔ لکڑی گئی۔ کوئلہ اور لوہا آیا۔ سرسوں کے تیل کی جگہ مٹی کے تیل نے لی۔ پھولوں کی جگہ عطر کوئلے سے نکلنے لگے۔ جہاں تک ہو سکا اس صنعت نے زندگی کو چھوڑ کر مردہ چیزوں سے رشتہ جوڑا۔ نفع طلبی کی ذہنیت اور اس انقلابی عقلی، غیر نامی صنعت نے ملکر دنیا کی کایا پلٹ دی۔ لاکھوں کروڑوں برس کی پونجی جو دنیا نے اپنے سینے میں چھپا رکھی تھی وہ اس نے کھود نکالی اور ساری دنیا میں بکھیر دی۔ آدمیوں کی تعداد میں اتنا اضافہ ہوا کہ یقین نہیں آتا۔ تجارت کو وہ فروغ ہوا کہ عقل حیران ہے۔ پہاڑ کٹے سمندر نپ گئے، ہوا پر قبضہ جم گیا۔ نفع کمانے کے لیے جس انہماک سے تریاق بیچا گیا اُسی سے زہر۔ جیسے بیماروں کو تندرست بنانے کا سامان بنا۔ اسی طرح زندوں کو مارنے کے لیے اسلحہ۔ پھر اس خیال سے کہیں انسانیت کو اپنے اس جنون کا احساس نہ ہو جائے علم نے زندگی کے اس بحران کا ساتھ دیا اور تھپکی دی کہ جس طرح عالم افلاک میں سیارے اپنی راہ پر بلا روک ٹوک چلتے ہیں اور کوئی کسی سے ٹکراتا نہیں، اسی طرح انسانوں پر سے سب پابندیاں اٹھ جائیں۔ اور یہ سب اپنے اپنے نفع اور اپنی اپنی غرض کے پیچھے ہو لیں تو

سب کی اس انفرادی خود غرضی سے ہی کل جماعت کی صلاح کا سامان ہو جائے گا۔ بے وقوف اور ناداں انسان کی مداخلتیں ہی اس قدرتی ہم آہنگی میں خلل ڈالتی ہیں۔ چنانچہ اپنے اپنے نفع کی فکر میں افراد، امیر اور غریب سب جماعتی بہبود سے بے فکر ہو گئے۔ اور سب نے اپنے بس بھر معاشی زندگی کے اس قمار خانے میں اپنی اپنی بازی لگائی۔

مگر یہ صورت زیادہ دن کیسے چل سکتی تھی جس نے کچھ کھویا اسی کو ہوش آیا۔ عوام کو جلد ہی اس کی خرابیاں بھی دکھائی دینے لگیں۔ ترقی کے ساتھ فلاکت نے بھی اپنا منہ دکھایا۔ اور اس ہم آہنگی میں مخالفتوں کی رگڑ بھی سنائی دینے لگی۔ انیسویں صدی کے وسط ہی میں یہ خیال عام ہو چلا تھا کہ سرمایہ داری کا یہ دیو اگر اسی طرح بے روک ٹوک اپنی تباہ کاریاں جاری رکھ سکا تو قیامت ہو جائے گی۔ نفع طلبی کے چکر میں پھنسنے تو پہلے ہی سب قسم کے لوگ تھے مگر ہوتے ہوتے سرمایہ داروں اور مزدوروں کی دو الگ صفیں ہو گئیں۔ دولت پیدا کرنے کا ساز و سامان چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں جمع ہو گیا۔ کم سرمایہ کے کاروبار برباد ہو گئے اور خود مختار دستکار اور کسان بڑے سرمایہ داروں کے دست نگر ہو گئے۔ مختار تھوڑے سے رہ گئے، مجبور بے شمار ہو گئے سستی مزدوری کے لیے عورتیں اور بچے بھی مشینوں پر لگائے گئے۔ گھر ٹوٹے عزیز چھوٹے، بد اخلاقیوں کا ہجوم آدمیوں کے ہجوم کے ساتھ ساتھ بڑھا۔ یہ مصیبتیں تو تھیں ہی۔ اس عقل و فراست کے نظام کی بے عقلیاں بھی سامنے آنے لگیں۔ بازاروں کا چڑھنا اترنا، تجارتی بحرانوں کا تھوڑے تھوڑے عرصے بعد رونما ہونا۔ امیر اور غریب دونوں کی معاشی بنیادوں کو ہلا ہلا دیتا تھا۔ کاروبار کی دنیا گھڑی گھڑی اجڑتی اور پھر نئے سرے بستی تھی۔ ان عیبوں پر نظر پہنچی تو عوام نے اصلاح کی تدبیریں بھی شروع کیں۔ مزدوروں کی انجمنیں بنیں کہ وہ سرمایہ دار کے مقابلے میں بے بس نہ ہوں۔ اتحاد باہمی کی تحریک اٹھی اور اس نے بہت مفید کام انجام دیے۔ لیکن یہ سب جزوی تحریکیں تھیں۔ پورا مقابلہ نہ کر سکتی تھیں۔ کل مرض کے علاج کے طور پر اشتراکیت کا نسخہ تجویز ہوا۔ شروع میں

وعظ و تلقین و تبلیغ سے خیالات کے سدھار کی تدبیر ہوئی۔ مگر مثل ہے "لاتوں کے بھوت باتوں سے کب مانتے ہیں" ہوتے ہوتے اس تحریک نے خصوصاً کارل مارکس کے زیر اثر امیر و غریب، مزدور و سرمایہ دار کے پرے باندھ دئے۔ یہ تحریک چلی تو سب ملکوں میں لیکن بڑے پیمانے پر عملی تجربے کا موقع اسے انقلاب کے بعد روس میں ملا۔ اس تجربے کی خوبیوں اور خرابیوں کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ یہاں صرف اتنا جتانا ہے کہ سرمایہ داری نظام سے عوام کی بیزاری نے ایک بہت بڑے ملک میں ایک دوسرے نظام کی بنیاد ڈال دی۔ اس عملی تجربے کے نتایج کا صحیح اندازہ تو موافقوں اور مخالفوں کے مبالغے کی وجہ سے ذرا دشوار ہے مگر ایک بات تو صاف سامنے ہے کہ اس نظام کے ماتحت بیس سال سے کم میں روس نے اپنے کو ایسا بنا لیا کہ آج جرمنی کی مہیب قوت کا نہایت بہادری سے مقابلہ کر رہا ہے۔ جرمنی کی بڑھتی ہوئی فوجوں کے سامنے یہ قوم جس طرح آہنی دیوار بن کر سینہ سپر ہوئی ہے، جس طرح اس سخت مصیبت میں بھی اس کے اندر ایک غدار (کوُزلنگ) پیدا نہیں ہوا، جس طرح وہ بیس سال سے بے روزگاری کی لعنت سے محفوظ رہی، جس طرح آج بھی اسے فاقے کی دھمکی نہیں دی جا سکتی، جس طرح ایک ابتدائی معاشی حالت سے اُس نے اپنے کو زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ صنعتی ملکوں کا ہمسر بنا لیا، ان سب باتوں سے کم سے کم یہ تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کرنے اور کامیاب زندگی کرنے کا بس ایک ہی اسلوب سرمایہ داری نہیں ہے۔ بلکہ اگر کوئی جماعت اپنی ضروریات فراہم کرنے کے اصول پر اپنے کو منظم کرنا چاہے اور جدید صنعت کی مدد سے اس مقصد کی تکمیل کے درپے ہو تو وہ سرمایہ داری کی طبقہ واری تقسیم، اس کی افراتفری، اس کی بے ترتیبی اور بے نظمی اور اُس کے آئے دن کے بحرانوں سے الگ رہ کر ایک مضبوط معاشی زندگی کی ایسی تنظیم کر سکتی ہے جو اپنے کو اس قابل جانے کہ اس کی حفاظت کے لیے سخت سے سخت دشمن کے مقابلے میں اس کا ہر مرد و عورت اس کا بچہ بچہ اپنی جان کی بازی لگا دے۔

سرمایہ داری کے بنیادی اصولوں پر تنقید اشتراکی خیالات کی ترویج اور پھر انقلاب

روس کے بعد اشتراکیت کے عملی تجربے نے جنگ سے پہلے ہی بہت سے ملکوں کو اپنی معاشی زندگی میں اصلاح کی طرف متوجہ کیا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ کوئی ملک اس پر آمادہ نہ تھا۔ کہ اس نئی زندگی کے لئے اپنی بنی بنائی معاشی زندگی کو پہلے بالکل تباہ و برباد کردے۔ لیکن سب اس طرف مائل تھے۔ انقلاب بغیر مرکزی سیاسی قوت معاشی زندگی کو اپنے قابو میں لے اور عوام کے فائدے کو مدنظر رکھ کر اس زندگی کی سمت بدلے۔ جرمنی میں یہی ہوا، اٹلی میں یہی ہوا، ریاستہائے متحدہ امریکہ میں یہی ہوا۔ دوسرے ملکوں میں بھی قانون سازی کے ذریعے سرمایہ داری کی سختیوں کو زمانہ کی کوشش مدت سے جاری تھی۔ اور اس دیو کو طرح طرح سے جکڑنے کی صورتیں نکالی جارہی تھیں۔ یہ ہو ہی رہا تھا کہ وہ تصادم شروع ہوگیا جس کے دھماکے آج خود ہمارے ملک کے دروازے کے پاس سنائی دیتے ہیں۔ سرمایہ داری کا نظام ایک حد تک خود اس تصادم کا بھی باعث ہے کہ اس کی بے حساب توسیع کے لئے کسی کو خام اجناس درکار ہیں، کسی کو تیار مال کے لئے نئی نئی منڈیاں، کسی کو اپنا سرمایہ لگانے اور نفع کمانے کے لیے میدان۔ لیکن ایک بات اب روز روشن کی طرح ظاہر ہے اور وہ یہ کہ اب انسانیت کی آرزو اس باب میں ایک خاص شکل اختیار کرچکی ہے۔ وہ اب یہ نہیں گوارا کرسکتی کہ دنیا کی دولت آفریں قوت تو بڑھے مگر وہ بھوکی مرے۔ ایک طرف تو امیر ہوں۔ جو یہ نہ سمجھیں کہ اپنی دولت کو آخر کیسے صرف کریں۔ دوسری طرف غریب زندگی کی کمترین ضرورتوں کو ترسیں۔ زمین روز بہ روز زیادہ غلہ اگلے اور انسان بھوکوں مرے۔ کارخانے روز بہ روز زیادہ کپڑا بنا سکیں اور آدمی ننگے پھریں۔ اینٹ چونے سیمنٹ اور لوہے کے خریدار نہ ملیں۔ مگر آدمی بے گھر بے در سرگرداں و پریشان ہو۔ انسانیت یہ گوارا نہیں کرسکتی کہ کبھی کھانے کو ملے بھی تو بھوک کا ڈر برابر سر پر منڈلاتا رہے۔ وہ سمجھنے لگی ہے کہ کام سے زندگی بنتی اور سنورتی بھی ہے۔ اس کا خلا پر ہوتا ہے۔ اِس لئے وہ یہ گوارا نہیں کرتی کہ کام اس کے لئے بس ہمیشہ وبال اور جان کا جنجال ہی ہو۔ غیر دلچسپ بے مقصد اور جہاں تک کام کرنے والے کی نظر میں کام کا براہ راست اس سے تعلق ہے۔ بے نتیجہ۔ وہ یہ گوارا نہیں کرسکتی۔ کہ اس کے

گنتی کے افراد دولت آفرینی کے ذریعوں پر قبضہ حاصل کر کے اسے فوج در فوج اپنا غلام بنا لیں۔ اور ستم ظریفی یہ کہ یہ سب آزادی معاہدہ کی آڑ میں ہو۔ وہ یہ نہیں گوارا کر سکتی کہ وہ کام کو آمادہ ہو اور کام نہ کر سکے۔ وہ نہیں چاہتی کہ خود غرض نفع طلبوں کی غلط اندازیوں کا خمیازہ اسے بیروزگاری اور کساد بازاری کی شکل میں بھگتنا پڑے۔ وہ پھر معشیت کا مرکز انسانی ضرورتوں کو بنانا چاہتی ہے۔ وہ پھر تخیل کی بے نہایتی سے بھاگ کر زندگی کی حدود میں آنا چاہتی ہے۔ وہ پھر نفع طلبی کے قمار خانے سے نکل کر خاندان، گاؤں، شہر، ملک اور انسانیت کی جماعتوں کو بامعنی تعلقات کی دنیا بنانا چاہتی ہے۔ وہ امید کرتی ہے کہ دولت پیدا کرنے کے اہم وسائل اس طرح اور اس پیمانے پر افراد کے قبضے میں نہ رہیں گے کہ وہ دوسروں کی زندگیوں کے مالک بن جائیں۔ وہ چاہتی ہے کہ ان وسایل پر فی الجملہ ہیئت اجتماعی کا قبضہ ہو۔ بے حساب دولت اگر ہو تو بس جماعتی بیت المال میں ہو۔ ہر شخص کو اس کی ضرورت کے لائق ملے۔ اور فی السماء رزقکم کا الٰہی وعدہ دنیا میں نائب الٰہی حکومت کی طرف سے پورا کیا جائے۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ جدید صنعت اور انفرادی نفع طلبی کے میل سے انسانیت اس درجہ اکتا گئی ہے کہ اگر کوئی صورت اصلاح کی نہ بن پڑی تو یہ اس جدید صنعت سے ہاتھ دھوکر چھوٹی چھوٹی غیر مرکزی بستیوں میں ابتدائی قسم کی زندگی گزارنے پر راضی بلکہ آمادہ ہو جائے گی۔ اگر کلوں سے کپڑا بنانے اور ٹریکٹر سے زمین جوتنے اور لوہے سے مکان بنانے کی صورت بس اسی طرح ممکن ہے کہ کچھ پہنیں کچھ ننگے رہیں، کچھ کھائیں کچھ بھوکے رہیں، کچھ محلوں میں رہیں اور کچھ کے سر پر بس آسمان کی نیلی چھت ہو تو وہ ان کلوں پر اپنے پرانے چرخوں اور کرگھوں کو، ان ٹریکٹروں پر اپنے لکڑی کے ہل کو، ان لوہے اور سیمنٹ کے قلعوں پر اپنی پھوس کی جھونپڑیوں کو پھر ترجیح دینا سیکھ لیں گے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ آج دنیا اس قسم کی خاص قومی تحریکوں سے خالی نہیں ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انسانیت اپنی ذہنی فتحمندیوں کو جو صنعت جدید سے عبارت ہیں ترک کیے بغیر افلاس سے بچنے، جماعت کی مستقل طبقاتی تقسیم کو بنانے کا ہر فرد کے لیے دلچسپ

ر باہمی اور فرصت کو خوشگوار بنانے کی تدبیر نکال سکتی ہے۔ اس لئے کہ بہر حال یہ صنعت ایک خادم ے۔ اس سے کام لینے والے تو انسان ہی ہیں۔ اگر ان کا ارادہ واضح ہو جائے اور مؤثر بن جائے ماعتی قابو میں آکر یہی صنعت انسان کی سب سے بڑی مددگار بن سکتی ہے۔ آج عوام کی معاشی زوؤں کو جہاں تک میں سمجھ سکتا ہوں اُن کا رخ یہی معلوم ہوتا ہے اور اس لئے میرا گمان ہے اس جنگ کے خاتمے کے ساتھ ساتھ دنیا میں ملکیت شخصی کے تصور اور تصرف میں ایک بادی تبدیلی رونما ہوگی۔ معاشی زندگی میں امداد باہمی کے اصول کو اور مرکزی ریاستی کاروبار بہت فروغ ہوگا اور شاید بیسویں صدی میں معاشی زندگی کی یہی خصوصیت قرار پائے گی۔

کینیڈا میں ذمہ دار حکومت کا ارتقا

از

پروفیسر شاہ عبدالرشید صاحب۔ ایم اے، ال ال بی شعبۂ تاریخ

وسیاسیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

اس مضمون کا مقصد کینیڈا میں ذمہ دار حکومت کے تاریخی نشو و نما کا تجزیہ کرنا اور یہ بتلانا ہے کہ اس نو آبادی میں ذمہ دار حکومت کے اصول کس طرح تدریجی طور پر اور کم و بیش غیر محسوس طریقے سے کار فرما رہے۔

کینیڈا ۱۷۵۹ء میں انگریزوں کے ہاتھ آیا۔ اور ابتدائی چند سالوں تک اُس کے نظم و نسق کو جنرل مُرے نے فوجی طریقہ پر چلایا۔ ۱۷۵۹ء کے اندازہ کے مطابق وہاں کی کل آبادی ستر ہزار باشندوں پر مشتمل تھی۔ یہ سب کے سب فرانسیسی تھے، جو دریائے سینٹ لارنس کے کنارے بہت ہی قلیل تعداد میں بس گئے تھے۔ اور اُن میں سے زیادہ تر کیوبک اور مانٹریل کے بیچ کے علاقہ میں رہتے تھے۔ ۱۷۶۳ء کے عہد نامۂ پیرس کی رو سے یہ ملک انگریزوں ہی کے قبضہ میں رہا مگر جو لوگ فرانس جانا چاہتے تھے انھیں اس کی آزادی دے دی گئی۔ چنانچہ سرکاری عہدہ دار تو واپس چلے گئے لیکن وہاں بس جانے والوں میں سے بہت تھوڑوں نے اُن کی تقلید کی۔ انگریزوں کی کثیر تعداد میں آمد کی وجہ سے وہاں کی آبادی تیزی سے بڑھنے لگی۔ یہ انگریز زیادہ تر امریکی نو آبادیات ہی سے آئے تھے۔ اس سیلاب کی وجہ سے ایک طرح کی افراتفری پیدا ہو گئی۔ بات یہ تھی کہ فرانسیسی آباد کار سب کے سب

رومن کیتھولک تھے اور نئے بسنے والے انگریز زیادہ تر پروٹسٹنٹ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ زبان، قانون، اور تہذیب کے اختلافات بھی وہاں کی آبادی میں ابھرنے لگے جن سے آنے والے جھگڑوں اور الجھنوں کے اسباب فراہم ہو گئے۔

وہاں کے نظم ونسق کی تنظیم سے متعلق برطانوی پارلیمنٹ کا پہلا قانون ۱۷۷۴ء میں نافذ ہوا۔ قانون کیوبک کی رو سے گورنر کے لئے یہ لازمی قرار دیا گیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ۲۳ اشخاص کی ایک نامزد کردہ کونسل کی مدد سے حکومت کرے۔ اور ان اشخاص کا صوبہ ہی کے باشندے ہونا ضروری تھا۔ صوبہ کی سرحدیں بھی بڑھا دی گئیں۔ اب تک کینیڈا دریائے سینٹ لارنس کے جنوبی جانب تقریباً پچاس میل، اور شمالی جانب قریب ایک سو میل کے چوڑے علاقہ پر پھیلا ہوا تھا۔ اس قانون کی رو سے گریٹ لیکس[۱] کا پورا رقبہ اور جنوب میں مسی سیپی اور اوہیو کی طرف کا وسیع علاقہ کینیڈا کی حکومت میں شامل کر دیا گیا۔ ولیم سن لکھتا ہے:۔

> "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ نے آنے والے امریکی نو آبادیوں کی قیادت کا اندازہ کر لیا تھا کیونکہ اس فیصلہ سے شمالی نو آبادیات کو شمال کی جانب پھیلنے سے روک دیا گیا تھا۔"

جنگ امریکہ ۱۷۷۵ء – ۱۷۸۱ء کے دوران میں کانگریس نے کینیڈا کے تسخیر کی کوشش کی تھی لیکن وہ ناکام رہی۔ بہ حیثیت مجموعی کینیڈا کی آبادی برطانوی تاج کی وفادار اور منحرف نو آبادیات کے اُن مہاجرین کی توجہ کا مرکز بنی رہی، جنھوں نے برطانوی دولت عامہ کے شہریوں کی حیثیت سے اپنے مرتبہ کی قربانی کے مقابلہ میں جلاوطنی کو ترجیح دی تھی۔ جنگ کے ختم ہونے پر سلطنت متحدہ کے وفاداروں کی ایک کثیر تعداد شمال کی طرف ہٹ گئی اور کینیڈا کے تقریباً غیر آباد صوبوں کو بسایا۔ اس طرح جو نقصان امریکہ کو ہوا اُس سے کینیڈا کو فائدہ پہنچا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ کم سے کم ۴۰ تا ۶۰ ہزار باشندے

۱۔ Great Lakes

۲۔

ریاستوں سے برطانوی شمالی امریکہ میں داخل ہوئے اور انھوں نے ابتدائی نوآبادی کے مغرب میں شمالی کینیڈا کی ایک نئی برطانوی نوآبادی قایم کی۔ اس توطن پذیری کی وجہ سے نووا اسکوشیا اور نیو برنزوک کے علاقے بھی آباد ہو گئے۔

انگریزوں کی اتنی کثیر تعداد میں آبادکاری نے ذمہ دار حکومت کے مطالبہ کو بھی کھڑا کر دیا۔ چنانچہ پارلیمنٹ سے اِس مطلب کی کئی ایک گزارشیں کی گئیں۔ تاہم کینیڈا کا مسئلہ دو نسلوں کا مسئلہ تھا۔ "ایک وہ کہ حق رائے دہی سے محروم رکھتے ہوئے دوسرے حصہ کو اس کا حق دینا بہت ہی خطرناک تھا۔ اور دونوں کو ایک ہی نیابتی مجلس میں شرکت کی اجازت دینے کے یہ معنی تھے کہ برطانوی اقلیت کو ہمیشہ کے لیے فرانسیسی اکثریت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے۔" پٹ نے اس گتھی کو سلجھانے کے لئے کینیڈا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور ہر ایک حصہ کو اپنی اپنی نیابتی اسمبلی کے قیام کا حق دے دیا۔ کینیڈا کا دستوری قانون ۱۷۹۱ء میں منظور ہوا۔ اس کی رو سے بالائی اور زیرین کینیڈا کے دو صوبے کر دئے گئے اور ہر ایک میں تاج کی نامزد کردہ ایک ایک کونسل اور باشندوں کی منتخب کردہ ایک ایک اسمبلی قائم کی گئی۔ یہ بھی قرار پایا کہ ایک لفٹننٹ گورنر نامزد شدہ مجلس عاملہ کے ساتھ ہر صوبہ پر اور ایک گورنر اِن چیف پورے ملک پر حکومت کرے گا۔ اسمبلیوں کو محصول بندی کا اہم اختیار تو عطا کیا گیا تاہم انھیں عاملہ کو متاثر کرنے یا اُسے برطرف کرنے کے کسی راست اختیار سے محروم رکھا گیا۔ اس قانون کے تحت کینیڈا میں تقریباً پچاس سال تک حکومت ہوتی رہی۔ ابتدا میں تو قانون کوئی بُری طرح عمل نہیں ہوا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد مشکلات شروع ہو گئیں۔ حقیقت تو یہ کہ خود قانون کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ دشواریوں اور جھگڑوں کا پیدا ہونا لازمی تھا۔

سب سے پہلے تو یہ کہ دو صوبوں میں کینیڈا کی تقسیم کی وجہ سے عداوت اور غیر صحتمند رقابت کا ایک جذبہ پیدا ہو گیا۔ شمالی کینیڈا کی تقریباً تمام خارجی تجارت کو جنوبی صوبہ سے گزرنا پڑتا تھا اور اس سلسلہ میں مستقل جھگڑے ہوا کرتے تھے۔ گو سمجھوتہ کی متعدد بار کوشش

کی گئی لیکن اس وقت تک کچھ نہ ہو سکا جب تک کہ شہنشاہی پارلیمینٹ کے ایک قانون، قانون تجارت کینیڈا ۱۸۲۲ء کے ذریعہ اس کو طے نہ کر دیا گیا۔ اس جھگڑے کی دوسری وجہ جنوبی کینیڈا میں تقابل لحاظ برطانوی عنصر کی موجودگی تھی۔ انگریز اس کو ایک مسلمہ بات سمجھتے تھے کہ جنوبی کینیڈا کی حکومت میں صرف ان ہی کا مفاد سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ابتدا میں تو اس طرز عمل سے زیادہ دشواری نہیں پیدا ہوئی کیونکہ فرانسیسیوں کو اپنے سیاسی مراعات سے بہت ہی کم دلچسپی تھی لیکن جیسے معاشی مفاد بڑھتا گیا ویسے ویسے دونوں فرقوں کی مخالفت اور عداوت بھی نمایاں ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۸۱۰ء میں اس بنا پر گورنر ان چیف کو ایک فرانسیسی اخبار لے کنا دیاں بند کر دینا پڑا۔ شمالی کینیڈا میں امن اور سلامتی نسبتاً زیادہ تھی لیکن وہاں بھی اراضی کے متعلق ناقص حکمت عملی کی وجہ سے تھوڑی بہت بے چینی ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ تھا کہ رشوت ستانون کو اُن سے کہیں زیادہ زمینوں پر قبضہ کر لینے کا موقعہ مل جاتا تھا جنھیں وہ واقعی ترقی دے سکتے ہیں۔ ۱۸۱۵ء کے بعد شمالی کینیڈا میں ایک طرح کی نسلی فرقہ بندی پیدا ہو گئی اور اس میں سلطنت متحدہ کے وہ وفادار، جنھیں اپنے مصائب کا احساس اور بی خدمات پر فخر تھا اور وہ نئے مہاجر جو نپولیانی جنگوں کے بعد بہت بڑی تعداد میں نگلستان سے آ گئے تھے، مبتلا ہو گئے۔ نیز عاملہ کی غیر ذمہ داری کی وجہ سے، جس کا نتیجہ یہ تھا ۔ایک مستقل چندسری راج نے ناجائز اثر اور اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا، مقننہ میں بغض حسد کا پیدا ہو جانا لازمی تھا۔ شمالی اور جنوبی دونوں کینیڈاؤں میں عاملہ اور اسمبلی کے رمیان تعطل تو عام بات ہو گئی تھی۔ اور اُسے دور کرنے کے لیے عارضی چارہ کار اختیار کرنا تا تھا مثلاً جن رقومات کو اسمبلی نے رد کر دیا ہو انھیں شہنشاہی فنڈ سے ادا کیا جاتا تھا۔ ۱۸۳۱ء میں ایک قانون کے ذریعہ مصالحت کی کوشش کی گئی جس کی رو سے تاج کی آمدنی کے ض ذرائع پر کینیڈا کی مقننہ کو اسی امید پر اختیار دیا گیا تھا کہ اس کے بعد سیول لسٹ بھی [illegible]

انکار کر دیا گیا اور ۱۸۳۴ء میں پاپینیو کے زیر ہدایت اسمبلی نے ۹۲ قرار دادیں منظور کیں جن میں اپنی شکایات پیش کی گئی تھیں اور ان کے دور کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ان شکایات کو ٹھکرا دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاپینیو اور اس کے حامیوں نے بغاوت کر دی۔ اسی طرح شمالی کینیڈا میں بھی میکنزی کی قیادت میں مصلحین کی ایک جماعت اسمبلی میں منظم کی گئی اور اس نے اس کا مطالبہ شروع کیا کہ عاملہ کے وزراء کو اسمبلی کے سامنے ذمہ دار قرار دیا جائے۔ اس وقت حکومت کے حقیقی اقتدار پر سیاست کاروں کی ایک چھوٹی سی متحد جماعت قابض تھی۔ اور ان سیاست کاروں نے عاملہ اور قانون ساز مجالس کی نشستوں کا تقریباً اجارہ لے رکھا تھا۔ اسی وجہ سے یہ جماعت ایک خاندان کے لقب سے مشہور تھی۔ اُس کے مفادات لازمی طور پر رجعت پسند تھے۔ چنانچہ جب اُس نے اصلاحی جماعت کے مطالبات کی مخالفت کی تو نتیجہ آخر کار ۱۸۳۷ء میں ایک اصلاحی بغاوت کی صورت میں نمودار ہوا۔

اس طرح ۱۸۳۷ء میں شمالی اور جنوبی دونوں کینیڈا میں بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔ فوجی کوشش کے اعتبار سے تو یہ شورشیں نہایت ہی کمزور تھیں۔ جنوبی کینیڈا میں وہ ایک مہینے کے اندر اندر ختم ہوگئیں اور شمالی کینیڈا میں تو وہ ایک ہفتہ سے کچھ ہی زیادہ چل سکیں تاہم سیاسی مظاہروں کی حیثیت سے یہ بغاوتیں موثر اور کارگر ثابت ہوئیں۔ کیونکہ ان کی وجہ سے نوآبادیاتی حکمت عملی کا مسئلہ انگلستان کے مدبروں کے لئے اہم ترین بن گیا۔ ملبورن وزارت کے جوشیلے رکن لارڈ جان رسل نے کینیڈا کے مسئلہ کی مکمل تحقیقات کی ضرورت محسوس کی اور خوش قسمتی یہ تھی کہ اُس نے انجمن آبادکاری کے ارکان کو اس طرف متوجہ کر لیا جو ویکفیلڈ، جیمس مِل، ٹورنس، بلر، مولسورتھ، وہیٹلے اور لیمٹن (جو بعد میں پہلا ارل آف ڈرہم ہوا) جیسے اشخاص پر مشتمل تھی۔ لارڈ ڈرہم کینیڈا کا ہائی کمشنر اور گورنر ان چیف مقرر کیا گیا اور اس ہدایت کے ساتھ بھیجا گیا کہ وہ برطانوی شمالی امریکہ کی صورت حال کے متعلق ایک رپورٹ پیش کرے۔

کینیڈا کو لارڈ ڈرہم کا مشن غالباً تنہا واقعہ ہے جو برطانوی شہنشاہی کی تاریخ میں

سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ہم نے اُسے "مشن" اس لئے کہا ہے کہ لارڈ ڈرہم نوآبادی کے گورنر کی حیثیت سے گیا بھی تھا تو اُس کے فرائض کا یہ پہلو شمالی اور جنوبی کینیڈا کی بے چینی کے متعلق رپورٹ پیش کرنے اور اُس بے چینی کو دور کرنے کے اہم کام کے مقابلہ میں کم اہمیت رکھتا تھا۔ پھر یہ کہ لارڈ ڈرہم صرف تنہا نہیں گیا بلکہ اس کے ساتھ انجمن آباد کاری کے دو اور ساتھی بھی تھے ــــ ویکفیلڈ اُس کی مجلس عاملہ کے رکن کی حیثیت سے اور بُلر اس کے پرائیوٹ سکریٹری کی حیثیت سے لارڈ ڈرہم کے مشن کے نتایج دوررس ثابت ہوئے۔ درحقیقت اسے قلمروؤں میں ذمہ دار حکومت کے نشوونما کا نقطہ آغاز کہا جاسکتا ہے۔ لارڈ ڈرہم کا زمانہ حکومت کامیاب نہیں رہا۔ ایک جماعتی سازش کی وجہ سے جو اُس کے شخصی دشمن لارڈ برہم نے شروع کی تھی، اُسے سال کے ختم ہونے سے پہلے ہی مستعفی ہو جانا پڑا۔ تاہم وہ کینیڈا میں اتنا عرصہ گزار چکا تھا جو اُس کی مشہور رپورٹ کے مرتب کرنے کے لیے کافی تھا۔ اور اُسے ڈرہم نے "حکومت کو متنبہ پاکر جس سے رپورٹ پیش کرنے کے معاملہ میں جھگڑا ہو گیا تھا" انگلستان جاتے ہی چھپوا دیا۔

اکثر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ڈرہم رپورٹ نے کینیڈا کے لیے مکمل ذمہ دار حکومت کی سفارش کی تھی۔ اس لئے یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ مفروضہ صرف جزوی طور پر درست ہے۔ لارڈ ڈرہم اور اس کا سکریٹری چارلس بُلر دونوں کینیڈائی مسئلہ کو ایک بنیادی مفروضہ پر جانچ رہے تھے۔ وہ یہ کہ "نوآبادیاتی حکومت اصل میں بلدی حکومت ہے یعنی وہ مقامی نظم و نسق کی ایک توسیع یافتہ شکل ہے۔" نوآبادیانی رتبہ کا یہ تصور درحقیقت انجمن آباد کاری کے جملہ نمایندوں کی تحریروں سے اکثر و بیشتر ظاہر ہوتا رہا ہے۔ یہ غلط تصور اُس زمانے میں ایک حد تک واقعی حق بجانب بھی تھا۔ کیونکہ اس وقت کینیڈا میں کوئی قومی جذبہ اور سیاسی بیداری کا کوئی ایسا تصور بیدار نہ تھا جس کی بنا پر سیاسی تنظیم کی کسی نمایاں اسکیم میں شرکت کا مطالبہ کیا جاتا۔ ایک عرصہ کے بعد تو یہ بلدی مماثلت بلاشبہ غلط اور ناکافی

ثابت ہوئی لیکن اُس وقت کینیڈا کے لیڈروں کے مطالبات بھی صوبائی خود اختیاری کی ایک معین شکل تک ہی محدود تھے اور مستقبل کے نشو ونما کا اندازہ بالکل نہیں کیا گیا تھا۔ لارڈ جان رسل بالنظر بے شک دوررس تھی۔ تب ہی اس کا یہ ادعا تھا کہ شہنشاہی اقتدار اعلیٰ صرف اُسی صورت میں محفوظ رہ سکتا ہے جب کہ جملہ اختیارات کا مرکز پارلیمنٹ ہو۔ ورنہ "ایسے ملک کو ایک دفعہ خود اختیاری دے دینے کے بعد جو اِس قدر دور ہو کہ اُس پر موثر پابندی عاید نہ کی جا سکتی ہو، وہ قومی آزادی ہی کی شکل اختیار کرلے گی"۔ ڈزرائیلی کی بھی، جو ایک بے تخیل ملک کا صاحب تخیل مدبر تھا یہی رائے تھی۔ اُس نے ۱۸۵۲ء میں لارڈ ڈربی کو ایک خط میں لکھا تھا کہ نوآبادیاتی مصلحین

"صرف بلدی اصول میں منہمک ہیں اور ایک امپائر کا اس غلط فہمی میں خاتمہ کر رہے ہیں۔ جسے وہ مقامی حکومت کہتے ہیں"۔

واقعہ یہ ہے کہ برطانوی شہنشاہی کے کسی تابع[1] میں بھی ذمہ دار حکومت کے قیام کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اُس سے دوہرے تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک تو گورنر اور نوآبادیاتی وزرات اور پارلیمنٹ کا تعلق، دوسرے بہ مجموعی طور پر نوآبادیاتی حکومت، اور برطانوی حکومت کا تعلق۔ لارڈ ڈرہم نے اپنے آپ کو صرف پہلے ہی تعلق کے غور و خوض اور اس کے متعلق سفارشات پیش کرنے تک محدود رکھا تھا اور دوسرے پہلو پر اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔

جب تک گورنر کو اپنے دورِ حکومت کی پالیسی پر قابو رہا، اس وقت تک نوآبادیاتی اختیارات کا عام سوال اپنی انتہائی شکل میں شاذ و نادر ہی پیدا ہوا کیا۔ مگر جب گورنر نے اسمبلی کے مطالبات کی مخالفت کی تو ـــــ بجائے نوآبادیاتی محکمہ کے ـــــ اُس پہلے

---

[1] Dependency

شروع ہو گئے۔ حالانکہ اُسے اُن کے مطالبات کو تسلیم کر لینے کا کوئی حقیقی اختیار حاصل ہی نہ تھا۔ اگر وہ اسمبلی کو اس دائرہ میں قدم رکھنے کی اجازت دیتا جو شہنشاہی فیصلہ کے لیے مختص تھا، تو اُسے فوراً واپس بلا لیا جاتا۔ اس طریقہ کو ختم کر دینے کے لیے لارڈ ڈرہم نے سفارش کی تھی کہ گورنر کو یہ ہدایت کی جائے کہ وہ ایسے وزراء کو چُنے جن پر نوآبادیات کی اسمبلی کو اعتماد ہو اور اپنی حکمت عملی میں اسمبلی کا تعاون حاصل کرے"۔ اس طریقہ کے خاتمہ نے نئے مسائل پیدا کر دئے۔ جب پالیسی کے تعین کا حق گورنر سے وزراء کے ہاتھ میں چلا گیا تو انھوں نے گورنر کی بجائے اسمبلی کی تائید اور منظوری کو مقدم قرار دیا اور اس کے بعد تو اُن امور پر بھی یکے بعد دیگرے حملے شروع ہو گئے جو شہنشاہی حکومت کے لئے مختص تھے۔ نوآبادیات آہستہ آہستہ قومیں بننے لگیں اور قومی اقتدار و اختیارات کا مطالبہ شروع کر دیا۔

اپنی رپورٹ کے تیار کرنے میں ڈرہم نہ صرف اس دوسرے تعلق کو سمجھنے سے قاصر رہا بلکہ پہلے تعلق کے متعلق بھی اس کی بصیرت ادھوری اور غیر سائنٹفک تھی۔ اس کی یہ سفارش بہت ہی عام اور غیر معین تھی کہ اسمبلی کے ساتھ گورنر کا تعلق ویسا ہی ہونا چاہئے جیسا برطانیہ عظمیٰ میں تاج کا پارلیمنٹ کے ساتھ ہے لیکن انگلستان میں پارلیمنٹ سے تاج کا تعلق ہر زمانے میں بدلتا رہا ہے ۱۸۳۸ء میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ تاج کو غیر واضح حالات میں حکومت کو برطرف کر دینے کا اختیار ہے لیکن اب اُسے ایسا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے اس کے علاوہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ڈرہم کے پیش نظر انگریزی نمونہ کی متحدہ "کابینہ" نہیں بلکہ ایک ایسی وزارت کا تصور تھا جو سررشتوں کے ذمہ دار حکام پر مشتمل ہو۔ انگلستان کے موجودہ کابینی طریقہ حکومت کے مقابلہ میں گورنر کو سررشتوں کے اعلیٰ حکام کی ایک ایسی کمیٹی میں زیادہ مواقع حاصل تھے جس کا ہر رکن اپنے فرایض کی انجام دہی کے لئے اسمبلی کے آگے جوابدہ تو ہو مگر اس شرط کے ذمہ داری کا پابند نہ ہو، جو صرف روکنگھم اور پٹ ثانی کے زمانے سے شروع ہوئی تھی

لارڈ ڈرہم نے وزارتوں کی تشکیل میں جماعت داری تنظیم کی صحیح اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا یہ درست ہے کہ جب ڈرہم نے اپنی رپورٹ لکھی تھی اُس وقت اور اُس کے بعد بھی چند سالوں تک کینیڈا کی پارٹیوں کا ارتقا پورے طور پر عمل میں نہیں آیا تھا، تاہم ڈرہم کے منشا کے متعلق لارڈ جان رسل کی یہ تعبیر نا واجب نہیں معلوم ہوتی کہ وہ گورنر سے، جو اسمبلی کے پسندیدہ وزرا کو خود منتخب کرتا اور ان کے ذریعہ حکومت کرتا ہو، یہ توقع رکھتا تھا کہ اُس کے طرزِ عمل میں مصلحت آمیز غیر جانبداری زیادہ شامل رہے گی۔

بہرحال ڈرہم کی رپورٹ غیر معمولی اہمیت کا ایک دستاویز ہے۔ یہ اُس اصول کا پہلا اور مکمل اظہار ہے جو مختلف ترقی پسند لوگوں کے دماغ میں بہت ہی موہوم طور پر کام کر رہا تھا۔ یہ واضح رہے کہ ڈرہم نے اپنی کوئی ذاتی سفارشات پیش نہیں کیں۔ دونوں صوبوں کے اتحاد کی تجویز ۱۸۱۴ء ہی میں ڈیوک آف کینٹ نے پیش کی تھی۔ نوآبادیات میں ذمہ دار حکومت کا ایک زمانے سے مطالبہ ہو رہا تھا اور کئی سال سے ویکفیلڈ مصلحین اس کی حمایت کر رہے تھے۔ ڈرہم کا سب سے بڑا کارنامہ اُن تجاویز کو صرف عملی سیاست کے میدان میں لانا تھا جنھیں "پہلے ناعاقبت اندیش زعیموں کے بے ربط اور غیر ممکن خیالات سمجھا جاتا تھا"۔ اس تبدیلی کی اہمیت کا اندازہ صرف اُن اعتراضوں کے مطالعہ سے کیا جا سکتا ہے جو لارڈ ڈرہم کی رپورٹ پر اس وقت کے ذمہ دار لوگوں اور اخباروں نے کئے تھے۔ کوارٹرلی ریویو نے "اس کے بر خود غلط مہملات، اس کی طفلانہ نظریہ پرستی، اس کے مسخ شدہ واقعات، غلط استدلال اور لغو تناقضات" پر روشنی ڈالی تھی۔ جان بُل نے اُسے "ڈرہم کی حماقت" کا لقب دیا تھا۔ یہاں تک کہ ٹائمز بھی اس عام لے دے میں شریک تھا۔ صرف انتہا پسند[1] طبقہ نے رپورٹ پر اچھی رائے کا اظہار کیا تھا۔

آج ہم بھی ڈرہم رپورٹ پر تنقید کرتے ہیں لیکن اس کے وجوہ دوسرے ہی ہیں۔ ہم اس پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں کہ اس رپورٹ میں فرانسیسی آباد کاروں کی بُری طرح مذمت کی گئی ہے

---

[1] Radical

ہمیں شہنشاہی اور نوآبادیاتی دائرہ عمل کی اس تقسیم سے بھی اختلاف ہے جو ڈرہم نے تجویز کی ہے۔ اس وجہ سے کہ "عملاً ایک دفعہ کامل ذمہ دار حکومت کے عطا کر دئے جانے پر' نوآبادی کے باشندوں نے بتدریج متعلقہ امور کو بھی اپنے قبضہ میں کر لیا اور برطانیہ عظمیٰ کی حیثیت ایک مقتدر طاقت سے گھٹ کر ایک مساوی حصہ دار کی ہو گئی"۔ لیکن اس وقت جھگڑا یہ تھا کہ آیا نوآبادیات پر جو کہ ہر لحاظ سے ماتحت ریاستیں تھیں' ذمہ دار حکومت کے نظریہ کے اطلاق کی گفتگو مناسب ہے یا نہیں۔ لارڈ جان رسل نے لکھا ہے کہ

"انگلستان کا دستور ایک طویل جد و جہد اور بنیادی کامیابی کے بعد ایک ایسی طرز حکومت اختیار کر چکا ہے جس میں تاج کا خصوصی اختیار مسلمہ ہے گو وہ بغیر مشورہ کے کہیں استعمال نہیں ہوتا۔ . . . . لیکن اگر ہم ایسے رواج کا اطلاق ایک نوآبادی پر کرنا چاہیں تو یہ ہماری غلطی ہو گی۔ . . . . . ہو سکتا ہے کہ گورنر کو ملکہ اور مجلس عاملہ سے جو کہ ایک دوسرے سے کلیتاً اختلاف رکھتے ہیں' ایک ہی وقت میں ہدایتیں اور مشورہ ملے۔ اگر وہ انگلستان سے آنے والی ہدایتوں کی تعمیل کرے تو دستوری ذمہ داری کی مماثلت ختم ہو جاتی ہے اور اگر برخلاف اس کے وہ اپنی کونسل کے مشورہ پر چلے تو پھر وہ ماتحت افسر نہیں رہتا بلکہ ایک آزاد مقتدر حاکم ہو جاتا ہے۔"

اس کے باوجود ڈرہم کے نتایج کو تسلیم کر لیا گیا اگرچہ کہ باقاعدہ طور پر اور فوراً تسلیم نہیں کیا گیا۔ پہلا قدم لارڈ سڈنہم نے اٹھایا جسے لارڈ ڈرہم کے استعفیٰ پر کینیڈا کا گورنر جنرل بنایا گیا تھا۔ فروری ۱۸۴۱ء میں شمالی کینیڈا کی اسمبلی نے ذمہ دار حکومت کا سوال کھڑا کر دیا۔ گورنر جنرل ایسے وقت عوام کے نمایندوں سے ایک طویل بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا جو کہ پچھلے ہنگاموں کے باعث بہت ہی نازک ہو گیا تھا۔ اس لئے اس نے ایک مبہم اور عام جواب یہ دے دیا کہ

"اُسے ملک معظم کے یہ احکام ملے ہیں کہ ان صوبوں کی حکومت کو عوام کی نیک خواہشات

کئے جائیں ان کا وہی احترام کرے جن کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں"۔

اس میں ۱۶ اکتوبر والے لارڈ جان رسل کے ایک مراسلہ سے اور اضافہ ہوا جس سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ اگر عاملہ کو اسمبلی کی اکثریت سے ہمدردی نہ ہو تو وزراء میں تبدیلی کی جائے گی۔ ۳ ستمبر ۱۸۴۱ء کو کینیڈائی حکومت سے متعلقہ پالیسی کو ایک اور باقاعدہ شکل عطا کی گئی۔ اس دن رابرٹ بالڈون نے اس موضوع پر غور و خوض کے لیے اسمبلی کے سامنے کئی ایک قرار دادیں پیش کیں جن میں پورے اور واضح طور پر نو آبادیاتی حکومت خود اختیاری کے نظریہ کی وکالت کی گئی تھی۔ یہ قرار دادیں اُن حدود سے بہت آگے نکل گئی تھیں جہاں تک گورنر جنرل یا شہنشاہی حکومت جانا چاہتی تھی۔ چنانچہ لارڈ سڈنہم نے مسٹر جے ہیرسن کو ہدایت کی کہ کونسل میں قرار دادوں کے ایک اور سلسلہ کے ذریعہ اُن قرار دادوں میں ترمیم پیش کرے۔ یہ قرار دادیں بہ اتفاق آراء منظور ہوئیں۔ اور وہ یہ تھیں :-

"۱۔ یہ کہ صوبہ کی عاملانہ حکومت کا صدر اپنی حکومت کی حدود میں بادشاہ کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے صرف شہنشاہی اقتدار کے آگے ذمہ دار ہے۔ تاہم ہمارے مقامی معاملات کو وہ صوبہ کے ماتحت عہدہ داروں کے توسط اور مدد، مشورہ اور اطلاع ہی سے چلا سکتا ہے"۔

"۲۔ یہ کہ صوبائی پارلیمنٹ کے مختلف شعبوں کے درمیان اُس ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کی غرض سے جو صوبہ کے امن، بہبودی اور اچھی حکومت کے لئے ناگزیر ہے، بادشاہ کے نمائندوں کے وہ اعلیٰ مشیر جن سے بادشاہ کے ماتحت صوبائی حکومت کی تشکیل ہوتی ہے، ایسے اشخاص ہونے چاہئیں جنھیں عوام کے نمائندوں کا اعتماد حاصل ہو۔ اس طرح اس کا یقین ہو جائے کہ عوام کی اُن خواہشات اور مفادات کی، جن کا ہمارے مہربان بادشاہ نے اعلان کیا ہے، ہر موقعہ پر دیانت داری کے ساتھ نیابت اور وکالت ہوتی رہے گی"۔

"۱۴۔ یہ کہ اس صوبہ کے باشندوں کو صوبائی حکومت سے یہ توقع رکھنے کا حق ہے کہ وہ شہنشاہی اقتدار کو دستوری حدود کے اندر اور اُن کی نیک خواہشات اور مفادات کے عین مطابق استعمال کرنے کی پوری کوشش کرے گی"۔

پھر بھی یہ تجاویز بہت مبہم اور غیر واضح تھیں۔ اسی وجہ سے وہ آیندہ بھی ایک حد تک نزاع کا باعث بنی رہیں۔ اُن کی تعبیر جہاں لارڈ سڈنہم کے جانشین سر چارلس بگیٹ نے یہ کی کہ وہ حقیقی ذمہ دار حکومت کے نشو ونما کی اجازت دیتی ہیں وہیں خود سر چارلس بگیٹ کے جانشین سر چارلس مٹکاف نے انھیں رجعت پسندی اور جمود کی حکمت عملی کا آلۂ کار بنا دیا۔ مثلاً جب ۱۸۴۲ء میں اسمبلی کی اکثریت مسٹر ڈریپر کی قدامت پسند اخلاقی حکومت کی مخالف ہو گئی تو سر چارلس بگیٹ نے ان تجاویز کی شرائط کی رو سے اپنا یہ فریضہ سمجھا کہ مخالف گروہ کو حکومت سنبھالنے کی دعوت دے حالانکہ وہ شخصی طور پر اس کی پالیسی کا حامی نہ تھا۔ اُس نے اپنی کونسل کے اجلاسوں کی صدارت تک چھوڑ دی اور وزراء کو کلیتاً اس کا اختیار دے دیا کہ وہ معاملات کو خود اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ لیکن جب ۱۸۴۳ء میں سر چارلس مٹکاف گورنر جنرل مقرر ہوا تو اُس نے فوراً ہی وزراء کے دعوؤں کی تردید شروع کر دی۔ اس کی دلیل تھی کہ لارڈ سڈنہم کا منشا ہرگز یہ نہ تھا کہ حکومت کو مجلس عاملہ کے قبضہ میں دے دیا جائے اور یہ کہ عمومیت اپنی پوری اور مکمل شکل میں انگلستان میں تو بالکل درست ہے لیکن ایک نوآبادی میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اُس نے اپنی پسند کے مطابق تمام پارٹیوں کے بعض لوگوں کی ایک کونسل ترتیب دیدی۔ لیکن اس تجربہ کا نتیجہ خوش گوار نہ نکلا۔ ستمبر ۱۸۴۳ء میں جوں ہی اسمبلی کا اجلاس ہوا، کونسل اور اسمبلی کے تصادم کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ سوائے ایک کے جملہ ارکان کونسل یکے بعد دیگرے مستعفی ہو گئے۔ گورنر جنرل نے اس کی انتہائی کوشش کی کہ اپنی شرائط پر کوئی عمومی وزارت قایم کی جائے لیکن وہ ناکام رہا اور دو سال کے صبر آزما اور نازک دور کے بعد وہ بالآخر دسمبر ۱۸۴۵ء میں کینیڈا سے چلا گیا۔

مٹکاف کے بعد لارڈ کارٹ ہارٹ کے تحت ایک سال تک آمرانہ حکومت کا دور دورہ رہا اس کی وجہ کینیڈا اور ممالک متحدہ کے درمیان تعلقات کی غیر معمولی کشیدگی تھی۔ لیکن جب حالات درست ہوئے تو انگلستان میں یہ محسوس کیا جانے لگا کہ کینیڈا کی حکومت کو "ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں دینے کی ضرورت ہے جسے اس ملک کے دستور کے اصول اور علم کا گہرا علم، عمومی مجالس کا کچھ تجربہ اور اس وقت کے سیاسی مسائل سے کافی آگاہی ہو۔" ایسا شخص لارڈ ایلجن کی ذات میں دستیاب ہوگیا۔ جسے ۱۸۴۷ء کے اوائل میں گورنر جنرل بنا دیا گیا۔ خوش قسمتی سے، انگلستان میں قدامت پسندوں(۱) کا اقتدار اسی زمانے میں ختم ہو گیا تھا اور دھلسن وزارت کے تحت لارڈ گرے نو آبادیاتی امور کا صدر مقرر ہوا تھا۔ اول گرے پہلا انگریز مدبر تھا جسے شہنشاہیت پر سچا اعتقاد تھا۔ اُسی کی رہنمائی میں لارڈ ایلجن اپنے پیشرو کے ہنگامہ خیز وارکے بعد کینیڈا میں "لارڈ ڈرہم کی تجاویز کو مکمل طور پر" بروئے عمل لایا۔

لارڈ ایلجن کے نزدیک ذمہ دار حکومت کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ "وزرا قوم کی مرضی کے مطابق مخالف گروہ سے نکل کر حکومت کے دائرہ میں شریک ہوتے جائیں۔" اس معاملہ میں اُسے نو آبادیات کے وزیر کی پوری تائید حاصل تھی جس نے خود اپنے ایک مراسلہ میں اس کا اس طرح اظہار کیا تھا۔"

"اس طریقۂ کار کی سفارش اس غرض سے کر رہا ہوں کہ تم پر یہ واضح ہو جائے کہ صوبہ میں جو بھی اقتدار ایک پارٹی سے دوسری پارٹی کے ہاتھ میں منتقل ہوگا وہ تمہاری کسی کارروائی کا نہیں بلکہ خود لوگوں کی خواہشات کا نتیجہ ہوگا۔ جیسا کہ اُس دشواری سے پتہ چلتا ہے جس کا تجربہ جانے والی پارٹی کو دستور کی شکل و صورت کے مطابق صوبہ کی حکومت چلانے میں ہوا تھا اس کی میرے پاس بڑی اہمیت ہے۔ اس لئے میں تمہیں ہدایت کرتا ہوں . . . . . ۔"

---

(۱) Tories

اس اصول کو بروئے عمل لانے کا پورا پورا موقعہ لارڈ ایلجن کو دیا گیا۔ برسرِ عہدہ آتے ہی اُس نے اس بات کی کوشش کی کہ موجودہ وزارت کو مختلف اضافوں اور تبدیلیوں کے ذریعہ مستحکم کرے لیکن جب اس میں ناکامی ہوئی تو اُس نے بالآخر اسمبلی ہی کو برخاست کر دیا۔ آئندہ انتخابات میں حکومت کو شکست ہوئی اور جب ایوان کا اجلاس ہوا تو عدم اعتمادی کا ووٹ منظور ہو گیا، اور اس طرح پُرانی وزارت کو مستعفی ہونا پڑا۔ لارڈ ایلجن نے مخالف گروہ کے قائدوں کو طلب کیا اور نئی وزارت تشکیل دینے کی خواہش کی اور کہا کہ "اگر وہ اعتدال اور استحکام سے کام لیں تو ایسی حکومت تشکیل دینے کے اچھے امکانات ہیں جس پر پارلیمنٹ کو اعتماد ہو' اور یہ کہ وہ اس سے ہر مناسب امداد اور تعاون کی توقع رکھ سکتے ہیں" غرض اس طریقے سے کینیڈا کی سیاست میں ذمہ دار حکومت کا اصول مکمل طور پر ظاہر ہوا۔

ذمہ دار حکومت فوراً ہی نہیں مل گئی۔ نوآبادی کے باشندے ایک عرصہ سے برابر سرگرمی کے ساتھ اس کا مطالبہ کر رہے تھے کہ داخلی معاملات میں انھیں پورا اختیار دیدیا جائے۔ قابلِ ذکر اور دلچسپ بات تو یہ ہے کہ یہ اہم تبدیلی ـــــ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تبدیلی نہایت اہم تھی ـــــ خاموشی کے ساتھ اور بغیر کسی قانون سازی کے عمل میں آئی۔ ذمہ دار حکومت سرکاری طور پر کبھی عطا نہیں کی گئی۔ اور جیسا کہ پروفیسر کیتھ نے اپنی کتاب "قلمرون میں ذمہ دار حکومت" میں بیان کیا ہے' اس کا انحصار محض رواج اور عمل پر رہا' اس کی محرک قوت گورنر کا طریقۂ کار تھا۔ اور گورنر کی حد تک بے شک اس کا امکان تھا کہ ایک طرف تو شہنشاہی حکومت اُس کو واپس بلالے اور دوسری طرف یہ بھی ممکن تھا کہ مقننہ کے اس کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دینے کی وجہ سے اس کی حیثیت غیر مستحکم ہو جائے۔

بہرحال ذمہ دار حکومت کو تسلیم کر لینے سے اصول کا تصفیہ تو ہو گیا لیکن اس کے گوناگوں مضمرات کو عملی جامہ پہنانا ابھی باقی تھا۔ خوش قسمتی سے لارڈ ایلجن کینیڈا میں اتنا عرصہ رہ سکا تھا جو اس نئے نظام کو ایک مضبوط بنیاد پر قایم کرنے کے لیے کافی تھا۔

ذمہ دار حکومت کے اصول کا نشاسب سے پہلے گورنر کے مرتبہ میں تبدیلی سے ظاہر ہوا۔ ذمہ دار نظام حکومت کے تحت گورنر نہ تو حکومت کا حقیقی صدر رہ سکتا تھا اور نہ سرپرستی کا ذریعہ بن سکتا تھا جیسا کہ وہ اب تک تھا۔ حالانکہ اُسے اس بنیادی رعب داب میں مبتلا ہونے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لارڈ ایلجن نے اس کو اچھی طرح محسوس کر لیا۔ اس لئے وہ چاہتا تھا کہ صوبہ میں ایک اخلاقی اثر ایسا پیدا کیا جائے جو اس اقتدار کے نکل جانے کی تلافی کر دے، جسے مقامی پارلیمنٹ کے آگے ذمہ دار عاملہ کے حوالے کر دینا پڑا تھا۔" وہ ایک حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔ اُس نے یہ اخلاقی اثر "پارٹیوں کے جھگڑوں سے بلند ہو کر ——— ایک ایسے عہدہ کی وجہ سے جو اس کے وزرائے کے مقابلہ میں زیادہ مستقل تھا۔ اور اُن لوگوں کے مفاد کے سوا جن کے معاملات کے انصرام کی غرض سے وہ مامور کیا گیا تھا جملہ سیاسی اغراض سے بے نیاز ہو کر حاصل کیا۔ اس نے آئندہ کے گورنر کے لئے راستہ صاف کر دیا جس کی حیثیت مادر وطن اور نو آبادی کے درمیان زیادہ تر ایک واسطہ کی بنتی جا رہی تھی اور جو ملک کے حقیقی حکمران کی بجائے نو آبادی کی حکومت کا ایک بلند مرتبت مشیر بننا چاہتا تھا۔

ملک کی حقیقی حکومت اُن وزراء کے ہاتھوں میں آگئی جنہیں اسمبلی میں اکثریت کی تائید حاصل تھی۔ اس کا اظہار پوری طرح اُن واقعات سے ہوتا ہے جو ۱۸۴۸ء ۱۸۴۹ء کے مسودہ نقصانات بغاوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن وفادار باشندوں کو شمالی کینیڈا کی ۱۸۳۷ء والی بغاوت سے نقصان پہنچا تھا ان میں پچھلی حکومتوں نے اس کا معاوضہ دلوایا تھا۔ چنانچہ موجودہ حکومت نے بھی یہ مناسب سمجھا کہ جنوبی کینیڈا کے وفاداروں کو جن کی آبادی زیادہ تر فرانسیسی تھی، اسی قسم کا معاوضہ دلایا جائے۔ مسودۂ نقصانات بغاوت میں بطور معاوضہ ۹۰ ہزار پونڈ کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ یہ رقم دونوں ایوانوں میں بڑی اکثریت کی تائید سے منظور ہو گئی۔ لیکن ٹوریوں نے مسودہ کی شدت کے ساتھ مخالفت شروع کر دی۔ اور برابر اپنے آپ کو کینیڈا میں انگریزی راج کے خاص حامی ظاہر کرتے رہے۔ اسی بناء پر

وہ گورنر سے ہمیشہ اس بات کی توقع رکھتے تھے کہ وہ اس کے معاوضہ میں اُن کے ساتھ خاص سلوک روا رکھے گا۔ انھوں نے لارڈ ایلجن سے دیوانہ وار یہ درخواست کی کہ وہ یا تو مسودہ کو منظور کرنے سے انکار کر دے یا اُسے ٹال رکھے۔ لیکن لارڈ ایلجن کا اندازہ زیادہ صحیح تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے وہ وزرا جنھوں نے مسودہ پیش کیا تھا اپنے جملہ اعمال کے لئے عوام کے سامنے ذمہ دار اور جوابدہ ہیں اور چونکہ یہ معاملہ خالص کینیڈائی معاملہ تھا اس لئے اس نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ اُس کے فیصلہ کا بار شہنشاہی پارلیمنٹ پر ڈالا جائے۔ چنانچہ اُس نے مسودہ منظور کر لیا۔ ٹوری غصہ سے بے قابو ہو گئے۔ اور تشدد کا نہایت ہی شرمناک مظاہرہ کیا۔ انھوں نے پارلیمنٹ کی عمارت لوٹ لی اور خود گورنر پر حملہ کر کے اُس کی توہین کی لیکن اس دوران میں لارڈ ایلجن خاموش ہی رہا۔ اور یہ اُبال بھی آہستہ آہستہ اُتر گیا۔

اس واقعہ کے نتایج بڑے اہم نکلے۔ اس کی وجہ سے مستقل اور قطعی طور پر یہ اُصول مسلم ہو گیا کہ گورنر پر لازم ہے کہ وہ اپنے ذمہ دار وزرا کے مشورہ کو قبول کرے۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ پارلیمانی اکثریت کی وہ آواز، جو ذمہ دار وزرا کی حمایت میں ہو، با اثر وفاداروں کی بیرونی جماعت سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اور یہ کہ آیندہ سے نظم و نسق کو متاثر کرنے یا اس پر نگرانی رکھنے کا فیصلہ کن ذریعہ عوام کی منتخب شدہ مقننہ ہی ہوا کرے گی۔ ضمناً اس واقعہ کا بہت ہی اہم نتیجہ یہ نکلا کہ پُرانی دنیا کا تنفر اور فرقہ واری بندھنیں ٹوٹ گئیں اور کینیڈا میں صحت بخش قومی سیاسی جماعتوں کے ارتقاء میں مدد ملی۔ حکومت کے روایتی طریقہ کے تحت "گورنر" با اثر لوگوں کو پارٹی کے اہم حصہ سے علٰحدہ رکھتے اور انھیں ایک وفادار ٹوری پارٹی سے وابستہ کرنے کی کوشش کرتا تھا" اور اس پارٹی نے واقعی ایک خاندان کی حیثیت اختیار کر لی تھی اس طرح کہ یہ انتہا پسند ٹوری ہر معاملہ میں گورنر کی تائید کرتے اور گورنر اس کے بدلے انھیں ایک مستقل ذی اثر مرتبہ اور اقتدار کا اجارہ دیدیا کرتا تھا۔ اس واقعہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ انتہا پسند ٹوری صرف اسی وقت تک گورنر کی

حمایت کا دم بھرتے رہے جب تک کہ پورے صوبہ کا اثر و اقتدار ان کے اختیار میں رہا۔ اس واقعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ خاندان سیاسی اعتبار سے مفقود ہوتا چلا گیا اور اس کے خاتمہ نے صحت بخش قومیت کی ترقی کی راہ کھول دی جس میں فرانسیسی اور انگریز دونوں شریک تھے اور اس سے زیادہ فطری بنیاد پر جو پہلے کبھی ممکن تھی، سیاسی پارٹیوں کے نشو و نما کے ذرائع مہیا ہو گئے۔ بالواسطہ یہ واقعہ مادر وطن اور نوآبادی کے تعلقات میں ایک نئے انداز کے آغاز کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ٹوری مخالفت اور لارڈ ایلجن کی منظوری کے پورے معاملہ کو شہنشاہی پارلیمنٹ میں زیر بحث لایا گیا۔ لارڈ رسل نے دارالعوام میں اور ارل گرے نے دارالامراء میں ایلجن کی پالیسی کی پُرزور تائید کی اور اس معاملہ میں کینیڈا کے حق قانون سازی کو تسلیم کر لیا۔

ذمہ دار حکومت کے اصول کی ترقی کا دوسرا دور ۱۸۴۷ء میں شروع ہوا۔ اور ۱۸۵۹ء تک بالکل نمایاں ہو گیا۔ کینیڈا کے قانون غلہ ۱۸۴۳ء کی رو سے وہاں کے گیہوں کو برطانوی مارکٹ میں ترجیح حاصل ہونے کے تین سال بعد یعنی ۱۸۴۶ء میں برطانیہ عظمیٰ نے آزاد تجارت کا فیصلہ کیا۔ اہل کینیڈا نے گیہوں کی برطانوی طلب کو پورا کرنے کی غرض سے مشینری کی فراہمی پر پہلے ہی سے کافی رقم صرف کر دی تھی۔ لیکن اپیل کے ۱۸۸۶ء والے آزاد تجارت کے موازنہ نے کینیڈا کی تجارت کو تباہ کر دیا۔ کیونکہ کینیڈا ممالک متحدہ سے مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کینیڈا کو بڑے معاشی مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ اور اس کے بعد برطانیہ کے خلاف عام بے اعتمادی کی لہر دوڑ گئی۔ یہاں تک کہ ممالک متحدہ سے الحاق کی ایک پُرزور تحریک شروع ہو گئی۔ اس تحریک کے خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے گورنر نے شہنشاہی حکومت کو مشورہ دیا کہ کینیڈا کی تجارت کو بحال کرنے کی غرض سے دو تجاویز اختیار کرے۔ ایک تو ۱۸۴۹ء کے قانون جہازرانی کی تنسیخ، دوسرے ۱۸۵۴ء میں ممالک متحدہ سے تجارتی لین دین کے معاہدہ کی تکمیل۔ ان کارروائیوں سے یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ برطانوی پارلیمنٹ اگر واقعی شہنشاہیت کی پناہ چاہتی ہے تو اب وہ اپنی پالیسی سے نوآبادیات کے معاشی مفادات کو

ارج یا نظر انداز نہیں کر سکتی۔

لارڈ ڈرہم نے خارجی تجارت کی نگرانی کو صریحاً یا تھا۔ اس

ناپر کہ کروڑ گیری کا معاملہ صوبہ جاتی نہیں بلکہ قومی معاملہ ہے اور نو آبادیات کو زیادہ سے

یادہ صوبے کہا جا سکتا ہے۔" لیکن حالات کے تقاضہ نے شہنشاہی حکومت کے اس اجار

و ختم کر دیا۔ ابتدا میں تو کینیڈا نے اصولاً اس کو تسلیم کر لیا کہ شہنشاہی حکومت ہی شہنشاہیت

ی کروڑ گیری کا انتظام کرے۔ لیکن اب بحری تجارت اور ممالک متحدہ سے داخلی تجارت میں

رق کیا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ یہ محسوس کیا گیا کہ کینیڈا کی خوش حالی کا دار و مدار تامینی کروڑ گیری

ی پر ہے۔ اور چاہے انگلستان کی مالی پالیسی کچھ ہی ہو اُسے چاہیئے کہ اپنے مفادات کے

یش نظر اپنی مالی پالیسی کا تعین خود ہی کرے۔ چنانچہ ۱۸۵۹ء میں باوجود اس کے کہ انگلستان

زاد تجارت کا قطعی طور پر وعدہ کر چکا تھا، کینیڈا کے وزیر مالیہ الکزنڈر گالٹ نے صنعتی

شیا پر محصول بڑھا دیا جس کی وجہ سے برطانوی کاروبار پر بھی بُری طرح اثر پڑا۔ ایوان تجارت

ور شفیلڈ کے صناعوں نے وزیر نو آبادیات سے احتجاج کیا۔ اور وزیر نو آبادیات نے

ہل کینیڈا سے ان کی غیر دانشمندانہ پالیسی کی شکایت کی۔ اس شکایت کے جواب میں کینیڈا کے

زیر نے ایک یادداشت بھی تیار کروائی جس میں اُس نے اپنی حکومت کی حکمت عملی کی پُرزور حمایت

ی تھی۔ اس میں لکھا تھا

"۔ ۔ ۔ ۔ لیکن کینیڈا کی حکومت، جو کینیڈا کی مقننہ اور اُس کے باشندوں کی جانب سے کام کر رہی ہو، احترام کے اُن احساسات کے باوجود جو شہنشاہی ارباب اقتدار کے لئے وہ رکھتی ہے، کسی طرح بھی محصول بندی کی نوعیت اور اس کی حدود، دونوں کے متعلق کینیڈا والوں کے اپنے آپ تصفیہ کرنے کے حق سے نہ تو دستبردار ہو سکتی ہے اور نہ اُسے گھٹا سکتی ہے۔ صوبہ کی وزارت مقننہ کے طرز عمل کے اسباب بتلانے کے لئے ہر وقت تیار ہے کیونکہ وہ بھی اس میں شریک ہے۔ تاہم ملکہ معظمہ سے

متعلق اپنے فرض اور وفاداری کے تابع اس کو پالیسی کے جملہ عام مسائل میں صوبہ ہی کی حکومت کے سامنے ذمہ دار ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اسی کے اعتماد کی بنا پر وہ ملک کے معاملات کا انتظام کرتی ہے۔ اور محصولات کے عاید کرنے میں تو حکومت اور عوام کا اس بات پر متفق ہونا نہایت ضروری ہے کہ اول الذکر مقامی مقننہ کے دائرہ سے ہٹ کر نہ تو ذمہ داری قبول کرے اور نہ منظوری کی طالب ہو۔ اگر شہنشاہی حکومت کی رائے کو اہل کینیڈا کی رائے پر ترجیح دی جائے تو حکومت خود اختیاری خاک میں مل جائے گی۔ اس لئے مقننہ کینیڈا کے اس حق کی صریح طور پر تائید کرنا موجودہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ عوام کے محصولات کا انتظام' جس طرح مناسب سمجھے کر سکتی ہے۔ وزارت کی برہمی ہی کیوں نہ مول لینا پڑے۔ ملکۂ معظمہ کو ایسی کارروائیوں کے نامنظور کرنے کا مشورہ نہیں دیا جا سکتا۔ تاوقتیکہ ان کے مشیر نو آبادی کے باشندوں کی خواہشات کا لحاظ کئے بغیر وہاں کے معاملات کے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے تیار نہ ہوں۔ کینیڈا کے قرضوں اور اقرار ناموں کے لئے شہنشاہی حکومت ذمہ دار نہیں ہے۔ اور نہ وہ اس کی عدالتی، تعلیمی اور سیول خدمات کے مصارف برداشت کرتی ہے۔ ملک کی داخلی حکومت میں وہ کوئی مدد نہیں کرتی۔ ان تمام ضروریات کا انتظام صوبائی مقننہ ہی کو ایک وزارت کے توسط سے کرنا پڑتا ہے جو راست اس کے سامنے ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا یہ دعویٰ لازمی ہے کہ لوگوں پر جو بار عائد ہو اس کی نوعیت اور وسعت میں اُسے پورا اختیار حاصل رہے۔"

اس غیر معمولی دستاویز میں جو دعوے کئے گئے ہیں ان سے شہنشاہی حکومت نے کبھی انکار نہیں کیا۔ اور نو آبادی کی تجارتی مشاغل پر قبضہ کی جملہ مزید کوششیں ترک کر دی گئیں۔
یہ واضح رہے کہ صرف کروڑگیری کا اختیار ہی ایک ایسا معاملہ نہ تھا جسے لارڈ ڈرہم نے

شہنشاہی حکومت کے لئے مختص کر دیا تھا۔ اس کی پوری تجویز "آزادی نہیں بلکہ خود اختیاری" کی تھی۔ اس لئے اُس نے "دستور کی تبدیلی" امور خارجہ، دفاع، خارجی تجارت، اور تاج کی اراضیات کے انتظام" کے اختیار کو قطعی طور پر شہنشاہی حکومت کے لئے محفوظ کر دیا تھا۔ ان محفوظات کا تذکرہ ڈرہم رپورٹ میں کہیں کہیں مبہم طور پر اور بغیر کسی تفصیل کے کیا گیا ہے لیکن بُلّر نے اپنی کتاب "نو آبادیات کے لئے ذمہ دار حکومت" میں انھیں صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان کی پوری طرح تعریف کی ہے۔ مگر یہ تمام پابندیاں ذمہ دار حکومت کے تجربہ کے ابتدائی دور ہی میں ختم ہو گئیں۔ ان میں سے ایک یعنی شہنشاہی بندوبست اراضی کے اغراض کے لئے پبلک اراضیات پر شہنشاہی نگرانی تو رپورٹ ہی میں دم توڑنے لگی۔ وہ تو ذمہ دار حکومت کے ابتدائی اصولوں ہی کے منافی تھی۔ دوسری پابندیاں نسبتاً بعد میں اُٹھتی گئیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ۱۸۵۹ء ہی میں تجارت پر شہنشاہی حکومت کی نگرانی ختم ہو چکی تھی۔ یہ دراصل اس تجارتی نظریہ کا ایک لازمی جز تھا جس پر انیسویں صدی کی ابتدا میں برطانوی حکومت کاربند تھی۔ خارجی پالیسی اور دفاع پر شہنشاہی اختیار کو ٹرنٹ کے واقعہ کی وجہ سے سخت دھکا پہنچا۔ اور بعد میں تو یہ اختیار بھی اپنی فطری موت مر گیا۔ سب سے آخری تحفظ یعنی کینیڈا کے دستور کی نوعیت کے متعلق، یہ کہا جا سکتا ہے کہ گو وہ اصولاً ۱۹۳۱ء کے قانون وسٹ منسٹر کی منظوری تک قائم رہا، تاہم تجربہ میں آ کر وہ بھی مقامی اختیار کے تابع ہو گیا۔

ذمہ دار حکومت کے آغاز ہی سے کینیڈا کے تمام دستوری قواعد کی تشکیل میں کینیڈا کی آواز پوری آزادی کے ساتھ بلند ہوتی اور اپنا کام کرتی رہی ہے سچ تو یہ ہے کہ دستور کینیڈا کے تحریری عناصر، اکثر اوقات کینیڈا کے احساسات ہی سے بنتے رہے ہیں حالانکہ اُن کی تشکیل زیادہ تر شہنشاہی پارلیمنٹ ہی میں ہوئی تھی ۱۸۴۰ء کے قانون اتحاد کا مسودہ دراصل جنوبی کینیڈا کے چیف جسٹس اسٹورٹ ہی کا تیار کردہ تھا۔

جسے شمالی کینیڈا کے رائے دہندوں کی تائید سے لندن بھیجا گیا تھا۔ ۱۸۶۷ء کے برطانوی شمالی امریکہ کے قانون کی شرائط تقریباً پوری طرح کینیڈائی تدبر کا نتیجہ تھیں اور اُس کی تمام ترمیمات (یعنی ۱۸۷۱، ۱۸۷۵، ۱۸۸۶، ۱۹۰۷ اور ۱۹۰۵ کی ترمیمات) اوٹاوا ہی میں تیار ہوئی تھیں اور شہنشاہی پارلیمنٹ سے برائے نام اس طرح منظور ہوئی تھیں کہ انھیں بجا طور پر مقامی قانون سازی ہی کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

۱۸۶۷ء کے برطانوی شمالی کینیڈا کے قانون کی منظوری کے طریقۂ کارروائی کا یہاں پر مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔ ۱۸۴۱ء کا قانون اتحاد تجربہ سے کارآمد ثابت نہیں ہوا۔ اس نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے نسلی شعور کو بیدار کر دیا اور نسلی رقابت اور اغراض کے تصادم کا باعث بنا۔ اسمبلی میں اِن دونوں قومیتوں کی نظریں ایک دوسرے پر جمی رہیں اور کسی ایک صوبہ میں پبلک کاموں پر ضروری مصارف کی تلافی کے لئے دوسرے صوبہ میں بھی اسی قسم کے مصارف برداشت کرنے پڑے، چاہے وہ ضروری ہوں یا نہ ہوں۔ اس کا تنہا علاج یہ محسوس کیا گیا کہ عہدیہ (کنفیڈریشن) جیسا زیادہ آزاد اور غیر پابند اتحاد قایم کیا جائے۔ جس میں قومی اغراض کے لئے تو تعاون ہو لیکن مقامی معاملات کے لئے صوبائی علٰحدگی پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ اسی ضرورت کے باعث عہدیہ کی تحریک بڑی سرعت سے پھیلنے لگی۔ آزاد اور قدامت پسند پارٹیوں کے لیڈر جو ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے، اس معاملہ میں ساتھ ہو گئے۔ انھوں نے ایک مشترک وزارت تشکیل دی اور ۱۸۶۴ء میں عہدیہ کے مسئلہ پر غور کرنے کی غرض سے ایک کانفرنس طلب کی۔ اس کے بعد کینیڈا کے ساحلی صوبوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اور انھیں تعاون عمل کی دعوت دی۔ یہاں مقامی وفاق کی تحریک پہلے ہی سے موجود تھی۔ انھوں نے اپنی کانفرنس کو ملتوی کر کے اپنے نمائندے کیوبک کے جلسہ میں روانہ کئے۔ بڑے مباحثہ کے بعد کیوبک کانفرنس

نے ۷۲ قرار دادیں منظور کیں جن میں اس تجویز کا خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ اور بالآخر یہ تجویز یکم جولائی ۱۸۶۷ء کو برطانوی شمالی کینیڈا کے قانون کی شکل میں برطانوی پارلیمینٹ سے منظور ہو گئی۔ کینیڈا والوں نے اس کا جو مسودہ پیش کیا تھا اس میں سوائے اس کے کوئی تبدیلی نہیں کی گئی کہ مجوزہ الفاظ "سلطنت کینیڈا" کو "قلمرو کینیڈا" سے بدل دیا گیا۔

وفاق کینیڈا نے برطانوی سلطنت میں ایک نئے عنصر کو داخل کر دیا جس میں ذمہ دار حکومت کا وہ تصور شامل تھا جو برطانوی شہنشاہیت کے دوسرے ملکوں کے دستوری ارتقاء کو آگے بڑھا سکتا تھا۔ وفاق کا مقصد یہی ہے کہ مرکزی حکومت اور صوبوں کے کاموں میں تفریق اور اُن کے باہمی تعلقات میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ صوبائی حکومتیں، مقامی صوبہ جاتی قانون سازی کے ایسے محدود اختیار کے ساتھ قائم ہوئیں جس کا تعلق صوبائی ملکیت، صوبائی اراضیات، صوبائی اغراض کے لئے قرضہ جات، براہ راست صوبائی محصول بندی، صوبائی کمیٹیوں کی تشکیل اور پبلک اداروں کی دیکھ بھال سے تھا۔ قلمروی اہمیت کے جملہ امور قلمروی حکومت کے تفویض کر دے گئے۔ مثلاً قرضہ عامہ، محصول گیری اور آبکاری، تجارت، ریلوے، بحری، فوجی اور سیول خدمات کا انضباط، قانون فوجداری، شادی اور طلاق کی نگرانی، زربنک، کرنسی اور دیوالیہ کا انضباط نیز بقیہ اختیارات یعنی ایسے جملہ اختیارات جنھیں صراحت کے ساتھ صوبائی حکومتوں کے لئے مختص نہ کیا گیا ہو، قومی حکومت کے قبضہ میں رہے۔ پہلے کی طرح مرکزی اور صوبہ جاتی حکومتوں کا ڈھانچہ برطانوی نمونہ ہی پر تیار کیا گیا۔ قلمرو کو ایک گورنر جنرل کے زیر حکومت کر دیا گیا، جو تاج کی طرف سے مامور ہوتا تھا۔ اور یہ گورنر جنرل قلمرو کے مختلف صوبوں کے لئے لفٹنٹ گورنر مقرر کرتا تھا۔ اُس کے مشورہ اور امداد کے لئے ایک پریوی کونسل ہوتی تھی جو قلمروی حکومت کے ایسے ارکان پر مشتمل ہوتی تھی جنھیں قلمرو کی مقننہ میں پارلیمانی اکثریت حاصل ہوتی تھی۔

[illegible]

ہوتے، دوسرے ایوان عام جو اُن ارکان پر مشتمل ہوتا تھا جنھیں عوام، آبادی کے لحاظ سے مقررہ حلقوں سے منتخب کرتے تھے۔ ایوان عام انگلستان کی طرح یہاں بھی جملہ امور میں زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ گورنر جنرل کی طرح صوبہ کے لفٹنٹ گورنر کو بھی ایک ایسی مجلس وزرا مشورہ دیتی تھی جو صوبائی مقننہ میں پارلیمانی اکثریت رکھتی ہو۔ یہ امر صوبوں کے صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ چاہے وہ ایک ایوانی مقننہ قائم کرے یا دو ایوانی۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ برطانوی شمالی کینیڈا کے قانون کے ذریعہ ذمہ دار حکومت کے بنیادی اصول کا تحفظ، خاص برطانوی طریقہ پر عمل میں آیا تھا۔ ذمہ دار حکومت کے دائرہ کے تعین کی کوشش نہیں کی گئی۔ یقیناً یہ تعجب کی بات ہے۔ ۱۸۳۹ء میں ذمہ دار حکومت کی تعریف اس لئے نہیں کی گئی تھی کہ اس وقت اس کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ اس وقت سے بتدریج اور باقاعدہ طور پر، مگر بحث و حجت کی ایک طویل جنگ کے بعد، ذمہ دار حکومت کا دائرہ بلاشبہ وسیع ہوتا گیا۔ لیکن اس کے باوجود آئندہ کے امکان کو برطانوی شمالی کینیڈا کے قانون میں بغیر تعین و تحدید ہی کے چھوڑ دیا گیا۔ کینیڈا میں ذمہ دار حکومت کی بنیادی طور پر یہ "غیر تحریری" خصوصیت، جسے برطانوی شمالی کینیڈا کے قانون میں بحال رکھا گیا، یقیناً غیر معمولی ہے۔ اُسے لارڈ ڈرہم کی پیش آگاہیوں کے جواز کے طور پر پیش کیا گیا۔ لارڈ ڈرہم نے اسی امکان کے تصور کا ذکر اپنی رپورٹ میں اس طرح کیا ہے۔

> "علاج کے لئے نہ تو اس کی ضرورت ہے کہ اصول حکومت میں کوئی تبدیلی کی جائے اور نہ اس کی کہ کوئی نیا دستوری نظریہ ایجاد کیا جائے . . . . یہ تبدیلی محض ایک مراسلہ کے ذریعہ جس میں یہ ہدایتیں موجود ہوں، عمل میں لائی جانی چاہیئے"۔

رفتار عالم

یورپ پچھلے مہینوں میں سردی کے موسم کے سبب سے خیال تھا کہ روس میں جنگی سرگرمیاں ذرا ٹھنڈی رہیں گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ روسیوں نے بڑی بہادری اور جرأت سے جرمنوں کے سیلاب کو پیچھے ڈھکیلنے کی کوشش کی اور بڑی حد تک اس میں کامیابی بھی حاصل کی۔ اب اس وقت بھی اسمولنسک کے قریب بڑی غضبناک لڑائی ہو رہی ہے۔ اس زمانہ میں برف پگھلنے کی وجہ سے روس کے میدانوں میں اتنی کیچڑ ہو جاتی ہے کہ کوئی بڑا جنگی اقدام کرنا دشوار ہے۔ چنانچہ جرمنوں کا اقدام تو رُک گیا لیکن موسم کی خرابی روسیوں کی جنگی سرگرمی میں کوئی خلل نہیں ڈال سکی۔ اگر آئندہ تین چار ماہ میں روسی اپنے حریف کو روکے رہے تو اس کا بڑا دور رس اثر ہوگا۔ ممکن ہے کہ مغربی سرحد پر انگلستان دوسرا محاذ قائم کر دے اور جس خطرہ سے جرمنی بچنا چاہتا تھا وہ پیدا ہو جائے۔ یورپ کی جنگ ہماری رائے میں فیصلہ کن صورت اسی وقت اختیار کر سکے گی جبکہ جرمنی کو مغربی محاذ پر بھی مصروف کر لیا جائے گا۔ اور ایسا ہونا جلد ضروری ہے تاکہ روس کی موجودہ صورت حال سے پورا فائدہ اُٹھایا جا سکے۔

جرمن لوگ بھی مغربی محاذ کے خطرہ کی پیش بندی کر رہے ہیں۔ چنانچہ پچھلے ہفتہ میں فرانس میں جو صورت حالات پیدا ہوئی ہے وہ اسی کے ضمن میں ہے۔ موسیو لاوال کے فرانسیسی کابینہ میں آجانے سے حکومت فرانس اور بھی زیادہ جرمن اثر میں آگئی ہے۔ چنانچہ یہ خبریں بھی موصول ہوئی ہیں کہ فرانس نے اپنا بحریہ جرمنی کے حوالہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اگر ان میں کچھ صداقت ہے تو یہ خبریں بڑی تشویش ناک ہیں۔ فرانسیسی جہازوں کی بدولت بحر روم میں بحری

قوت کے توازن پر زبردست اثر پڑے گا۔ عام طور پر یہ بھی خیال کیا جا رہا ہے کہ شمالی افریقہ میں رومل کو جو مدد مل رہی ہے وہ فرانس اور اس کی نوآبادیوں کے توسط سے مل رہی ہے۔ فرانس کی مشرقی ریلوے لائن بھی اس وقت کم و بیش جرمنوں کے تصرف میں ہے جس کو فوجی نقل و حرکت کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اگر انگریزوں نے جرمنی کے خلاف اپنا مغربی محاذ فرانس میں قائم کیا تو اس کا بھی اندیشہ ہے کہ کہیں فرانسیسی فوجیں جرمنوں کے دوش بدوش فرانس کی مدافعت کے بہانہ سے نہ لڑیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام خطرے برطانوی مدبروں کے سامنے ہیں جن کے باعث وہ مغرب میں دوسرا محاذ قائم کرنے میں اب تک تامل کرتے رہے ہیں۔ اگر انگریزوں کو یہ قوی اندیشہ ہوا کہ فرانس کلیتہً جرمنی کا ساتھ دے گا تو ممکن ہے وہ ناروے یا دوسرا محاذ قائم کریں اگرچہ اس میں ان کے لئے فاصلہ کی دشواریاں ضرور ہیں۔ اور اگر یہ دیکھا گیا کہ فرانس پہلے ہی سے جرمنی کے ساتھ پوری طرح تعاون کر رہا ہے اور برطانوی مفاد و مقاصد کو جو نقصان پہونچا رہا ہے اس سے زیادہ نقصان پہونچانا ممکن نہیں تو ممکن ہے فرانس ہی میں دوسرا محاذ قائم کیا جائے جیسا کہ سینٹ نازیر اور بولونین پر حال میں فوجیں اُتارنے سے مستقبل کے متعلق کچھ اشارہ ملتا ہے۔ حال ہی میں ہٹلر نے جنرل رنس ٹڈ کو جو فرانس بھیجا ہے اس کے دو مطلب ہوسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جرمنی برطانوی اقدام کے خلاف روک تھام کرنا چاہتا ہے اور اس کی پوری کوشش یہ ہوگی کہ اہل فرانس کو انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے آمادہ کرے۔ دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ ہٹلر ایک پرانے جواری کی طرح اپنا آخری پانسہ پھینکنے کی تیاری کر رہا ہے یعنی جون یا جولائی میں وہ انگلستان سے فیصلہ کن قسمت آزمائی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ ایسی حالت میں کامیابی کے ساتھ انگلستان پر حملہ کرسکے گا جبکہ اس کی فوج کا بہت بڑا حصہ روس میں پھنسا ہوا ہے اور اس طور پر پھنسا ہوا ہے جیسے سانپ کے منھ میں چھچھوندر کہ جسے وہ نگل سکتا ہے اور نہ باہر نکال سکتا ہے۔ لیکن اس سے کوئی بات بھی بعید نہیں ہے۔ انگلستان کے ارباب حل و عقد یہ جانتے ہیں اور اسی لئے ہر ناگہانی صورت

کے لئے تیار ہیں۔

ہندوستان

سر اسٹیفورڈ کرپس برطانوی کابینہ کی تجاویز ہندوستان لے کر آئے اور تین ہفتے نئی دہلی میں رہکر انگلستان واپس جا چکے ہیں۔ ان تین ہفتوں میں نئی دہلی تمام دنیا کی نگاہوں کا مرکز بن گئی تھی۔ وجہ ظاہر ہے۔ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ اب تمام دنیا کے لئے اہمیت رکھنے لگا ہے۔ اور بڑی حد تک یہ کہنا درست ہوگا کہ مشرق کی جنگ کا فیصلہ ہندوستان کے تعاون عمل پر منحصر ہے۔ پھر ابھی حال میں ملایا اور برما میں جاپان کو جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کو ان ملکوں کے باشندوں کا عملی تعاون نہ حاصل ہونے کے سبب سے بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لہذا جاپان کے خلاف جنگ جیتنے کے لئے لابدی ہے کہ حکومت ہند اور ہندوستان کے باشندوں میں پوری طرح تعاون عمل کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہو۔ روس اور چین کے تجربوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اب جنگ صرف پیشہ ور سپاہ کی مدد ہی سے نہیں لڑی جاتی بلکہ عوام الناس بھی اس میں براہ راست حصہ لے سکتے ہیں۔

سر اسٹیفورڈ کرپس کی تجاویز کا مقصد بھی یہی تھا کہ فی الحال ایک عارضی سمجھوتہ کے وسیلے ہندوستان میں ایسی سیاسی صورت حال پیدا کر دی جائے کہ اہل ہند موجودہ جنگ میں محض کرایہ کے ٹٹو کی حیثیت سے حصہ نہ لیں بلکہ اپنے قومی وقار اور قومی آزادی کی خاطر جوش اور تندہی سے اس میں شرکت کریں۔ سر اسٹیفورڈ کی تجاویز دو حصوں پر مشتمل تھیں۔ ایک وہ حصہ جس کا تعلق جنگ کے بعد کے حالات سے ہوگا۔ یعنی یہ کہ جنگ کے ختم پر ہندوستان کو قلمروئی نوعیت کی مکمل آزادی حاصل ہو جائے گی اور اس کو یہ حق بھی ہوگا کہ چاہے تو برطانوی دولت مشترکہ سے علٰحدہ ہو جائے۔ ہندوستان کا آئندہ دستور خود اہل ہند اپنے منتخب شدہ نمائندوں کے ذریعہ سے وضع کریں گے۔ اس کا امکان بھی ہوگا کہ مختلف علاقہ جاتی وحدتیں یا منطقے اپنے یونین الگ الگ قائم کرلیں۔ اس طرح ہندوستان میں دو یا اس سے زائد یونین

قائم ہو سکیں گے جو اپنے تمام اندرونی اور بیرونی معاملات میں آزاد ہوں گے۔

برطانوی کابینہ کی تجاویز کا دوسرا حصہ موجودہ انتظامات کے متعلق تھا۔ چونکہ جنگ کے سبب سے اس وقت کوئی بنیادی دستوری تبدیلی ممکن نہیں تھی اس لئے توقع کی گئی تھی کہ مرکز میں ایک قومی حکومت قائم ہو جائے گی جو اس ملک کے مختلف سیاسی عناصر پر مشتمل ہوگی تاکہ جنگ کے انتظام میں پبلک کا زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل ہو سکے۔ یہ قومی حکومت وائسرائے کے آگے جوابدہ ہوگی۔ رکن دفاع کے اختیارات محدود ہوں گے تاکہ کمانڈر ان چیف متحدہ اقوام کی جنگی تدابیر کے بموجب ہندوستان کی مدافعت کر سکے۔ انگلستان کی جنگی کابینہ میں ایک ہندوستانی ذمہ دار رکن شرکت کرے گا تاکہ ہندوستان اور برطانیہ کے جنگی مقاصد یا اس کے توسط سے ہم آہنگی ممکن ہو سکے۔

سر اسٹیفورڈ نے ان تجاویز کے متعلق ملک کی تمام سیاسی جماعتوں سے گفت و شنید کی اور آخر تک کچھ ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ مفاہمت کی کوئی نہ کوئی شکل ضرور نکل آئے گی۔ لیکن بعض بنیادی اختلافات کے سبب سے یہ صورت نہ نکل سکی۔ گفتگو کی طوالت اور بعد میں ناکامی کا سبب یہ تھا کہ کانگریس ملکی دفاع کو پوری طرح نمائندہ ہندوستانیوں کے تحت کرنا چاہتی تھی اور مرکز میں قومی حکومت کے قیام پر وہ بہت زور دے رہی تھی تاکہ وائسرائے منتخب شدہ نمائندوں کی کابینہ کے سامنے جوابدہ ہو جائے۔ دراصل ملکی دفاع کو کلیتہً منتخب شدہ ہندوستانیوں کے تحت اسی وقت کرنا ممکن ہوگا جبکہ مرکز میں قومی حکومت قائم ہو جائے۔ لیکن ایسا کرنا اس وقت تک کیسے ممکن ہے جب تک کہ بنیادی دستوری تبدیلی نہ کی جائے۔ دستوری تبدیلی کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان کے مختلف سیاسی عناصر اس امر کے متعلق کوئی مفاہمت کر لیں کہ انگریزوں سے ہندوستانیوں کو جو اختیارات منتقل ہوں گے انھیں وہ آپس میں کس طرح سے تقسیم کریں گے تاکہ ایسی دستوری صورت حالات پیدا ہو جائے کہ کوئی ایک گروہ یا فریق دوسرے پر ظلم و زیادتی نہ کر سکے۔ کیا یہ صورت حالات محض نئی دستوری روایات کے ذریعہ سے وجود میں

آسکتی ہے جیسا کہ کانگریسی لیڈروں کا خیال ہے؟ دراصل ہندوستان کا دستوری مسئلہ اس وقت تک قابل اطمینان طور پر حل نہیں ہو سکتا جب تک کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں کوئی باعزت سمجھوتہ نہیں ہو جاتا۔ اس کے علاوہ ہندوستانی ریاستوں کی حیثیت بھی خود ان والیان ریاست کے مشورہ اور مرضی سے متعین ہو جانی چاہئے۔ غرضکہ یہ سب مسائل بہت بحث و مباحثہ چاہتے ہیں۔ اس وقت جبکہ جاپان کے ہوائی حملے ہندوستان پر شروع ہو چکے ہیں ان دستوری مباحث میں قومی وقت کو ضائع نہیں کیا جا سکتا۔

سر اسٹیفورڈ کی لائی ہوئی برطانوی پیشکش کو ہندوستان کی سب اہم سیاسی جماعتوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے لیکن ان سب کے ایسا کرنے کی وجوہ مختلف ہیں۔ کانگریس نے ان تجاویز کو اس واسطے مسترد کیا کہ ہندوستان میں زمانۂ جنگ میں قومی کابینی حکومت کا قیام ممکن نہ تھا۔ مسلم لیگ نے اس وجہ سے ان تجاویز کو مسترد کیا کہ پاکستان کے حق کو غیر مبہم اور واضح الفاظ میں برطانوی حکومت نے تسلیم نہیں کیا اگرچہ مستقبل میں متعدد یونین قائم کرنے کے امکان سے ایک حد تک پاکستان کا مطالبہ پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن مختلف یونین قائم کرنے کی جو تدابیر پیش کی گئی ہیں ان کے باعث عملی اعتبار سے ان کا وجود ممکن نہ ہوگا۔ برطانوی تجاویز کو مسلم لیگ نے اس واسطے غیر تشفی بخش قرار دیا کہ ان کے بموجب مسلمانوں کو اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرنے کا حق نہیں ملتا۔ ہندوستان کا مسئلہ بین اقوامی مسئلہ ہے۔ اس براعظم کے مختلف گروہوں میں اتنے اختلافات پائے جاتے ہیں کہ نہ ان پر پردہ ڈالا جا سکتا ہے اور نہ انھیں دوسری تنقیحات کے ساتھ غلط ملط کیا جا سکتا ہے لیکن مسلم لیگ دوران جنگ کے لئے کسی ایسے عارضی سمجھوتہ کے لئے تیار ہے جس کی بدولت آئندہ پاکستان کے حق کو متاثر نہ کیا جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ سر اسٹیفورڈ کرپس اور ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کی گفت و شنید کی ناکامی کے بعد کیا ہوگا؟ خود کانگریس کے لیڈر اس وقت چہ کنم میں ہیں۔ انگریزی حکومت سے زمانہ سابق کی بے اعتباریوں کے باعث ان کا سمجھوتہ بہت دشوار معلوم

ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ نازی اور فاشتی فلسفۂ حیات کے سخت مخالف ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو اور راجگوپال چاری نے گزشتہ ہفتہ اپنی تقریروں اور بیانات میں اہل ہند کو شکست پسندی کے خیالات اپنے دلوں سے نکال دینے اور حملہ آور کا مقابلہ کرنے کی پرزور دعوت دی ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ ممکن ہے مسٹر جانسن کے ذریعہ مسٹر روزویلٹ کو پنچ مقرر کیا جائے گا تاکہ وہ انگلستان اور ہندوستان اور خود ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں میں کوئی سمجھوتہ کرادیں۔ مسٹر جانسن نے اہل امریکہ کی طرف سے ہندوستانیوں سے تعاون کی توقع ظاہر کی ہے تاکہ امریکہ اس وقت ہندوستان کو جو مدد دے وہ بیکار نہ جائے۔ اُمید ہے کہ اس ضمن میں عنقریب کوئی نئی صورت پیدا ہوگی تاکہ ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کے جوش عمل کو انصرام جنگ کے لئے باعزت طور پر استعمال کیا جا سکے۔

ملایا، برما اور جزائر شرق الہند پر قبضہ ہو جانے سے جاپان اس وقت چاہے تو فوجی پیش قدمی کا رخ آسٹریلیا کی طرف پھیر دے اور چاہے تو ہندوستان کی طرف پھیر دے۔ ہندوستان پر ہوائی حملے شروع ہو چکے ہیں۔ مشرقی ساحل پر کسی وقت بھی جاپانی فوجیں اتر سکتی ہیں۔ ان حالات میں اہل ہند کا فرض ہے کہ وہ مقاومت کے لئے تیار رہیں اور اگر دشمن سے مقابلہ کی نوبت آئے تو نہایت اطمینان، سکون قلب اور جرأت کے ساتھ اپنے وطن کی حفاظت کریں اور شکست خوردگی کی ذہنیت کو اپنے پاس پھٹکنے تک نہ دیں۔

دوسرے رسائل

The Indian Journal of Political Science } بابتہ جنوری۔ مارچ ۱۹۴۲ء۔ اس اشاعت کے خاص مضامین یہ ہیں۔ (۱) بعض اسلامی

مفکرین کے سیاسی نظریات: اس مضمون میں جب پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی نے ابن فارابی، ابن رشد، ابن طفیل، غزالی اور ماوردی کے سیاسی نظریات کی تشریح کی ہے اور بتلایا ہے کہ ان مفکرین کے خیالات سے اب تک کس قدر لاپروائی برتی گئی ہے اس ضمن میں مملکت کے آغاز، مملکت کی ساخت، اقتدار اعلیٰ، بین اقوامیت، غرضکہ نہایت اہم سیاسی مسائل کی نسبت ان اسلامی مفکرین کے جو تصورات تھے انھیں پروفیسر شروانی صاحب نے نہایت وضاحت سے پیش کردیا ہے۔

(۲) مسٹر ای اشیرواتھم نے اپنے مضمون" زمانہ جنگ میں فرد کی ازادی" میں بعض بنیادی مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ موصوف کا خیال ہے اور صحیح ہے کہ جنگ کے زمانہ میں آزاد سے آزاد ملک میں بھی انفرادی آزادی پر حدود قائم کرنی پڑتی ہیں۔ چنانچہ انگلستان میں جنگ شروع ہونے سے قبل پارلیمنٹ نے اگست ۱۹۳۹ء میں ایمرجنسی پاورس ایکٹ" منظور کیا تھا جس کی روسے عاملہ کو نہایت وسیع اختیارات حاصل ہوگئے۔ ہوم سکریٹری کو اس قانون کے بموجب اختیار حاصل ہے کہ ایسے ضوابط نافذ کرے جو پارلیمنٹ میں پیش ہونے سے قبل ہی وہی حکم رکھیں گے جو پارلیمنٹ میں منظور شدہ قانون کی نوعیت ہوا کرتی ہے۔ پارلیمنٹ زیادہ سے زیادہ ہوم سکریٹری سے درخواست کرسکتی ہے کہ وہ ان ضوابط میں سے کسی کا مسودہ دوبارہ تیار کرے۔ اس قانون کے تحت ہر قسم کا پروپگنڈا اور ہر قسم کے جلسے ممنوع قرار دئے جاسکتے ہیں۔ مئی ۱۹۴۱ء میں جنگ کے سلسلہ میں پارلیمنٹ میں ایک قانون منظور ہوا جس کے بموجب حکومت کو یہ اختیار

اصل ہوگیا ہے کہ جس شخص سے چاہے اپنی مرضی کے مطابق کوئی کام کرنے کو کہے اور اپنے
سب صوابدید اس کو تنخواہ دے۔ افراد کی تمام ملکیت پر حکومت اگر ضروری سمجھے تو تصرف
اصل کرے صنعتی اداروں پر حکومت قبضہ کر سکتی ہے اور مزدوری اور منافع متعین کر سکتی ہے
ملکی مالیات کو جس میں بنک بھی شامل ہیں اپنی نگرانی میں لے سکتی ہے۔

غرضکہ موجودہ جنگ ہمہ گیر نوعیت رکھتی ہے۔ اجتماعی مفاد کے مدنظر افراد کو اپنی
زادی قربان کرنی پڑتی ہے کہ بغیر اس کے جنگ کامیابی کے ساتھ نہیں چلائی جا سکتی۔

تنقید و تبصرہ

World Economic Survey 1939-41 } لیگ آف نیشنز۔ جنیوا۔ ہندوستان میں ملنے کا ۸۰ کرزن
ضخامت ۲۷۵ صفحات قیمت سوا پانچ روپئے۔

عوام تو کیا خاصے پڑھے لکھے حلقوں میں یہ یقین کیا جا چکا ہے کہ مجلس اقوام ختم ہو گئی۔ لیکن تذکرہ بالا کتاب دیکھ کر یہ پتہ چلتا ہے کہ لیگ ختم نہیں ہوئی بلکہ اس سے بڑھ کر حیرانی یہ ہوتی ہے کہ لیگ نہ صرف قائم ہی ہے بلکہ کچھ نہ کچھ کام بھی کر رہی ہے۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ سیاسی حیثیت سے لیگ کا خاتمہ ہو چکا ہے اور صحیح معنوں میں تو یہ خاتمہ اس وقت ہی ہو گیا تھا جب لیگ نے منچوریا کے معاملہ میں جاپان کے سامنے ہتھیار ڈال دئے تھے اور کاری ضرب اس پر اس وقت لگی تھی جب ایبے سینیا کے معاملہ میں لیگ کے اراکین کے خوشنما اور دلفریب وعدوں کا پول کھل گیا۔ لیکن باوجود اس سیاسی خودکشی کے اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ بطور ایک ثالثی ادارے کے لیگ کا کام نہایت قابل قدر رہا ہے اور اس جنگ کے زمانہ میں ایسے بین اقوامی ادارہ کی ضرورت تو اور بھی شدت سے محسوس ہو رہی ہے جنگ چھڑنے کے بعد لیگ کو اکثر شعبے مجبوراً بند کرنے پڑے لیکن یہ نہایت مسرت کا مقام ہے کہ شعبۂ معاشیات اور مالیات بند نہیں کیا گیا اور اس نے اپنا مفید کام جاری رکھا۔ ۱۹۳۲ سے یہ شعبہ ہر سال کے اہم معاشی واقعات پر تبصرہ کی صورت میں ایک کتاب شائع کرتا ہے اور یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی نویں جلد ہے۔ البتہ یہ بجائے سالانہ تبصرہ کے دو سالہ تبصرہ ہے اس کتاب کے دس ابواب میں پہلے باب میں یہ بتلایا گیا ہے کہ کس طرح امن کے زمانہ سے معیشت کو جنگ کے زمانہ کی طرف آنا پڑا۔ اس دور کی اہم تبدیلیاں کیا تھیں اور کن

مسایل کا سامنا کرنا پڑا۔ اس دور کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ معاشیات کے وہ تمام اصول جو آزاد تجارت اور انفرادی آزادی کے کاروبار پر مبنی تھے ان پر گرہن چھا گیا اور معیشت کو بجائے انفرادی منافع کے اصول کے حکومت کی ضروریات کے اصول پر چلانا پڑا۔ اس اصول کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پیدایش دولت پر حکومت کی نگرانی اور جہاں نگرانی سے کام نہ چلے حکومت کا قابو رکھا جائے۔ چنانچہ کتاب کے دوسرے باب میں تبلایا گیا ہے کہ کس طرح (صنعت) تجارت۔ زراعت اور محنت پر حکومت کا تصرف اور دباؤ رہا جب تجارت انفرادی نفع کی خاطر نہ ہو اور بازاری قیمتیں طلب و رسد کے قانون کے تحت نہیں بلکہ حکومتوں کے فرمانوں کے تحت مقرر ہوں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ جو چیزیں چاہیں وہ نہیں خرید سکتے۔ پیدایش دولت پر حکومت کے قابو رکھنے کی وجہ سے صرف کی رسد بندی بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ کتاب کے تیسرے باب میں یہ بتلایا گیا ہے کہ کس طرح مختلف ممالک میں رسد بندی کی گئی اور اس کا معیار رہایش پر کیا اثر پڑا؟ ہندوستان میں اس وقت صرف پٹرول کی بڑے پیمانہ پر رسد بندی کی گئی ہے اور کم و بیش ہر شخص اس سے غیر مطمئن نظر آتا ہے اگرچہ جنگ کے زمانہ میں ایثار کرنے کی ضرورت کی وجہ سے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی جا سکتی جب ہندوستان میں صرف ایک شئے کی رسد بندی پر صارفین یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے حقوق پر چھاپا مارا گیا ہے تو ان ممالک میں صارفین کی کیا حالت ہوگی جہاں زندگی کی کم و بیش ہر ضرورت پر کڑی رسد بندی کی گئی ہے۔ محوری ممالک میں رسد بندی کا سلسلہ $\frac{1932}{1933}$ کے زمانہ سے شروع ہے اور وہ لوگ قریباً اس کے عادی ہو چکے ہیں اس لئے ان ممالک کہ امن کے زمانہ سے جنگ کے زمانہ میں داخل ہونے میں اتنی دشواریاں پیش نہیں آئیں جتنی کہ جمہوری ممالک کو پیش آئی ہیں۔

جنگ کا دوسرا اہم اثر یہ پڑا ہے کہ حکومتوں کے اخراجات بھی بڑھ گئے ہیں۔ جنگ کے شروع میں حکومت انگلستان کا روزانہ خرچ قریباً آٹھ کروڑ روپیے تھا اس وقت یہ خرچ قریباً

سولہ کروڑ روپیہ ہوگیا ہے اور شیطان کی آنت کی طرح بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ چوتھے باب میں یہ بتلایا گیا ہے کہ مختلف ممالک میں حکومتوں کا خرچ کتنا بڑھا ہے۔ ان بڑھتے ہوئے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے کیا کیا محاصل عاید کئے گئے اور جب محاصل عاید کرنے سے بھی کام نہ چلا تو پھر کس طرح لوگوں سے قرضے حاصل کئے گئے۔ سود کی شرحوں اور قیمتوں کا کیا حال رہا اور قیمتوں پر قابو حاصل کرنے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کی گئیں۔ کتاب کے باقی چھ ابواب میں اسی قسم کے دوسرے اہم مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہم اس کتاب کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتے ہیں

ا - ا - ق

Review of the Co-operative Movement in India, 1939-40 — صفحات ۹۲ قیمت بارہ آنہ ملنے کا پتہ ریزرو بنک آف انڈیا بمبئی۔

یہ رپورٹ مختصر مگر بہت مفید ہے جو حضرات ہندوستان میں اس تحریک کی موجودہ حالت کا پتہ چلانا چاہیں اور ان کے پاس وقت کم ہو ان کو اس رپورٹ کا خاص طور پر مطالعہ کرنا چاہیے یہ رپورٹ ہمارے طلباء کے لئے بھی بہت مفید ہو سکتی ہے۔ اس وقت ہندوستان میں انجمن ہائے امداد باہمی کی جملہ تعداد ایک لاکھ نتیس ہزار ہے اراکین کی تعداد ساٹھ لاکھ اور جملہ کاروباری سرمایہ ایک سو سات (۱۰۷) کروڑ ہے لیکن اس وقت اس تحریک کی مالی حالت تسلی بخش نہیں۔ ۱۹۴۰ کے اخیر میں انجمنوں کے دیئے ہوئے قرضوں کی مقدار تیئیس کروڑ سے کچھ زاید تھی لیکن ان میں سے دس کروڑ کے قرضے ایسے تھے جو وقت پر ادا نہیں کئے گئے تھے، بعض صوبوں میں مثلاً بنگال۔ بہار۔ اڑیسہ اور برار میں تو یہ تحریک قریباً ناکام ثابت ہو چکی ہے۔ ریزرو بنک نے ان انجمنوں کی حالت کو درست کرنے کے لئے جو تجاویز پیش کی ہیں ان کا بہ غور مطالعہ ہر امداد باہمی کی تحریک کے ہمدرد کو کرنا چاہیے

میں تو اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ لوگ جن کی معاشی حالت پست ہے اُن کے لئے "اتحاد باہمی" زیادہ مفید نہیں حالانکہ ہندوستان میں جو شاہی زرعی کمیشن قائم ہوا تھا اس نے تو کہا تھا کہ اگر ہندوستان میں امداد باہمی کی تحریک ناکام رہی تو پھر ہندوستان کی تمام امیدوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اتحادی حلقوں میں میرے اس بیان پر بہت نے ناک بھوں چڑھائی ہے۔ اور میرے اس بیان کو بالکل مہمل اور بے معنی خیال کیا جا رہا ہے۔ لیکن آج سے آٹھ سال قبل جب میں نے غیر محدود ذمہ داری کے متعلق لکھا تھا تو بھی مجھ پر اس قسم کے حملے کئے گئے تھے لیکن آج اکثر اتحادی حلقے اس پر متحد ہو گئے ہیں کہ غیر محدود ذمہ داری سے اس تحریک کو بہت نقصان پہنچا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ دن دور نہیں جب میرے اس بیان کو کہ "اتحادی باہمی کی تحریک معاشی پستی والے ملکوں کے لئے چنداں مفید نہیں" زیادہ حقیقت کے قریب سمجھا جائے گا۔ اسی رپورٹ کے بعض حصوں میں اجمالاً اس کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ پست معاشی حالت والے ملکوں کے لئے تو صرف حکومت کی طرف سے پیدائش دولت کی طرف تیزی اور شدت سے حصہ لینے سے ان کی مشکلات دور ہو سکتی ہیں۔

(ا۔ ا۔ ق)

Report of the Committee on Co-operation in Madras, 1939-40	مہتمم گورنمنٹ پریس مدراس ضخامت ۵۲۳ صفحات قیمت دو روپیہ بارہ آنے

امداد باہمی کی جتنی رپورٹیں اس وقت تک میری نظر سے گذری ہیں یہ رپورٹ ان میں سے بہترین اور بدترین رپورٹ ہے۔ اب حیران ہونگے کہ اس متضاد بیان سے کیا مطلب ہے۔ ایک رپورٹ بہ یک وقت بہترین اور بدترین کیسے ہو سکتی ہے اسی کا جواب کمیٹی کی ہیئت ترکیبی دیکھنے سے ملتا ہے۔ [illegible]

ں پر غور و فکر کرنے کے لئے چند چیدہ مخصوص قابلیت کے افراد کی ضرورت تھی لیکن اس
ٹی کے اراکین کی تعداد اکیس تھی جس میں سب ہی قسم کے لوگ شامل تھے۔ اس گنگا جمنی
ٹی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بجائے کوئی ایک متفقہ رپورٹ پیش کرنے کے کیٹی کے چار اراکین
، چار علیحدہ علیحدہ اختلافی نوٹ لکھے ہیں اور پانچ ممبروں نے مزید تشریحی نوٹ لکھے ہیں۔
کیٹی کی رپورٹ میں جو چیز مجھے سب سے زیادہ قابل افسوس نظر آتی ہے وہ معاملات
ں سیاسیات کا دخل ہے۔ ہندوستان میں سیاسی طور پر پاکستان کا اعلان کرنے پر تو ہر
ندو چیں بہ جبیں نظر آتا ہے۔ لیکن مجھے اس رپورٹ میں یہ پڑھ کر سخت حیرانی ہوئی کہ
اپریشن میں بنک کاری کی حد تک صوبہ مدراس میں وہی پاکستان والا اصول جھلک رہا ہے۔
آندھرا کے حصہ کے لئے ایک الگ یونین اور ایک الگ بنک کا مطالبہ کیا جا رہا
ہے حالانکہ تجربہ بتاتا ہے کہ بنک کاری کے ادارے جتنے بڑے اور مضبوط ہوں اتنی ہی
ں حالت بہتر رہتی ہے اور وہ ملک کی زیادہ خدمت کر سکتے ہیں۔
جہاں تک مدراس میں کواپریشن کی ترقی اور نشو و نما کا تعلق ہے اس رپورٹ میں
ں کا نہایت عمدہ خاکہ کھینچا گیا ہے لیکن تعمیری پہلوؤں کی حد تک اراکین کیٹی میں
مدید اختلاف نظر آتا ہے ایک گروہ تو وہی قدیم اصولوں کی پیروی کی رٹ لگا رہا ہے اور
دوسرے گروہ کے بعض اراکین نے زیادہ حقیقت شناسی سے کام لیا ہے۔
آیا امداد باہمی کی انجمنوں کی ذمہ داری محدود ہو یا غیر محدود یہ مسئلہ اتحادی حلقوں میں
جکل خاصی دلچسپی کا موضوع بنا ہوا ہے۔ ہندوستان میں غالباً سب سے پہلے میں نے باضابطہ
ر پر اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ امداد باہمی کی انجمنوں کی ذمہ داری غیر محدود نہیں ہونی
ہیئے کیونکہ اس کی وجہ سے ذی حیثیت لوگ اس میں شامل نہیں ہوتے۔ دوسرے جہاں تک
ں ذمہ داری کا تعلق ہے غیر محدود ذمہ داری کا نفاذ بڑے پیمانہ پر عملاً نہیں کیا جا سکتا
پنجاب۔ بہار۔ اڑیسہ اور برار کا تجربہ میرے بیان کی تصدیق کرتا ہے۔ مجھے
ں امر سے بہت مسرت ہوئی کہ کیٹی کے ایک گروہ نے بھی یہی زاویۂ نگاہ پیش کیا ہے۔
(ا۔ا۔ق)

مفید درسی کتابیں کوڑیوں کے مول

جدید جغرافیہ دنیا ۔ مکمل مع نقشہ جات ضخامت ۳۲۰ صفحے ۔ یہ جغرافیہ پانچویں سے لیکر آٹھویں جماعت تک کام دے سکتا ہے ۔ اصلی قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ ۔ رعایتی قیمت صرف پانچ آنہ ۔

تاریخ ہند ۔ مکمل مع نقشہ جات ضخامت ۳۸۰ صفحے طالب علموں کے لئے یہ بہت کار آمد کتاب ہے ۔ اصلی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ ۔ رعایتی قیمت صرف چار آنہ سکۂ عثمانیہ ۔

جغرافیہ ملک سرکار عالی ۔ مع رنگین نقشہ جات و تصاویر ۔ یہ جغرافیہ تیسری اور چوتھی جماعتوں کے لئے لکھا گیا ہے ۔ رعایتی قیمت صرف دو آنہ سکہ عثمانیہ ۔

سلیس جغرافیہ دکن ۔ رعایتی قیمت صرف ایک آنہ سکہ عثمانیہ ۔

اصول حفظان صحت ۔ مع تصاویر ۔ بہت دلچسپ انداز میں حفظان صحت کے جملہ اصول لکھے گئے ہیں ۔ قیمت دو آنہ چار پائی سکہ عثمانیہ ۔

المشتہر سید عبد القادر اینڈ سنس تاجران کتب و پبلشرز مالک اعظم اسٹیم پریس
گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدر آباد (دکن)

کارنامہ حیدری ۔ رائٹ آنریبل نواب سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم مملکت آصفیہ کی مکمل سوانح حیات مع خدمات و پیامات قلمبند کئے گئے ہیں جس میں متعدد تصاویر کاغذ اور چھپائی نفیس ۔ قیمت مجلد (ے ر)

مشاہیر ہند ۔ اس کتاب میں چھ مشاہیر ہندوستانی یعنی آغا خاں ۔ اقبال ۔ سر اکبر حیدری ۔ بوس ٹیگور اور جواہر لعل نہرو کے سبق آموز سوانح حیات اور ان کی علمی ادبی کارناموں پر تبصرے قوم پرستی کے کارنامے اور ان کے پیغامات کو بہترین پیرایہ میں درج کیا گیا ہے ۔ قیمت مجلد (ع ر)

المشتہر عبد القادر اینڈ سنس تاجران کتب و پبلشرز مالک اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز

مکتبۂ جامعہ کی نئی کتابیں

خطوطِ محمد علی یہ اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا نے اپنے عزیزوں، دوستوں اور ملک کے سربرآوردہ حضرات کو لکھے تھے۔ اُن میں سے چند خط اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور بقیہ "محمد علی میوزیم" کتب خانہ جامعہ سے لئے گئے ہیں۔

کسی شخص کے خط صحیح معنوں میں اُس کی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ سوچتا ہے اور جو اس کے دل پر گزرتی ہے بلا تکلف اپنے دوستوں کو لکھ دیتا ہے۔ مرحوم کا تو یہ حال تھا کہ وہ سیاست تک میں زمانہ سازی اور ظاہر داری کے قائل نہ تھے اور اپنے دوستوں کو لکھنے میں تکلیف نہ برتتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ خطوط ہندوستان کے ایک ہنگامہ خیز دور کی تاریخ کے ابواب ہیں اور مرحوم کی شخصیت کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ۔ حجم ۳۲۰ صفحات۔ قیمت عہ ۸/

بحرالکاہل کی سیاست مصنفہ ابن خالدی۔ اس مقالے میں مصنف نے بحرالکاہل کی سیاسی اور معاشی اہمیت ظاہر کی ہے۔ موصوف نے امریکہ، جاپان، روس، انگلستان اور چین کے مفاد کے باہمی اتحاد اور ان کی ایک دوسرے سے ٹکر کے امکانات پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔ قیمت عہ روپے۔

اسلامی ممالک کی سیاست مصنفہ عشرت علی۔ مصنف نے اس کتاب میں مختلف اسلامی ملکوں کی سیاسی اور تاریخی ارتقا پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ جنگ عظیم سے پہلے مصر، ترکی، عراق، عرب اور ایران وغیرہ کی سیاسی اہمیت کیا تھی اور جنگ عظیم کے بعد ان ملکوں میں کس قسم کی نئی سیاسی تحریکیں اٹھیں ان کا کیا حشر ہوا اور موجودہ وقت میں ان کی سیاسی اور جنگی حیثیت کیا ہے۔ قیمت عہ روپے۔

قومیت اور بین اقوامیت مصنفہ محمد قاسم حسن۔ مصنف نے اس مقالے میں قومیت کے مفہوم کی تشریح کی ہے اور اس کے عناصر سے بحث کی ہے نیز بتایا ہے کہ قومیت کا ارتقا کس طرح ہوا مشرق میں قومیت کا تصور کیا ہے اور یورپ والے کس قسم کی قومیت کے قائل ہیں۔ اس مسئلہ کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ بین اقوامیت کے تخیل کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ اس کا موجودہ تصور کیا ہے اور مستقبل میں اس کی کیا نوبت ہوگی۔ آخر میں انجمن اقوام کی ہیئت، اس کے ارتقا، اس کی کارگزاریاں اور اس کی ناکامی کے اسباب پر بھی تبصرہ ہے۔ قیمت عہ روپے۔

نازیت مصنفہ شاہد حسین رزاقی۔ یہ سمجھنا کہ نازیت کا تخیل ہٹلر کی دماغی پیداوار ہے اور ہٹلر نہ رہے تو نازیت خود بخود ختم ہو جائے گی بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہٹلر نازیت کی پیداوار ہے اور یہ نظریہ دراصل ایک جدید ارتقا کا نتیجہ ہے جسے ہٹلر نے پروان چڑھایا۔ مصنف نے آخر میں نازیت کے اچھے اور بُرے پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا ہے۔ قیمت عہ روپے۔

ناموران سیاست موجودہ جنگ کی وجہ سے ہر شخص کو سیاسی معاملات سے خاص دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ ہٹلر، مسولینی، روزولٹ، اسٹالن، چرچل اور عصمت انونو ہر شخص کی زبان پر رہتے ہیں۔ اُن کے حالات سے ناواقفیت کی بنا پر معاملات صحیح طور پر سمجھنے میں کبھی کبھی دشواری پیدا ہوتی ہے۔ اس کتاب میں ایشیا اور یورپ کے انھیں مسلمہ سیاسی رہنماؤں کے حالات درج ہیں اس میں بہت سے ایسے لوگوں کے حالات بھی ملیں گے جو غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے لیکن اپنی ہمت کی رہنمائی سے آج بڑی بڑی سلطنتوں کی آزادی اُن کے رحم و کرم پر موقوف ہے۔ قیمت حصہ اول ۶ر

حصہ دوم "مشاہیر عالم" زیر ترتیب ہے۔

ٹروٹسکی ۔ مترجمۂ۔ ایم ایم۔ جوہر۔ ٹروٹسکی کو کون نہیں جانتا۔ موجودہ روسی حکومت نے اسے باغی

قرار دیا گیا تھا۔ اس کے جو ساتھی اب تک روس میں موجود تھے ۱۹۳۶ء میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ ان مجرموں نے اپنے جرم کی ذمہ داری ٹروٹسکی پر ڈال دی۔ ٹروٹسکی کی صفائی اور غداری کی خاطر امریکہ میں ایک کمیشن بنایا گیا جس نے ٹروٹسکی کے بیانات لئے۔ یہ کتاب انہی بیانات کا خلاصہ ہے۔ اس میں ان تمام کارناموں کا کچا چٹھا ہے جو روس میں اشتراکیت کے پردے میں کئے جا رہے ہیں۔ شروع میں روسی انقلاب کی مختصر سی تاریخ بھی آگئی ہے۔ زبان اتنی صاف اور سہل ہے کہ معمولی استعداد کا آدمی بھی اچھی طرح ذہن نشین کر سکتا ہے۔ قیمت دس آنے۔

بت تراش از پروفیسر اشتیاق حسین قریشی۔ اس ڈرامے میں مصنف نے ایک بت تراش کی نفسی کیفیات کی تصویر کھینچی ہے اور اسی سلسلے میں حسن و عشق اور دنیا کی تخلیق میں رنج و مسرت کے وجود پر ایک فلسفیانہ نظر ڈالی ہے۔ انداز تحریر اس قدر دلکش ہے کہ پڑھنے والا مصنف کی نظر سے دیکھتا ہے اور اسی کے دماغ سے سوچتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ قیمت ۸/

صدر دفتر مکتبہ جامعہ قرول باغ، نئی دہلی

شاخیں:- (۱) مکتبہ جامع مسجد دہلی (۲) مکتبہ جامعہ بیرون لوہاری دروازہ، لاہور (۳) مکتبہ جامعہ امین آباد لکھنو (۴) مکتبہ جامعہ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

سول ایجنسیاں:- (۱) کتاب خانہ عابد شاپ۔ حیدرآباد دکن۔
(۲) سرور بک ایجنسی بازار قصہ خوانی۔ پشاور۔

جغرافیہ اور اٹلس تاریخی وجغرافیہ

(مرتبہ مولوی سید شرف الدین صاحب قادری ایم اے، بی ٹی)

جیبی اٹلس تاریخ وجغرافیہ یہ اُردو زبان میں ایک پہلا اٹلس ہے۔ قریب قریب نصابی حیثیت سے مکمل ہونے کے علاوہ عام شائقین کے دلچسپی کا باعث ہے۔ طلباء کے لئے تو نہایت ہی مفید ہے جس میں عکسی بلاکوں کے (۴۲) عدد نقشے رنگین اور ... سادہ نقشہ جات وتصاویر کے علاوہ تاریخ اور جغرافیہ کے متعلق پوری پوری شرح موجود ہے۔ ضخامت ۸۵ صفحہ۔ قیمت ۷ ر کلدار یا ۸ ر حالی۔

مصور جیبی اٹلس دنیا یہ اٹلس شروع سے آخر تک عکسی بلاکوں کے ذریعہ قیمتی آرٹ پیپر پر نہایت ہی آب وتاب کے ساتھ ابھی چند ہی روز ہوئے طبع وشائع ہوئی ہے۔ سب نقشہ جات وتصاویر رنگین بلاکوں پر چھپے ہیں۔ جس کا مطالعہ طالب علموں کے لئے ہر حیثیت سے مفید اور کارآمد ہے۔ قیمت ۷ ر کلدار یا ۸ ر حالی۔

مرقع عالم اس کو مؤلف نے برسوں کی محنت اور سالہا سال کے وسیع تجربہ کے بعد اہل ملک کے سامنے پیش کیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ علم دوست حضرات شوق ورشوق اس کے مطالعہ سے دلچسپی لے کر مؤلف صاحب کی رہنمائی فرمائیں گے۔ یہ ۳ حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں ہاف ٹون بلاک کی رنگین وسادہ ۴۴ تصویریں اور دوسرے حصے میں لائن بلاک کے ۶۴ رنگین نقشے ہیں۔ تیسرے حصہ میں ہر دو کا خلاصہ بشکل مضمون دیا گیا ہے۔ آج تک تاریخ اور جغرافیہ عام معلومات کے لئے کوئی کتاب اس نوعیت کی شائع نہیں ہوئی۔

قیمت مجلد عہ ۸ ر کلدار یا عہ ۱۴ ر حالی

کتب خانہ

حیدرآباد میں یوں تو کئی کتب خانے ہیں لیکن کمیاب، نادر اور جدید اردو، ادبی، تاریخی، مذہبی و اخلاقی کتب مکمل طور سے ایک جگہ کہیں بھی دستیاب نہیں ہو سکتی تھیں۔ یہ کمی حیدرآباد کے قدیم پچاس سالہ کتب خانہ سید عبدالقادر اینڈ سنس "چارمینار" نے پوری کر دی ہے۔ مثال کے طور پر مولوی سید علی بلگرامی ۔ حمد کا شہرۂ آفاق کتاب "تمدن عرب" کو جو کہ مدتوں سے نایاب تھی ور روپیہ پر بھی نہیں مل سکتی تھی اس کتب خانہ کے مالک ہمت کر کے نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کی اور اس کی قیمت صرف ۹ روپیہ رکھی فون نمبر ۳۴۰۱۔

اس کتب خانہ کے زیر اہتمام ایک خاص شعبہ قائم ہے جو مشہور مؤلفین و مصنفین کی کتب کے شائع کرنے کا انتظام کرتا ہے۔ جو اہل قلم حضرات تصانیف کو شائع کرنا چاہتے ہیں اس کے متعلق ہر وقت مشورہ فرما سکتے ہیں۔ اس کتب خانہ کے تحت ایک پریس بھی ہے جو اعظم اسٹیم پریس کے نام سے مشہور ہے۔ جہاں ہر قسم کا رنگین و سادہ کام بکفایت اور وعدہ کی پابندی کے ساتھ ہوتا ہے۔ فون نمبر ۳۴۰۳

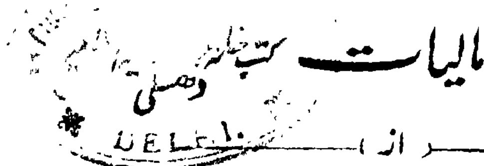
معزز حضرات کی سہولت کی خاطر اس کتب خانہ کی ایک شاخ موسومہ سید عبدالرزاق تاجر کتب عابد روڈ پر بھی قائم کی گئی ہے جہاں اردو انگریزی لٹریچر کا کثیر اسٹاک موجود ہے جہاں تشریف فرما ہو کر کتب ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔ فون نمبر ۲۸۰۷

سیاست

جلد ۲ | جولائی ۱۹۴۲ عیسوی | نمبر ۳

فہرست مضامین

مالیات عامہ اور ہندوستانی مالیات



از

جناب ڈاکٹر جعفر حسن صاحب پی، ایچ، ڈی صدر شعبۂ عمرانیات
(جامعہ عثمانیہ سرکار عالی)

دیسی ریاستوں کی آمدنی ہندوستان میں چھوٹی بڑی تقریباً ۶ سو دیسی ریاستیں قائم ہیں جو پرانے زمانے کی یادگار یا برطانوی حکومت کی پروردہ ہیں ان ریاستوں کو مختلف درجوں کی اہمیت اور خود مختاری حاصل ہے، مالیات کے نقطۂ نظر سے بعض ریاستیں برطانوی صوبوں سے زیادہ اہم ہیں، مثلاً بھاؤنگر کی آمدنی سرحدی صوبے یا اڑیسہ سے زیادہ ہے. کشمیر کی آمدنی آسام سے زیادہ ہے. میسور کو سندھ سے زیادہ ملتا ہے اور حیدرآباد کی آمدنی متوسط صوبے یا بہار کی آمدنی سے ڈیوڑھی ہے.

آمدنی کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہم ریاستیں یہ ہیں۔

۱۔ حیدرآباد (سالانہ آمدنی کا معتبر اندازہ)	۸،۵۰،۰۰،۰۰۰
۲۔ میسور (" " " ")	۳،۷۵،۰۰،۰۰۰
۳۔ جموں، کشمیر (" " " ")	۲،۷۰،۰۰،۰۰۰
۴، ۵، ۶۔ گوالیار، بڑودہ، ٹراونکور (ہر ایک کی آمدنی)	۲،۵۰،۰۰،۰۰۰
۷۔ بھاؤنگر	۲،۰۰،۰۰،۰۰۰
۸، ۹۔ جودھپور یا پٹیالہ (" " ")	۱،۵۰،۰۰،۰۰۰
۱۰، ۱۱۔ جے پور، بیکانیر (ہر ایک کی آمدنی)	۱،۲۵،۰۰،۰۰۰

۱۲- اندور ۰۰۰، ۰۰، ۵، ۱، ۱

ایک کروڑ اور پچاس لاکھ کے درمیان (گھٹتی ہوئی نسبت سے) آمدنی ناؤنگر، جوناگڈھ، بھوپال، کوچین، اودے پور، کولھاپور، موروی، ریوا اور گنڈول کی ہے۔

۵۴ ریاستیں مثلاً رام پور، الور، کپورتھلہ، نابھا، کوچ بہار، ٹونک، دتیا، راجکوٹ وغیرہ ایسی ہیں جن کی سالانہ آمدنی ۵۰ لاکھ سے کم اور دس لاکھ سے زیادہ ہے گویا ۶۰۰ ریاستوں میں سے

۲۵ ریاستوں کی آمدنی نصف کروڑ سے زیادہ ہے۔

۴۵ " " " پچاس لاکھ اور دس لاکھ کے درمیان ہے بقیہ ریاستوں کی آمدنی دس لاکھ بھی نہیں۔

دس لاکھ اور ایک لاکھ کے درمیان آمدنی پانیوالی ریاستیں ۴۵، ہیں بقیہ ۳۷۵ ریاستوں کی آمدنی ایک لاکھ سے بھی کم ہے۔ یہ ریاستیں صرف نام کی ریاستیں ہیں۔ ان کا درجہ اور مرتبہ درحقیقت مثل جاگیرداروں کے ہے اُن میں سے دوسو نام نہاد "ریاستیں" ایسی ہیں جن کی آمدنی دس ہزار روپیہ سالانہ سے کم ہوتے ہوتے چند سو رہ جاتی ہے۔

دو ریاستیں نہارا اور بلبری تو ایسی ہیں جنھیں سالانہ سو روپیہ بھی نہیں ملتے!!

بیسیوں "ریاستیں" ہیں جن کا رقبہ ایک مربع میل بھی نہیں۔ اور کئی ریاستیں ایسی ہیں جن کی آبادی سو سے کم ہے!! ان مضحکہ انگیز ریاستوں سے لے کر چھوٹی بڑی تمام ریاستوں کی سالانہ آمدنی کا معتبر اندازہ بچپن کروڑ سے کم اور پچاس کروڑ سے زیادہ کیا جانا چاہئے۔

آٹھ دس برس ہوئے سر ولیم بارٹن سابق رزیڈنٹ حیدرآباد نے تمام ریاستوں کی آمدنی کا اندازہ ۴۸ کروڑ کیا تھا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ موجودہ زمانے میں تمام دیسی ریاستوں کی آمدنی پچاس تا پچپن کروڑ ہوگی۔

دیسی ریاستوں کے ذرائع آمدنی میں سب سے زیادہ اہم مالگزاری ہے۔ اِس کے بعد آبکاری، کروڑگیری، ریل، جنگل، سود وغیرہ کو اہمیت حاصل ہے۔

بعض بعض ریاستوں کے خصوصی ذرائع آمدنی ہیں مثلاً بڑودہ اگرچہ خود دیسی ریاست اور برطانوی حکومت کی باج گذار ہے مگر اسے دوسری ریاستوں سے (جو کسی زمانہ میں بڑودہ کے تحت تھیں یا اُس سے متعلق ہوگئی تھیں) چھ سات لاکھ روپیہ سالانہ خراج ملتا ہے۔ گویا بڑودہ خراج کی لین دار بھی ہے اور دین دار بھی۔

میسور کا شمار بلاشبہ ہندوستان کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ریاستوں میں ہوتا ہے۔ اُس نے صنعت کو فروغ دیکر اپنی آمدنی میں خاصہ اضافہ کرلیا ہے۔ میسور کا ریشم، سُونا، صندل، ہاتھی، اور جل بجلی سارے ہندوستان کے لیے قابل قدر اور قابلِ رشک ہے۔ سونے کی کان ہے تو میسور میں مگر اس سے زیادہ تر انگریزی کمپنی مستفید ہوتی ہے ریاست کو البتہ خالص آمدنی کا ایک جزو ملتا ہے۔ تقریباً ۲۰ لاکھ سالانہ۔

حیدر آباد کو سکّے بنانے اور کاغذی روپیہ جاری کرنے کی وجہ سے پندرہ بیس لاکھ سالانہ ملتے ہیں۔ بعض ساحلی دیسی ریاستوں کو نمک سے بھی منافع ہوتا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہے کہ ریاستوں کے اِن خُصوصی ذرائع کو نظرانداز کرتے ہوئے عام ذرائع آمدنی وہی ہیں جو بقیہ صوبائے ہندوستان کے ہیں۔ بطور مثال ہم سب سے بڑی دیسی ریاست حیدر آباد اور راجپوتانے کی مشہور ریاست جودھپور کی آمدنی کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ کرتے ہیں۔

حیدرآبادی مالیات

حیدر آباد کی ریاست میں آمدنی کے ذریعے اور اُن سے حاصل کی ہوئی آمدنی کے جدید ترین اعداد یہ ہیں۔

	۱۹۳۸-۳۹ء (۱۳۴۸ف) کی حقیقی آمدنی	۱۹۴۰-۴۱ء (۱۳۵۰ف) کی متوقع آمدنی
مالگذاری	۲،۹۵،۳۵،۰۰۰	۳،۱۰،۰۰،۰۰۰

آبکاری گانجہ، افیون	۱،۸۲،۰۵،۰۰۰	۱،۸۸،۵۰،۰۰۰
ریلیں	۱،۴۱،۲۲،۰۰۰	۱،۳۵،۰۰،۰۰۰
کروڑگیری	۱،۱۱،۲۶،۰۰۰	۱،۲۰،۰۰،۰۰۰
سود	۳۰،۵۴،۰۰۰	۳۱،۰۰،۰۰۰
برار کا معاوضہ	۲۹،۱۷،۰۰۰	۲۹،۱۷،۰۰۰
سکہ سازی، کاغذی زر اور تبادلہ	۲۳،۲۱،۰۰۰	۲۷،۶۷،۰۰۰
پٹرول محصول، سواری محصول، شکر محصول، سگریٹ محصول۔	۲۱،۳۱،۰۰۰	۲۹،۹۰،۰۰۰
اسٹامپ	۱۷،۳۸،۰۰۰	۱۷،۵۰،۰۰۰
پٹہ خانہ (ڈاک)	۱۴،۰۵،۰۰۰	۱۴،۵۰،۰۰۰
جنگل	۱۲،۱۲،۰۰۰	۱۳،۱۰،۰۰۰
کان کنی (معدنی ذخیروں کی آمدنی)	۵،۳۸،۰۰۰	۵،۵۰،۰۰۰
بجلی	۳،۰۳،۰۰۰	۵۰،۰۰۰
رجسٹریشن	۲،۵۸،۰۰۰	۲،۵۰،۰۰۰

یہ اعداد ۱۳۵۰ف (فصلی) کے انگریزی بجٹ نوٹ سے لئے گئے ہیں۔ حیدرآباد کا سرکاری سنہ فصلی کہلاتا ہے۔ فصلی سال کا آغاز ۶ ؍ اکتوبر کو ہوتا ہے۔ ۱۳۴۸ف کی حقیقی آمدنی ۶ ؍ اکتوبر ۱۹۳۸ء اور ۵ ؍ اکتوبر ۱۹۳۹ء کے درمیانی سال کی ہے فصلی اور عیسوی سنون کے رواج کی وجہ سے کئی مرتبہ پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ عیسوی سنہ بین اقوامی اہمیت رکھتا ہے اور کل ہند اہمیت حاصل کر چکا ہے کیا اچھا ہو کہ حیدرآباد میں بھی اسی سنہ کو اختیار کیا جائے۔

متغرق	۲،۵۳،۰۰۰	۱،۵۰،۰۰۰
آب پاشی	۴۷،۰۰۰	۵۰،۰۰۰
حقیقی آمدنی ۱۹۳۸-۳۹ء (۱۳۴۸ف)۔	۸،۹۲،۶۴،۰۰۰	۹،۲۶،۸۵،۰۰۰
صنعتی محفوظہ، قحط فنڈ اور ٹرک سے	ن۔ ۲۲،۰۸،۰۰۰	۳۱،۹۵،۰۰۰
ٹیلیفون خسارہ		۳۴،۰۰۰۔
عثمانیہ سکے میں ۱۹۳۸-۳۹ء کی کل آمدنی	۹،۱۴،۷۲،۰۰۰	۹،۶۸،۴۶،۰۰۰ حالی
برطانوی سکے میں ۱۹۳۸-۳۹ء کی کل آمدنی	۷،۸۵،۰۰،۰۰۰	۸،۳۰،۰۰،۰۰۰ کلدار

گذشتہ چند سال میں حیدرآبادی ریاست کی آمدنی یہ تھی۔

کیفیت موازنہ

۱۳۴۰ف	۱۹۳۰-۳۱ء۔ کل آمدنی	
۱۳۴۱ف	۱۹۳۱-۳۲ء " "	
۱۳۴۲ف	۱۹۳۲-۳۳ء " "	۸،۰۶،۱۸،۰۰۰
۱۳۴۳ف	۱۹۳۳-۳۴ء " "	۷،۹۵،۲۷،۰۰۰
۱۳۴۴ف	۱۹۳۴-۳۵ء " "	۸،۵۳،۳۱،۰۰۰
۱۳۴۵ف	۱۹۳۵-۳۶ء " "	۹،۰۵،۹۱،۰۰۰
۱۳۴۶ف	۱۹۳۶-۳۷ء " "	۹،۴۳،۳۲،۰۰۰
۱۳۴۷ف	۱۹۳۷-۳۸ء " "	۹،۳۹،۹۶،۰۰۰
۱۳۴۸ف	۱۹۳۸-۳۹ء حقیقی کل آمدنی	۹،۱۴،۷۲،۰۰۰

۱۳۴۹ف ۱۹۳۹-۴۰ء - متوقع آمدنی ...،۴۰،۰۴،۱۴،۹

۱۳۵۰ف ۱۹۴۰-۴۱ء بجٹ کے مطابق متوقع آمدنی ...،۴۶،۶۸،۹

اِن اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد ریاست کی سالانہ آمدنی نو کروڑ ہے اور کلدار کے مطابق پونے آٹھ کروڑ ...،۰۰،۷۵،۷۔

حیدرآبادی مالیات کے متعلق چند باتیں قابل لحاظ ہیں:۔

(۱) سب سے پہلے یہ کہ حیدرآبادی ریاست کا ذاتی روپیہ ہے۔ جسے حالی سکہ یا موجودہ تاجدار کے نام نامی سے عثمانیہ سکہ کہتے ہیں۔ برطانوی ہند کے روپیہ کو حیدرآباد میں کلدار روپیہ کہتے ہیں۔ حالی سکہ کی قدر و قیمت برطانوی ہند کے سکہ کے مقابلہ میں ہمیشہ کم رہتی ہے۔ کلدار حالی اور حالی کلدار کی شرح تبادلہ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ حالی کلدار شرح تبادلہ کی انتہائی شرحیں (۱۱۵/۱۰) اور (۱۱۸/۱۲) فی سو روپیہ کلدار مقرر کی گئی ہیں[1]۔ یعنی سرکار نے ایسا انتظام کیا ہے کہ حالی کلدار کا بھاؤ (۱۱۵/۱۰) اور (۱۱۸/۱۲) کے درمیان رہے گا۔ فی سو روپیہ کلدار کم سے کم (۱۱۵/۱۰) یا زیادہ سے زیادہ (۱۱۸/۱۲) ملیں گے۔

سرکاری (مستقل) شرح تبادلہ (۱۱۶/۱۰/۸) فی سو کلدار ہے۔ اِس شرح کے مطابق چھ کلدار کے سات حالی ہوتے ہیں لہذا ...،۰۰،۶ کلدار کے ...،۰۰،۷ حالی ہوں گے۔ اور ۷ کروڑ حالی کے اِسی شرح سے صرف ۶ کروڑ کلدار ہوں گے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ حیدرآبادی سکہ یعنی حالی روپیوں میں ۱۹۳۸-۳۹ء کی آمدنی اگرچہ نو کروڑ ۱۵ لاکھ تھی مگر برطانوی روپیہ کے مطابق صرف سات کروڑ ۸۵ لاکھ ہوتی ہے۔ کئی لوگوں نے حیدرآباد کے موازنہ کا مقابلہ کسی اور ریاست یا برطانوی ہند کے

---

[1] The Economic life of Hyderabad صفحہ ۱۳۲۔ نیم سرکاری اشاعت ۱۹۳۶ء

کسی صوبے سے کرتے وقت یہ غلطی کی ہے کہ حیدرآباد کے سکّے کی قدر و قیمت کا لحاظ نہیں رکھا چونکہ علمی کتابوں اور تحقیقی مقالوں میں بھی یہی ہوتا ہے اور دو مختلف قدر و قیمت کے سکوں کا باہمی تقابل کیا جاتا ہے لہذا اس غلطی کی طرف خاص طور پر توجہ مبذول کرائی جاتی ہے۔ غرض یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ حیدرآبادی مالیات کے متعلق تمام حوالے حیدرآبادی روپیوں میں ہوتے ہیں اور خاص کر بیرون حیدرآباد سے مقابلہ کرتے وقت اس فرق کا لحاظ رکھا جانا لازمی ہے چونکہ تمام اِعداد کا برطانوی ہند کے روپیہ میں منتقل کرنا طول عمل اور دردسری کا باعث ہوتا لہذا سہولت کی خاطر میں نے بھی تمام اِعداد حیدرآبادی روپیوں میں دیئے ہیں البتہ میزان کو کلدار میں بھی ظاہر کیا ہے۔

حیدرآباد کی مالیات کے متعلق دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ ریاست کی آمدنی کے اہم ترین ذرائع اگرچہ مالگذاری اور آبکاری ہیں مگر کل ریاست میں جس قدر مالگذاری اور آبکاری وصول کی جاتی ہے وہ صرف ریاست کو نہیں ملتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مالگذاری اور حق ملکیت کے نقطہ نظر سے ریاست کئی حصوں میں منقسم ہے جنھیں دیوانی، صرفخاص، سمستان اور جاگیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جو علاقے براہ راست ریاست کے تحت ہوں اور کلیتاً ریاست کے قبضہ میں ہوں اُنہیں محض "دیوانی" یا "دیوانی علاقہ" یا "خالصہ" کہتے ہیں۔ ریاست کا تقریباً ۵۵ فیصد رقبہ دیوانی ہے۔

جو علاقے اعلیحضرت حضور نظام کی ملکیت میں ہیں اُنہیں "صرفخاص" کہا جاتا ہے یعنے وہ علاقے جن کی آمدنی "صرف خاص" کے لیے مقرر کر دی گئی ہو۔ "صرفخاص" کے علاقوں سے جتنی آمدنی (زیادہ تر مالگذاری اور آبکاری) وصول ہوتی ہے وہ کلیتاً اعلیحضرت حضور نظام کی ہوتی ہے۔ صرفخاص کی اَہمیت کے مدنظر اس کا اِنتظام ریاستی اِنتظام سے علیحدہ طور پر کیا جاتا ہے۔ موزونیت اور ضرورت کے مطابق جا بجا صرفخاص

کے محکمے اور سررشتے قائم ہیں جو ریاست کے محکموں اور سررشتوں سے الگ ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں اشتراکِ عمل ضروری ہے مگر پھر بھی دونوں کی نوعیت جداگانہ ہے۔ صرفخاص کی آمدنی کا اندازہ ۱½ کروڑ سالانہ کیا جاتا ہے۔

حیدرآباد میں بعض قدیم سلطنتوں کی یادگار جاگیریں موجود ہیں مختلف زمانوں میں یہ ریاست نما جاگیریں مختلف حاکموں کو خراج ادا کرتی تھیں۔ عرصہ تک مرہٹوں کو چوتھ ملا کیا اور انگریزی عملداری نے بھی ان سے خراج حاصل کیا۔ ان علاقوں کو "سمستان" کہتے ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ اہم گدوال کی سمستان ہے۔ سمستانوں کی کل تعداد دس بارہ ہے جن میں پالونچہ ونپرتی، جٹپرول، امرچنتا گرد گننہ وغیرہ ہیں۔ ہر ایک سمستان کی طرف سے حیدرآباد ریاست کو کچھ نہ کچھ پیشکش ضرور ملتا ہے۔ گدوال کا پیشکش ۱ لاکھ پندرہ ہزار، ونپرتی کا ۸۲۰۰۰ اور جٹپرول اور امرچنتا کا تقریباً پون پون لاکھ ہے۔ کل سمستانوں کی مجموعی آمدنی کا اندازہ پچیس تیس لاکھ سے کم نہیں۔

صرفخاص مبارک اور سمستانوں کے علاوہ حیدرآباد میں تین بڑی بڑی جاگیریں ہیں جنھیں پائیگاہیں کہتے ہیں۔ ریاست کی خودمختاری کے وقت سے یہ پائیگاہیں قائم ہیں۔ سب سے بڑی پائیگاہ کرکٹ کے مشہور سرپرست نواب معین الدولہ بہادر مرحوم کی ہے اس کا رقبہ ۲ ہزار مربع میل ہے اور آمدنی ۲۲ لاکھ ہے۔ تینوں پائیگاہوں کی مجموعی سالانہ آمدنی تقریباً نصف کروڑ ہے۔

صرف خاص، سمستانوں اور پائیگاہوں کے علاوہ چھوٹی بڑی کئی جاگیریں ہیں جن کی آمدنی متعلقہ جاگیرداروں کو ملتی ہے۔ ان جاگیروں کے اہم ترین ذرائع آمدنی مالگذاری اور آبکاری ہیں۔ ہر جاگیر کی حیثیت، رقبہ آبادی اور آمدنی کے مطابق مختلف ہے۔ بڑی بڑی جاگیروں کو دیوانی اور فوجداری کے حقوق حاصل ہیں۔ انکی پولیس بھی علٰحدہ ہے۔ البتہ ہر جگہ ریاست کی بڑھتی ہوئی نگرانی کیوجہ سے حالت کسی قدر بہت

رفتار پر ہی سہی) رو بہ اصلاح ہے۔

سب سے بڑی جاگیر نواب سالار جنگ بہادر کی ہے۔ جن کے دادا حیدر آباد کے محسن اعظم اور کل ہند شہرت اور مقبولیت پانے والے مدبر تھے۔ موجودہ نواب سالار جنگ بہادر بھی کچھ عرصہ کے لیے وزارت کر چکے ہیں۔ اور اپنے باپ دادا کی طرح حیدر آباد کی علمی، تمدنی اور مادی دولت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد مرحوم کی جاگیر کی آمدنی دس لاکھ سے زیادہ کی ہے۔ حیدر آباد کے ممتاز جاگیرداروں میں (جو ریاست کے باہر بھی شہرت حاصل کر رہے ہیں) نواب کمال یار جنگ بہادر، نواب مہدی جنگ بہادر اور "قائد ملت" نواب بہادر یار جنگ بہادر ہیں۔ اول الذکر کل ہند تعلیمی کانفرنس کے صدر رہ چکے ہیں اور کئی تمدنی تحریکوں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ نواب مہدی جنگ بہادر نے ٹینس کی سرپرستی کر کے کھیل سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں میں بجا طور پر مقبولیت حاصل کی اور بہادر یار جنگ بہادر مسلم عوام کے ہر دلعزیز رہنما ہیں۔

متذکرہ جاگیروں کے علاوہ مختلف وسعت اور نوعیت کی سینکڑوں جاگیریں ہیں جن کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکی۔ مجموعی آمدنی کا البتہ اندازہ لگایا گیا ہے اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ چھوٹی بڑی تمام جاگیروں کی مجموعی آمدنی کسی طرح پچاس لاکھ سے کم نہیں ہے۔

ریاست حیدر آباد سے کل مالگزاری اور آبکاری جس قدر وصول ہوتی ہے اس کا اندازہ ایک اور طرح لگایا جا سکتا ہے۔ ریاست حیدر آباد کا صرف پچپن فی صد رقبہ دیوانی ہے۔ بقیہ ۴۵ فی صد رقبہ صرفخاص، پائیگاہوں اور جاگیروں پر مشتمل ہے۔ ہمیں یقین سے معلوم ہے کہ دیوانی علاقوں کی مالگزاری اور آبکاری پونے پانچ کروڑ (۴،۷۵،۰۰،۰۰۰) سالانہ ہوتی ہے۔ اگر جس نسبت سے دیوانی علاقوں سے آمدنی ہوتی ہے اسی نسبت سے غیر دیوانی علاقوں سے بھی آمدنی ہوتی ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ

صرفخاص مبارک، پائیگاہوں، سمستانوں اور جاگیروں کو تقریباً ۳¾ کروڑ آمدنی ہوتی ہوگی اور اس طرح کل ممالک محروسہ سرکار عالی سے دیوانی اور غیر دیوانی علاقوں کی مالگذاری ۴،۷۵،۰۰،۰۰۰ + ۳،۷۵،۰۰،۰۰۰ یعنی ۸،۵۰،۰۰،۰۰۰ ہے۔

حیدرآباد کے سرکاری ذرائع آمدنی کے بارے میں تیسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ یہاں آمدنی محصول (انکم ٹیکس) اب تک رائج نہیں ہوا۔ مالیات کے ممتاز محققوں کے نزدیک آمدنی محصول بہت ہی جائز اور مناسب ذریعہ آمدنی ہے جسکی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ آسانی سے منتقل نہیں ہوسکتا اور اس کی بدولت مالدار لوگ اپنی حیثیت اور آمدنی کے مطابق سرکاری اخراجات کا بار سہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

دنیا کے تمام آزاد اور ترقی پذیر ملکوں میں آمدنی محصول رائج ہے۔ برطانوی ہندوستان میں آمدنی محصول ۱۸۶۰ء سے مستقل طور پر ذریعہ آمدنی بن گیا ہے اور اس کی بدولت مرکزی حکومت کو تیرہ چودہ کروڑ روپیہ سالانہ ملتے ہیں۔ دیسی ریاستوں میں بڑودہ، ٹراونکور اور ترقی پذیر میسور میں آمدنی محصول لیا جاتا ہے ۱۹۳۵ء سے کشمیر میں بھی انکم ٹیکس لیا جاتا ہے۔ اس ٹیکس کی بدولت میسور کو تقریباً ۳۵ لاکھ سالانہ وصول ہوتا ہے۔

اگر حیدرآباد میں بھی صرف جاگیرداروں، سیٹھ ساہوکاروں، سرکاری عہدہ داروں اور مرفہ الحال تاجروں اور گتہ داروں سے معقول شرح پر انکم ٹیکس وصول کیا جائے تو ریاست کی آمدنی میں ایک کروڑ کا اضافہ ممکن ہے۔

برطانوی ہند میں انکم ٹیکس کے متعلق جتھار اور بیری نے اپنی معروف کتاب ہندوستانی معاشیات میں لکھا ہے:-

جنگ سے پہلے بہت کم محصول آمدنی The yield of the income tax before

وصول ہوتا تھا، تقریباً ۳ کروڑ روپئے۔ مالدار طبقے بہت آسانی سے بچ نکلتے تھے اور بار محصول میں سے اپنے حصہ کا جائز بار برداشت نہیں کرتے تھے[1]	the war was very small, being only about Rs. 3 crores. The richer classes escaped two lightly and did not bear theii legitimate share of the burden of taxation

یہی حال حیدرآباد کے موجودہ مالدار طبقوں کا ہے۔ وہ اپنی مالی حیثیت کے مطابق سرکاری اخراجات کا بار اٹھانا تو درکنار جائز بار محصول کا نصف بھی برداشت نہیں کر رہے ہیں۔ ایسے بھی کئی لوگ ہیں جنھیں ریاست کے امن اور انتظام سے لاکھوں روپیہ کی سالانہ آمدنی ہوتی ہے اور وہ براہ راست ایک پیسہ بھی سرکاری تجوری میں جمع ہونے کے لیے نہیں دیتے۔ ظاہر ہے یہ صورت حال عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی۔

جودھپوری مالیات

جودھپور کے متعلق جدید ترین اعداد ۴۰-۱۹۳۹ء کے دریافت ہو سکے۔ اس قسم کی باتوں سے ثبوت ملتا ہے کہ دیسی ریاستوں کا انتظام برطانوی ہند کے علاقوں سے بعض امور میں بہتر ہو سکتا اور رہتا بھی ہے۔ جودھپور کی ریاست کو ۴۰-۱۹۳۹ء میں تقریباً پونے دو کروڑ کی حقیقی آمدنی ہوئی تھی۔ اہم ذرائع آمدنی اور حاصل کی ہوئی رقمیں یہ تھیں:-

ریلیں	۴۳،۱۵،۰۰۰
کروڑگیری	۲۴،۲۲،۰۰۰
آبکاری اور نمک	۱۷،۲۹،۰۰۰

---

[1] ۱۹۳۴ء صفحہ ۴۴۵

سود، تبادلہ، ٹپہ	۱۴،۶۷،۰۰۰
مالگزاری	۹،۸۴،۰۰۰
معاہدے	۹،۷۱،۰۰۰
متفرق ذریعے (کانیں، صنعت و حرفت، خراج)	۵۶،۶۹،۰۰۰
میزان	۱،۷۵،۵۶،۰۰۰

میسوری مالیات

ریاست میسور کے متعلق جدید ترین اعداد ۱۹۴۱-۴۲ء کے معلوم ہو سکے بعض ریاستوں کی ہر جہتی ترقی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اُن کے متعلق مطلوبہ اعداد اور معلومات حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ بہرحال میسور میں آمدنی کے ذریعے اور اُن سے ۱۹۳۹-۴۰ء میں حقیقی حاصل کی ہوئی آمدنی اور ۱۹۴۱-۴۲ء میں متوقع آمدنی کے اعداد یہ ہیں

	۱۹۳۹-۴۰ء کی حقیقی آمدنی	۱۹۴۱-۴۲ء کی متوقع آمدنی
مالگزاری	۱،۲۴،۷۷،۰۰۰	۱،۲۵،۲۹،۰۰۰
آبکاری	۴۹،۷۱،۰۰۰	۵۱،۵۵،۰۰۰
آمدنی محصول (انکم ٹیکس)	۲۹،۵۹،۰۰۰	۴۰،۳۰،۰۰۰
جنگل	۲۷،۵۳،۰۰۰	۲۵،۹۳،۰۰۰
اسٹامپ	۱۷،۷۹،۰۰۰	۱۷،۶۲،۰۰۰
رجسٹریشن	۳،۰۳،۰۰۰	۳،۰۰،۰۰۰
متفرق محصولی نوعیت کی آمدنی	۱۶،۱۰،۰۰۰	۲۴،۰۵،۰۰۰

محصولی نوعیت کی کل آمدنی	۲،۶۸،۵۲،۰۰۰	۲،۸۶،۷۴،۰۰۰
جل بجلی (تشریح کے لیے دیکھئے عبارت [ا])	۴۹،۴۸،۰۰۰	۵۸،۲۹،۰۰۰
ریلیں (" " " " [ب])	۲۷،۴۹،۰۰۰	۲۶،۳۷،۰۰۰
معدنی کان (" " " " [ج])	۲۶،۳۲،۰۰۰	۲۱،۱۳،۰۰۰
سود	۲۰،۱۳،۰۰۰	۱۷،۳۷،۰۰۰
سونا (" " " " [د])	۳،۸۵،۰۰۰	۲۳،۷۶،۰۰۰
صنعتی کاروبار (" " " " [ہ])	۳،۱۱،۰۰۰	۵،۴۷،۰۰۰
کرشنا راج ساگر (" " " " [و])	۲،۰۱،۰۰۰	۵،۸۵،۰۰۰
متفرق	۱۷،۰۷،۰۰۰	۱۳،۲۶،۰۰۰
کل آمدنی	۴،۱۷،۹۸،۰۰۰	۴،۵۸،۲۴،۰۰۰

(ا) جل بجلی کی کل آمدنی ۴۹،۴۸،۰۰۰ بتائی گئی ہے۔ اگر خالص منافع لکھدیا جاتا تو یقین ہوتا کہ یہ رقم عام اخراجات کے لیے بچ گئی ہے۔ آمدنی سے یہ احتمال رہتا ہے کہ عام کاروباری اخراجات تو نکال لیے گئے مگر اصل لاگت پر سود نہیں جوڑا گیا یا کم قدری[1] کی مد میں کچھ نہیں رکھا گیا۔ ہماری مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ میسور ریاست پر نکتہ چینی کریں، البتہ ایک بات واضح کر دینی تھی کیونکہ درحقیقت بعض ریاستوں نے منافع یا آمدنی لکھکر یہ غلط فہمی پیدا کی کہ متذکرہ رقم خالص منافع ہے جو ریاست کے عام اخراجات کے لئے بچ رہا ہے حالانکہ وہ رقم خام منافع تھی جس میں سے لاگت کا سود اور قائم اصل کا کم قدری[1] کا مطالبہ نکالنا ضروری تھا۔

(ب) یہ رقم خالص وصولی ہے[2]۔ پتہ نہیں کہ ریلوں کی لاگت کا سود اور کمقدری

[1] (Depreciation)   [2] (Net Receipt)

کے اخراجات منہا کئے گئے یا نہیں۔ "خالص وصولی" کے بجائے خالص منافع لکھا جاتا تو مطلب صاف ہوتا۔

(ج) اصل ترکیب جو بجٹ میں استعمال کی گئی ہے[1]۔ یعنی کان کنی کی آمدنی ہے یہاں بھی مطلب واضح نہ ہوا کہ آمدنی کی نوعیت کیا ہے؟ خام منافع یا خالص منافع؟

(د) کل ہندوستان میں تقریباً ۳½ لاکھ اونس (ایک اونس۔ ۲½ تولے کے مساوی ہوتا ہے) سونا پیدا کیا جاتا ہے۔ اور بجز ۹۹ یا ۹۹½ سو تولوں کے سب کا سب میسور ریاست کی "کولار گولڈ فیلڈ" سے ملتا ہے۔ جنگ کے قبل اس سونے کی قیمت ۳ کروڑ ہوتی تھی جس میں سے میسور ریاست کو صرف تین چار لاکھ ملتا تھا اور باقی رقم ان سونے کی کانوں کو چلانے والی ٹھیکہ دار بدیسی کمپنی کو ملتا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں جب اس کمپنی کا پہلا ٹھیکہ ختم ہونے والا تھا تو مرکزی حکومت ہند کے دباؤ سے مجبور ہو کر میسور کو ٹھیکہ کی تجدید کرنی پڑی۔ غنیمت ہے میسور نے دلیری سے مقابلہ کر کے ایسی شرطیں منوائیں جن سے ریاست کو آئندہ سالوں میں سات آٹھ گنی زیادہ آمدنی ہوگی۔ تین کروڑ کے مالیتی سونے سے ۲۵ لاکھ یانا روپیہ میں صرف ایک آنہ حاصل کرنا ہے۔ مگر آفریں ہے میسور کے سابق دیوان سر مرزا اسمٰعیل اور مرحوم مہاراجہ پر کہ انھوں نے انگریزی راج سے لڑ بھڑ کر اور اپنی پوزیشن خطرہ میں ڈال کر ریاست کے لیے سولہواں حصہ تو حاصل کر لیا ورنہ پہلے کی طرح اب بھی وہی تین چار لاکھ ملتے نہ کہ متوقع ۲۵ لاکھ۔

(ھ) صنعتی اعتبار سے میسور سب دیسی ریاستوں اور کئی برطانوی صوبوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ ریاست کے کئی کارخانے ہیں جن سے خالص وصولی تین چار لاکھ ہوتی ہے۔

(و) کرشنا راج ساگر میسور کا سب سے بڑا تالاب ہے جس کی آبپاشی سے

---

[1] Mining Revenue

دو تین لاکھ کی خالص وصولی ہوتی ہے۔ یعنی آبپاشی کا انتظام کرنے کے اخراجات نکالنے کے بعد یہ رقم بچ رہتی ہے۔ خالص منافع کتنا ہوتا ہے یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔

ہندوستان کی مجموعی سرکاری آمدنی

گزشتہ صفحوں سے ظاہر ہے کہ ہندوستان میں سرکاری طور پر محصول وصول کرنے والی کئی اقتداری ہستیاں ہیں یہ سب جس قدر محصول وصول کرتی ہیں وہ یہ ہے:-

مرکزی حکومت ہند	تقریباً	۱۲۱	کروڑ
تمام صوبائی حکومتیں	"	۸۵	"
میونسپالٹیاں	"	۴۱	"
ڈسٹرکٹ بورڈ	"	۱۶	"
بندرگاہی ٹرسٹ	"	۷	"
کل برطانوی ہند کی سرکاری آمدنی	"	۲۷۰	"
تمام دیسی ریاستوں کی " "	"	۵۲	"
کل ہندوستان کی " "	"	۳۲۲	"

اس طریقے پر ہندوستان کی مرکزی، صوبائی، بلدی، مقامی، بندرگاہی اور دیسی ریاستی آمدنی کی کل میزان ۳،۲۲،۰۰،۰۰،۰۰۰ یعنے تین سو بائیس کروڑ یا تقریباً سوا تین ارب ہوتی ہے۔

یہ یاد رہے کہ اس رقم میں زیادہ تر مالگذاری کی وہ آمدنیاں شامل نہیں ہیں جو چھوٹے بڑے تعلقہ دار، جاگیردار وغیرہ حاصل کرتے ہیں حالانکہ ان کی نوعیت میں اور سرکاری طور پر حاصل کی ہوئی مالگذاری میں کچھ فرق نہیں ہے۔ ہندوستان

(Authorities)

کے ہر حصہ میں سینکڑوں ہی نہیں ہزاروں[1] زمیندار اور جاگیردار ہیں جنھیں کاشتکار مالگذاری ادا کرتے ہیں اور اس کا صرف جزوی حصہ ہی سرکاری تجوری تک پہنچتا ہے۔ بقیہ قدیم رواج، سند، خوش بختی اور حسن اتفاق سے جاگیرداروں اور زمینداروں کو ذاتی خرچ کے لئے بچ رہتا ہے۔ چونکہ اِن آمدنیوں کا شمار نہیں کیا جاتا لہٰذا اوسط بار محصول کے متعلق غلط نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔

معاشیات ہند سے دلچسپی رکھنے والے کے لئے یہ موضوع تحقیق بہت موزون ہوگا کہ ہندوستان میں بار محصول کی کیا اصلیت ہے ؟

اِس کے لئے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہوگا کہ ہندوستان میں کتنا محصول سرکاری اور غیر سرکاری طور پر لیا جاتا ہے ؟ یعنے وہ کل کتنی رقم ہے جو سارے ہندوستان سے محصولوں اور محصولی نوعیت رکھنے والی آمدنیوں سے حاصل کی جاتی ہے ؟ چونکہ مالگذاری محصول ہے لہٰذا بار محصول کا مسئلہ حل کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ دریافت کرنا ہوگا کہ کل کس قدر محصول مالگذاری سارے ہندوستان سے وصول کیا جاتا ہے ؟ اس کے قطع نظر کس قدر کس کو ملتا ہے یعنے مالگذاری کی حقدار صرف حکومت ہے یا جاگیرداروں کو بھی کچھ ملتا ہے۔ یا ہر ایک کے حصے میں کس قدر رقم آتی ہے ؟ تاوقتیکہ اس قسم کی تحقیق نہ ہو ہمیں مجبوراً اس رقم کو ملحوظ رکھنا پڑے گا جو سرکاری طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کی کل میزان سارے ہندوستان کے لئے ۳ ¼ ارب ہوتی ہے۔

بظاہر ۳ ¼ ارب یعنے دراصل ۳۲۲ کروڑ سے بھی کچھ اندازہ نہیں ہوتا ؛ یہ رقم بہت زیادہ ہے ؟ یا بہت کم ؟ اس کی اصلیت کا اندازہ صرف تقابل سے

[1] افسوس ہے کہ باوجود کوشش اور کھوج کے صحیح اعداد معلوم نہ ہو سکے اور تو اور خود حیدرآباد میں مجموعی طور پر کتنے جاگیردار ہیں ؟ اس کا بھی صحیح پتہ نہ چلا۔

ہو سکیگا۔ اگر ہم ہندوستان کی آمدنی کا موازنہ اور مقابلہ دوسرے ملکوں کی آمدنیوں سے کریں گے تو ہمیں اپنی اصلیت کے بارے میں کسی قدر بہتر رائے قائم کرنے میں مدد ملیگی کم سے کم ہمیں یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ ۳۲۲ کروڑ جو ایک نردھن خاندان یا تنگ دستی میں گذر کرنے والے طالب علم کے لئے قارون کے خزانے سے زیادہ معلوم ہوتا ہے، بین اقوامی مالیات میں کیا اہمیت رکھتا ہے؟

کہتے ہیں کہ ریگستانی صحرا کا اونٹ پردیس جانے والے قافلے کے ساتھ کسی پہاڑ کے قریب پہنچا تب اسے خیال ہوا کہ موجودات میں اس سے بھی بڑھکر چیزیں ہیں۔ اسی طرح کا احساس ان لوگوں کو ہوتا ہے جو پہلے پہل اپنے ملک کی حالت وحیثیت کا مقابلہ ایران وافغانستان سے نہیں بلکہ یورپ اور امریکہ کی ترقی یافتہ، ترقی پسند اور ترقی پذیر قوموں سے کرتے ہیں۔

بعض ممتاز ملکوں کی سرکاری آمدنی

آئندہ جدول میں دنیا کے بعض ترقی پذیر ریاستوں کی سرکاری آمدنی کے اعداد اسٹیٹسمن ائیر بک بابتہ ۱۹۴۱ء سے لے کر یک جا کئے گئے ہیں باوجود کوشش کے اسٹیٹسمن ائیر بک کے علاوہ کسی اور ذریعے سے جدید سرکاری آمدنیوں کا حوالہ نہیں مل سکا۔

سال	ملک	آمدنی
۱۹۳۹ء	انگلستان (پاونڈ)	۱،۰۰،۶۲،۳۵،۰۳۴
۱۹۳۹ء	ریاستیں (ڈالر)	۵،۶۶،۷۸،۲۴،۰۰۰
۱۹۳۸-۳۹ء	کناڈا (")	۴۹،۸۰،۱۶،۷۰۶
۱۹۴۰ء	ارجنٹائن (کاغذی پیسو)	۹۲،۲۷،۱۹،۰۰۰
۱۹۴۰ء	برازیل (" کانٹو)	۴۲،۰۹،۴۰۷

سنہ ۱۹۴۰ء	فرانس (فرانک)	۷۹،۹۶،۱۱،۸۳،۱۱۲
سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء	اطالیہ (لیرے)	۳۹،۰۰،۲۰،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء	جاپان (ین)	۱۰،۲۸،۲۰،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء	ترکی (ترکی پاؤنڈ)	۲۶،۱۱،۱۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء	ہندستان (روپئے)	۱،۲۱،۷۹،۹۵،۰۰۰

چونکہ ہرملک کی آمدنی اسی ملک کے سکہ میں دی گئی ہے اس لئے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ رقموں کا باہمی تناسب کیا ہے اور اُن رقموں کی بذاتہٖ کیا اہمیت ہے؟ بعض علمی اور درسی کتابوں میں غیر ملکوں کی موازنوں کی کیفیت درج ہے مگر حیرت ہوتی ہے کہ نہ صرف حوالے کی کتابوں میں بلکہ درسی اور علمی کتابوں میں بھی صرف بیرونی زر میں اعداد دیئے گئے ہیں، اس پر طرہ یہ کہ ہرملک کے اعداد اسی ملک کے زر میں دئے ہیں اور کہیں بھی شرح تبادلہ یا اوسط شرح تبادلہ یا باہمی قدر کا کچھ ذکر نہیں۔ مختلف قسم کے بیرونی زروں کی قدر و قیمت جاننا تو درکنار بسا اوقات ہم اُن کے نام سے تک ناواقف ہوتے ہیں۔ تقابل کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک مانوس اور یکساں معیار کے مطابق حوالے دیئے جائیں۔ مختلف ملکوں کی مالی سرگذشت بیان کرتے ہوئے کہیں جاپانی زر میں حوالہ دینا، کہیں چینی ڈالر میں، کبھی اطالوی لیروں میں اعداد پیش کرنا، کبھی جرمن مارکوں میں ایسی ہی "دانشمندی" ہے جیسے کسی سوانحی سرگذشت کے اعداد کہیں ہجری سنہ میں کہیں فصلی سنہ میں اور کہیں عیسوی سنہ یا بکرمی سمبت میں پیش کرنا۔ نامانوس زر میں حوالے دینے سے ذہنی پریشانی ہوتی ہے۔ مالی حالت کچھ معلوم نہیں ہوتی اس لیے میں نے دردسری گوارا کر کے ایک جدول تیار کی ہے جس میں تمام ملکوں کی آمدنی روپیوں میں منتقل کی گئی ہے۔ اول تو یہی معلوم کرنے میں بہت دقت ہوئی کہ مختلف ملکوں کے زر موجودہ اور قبل از جنگ شرح تبادلہ کیا تھی؟ نہ تو کسی علمی کتاب میں کچھ پتہ چلا اور نہ کسی ماہر سے مدد ملی۔ حیرت تو یہ ہے کہ برازیل اور ارجنٹائن

کے کونسل صاحبوں سے دریافت کرنے سے بھی معلوم نہ ہوا کہ اِن ملکوں کے سکوں کی کیا قدر و قیمت تھی اور ہے۔ اِن بھلے مانسوں نے سرے سے خط کا کچھ جواب ہی نہ دیا۔ آخر کار میں نے مقامی بنکوں کو لکھا۔ ایک بنک نے کوئی جواب ہی نہ دیا۔ سیٹھ رگھوناتھ ل بنکر نے بڑی مہربانی سے دو اِستفساروں کے جواب دیئے اور اُن ہی کی مدد سے میں نے یہ جدول تیار کی ہے پردیسی زروں کو پونڈ میں تبدیل کر کے اور پھر پونڈ کے روپیہ بنانے میں ممکن ہے کہ غلطی ہوئی ہو۔ مگر امکانی کوشش کی گئی ہے کہ حساب صحیح ہو۔ میں سیٹھ رگھوناتھ ل کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُن کی توجہ سے پردیسی زروں کی قدر و قیمت معلوم کرنے میں دشواری کم ہوئی۔

ظاہر ہے کہ اِس جدول میں دیئے ہوئے اعداد کی ذمہ داری بہرحال مجھ ہی پر ہے اِس کا ذکر میں عمداً تحقیقی کاموں کی دشواری اور اپنی کم واقفیت کو ظاہر کرنے کے لیے کر رہا ہوں اگر کوئی صاحب مہربانی کر کے مزید معلومات بہم پہنچائیں یا غلطیوں کی طرف متوجہ کریں تو شکریہ کے ساتھ آئندہ مضمون میں اُن کا حوالہ دیا جائیگا اور ضروری تصحیح کی جائے گی۔

بعض ممتاز ملکوں کی آمدنی (روپیوں میں)

(اِس جدول میں ملکوں کی ترتیب مجموعی آمدنی کے لحاظ سے کی گئی ہے)

امریکی متحدہ ریاستیں	۱۷،۰۰،۴۴،۷۲،۰۰۰
اِنگلستان	۱۳،۴۱،۶۴،۶۷،۰۰۰
جاپان	۱۲،۶۲،۶۲،۹۲،۰۰۰
فرانس	۶،۰۵،۷۶،۶۵،۰۰۰
اطالیہ	۴،۳۵،۰۸،۸۰،۰۰۰
کناڈا	۱،۴۹،۴۰،۵۰،۰۰۰
ہندستان (صرف مرکزی حکومت کی آمدنی)	۱،۲۱،۷۹،۹۵،۰۰۰

ترکی ۶۶،۹۵،۰۸،۰۰۰

صرف آمدنیوں کا تقابل ہی مختلف ملکوں کی مالی حالت اور وہاں کی آبادیوں کی مالی حیثیت کو واضح نہیں کرتا، کیونکہ سب ملک یکساں بڑے نہیں ہیں۔ تقابل کے لیے اور بھی باتیں معلوم کرنا ضروری ہے محض سہولت کی خاطر ہم دو ملکوں کے متعلق تفصیل پیش کرتے ہیں۔

برطانیہ سنہ ۱۹۳۶ء میں برطانیہ کی آمدنی ۱،۰۰۶،۲۲۵،۰۴۴ (یعنے ایک ہزار چھ ملین پاؤنڈ سے زیادہ) تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک پونڈ ۱۳ ۱/۳ روپیہ کا ہوتا ہے نیز انگریزی اور ہندستانی زر کی قیمت مقرر ہے، یعنے فی روپیہ ایک شلنگ چھ پنس۔ اس شرح کے مطابق پونڈ کے ۱۳ ۱/۳ روپیہ ہوتے ہیں اور اسی شرح کی مناسبت سے برطانیہ کی آمدنی ۱۳،۴۱،۶۴،۶۷،۱۳ روپیہ یعنے تقریباً ساڑھے تیرہ ارب ہوتی ہے خیال فرمائے کہ ایک ملک جس کا رقبہ صرف ۹۴ ہزار مربع میل ہو اور جس کی آبادی صرف پونے پانچ کروڑ ہو اس کی سرکاری آمدنی ساڑھے تیرہ ارب روپیہ ہے اور ہندوستان جو رقبہ کے اعتبار سے سولہ گنا زیادہ ہو اور آبادی کے اعتبار سے آٹھ گنا زیادہ ہے اس کی مرکزی آمدنی ۱۲۱ کروڑ اور مجموعی سرکاری آمدنی صرف ۲۲۲ کروڑ ہے۔ انہیں اعداد سے ہندستان کی مفلسی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور سمجھنے والوں کے لیے ان اعداد میں انگلستان کی عظمت اور ہندستان کی نکبت جھلکتی ہے۔

امریکہ کی متحدہ ریاستیں اس میں شک نہیں کہ امریکہ کی متحدہ ریاستوں کا رقبہ ہندستان کے رقبہ سے سوا دو گنا زیادہ ہے اور وہ نہ صرف میکانی اعتبار سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ بلکہ معاشی نقطہ نظر سے سب سے زیادہ دولتمند ملک ہے گر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندستان کے مقابلہ میں امریکہ کی آبادی صرف ایک تہائی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ امریکہ کی متحدہ ریاستیں ۴۸ ہیں جو سیاسی نقطہ نظر سے بہترین وفاقی حکومت کے تحت ہیں۔ اگر ان تمام ۴۸ ریاستوں کی علیحدہ علیحدہ آمدنیاں اور امریکہ کی میونسپلیٹیوں کی آمدنیاں شامل کی جائیں تو نہ معلوم اس کی میزان کتنے کھرب روپئے ہو۔ ہم نے صرف

وفاقی حکومت کی آمدنیاں لی ہیں جو ۵،۶۶،۷۸،۴۲،۰۰۰ یعنے تقریباً چھ ہزار ملین ڈالر ہے جنگ سے پہلے ڈالر کی قیمت تقریباً عہ ۱۲ تھی اس لحاظ سے امریکہ کی وفاقی آمدنی ۱۷،۰۰،۳۴،۲۲،۰۰۰ یعنے سترہ ارب سے زیادہ ہوتی ہے۔ ہر ملک کے زر کی قیمت، شرح تبادلہ رقبہ اور آبادی کی تفصیل پیش کرنا چونکہ طوالت کا باعث ہے اس لئے میں نے آئندہ جدول میں فی کس سرکاری آمدنی بتائی ہے۔ اس جدول سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ مختلف ملکوں میں سرکاری آمدنی کا کیا اوسط ہے۔

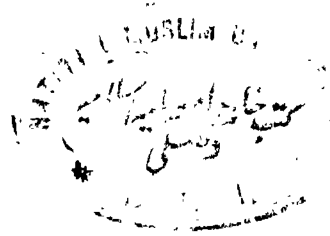
فی کس سرکاری آمدنی کے لحاظ سے ملکوں کی جدولی ترتیب

۱۔ انگلستان	۲۹۸ روپیہ
۲۔ جاپان	۱۸۰ "
۳۔ فرانس	۱۴۴ "
۴۔ متحدہ ریاستیں	۱۲۴ "
۵۔ کناڈا	۱۰۵ "
۶۔ اطالیہ	۱۰۱ "
۷۔ ارجنٹائن	۴۷ "
۸۔ ترکی	۴۱ "
۹۔ ہندوستان	۳ ½ "

صرف مرکزی حکومت کی آمدنی کے لحاظ سے سرکاری آمدنی کا اوسط ۳ ½ روپیہ سالانہ فی کس ہوتا ہے۔ اگر مرکزی حکومت کے علاوہ تمام صوبائی اور تمام دیسی ریاستوں کی میزان نکالی جائے تو ۱۲۱ + ۸۵ + ۵۲ = ۲۵۸ کروڑ آمدنی ہوتی ہے اس لحاظ سے ہندوستان میں سرکاری آمدنی کا فی کس اوسط

$\frac{1}{4}$، روپیہ سالانہ نکلتا ہے۔

سرکاری اوسط آمدنیوں کی جدول میں مختلف قوموں کی مرفہ الحالی اور تباہ حالی، خوشحالی یا کنگالی جھلکتی ہے اور ایک سمجھدار آدمی کے لیے محض ان اعداد سے متعلقہ قوموں کی معاشی حالت معلوم کرنا اور معیار زندگی کا اندازہ کرنا ممکن ہے۔ یعنے کہیں دولت وثروت اور کہیں افلاس اور مصیبت؛ کہیں فراوانی کہیں کنگالی!!



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسیات

(از)

سید معین الدین قادری متعلم ایم ، اے جامعہ عثمانیہ سرکارعالی

کمیٹی جشن میلاد جامعہ عثمانیہ نے اِس مضمون کو طیلسانی طبقہ میں انعام اوّل کا مستحق قرار دیا۔

محمد بشیر الدین

معتمد کمیٹی میلاد جامعہ عثمانیہ

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ایک شخص حضرت عائشہ ؓ صدیقہ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپؐ کے اَخلاق سے متعلق دریافت کرنے لگا۔ اُم المومنینؓ نے اُس شخص سے پُوچھا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ اسنے کہا ہاں پڑھتا ہوں۔ آپ نے جواب میں فرمایا تو بس "خلقہٗ قرآن"

جب حقیقت یہ ہے کہ وَمَا یَنطِقُ عَنِ الهَوىٰ۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحیٌ یُوحىٰ (۵۳: ۴،۳) تو ہم آپ کی سیاسیات کو "الٰہی سیاسیات" یا "قرآنی سیاسیات" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور چونکہ قرآن اور سُنت دونوں کے لیے مجموعی طور پر اسلام کا جامع و مانع لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے ہم آپ کی سیاسیات کو بہتر طریقہ پر "اسلامی سیاسیات" کا نام بھی دیسکتے ہیں

آپ کی سیاسیات کا تاریخی پس منظر۔

ایک مشہور سائنسدان نے تاریخ کو سیاسیات کی جڑ اور سیاسیات کو تاریخ کا پھل کہا ہے۔ اس لیے آپ کی سیاسیات کو پیش کرنے سے پہلے اُس کے تاریخی پس منظر کو نہایت اجمال سے پیش کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے[1]

آپ کی ولادت باسعادت کے زمانہ میں دُنیا کی حالت نہایت ابتر ہو رہی تھی اس زمانہ میں روم اور ایران کی دو عظیم الشان سلطنتیں خود غرضانہ شہنشاہیت کے اصولوں پر قائم اور آپس میں باہم دست و گریبان تھیں۔ عرب کا ملک مختلف قبیلوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر قبیلہ اپنی جگہ آزاد تھا۔ مرکزیت ناقابل تصور تھی۔ آئے دن قبیلوں میں کشت و خون اور غارت گری کا بازار گرم رہتا تھا۔ جان و مال و آبرو ہمیشہ خطرہ میں تھے۔ امن و چین کا نام و نشان نہ تھا۔ لوٹ مار اور غارت گری کسب معاش کا ذریعہ بنے ہوئے تھے۔ جنگ کی وجہ سے ان کے جنگجویانہ قویٰ تو ہمیشہ بیدار رہتے تھے لیکن اسی جنگ کے باعث ان میں طرح طرح کی بے اعتدالیاں اور بدعنوانیاں جڑ پکڑ رہی تھیں۔ قماربازی، شراب خواری آپس میں گالی گلوچ اور ایک دوسرے کی بے حرمتی، جان اور مال اور آبرو کی تحقیر اور نوع انسانی کی جگہ قبیلوں اور خاندانوں میں انسانیت کی تقسیم الغرض قسم قسم کی گمراہیاں اُن میں پرورش پا رہی تھیں جس کے باعث انسانیت قعر مذلت اور تباہی کے عمیق غار کے کنارے آچکی تھی۔ وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا (پ ع ۲)

ہمیشہ ظلمت کے بعد نور، فساد کے بعد امن اور ضلالت کے بعد ہدایت کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ لہٰذا جب دُنیا اپنی انتہائی ضلالت کی حد تک پہنچ چکی تھی تو پھر ہدایت کا

---

[1] یہ تاریخی واقعات سیرۃ النبی صلعم از شبلی صاحب جلد اول، تاریخ الامت حصہ اول از محمد اسلم صاحب جیراج پوری اور تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین صاحب سے لیئے گئے ہیں۔

آنا ضروری تھا۔ چنانچہ ۵۷۰ء کی صبح کو خدا نے ہادی برحق کی ولادت سے دنیا کو مسعود کیا۔ اور اُن کے چالیس سال بعد اسی شہر مکہ سے آفتاب رسالت کو طلوع کیا۔ اس آفتاب عالمتاب نے پہلے اپنے گھر پھر اعزہ واقربا، پھر قبیلہ کے لوگوں کو اور پھر پورے شہر کے باشندوں کو اپنی شعاعوں سے گرمانا شروع کیا۔ تاریک گھنگھور گھٹائیں اس کے درمیان حائل ہو رہی تھیں اور اس کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کر رہی تھیں۔ لیکن یہ نور سارے عالم کو منور کرنے والا اور ظلمت و تاریکی کو دنیا کے گوشہ گوشہ سے دور کرنے والا تھا اور بالآخر یہ شعاعیں وادی غیر ذی زرع سے نکلکر طائف اور حبشہ تک میں ضوگستری کرنے لگیں اور دوسری طرف یثرب کو اپنی ضیا تابی سے گرما کر اپنے لئے زمین ہموار کرلی۔

۶۲۲ء سے آفتاب رسالت کی شعاعوں نے اپنی پوری آب وتاب سے سارے عرب میں ضیا پاشی کرنا شروع کیں اور دیکھتے دیکھتے مدینہ کی اکثریت کے قلوب کو اپنے نور سے منور کر لیا۔ گویا یہیں سے آپ کی سیاسی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔

جب مدینہ میں ایک شہری مملکت قائم ہوگئی تو آپ نے قرآنی احکامات کی روشنی میں اس مملکت کا سیاسی انتظام کرنا شروع کر دیا۔ وہاں کی اقلیت یا یہودیوں سے آپنے معاہدے کئے اور ان کے اور مسلمانوں کے حقوق و فرائض کو متعین کر لیا۔ قرب وجوار کے قبیلوں سے بھی آپ نے معاہدے کئے اور اپنے مشن کا پوری شدت سے پرچار کرنا شروع کر دیا۔

مدینہ آنے کے بعد بھی آپ کو امن وچین نصیب نہ تھا۔ یہاں کفار قریش کے علاوہ مدینہ کے یہود اور منافقون سے بھی سابقہ تھا۔ کفار قریش کی سازشیں اور مدینہ کے یہودیوں اور منافقوں کی اُن سے ساز باز برابر جاری تھا۔ لیکن اُس پر بھی مکہ والوں کو تسلی نہ ہوئی اور وہ رمضان ۲ھ کو مدینہ پر مسلمانوں کو تباہ کرنے کے ارادہ سے حملہ آور ہوئے مسلمان مظلوم تھے۔ خدا نے انہیں بھی جنگ کی اجازت دیدی۔ بالآخر ۱۷ رمضان کو کفر و

اسلام پہلی بار باضابطہ طور پر نبرد آزما ہوئے اور خدا کی نصرت مسلمانوں کے شامل حال رہی اور کفر کو حق کے سامنے بھاگنا ہی پڑا۔ اس کے بعد کفار سے متعدد جنگیں ہوئیں مگر اتنی نہیں جتنی کہ مغاری رسولؐ پڑھنے کے بعد معلوم ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان اصحاب نے ہر معمولی واقعہ کو، دو تین آدمیوں کی جھڑپ، دشمنوں کی دیکھ بھال، قافلہ کی روک ٹوک اور اس قسم کے معمولی واقعات کو ایک جنگ کی حیثیت دیدی۔ ورنہ بڑی بڑی جنگیں بس یہی چند بدر، احد، بنی نضیر، خندق، بنی قریظہ، بنی مصطلق، خیبر، موتہ، حنین اور تبوک کی لڑائیاں تھیں۔ یہ تمام جنگیں مدافعانہ تھیں۔ مکہ بغیر خون ریزی کے فتح ہوگیا اور یہ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے تاریخ اسلام کا بہت عہد آفرین واقعہ ہے۔ فتح مکہ ۸ھ کے بعد سارے عرب میں اسلام کا رعب داب قائم ہوگیا اور اس کے بعد عرب کے مختلف قبائل اسلام میں جوق در جوق آنے لگے۔ اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا اور یہ سال (۹ سنہ ہجری) عام الوفود کے نام سے تاریخ اسلام میں مشہور ہوگیا۔

عرب پر تسلط قائم ہونے کے بعد آپ نے اپنے تبلیغی کام کو سارے عالم تک پھیلا دیا اور تمام سلاطین اور رؤساء کے نام مراسلات روانہ فرمائے۔ قیصر نے دل سے اسلام کی حقانیت قبول کرلی اور اسی طرح عزیز مصر نے بھی اس دین کی سچائی کا اقرار و اعتراف کیا لیکن دربار کی وجہ سے اسلام سے یہ ہر دو مشرف نہ ہوسکے۔ لیکن شاہ حبش نجاشی نے اسلام قبول کرلیا کسریٰ نے نخوت و تکبر سے نامہ مبارک کو چاک چاک کردیا اور باذان کو آپ کے پکڑ لانے کا حکم دیا۔ اور شاہ غسان نے سفیر کو قتل کردیا جن کے قصاص کے لیے سریہ موتہ کا واقعہ پیش آیا۔

الغرض آفتاب رسالت گھر سے قبیلہ، قبیلہ سے شہر، شہر سے اطراف و اکناف شہر پھر طائف وحبش و یثرب، اس کے بعد سارے عرب اور بالآخر سارے عالم میں تنویر ہدایت پہنچا کر رہا اور جس حق کو پہنچانے کے لیے طلوع ہوا تھا اس کو پہنچا کر چھوڑا۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

یہ تھا عہد نبوی صلعم کی تاریخ کا ایک نہایت ہی مختصر تدریجی اور ارتقائی خاکہ ہے اس کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی سیاسیات کی خصوصیات بیان کرنے سے پہلے اس کے نظام حکومت کا ایک مختصر سا خاکہ بھی پیش کر دیا جائے کیونکہ محض نظریے بغیر عملی نمونہ کے بے رُوح ہوتے ہیں:۔

نظامِ حکومت گو آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہجرت کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا لیکن اسلام کی شہنشاہی کا پہلا دن فتح مکہ ۸ھ تھا کیونکہ اس واقعہ کے بعد ہی سارے عرب نے وفود بھیج کر گویا آپ کی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا۔ آپ نے اصل خلافت آلٰہی کے اہم اجزاء اواخر ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقعہ پر سب کو بتلا دیئے تھے[1]۔

آپ کی بعثت کا اصل مقصد دعوت مذہب، اصلاحِ اخلاق، اور تزکیہ نفوس تھا۔ اس کے علاوہ اور تمام فرائض ضمنی حیثیت رکھتے تھے۔ اس بناء پر انتظامات ملکی آپ نے اسی حد تک قائم کئے جہاں تک ملکی بدامنی کے باعث دعوتِ توحید میں عوائق پیش آتے تھے لیکن ایک صالح سیاسی نظام کے لیے جو جو باتیں ضروری تھیں اُن کا آپ نے اپنی عملی مثال اور نمونہ سے صحابہ کے سامنے ایک اجمالی مگر پورا خاکہ پیش کر دیا۔

اُس وقت آپ کی عمر شریف ساٹھ برس کی تھی تاہم حکومت کے تمام کام آپ خود ہی انجام دیتے تھے۔

سپہ سالاری یا امیر العسکری چھوٹی مہمون کے لیے صحابہ کو بھی بھیج دیا کرتے تھے لیکن بڑی مہمیں تامتر آپ ہی سر انجام دیتے تھے۔ جنگ میں شرکت سے مقصد صرف لڑائی اور آخری فتح ہی نہ ہوتا تھا بلکہ فوج کی عام اخلاقی اور رُوحانی نگرانی کرنی

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سیرۃ النبی صلعم جلد دوم باب "تاسیس حکومت" صفحہ ۲۳-۱ اور یہ تمام واقعات اُسی کتاب سے لیے گئے ہیں۔ بڑی تقطیع۔

اور انہیں میدان رزم کے صحیح اور معتدل طریقے بتلانا بھی ہوتا تھا۔

افتا و فصل مقدمات افتا اور فصل مقدمات کے لیے کوئی خاص وقت مقرر نہ تھا۔ اذن عام تھا۔ دروازہ پر کوئی دربان نہوتے تھے۔ آپ چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے صحابہ کو مسائل سمجھاتے اور احکامات دیتے تھے اور جھگڑے اور نزاعات کا فیصلہ قرآن کی روشنی میں فرمایا کرتے تھے۔ اگر قرآن کی کوئی آیت نازل نہوئی ہوتی تو صحابہ سے مشورہ فرماتے اور اہل کتاب سے بھی ان کے کتابی احکام معلوم کر کے فیصلہ فرماتے۔ بعض اکابر صحابہؓ مثلاً ابوبکرؓ، عمرؓ، علی اور معاذ بن جبل (رضوان اللہ علیہم اجمعین) وغیرہ کو آپ نے فصل مقدمات کی اجازت دی تھی[1]۔ لیکن مدینہ اور حوالی مدینہ کے اکثر مقدمات خود آپ ہی فیصل فرمایا کرتے تھے۔

کتابت اس کام کی اہمیت کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں اگرچہ دوسرے صیغوں کے باضابطہ دفتر قائم نہیں ہوئے تھے لیکن اس کام کے لیئے ایک باضابطہ محکمہ قائم تھا۔ سلاطین و ملوک کو دعوت اسلام کے خطوط، غیر قوموں کے ساتھ معاہدے، مسلمان قبائل کو احکامات لکھوانا، عمال محصلین کو تحریری فرامین، فوج کا رجسٹر مرتب کرنا، بعض کو حدیثیں لکھوانا اور قرآن پاک کی کتابت سب اسی محکمہ کے تفویض تھے۔ اِن کاموں پر متعدد صحابہ فائز رہے مثلاً حضرت علیؓ امیر معاویہؓ وغیرہم لیکن ان میں حضرت زید بن ثابتؓ کو ایک خاص امتیاز یہ حاصل تھا کہ وہ عربی کے ساتھ عبرانی زبان بھی جانتے تھے۔

مہمانداری۔ اس محکمہ کا کام وفود اور سفیروں کی خاطر تواضع، نومسلموں کے تالیف

---

[1] مثلاً حضرت علیؓ اور معاذ بن جبلؓ کو فیصلوں کے طریقے سکھا کر آپ نے یمن بھیجا ہے۔ اور معاذؓ سے خود طریقہ دریافت فرما کر ان کے جواب پر خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے۔

قلوب کے لیے ان سے حسن سلوک اور غریب و نادار مسلمانوں کے لیے غذا و لباس مہیا کرنا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ برہنہ جماعت آئی تو آپ نے صحابہ کو جمع کر کے ان سے حسن سلوک کی تلقین کی اور آن کی آن میں کپڑوں اور غلہ کے انبار لگ گئے اور ان کی احتیاج رفع کر دی گئی۔ سفیروں کے ساتھ آپ خاص تواضع اور مدارات کرتے۔ نجاشی کے سفیروں کی مہمانداری آپ نے خود اپنے دست مبارک سے کی کہ انھوں نے مہاجرین حبشہ کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا۔ آپ کو وفود کی خاطرداری کا اتنا خیال تھا کہ آخری وقت آپ نے نصیحت فرمائی تھی اجیزالوفود بنحو ماکنت اجیزھم۔

عیادت مرضی آپ یوں بھی حسن معاشرت کے طریقے ہمیشہ صحابہ کو سکھاتے رہتے کہ اس سے حقیقی امن و چین بستیوں میں قائم رہتا ہے لیکن جب کوئی مرض میں مبتلا ہوتا تو اس کی خاص طور سے عیادت فرماتے اور نزاع کے وقت اکثر لوگ آپ کو اپنے گھر لیجاتے اور مریض کے لیے دعائے مغفرت کے طالب ہوتے۔ آپ دعائے مغفرت کرتے اور جنازہ کی نماز بھی پڑھاتے۔ آپ نے باوجود صحابہ کی مخالفت اور آگاہ کرنے کے عبداللہ بن ابی منافق کی نماز جنازہ پڑھائی اور اپنا کرتہ مبارک کفن کے لیے دیا تاکہ اس کے قبیلہ والے اور دوسرے منافقین راہ راست پر آجائیں اور ان میں خلوص پیدا ہو جائے[1]۔ اگر کسی کے اوپر قرض ہوتا تو آپ اس کے جنازہ کی نماز نہ پڑھاتے نتیجہ یہ ہوتا کہ دوسرے صحابہ اس مردہ کا قرض ادا کر دیتے اور پھر آپ اس کی نماز جنازہ ادا فرما دیتے۔

احتساب۔ تمدن اسلامی کے دور ترقی میں محکمۂ احتساب ایک مستقل محکمہ تھا جو نہایت وسیع پیمانہ پر تمام قوم کے اخلاق و عادات، بیع و شری اور معاملات داد و ستد کی نگرانی کرتا تھا۔ لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہ محکمہ قائم نہیں ہوا تھا

---

[1] یہ اس احسان کا بدلہ بھی تھا جو ابی نے حضرت عباسؓ پر جب وہ بدر کی قیدی تھے اپنا کرتہ دے کر کیا تھا۔

بلکہ آپ خود اس فرض کو انجام دیا کرتے تھے۔

آپ کے صحابہ جو آپ کی ذات سے اپنا تزکیہ قلب کر چکے تھے خود اپنے محتسب آپ ہوتے تھے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو اپنا فریضہ سمجھتے اس لیے کسی خاص محکمہ کی ضرورت ہی نہ تھی۔ بقول مولانا ابو الکلام آزاد اسلامی عبادات خود سب سے بڑے محتسب تھیں ۔ (اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ اور الصَّوْمُ جُنَّۃٌ) "یہ محتسب تمہارے پاس پانچ وقت آتے ہیں۔ ہر سال آتے ہیں تمام عمر میں ایک بار آتے ہیں"[1] لیکن پھر بھی جیسے جیسے کاروبار اور اجتماعی زندگی میں وسعت ہوتی گئی آپ کے لیے ان پر نگرانی رکھنی اور انہیں صحیح طریقے دکھلانے بھی ضروری ہو گئے۔ چنانچہ ایک بار آپ نے بازار میں اناج کا ڈھیر دیکھا۔ اندر ہاتھ ڈالا تو نمی تھی۔ فرمایا کہ اس حصہ کو اوپر کر دیا ہوتا کہ لوگوں کو حقیقت کا علم ہو جاتا۔ پھر فرمایا "جو لوگ دھوکہ دیتے ہیں وہ ہم میں سے نہیں"۔ ایک بار ابنؓ اللتیہ صدقہ کا مال لیکر آئے اور کہا یہ مال صدقہ کا ہے اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے آپ نے فرمایا "تمہیں یہ ہدیہ گھر بیٹھے بیٹھے کیوں نہیں مل گیا؟" پھر آپ نے ایک عام خطبہ دیا جس میں اس قسم کے کاموں کی ممانعت فرمائی۔

اصلاح بین الناس اسلام امن و سلامتی کا علمبردار تھا یہ تمام دنیا کے تفرقوں کو عموماً اور عرب کے اختلافات کو خصوصاً مٹانے آیا تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کام کو اپنا ضروری فرض سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ عمرو بن عوف کے قبیلہ میں جھگڑا ہو گیا تو آپ اس جھگڑے کے چکانے میں اس قدر منہمک ہو گئے کہ جماعت میں دیر سے آکر ملے۔ حدرد اور کعب میں قرضہ کے معاملہ میں تکرار ہوئی تو اس کا بہترین طریقہ پر تصفیہ فرما دیا۔ عبداللہ بن ابی کی شرارتوں اور ریشہ دوانیوں سے ایک بار انصار کے

---

[1] الحسبہ فی الاسلام یعنی احتساب فی الاسلام از ابو الکلام آزاد الہلال جلد ۵ نمبر

دو قبیلوں کی تلواریں نکل گئی تھیں پھر آپ نے معاملہ پاک کروادیا اور ان میں صلح کرادی اس طرح آپ ہمیشہ نزاعات کو پیدا ہونے سے روکتے رہتے اور ان کے تمام منافذ بند کرتے رہتے تھے۔

حکام وولاۃ فصل قضایا، اقامت عدل، بسط امن اور رفع نزاع کے لیے متعدد ولاۃ وحکام کی ضرورت تھی اور آپ نے متعدد صحابہ کو مختلف مقامات کا حاکم ووالی بنا کر بھیجا۔ چونکہ یمن ایک متمدن اور بڑا ملک تھا اس لیے اس کو پانچ حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ کا علیحدہ علیحدہ گورنر مقرر فرمایا۔ عموماً جب کسی مہاجر کو عامل مقرر فرماتے تو اس کے ساتھ ایک انصاری کا بھی تقرر فرما دیتے۔ ملکی انتظامات، فصل مقدمات، اور تحصیل خراج وغیرہ کے علاوہ ان عمال کا سب سے مقدم فرض اشاعت اسلام اور سنن وفرائض کی تعلیم تھی۔ اس طرح یہ لوگ حاکم ملک ہونے کے ساتھ ساتھ مبلغ دین اور معلم اخلاق بھی ہوتے تھے۔ "ھم باللیل رھبانٌ وبالنھار فرسان"۔

باوجود عرب اتنا وحشی ملک ہونے کے وہاں کے لوگوں پر جب حاکم مقرر فرماتے تو اُن سے نہایت نرمی اور خوش اخلاقی کا برتاؤ کرنے کا حکم دیتے۔ چنانچہ معاذؓ سے فرمایا: "احسن خلقك للناس (ابن سلم)" "یسر ولا تعسر او بشر ولا تنفر او تطاوعا ولا تختلفا"۔ (مسلم جلد ۲ صہ ۶۳)۔

محصلین زکوٰۃ مسلمان خود صدقہ لاکر پیش کر دیتے لیکن حکومت کی وسعت باضابطگی کی مقتضی ہوئی۔ چنانچہ سنہ ۹ھ میں ہر قبیلہ کے لیے محصلین مقرر فرمائے اور عموماً روسا، خود محصل ہوتے تھے جن کا تقرر عارضی ہوتا تھا۔ جو خود درخواست کرتا اسے مقرر نہ فرماتے بلکہ آپ خود دیکھکر مقرر فرماتے اہلبیت کے لیے صدقہ جائز نہیں ہے۔ اسلئے اپنے خاندان والوں کو اس پر مقرر نہ فرماتے اور اس بنا پر آپ نے حضرت فضلؓ بن عباسؓ کی درخواست رد کر دی تھی۔ محصلین کو مال کے اقسام، اُس کے احکامات

لینے کے طریقے سکھلاتے اور ان کو حسب ضرورت معاوضہ عطا فرماتے تھے۔

جلاد۔ اس کام کو مختلف صحابہ انجام دیتے تھے جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

پولیس۔ اس کا کوئی باضابطہ محکمہ نہ تھا۔ اکثر صحابہ آپ کے ساتھ پھرتے اور کام انجام دیتے تھے۔

غیر قوموں سے معاہدے اسلامی فتوحات کو ترقی ہونے کے بعد مختلف مقامات پر غیر مسلموں کی اقلیتیں پیدا ہو گئی تھیں کیونکہ اکثر مقام کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ لہٰذا ملک میں امن کے قیام کے لیے ان سے معاہدے ضروری تھے۔ چنانچہ، حجاز، یمن کے یہودی اور یمن کے یہودیوں اور عیسائیوں، حدود شام، دومۃ الجندل، ایلہ، مقناد، حربا، اذرح نبالہ اور نجران کے غیر مسلموں سے معاہدے طے پائے جن میں انہی رعایا کی حیثیت دی گئی اور انہیں جنگی خدمات سے بری کر کے جزیہ کا محصول لیا گیا جس کے معاوضہ میں ان کی جان مال، عزت و آبرو، آزادی وغیرہ کی ضمانت مسلمانوں نے اپنے ذمہ لی۔ جزیہ کی[1] رقم مقرر نہ تھی عموماً ہر عاقل و بالغ اور مستطیع سے سالانہ ایک دینار کی رقم وصول کی جاتی تھی جس سے بوڑھے، بچے، دیوانے اور عورتیں بری تھے۔ بعضوں سے خاص معاہدے بھی طے پاتے تھے کہ وہ مسلمانوں کو اگر وہ انکے ملک سے گذریں تو مہمان رکھیں گے۔ خیبر، فدک، وادی القریٰ اور تیما کے لوگوں سے نصف پیداوار پر مصالحت ہوئی تھی۔ اس کے بعد جزیہ کی آیت نازل ہوئی لیکن پرانا معاہدہ برقرار رہا۔

اصناف محاصل و مخارج مختلف اغراض و مصالح کی بناپر اسلام میں آمدنی کے صرف پانچ

---

[1] یسئلونک عن الانفال قل الانفال للہ والرسول (انفال) واعلموا انما غنمتم من شیٔ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتمیٰ والمساکین وابن السبیل (انفال)

ذرائع تھے۔ غنیمت، فئی، زکوٰۃ، جزیہ اور خراج جن میں غنیمت مستقل آمدنی نہ تھی۔ خمس نکال دینے کے بعد غنیمت کا ایک ایک حصہ سوار کو تین یا دو اور پیادہ کو ایک حصہ کے حساب سے تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ خمس میں اگرچہ ان کا حق نہ تھا لیکن پھر بھی اکثر انہی پر خرچ ہو جاتا تھا۔

زکوٰۃ صرف مسلمانوں سے لی جاتی تھی تاکہ دولت صرف مالداروں میں جمع نہ ہو جائے[1] اور دوسرے بھائیوں کو بھی اُس میں سے حصہ ملے۔ یہ چار مدوں سے وصول ہوتی تھی، نقد روپیہ، پھل اور پیداوار، مویشی (بجز گھوڑا) اسباب تجارت۔ دوسو درہم چاندی بیس مثقال سونا، پانچ اُونٹ اور ۵ وسق سے کم پر زکوٰۃ نہ تھی۔ اس کے یہ مصارف تھے۔ انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیھا والمولفۃ قلوبھم وفی الرقاب والغارمین فی سبیل اللہ وابن السبیل (توبہ - ۸) یہ رقم نہایت تاکید سے اُنہی لوگوں پر صرف کی جاتی تھی اور عموماً جہاں سے وصول کی جاتی تھی وہیں کے لوگوں پر صرف ہوتی تھی۔

خراج: غیر مسلم کاشتکاروں کے کھیت اور باغ وغیرہ جب تیار ہو جاتے تو محصلین بھیج دیئے جاتے اور وہ حسب معاہدہ تخمینہ کر کے وصول کر لیتے۔ خیبر وغیرہ میں آدھی پیداوار پر صلح ہوتی تھی۔ رفع اشتباہ کے لیے تخمینہ میں سے ایک ثلث کم کر دیا جاتا تھا۔

تقسیم حسب ضرورت ہوتی تھی۔ رجسٹر میں نام لکھے ہوتے تھے۔ متاہل لوگوں کو دو اور مجرد کو ایک حصہ دیا جاتا تھا۔ اوّل آزاد کردہ غلام پھر سپاہیوں کو دیا جاتا تھا۔

رسول کریم صلعم کی سیاسیات آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا تاریخی پہلو اور آپ کے نظام حکومت کا نہایت اِجمالی اور مختصر خاکہ پیش کرنے کے بعد اب ہم آپ کی سیاسیات پر فنی اعتبار سے روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

مَبدا سلطنت سیاسیات کی کتابوں میں سب سے پہلی بحث مَبدا سلطنت کی ہے۔ مختلف سیاست دانوں نے اپنی اپنی فکر اور معلومات کے اعتبار سے

---

[1] کی لایکون دولۃ بین الاغنیاء

سلطنت کا مبدأ مختلف قرار دیا ہے۔ کسی نے اس کو "معاہدۂ معاشری" کا نتیجہ بتلایا تو کسی نے جبر و قوت کا اور کسی نے "ارتقائی" یا "تاریخی" نظریہ پیش کیا اور چند دینی لوگوں نے اسکے "ربانی" ہونے پر یقین کیا۔ الغرض۔ع

"شد پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا"

عقلیت پسندوں نے "ربانی" نظریہ کی طرف زیادہ توجہ نہ کی کیونکہ اس میں تعیشات عقل کے لیے کچھ زیادہ سامان موجود نہ تھا۔

اسلام نے سلطنت کا مبدأ خدا کی ذات کو قرار دیا ہے:۔ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ[۱] (۱۲۰/۵) اور اس نے انسان سے پہلے ہی معاہدہ لے رکھا ہے کہ وہی ان کا پروردگار اور پالنہار ہے۔ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟ قَالُوْا بَلٰى۔

اقتدار اعلیٰ یہ بھی سیاسیات کے معرکۃ الآرا مباحث میں سے ایک ہے کہ حکومت میں سب سے اعلیٰ اقتدار کس کو حاصل ہے۔ آیا بادشاہ کو یا عوام کو؟ اس مسئلہ سے متعلق بھی سیاست دانوں نے اپنے عقلی اور تاریخی خیالات ظاہر کئے ہیں۔ کسی نے بادشاہت کو معاہدہ کا نتیجہ بتلاتے ہوئے آخری اقتدار عوام کا ثابت کیا ہے اور بادشاہ کے اختیارات کو محض مفوضہ اختیارات قرار دیا ہے۔ دوسرے گروہ نے جو معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہت کا بہت طرفدار تھا "ظل اللہی" نظریہ گھڑ کر بادشاہ کی ذات کو خدا کا سایہ بنایا یہ بتلایا اور اقتدار اعلیٰ کو بادشاہ میں مرکوز کر دیا۔ بہر حال كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۔

قرآن نے کھلے طور پر کہہ دیا کہ حکومت صرف خدا کی ہے اور اس کی حکومت میں کوئی شریک نہیں۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۵۷/۶) لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۲۶/۱۸) اور كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ[۲] (۱۱۶/۲)

---

[۱] لہٗ مقالید السموٰت والارض (۶۳/۳۹) ولله المشرق والمغرب (۱۱۵/۲) وله ما سكن فى الليل والنهار (۱۳/۶) ولله خزائن السموٰت والارض (۷/۶۳) فسبحٰن الذى بيده ملكوت كل شىء (۸۳/۳۶)۔

[۲] قل اللهم مالك الملك تؤتى الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء (۲۶/۳) والله يحكم لا معقب لحكمه (۴۱/۱۳)

خلافت اس حکومت میں بادشاہت، آمریت یا اس قبیل کی چیزوں کا کوئی تصور ہی نہیں بلکہ قرآن نے بار بار فرعون وہامان اور قارون جیسے لوگوں کا ذکر کرکے لوگوں کو متنبہ کر دیا ہے کہ یہ خدا کے باغی اور دنیا میں فساد پھیلانے والے ہیں۔ اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی اور ان فرعون علا فی الارض وجعل اهلها شیعا یستضعف طائفۃً منهم ویذبح ابناءهم ویستحی نساءهم (۲۸:۴) اور خدا نے ان "اربابا من دون الله" کی حکومت اور بادشاہت اور حکم قائم کرنے کا بارہا حکم دیا ہے[1]

خدا نے انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ[2] یا نائب بنا کر بھیجا ہے اور اس کے حقوق متعین کر دیئے ہیں۔ اُس کو کوئی حق نہیں کہ وہ اپنا حکم چلائے اور بجائے خدا کی بادشاہت دنیا میں قائم کرنے کے خود اپنی خدائی کا دعویٰ کر بیٹھے[3]۔ اس کا کام صرف عامل یا "عاملہ" کا ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں خدا کے نازل کئے ہوئے احکامات کا نفاذ کرکے خدائی حکومت قائم کرے۔ اسکو زیادہ سے زیادہ یہ حق ہے کہ وہ ان احکامات کی آپس کے مشورہ اور غور وخوض سے تاویل[4]

---

[1] فلا تطع اثماً او کفوراً ۲۴ فلا تطع المکذبین ۶۸ ولا تطیعوا امر المسرفین۔ الذین یفسدون فی الارض ولا یصلحون ۲۶: ۱۵۱، ۱۵۲ اور اُن باغیوں میں صرف بادشاہ ہی نہیں بلکہ قارون جیسے بخیل سرمایہ دار اور رہبان احبار بھی ہیں: اتخذوا احبارهم ورهبانهم اربابا من دون الله (التوبہ۔ ۵)

[2] واذ قال ربک للملئکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃ (بقرہ)

[3] ما کان لبشر ان یؤتیه الله الکتب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عباداً لی من دون الله ولکن کونوا ربانیین (آل عمران۔ ۸) واذا تولی سعیٰ فی الارض لیفسد فیها ویهلک الحرث والنسل والله لا یحب الفساد (بقرہ۔ ۲۵)

[4] انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک الله ۵:۱۴ وما یعلمون تاویله الا الله والراسخون فی العلم یقولون امنا به کل من عند ربنا ۳:۱

کرے اور ان نازل کئے ہوئے اساسی قوانین کی بناپر فروعی احکامات وقوانین مستنبط کرے اور بس۔

آپ نے اپنی زندگی سے اس کی بہترین مثال پیش کی کہ اس سے اکمل اور کوئی مثال نہیں ہوسکتی۔ آپ نے کبھی اس دنیا میں اپنی بڑائی نہیں چاہی اور جب کفار قریش نے حضرت ابوطالب کے آگے آپؐ کے سامنے بادشاہت پیش کی تو آپ نے اُسے صاف ٹھکرا دیا۔ اور اپنے کام کو باوجود ناقابل تصور سختیوں اور مشکلوں کے جاری رکھا اور وہ کام اپنی نہیں بلکہ خدا کی بادشاہت کا قیام تھا۔ آپ کو جب طاقت حاصل ہوئی تو آپ نے وہ تمام طاقت وقوت کو خدائی حکومت کے قیام کے لیے صرف کیا۔ آپ نے صحابہ کو نیابت الٰہی کے طریقے سکھائے۔ یعنی وامرھم شوریٰ بینھم ۴۲: ۳۶ اور وشاورھم فی الامر ۳: ۱۵۹

دستور

دساتیر قسم قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض قوم کی تدریجی ترقی کا نتیجہ ہوتے ہیں مثلاً انگلستان کا دستور، بعض جگہ کوئی دستور ساز جماعت بیٹھکر ایک دستور قوم کے لیے مرتب کردیتی ہے جیسے فرانس میں انقلاب کے بعد ہوا تھا۔ بعض محض بادشاہوں یا حاکموں کے عطاکردہ ہوتے ہیں جیسے ہندوستان کا دستور یا ہماری دیسی ریاستوں کے حالیہ نافذہ دساتیر، اور بعض مملکتوں میں سرے سے دستور ہی نہیں ہوتا جیسے آج بھی بہت سے ہندوستانی دیسی ریاستوں میں ہے۔

پھر ان دساتیر کی تقسیم ایک اور طرح بھی کی جاتی ہے یعنی لچکدار وغیر لچکدار اور تحریری وغیر تحریری۔

اسلامی ریاست کا دستور خدا کی طرف سے نازل کیا ہوا، ناقابل تغیر وتبدل اور تحریری وانمٹ ہوتا ہے۔ اور صرف فروعی حد تک لچکدار یہ دستور خدا کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے جو انسانی جذبات، خواہشات واغراض اور ماحول کے اثرات سے بالکل پاک اور انسان کو صراط مستقیم بتلانے والا ہے: کتابٌ انزلناہُ الیك لتخرج الناس

من الظلمٰت الی النور ۱/۱۴ وما انزلنا علیك الکتاب الا لتبین لھم الذی اختلفوا فیہ ۱۶/۶۴ وانزلنا الیك الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون ۱۶/۴۴۔

یہ دستور ناقابلِ تغیر و تبدل ہے اِس لیے کہ یہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔
واُوحی اِلیّ ھذا القرآن لانذرکم بہ ومن بلغ اسی لئے آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا کہ "تم کو لازم ہے کہ میرا یہ کلام اُن لوگوں کو پہنچا دو جو یہاں موجود نہیں ہیں کیونکہ بہت لوگ روایتاً کلام کو سُنکر اُن سے زیادہ کہتے ہیں جو خود اپنے کانوں سے سُنتے ہیں" یہ اُس دستور کے دائمی ہونے کا ثبوت ہے۔ اور اس میں مقام کی بھی قید نہیں کہ یہ سارے عالم کے مسلمانوں کے لیے ہے اور مسلمان کسی جغرافی قوم کا نام نہیں۔
ونزلنا علیك الکتاب تبیاناً لکل شیءٍ ھدیً ورحمۃً وبشریٰ للمسلمین ۱۶/۸۹
اور چونکہ یہ دائمی اور عالمی ہے اِس لیے اس کی محافظ خود خدا کی ذات ہے: انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحٰفظون ۱۵/۹ لہٰذا نہ اُس کو کوئی مٹا ہی سکتا ہے اور نہ اُس میں تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔ واتل ما اُوحی الیك من کتاب ربك لا مبدل لکلماتہٖ ولن تجد من دونہ ملتحداً ۱۸/۲۷۔

اور یہ دستور چونکہ انسانی جذبات، تحریکات، خواہشات و اغراض اور ماحول و علم کے اثرات سے پاک ہے اِس لیے اس میں جھوٹ، غلطی، فریب، غلط فہمی، غلط استناج یا خامی بھی نہیں ہو سکتی: وما ھو بقول شاعرٍ قلیلاً ما تؤمنون۔ ولا بقول کاھنٍ قلیلاً ما تذکرون۔ تنزیلٌ من رب العالمین ۶۹/۴۱-۴۲-۴۳ اور وانہ لکتابٌ عزیزٌ لا یاتیہ الباطلُ من بین یدیہ ولا من خلفہ۔ تنزیلٌ من حکیمٍ حمید ۴۱/۴۲
اور یہ دستور تمام انسانوں کے لیے ہے جو ان الفاظ "لتخرج الناس من الظلمات الی النور"

لے بل ھو قرآن مجید فی لوحٍ محفوظ ۸۵/۲۱ ۔

اور " لتبین للناس ما نزل الیھم " سے ظاہر ہے۔ لیکن اس دستور سے فائدہ اٹھانے کے لیے انسانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ خدا کی حکومت کو تسلیم کرلیں یعنی وہ مسلمان ہوجائیں ورنہ نہ ان پر اس دستور کی پابندی ہی لازم ہے اور نہ وہ اس کی خوبیوں سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔ " ھدیً ورحمۃ وبشریٰ للمسلمین " اور جو اس حکومت کو قبول کرلیتا ہے وہ اس سے بلا امتیاز رنگ ونسل[1] مستفید ہوسکتا ہے کیونکہ کل مومنین اخوۃ اور ان اکرمکم عند اللہ اتقکم۔ اور آپ نے فرمایا: لیس لاحد علی احد فضل الا بدین وتقوی (مشکوٰۃ) اور " اقیموا حدود اللہ علی القریب والبعید ولا تاخذکم فی اللہ لومۃ لائم (ابن ماجہ کتاب الحدود)۔

اس دستور کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر انسان اس پر سختی سے عمل کریں تو خواہ وہ کیسی ہی مسکنت اور کتنے ہی افلاس میں کیوں نہوں بہت جلد وہ حکومت اور دنیا ودین میں برتری حاصل کرکے رہیں گے۔ مگر اس دستور پر یقین وایمان اور اس پر عمل شرط ہے۔ وانتم الاعلون ان کنتم مومنین اور وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف من قبلھم (النور - ۰)

قانون ہر ملک میں اس کے تاریخی روایات، ماحول اور تمدنی وتہذیبی ترقی کے اعتبار سے مختلف قوانین ہوتے ہیں۔ اور یہ قوانین چند خاص اساسی اصولوں کے تحت مرتب کئے جاتے ہیں۔ اور جیسے جیسے زمانہ بدلتا جاتا ہے ان قوانین میں بھی رد وبدل ہوتا رہتا ہے۔ جیسے فرانس میں مشہور انقلاب کے بعد یا روس میں ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد ہوا۔ اور یوں بھی ان میں تغیر وتبدل ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ اور اس کا انحصار بہت کچھ اس وقت کی

---

[1] یا معشر قریش ان اللہ قد اذھب منکم نخوۃ الجاھلیۃ وتعظمھا الاباء۔ ایھا الناس کلکم من آدم وآدم من تراب لا فخر للانساب لا فخر للعربی وعلی العجمی ولا للعجمی علی العربی ان اکرمکم عند اللہ اتقکم (فتح مکہ کا خطبہ)

حکومت پر ہے مثلاً قدامت پرست، جدت پسند، آزاد خیال یا اعتدال پسند اور انقلابی وغیرہ اور یہ قوانین بنانے کا کام ایک خاص جماعت "مقننہ" کے تفویض ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ ظاہر ہے اکثر و بیشتر اکثریت والی جماعت کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر یہ قوانین بنائے جاتے ہیں جو برسر اقتدار ہو ــــ اور اُن میں ترمیم و تنسیخ صرف اُسی وقت ممکن ہے جب کہ یہ دوسری جماعت بھی اپنے آپ کو اکثریت میں تبدیل کر لے۔

اسلامی قانون شل اس کے دستور کے بالکل خدائی قانون ہے۔ یعنی قرآن اس قانون میں اجتماعی اور انفرادی ہر دو قسم کی زندگیوں کے لیے قوانین موجود ہیں۔ اور ان "حقوق العباد" و "حقوق اللہ" کو تفصیل اور تکرار کے ساتھ بیان کر دیا گیا۔ وکذالك نصرف الأيت ليقولوا درست ولنبينه لقوم يعلمون ۞

یہ قوانین تمام زمانوں اور مقاموں کے لیے یکساں طور پر قابل عمل ہیں۔ اور انہیں نہ کوئی تجدد پسند "اساطیر الاولین" کہہ کر بدل سکتا ہے اور نہ کوئی قدامت پرست "حسبنا ما وجدنا علیہ اٰبانا" کہہ کر اُن کو رد کر سکتا ہے اور نہ کوئی جماعت برسراقتدار آنے کے بعد محض اپنی جماعت کی خاطر اس میں رد و بدل کر کے اپنے موافق مقصد قوانین بنا سکتی ہے۔ انسانوں کو اِس قانون کی صرف تاویل کی اجازت دی گئی ہے کہ اُن بتلائے ہوئے اساسی اصولوں کی رو سے زمانہ اور حالات اور واقعات کو دیکھ کر فیصلہ کریں۔ یہ قوانین فروعی ہو سکتے ہیں اور اُنہی اساسوں پر اُن کا قائم ہونا ضروری ہے۔ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئك هم الظالمون (مائدہ ۔ ۷)

جس حکومت کے لیے قانون پہلے ہی سے موجود ہو اور تمام باشندگان حکومت کو اس پر عمل کرنے اور اس میں غور کرنے کی تاکید ہے تو ظاہر ہے کہ پھر کسی جماعت مقننہ کی اُس حکومت میں ضرورت نہیں۔ اب رہ جاتا ہے صرف اس کی تاویل کرنے اور اس کو نافذ کرنے کا کام تو یہ عدلیہ اور عاملہ کا کام ہے۔ اور اس حکومت میں مقننہ، عدلیہ اور عاملہ میں "تفریق

اختیارات" کا کوئی سوال ہی نہیں کہ یہ سب ایک ہی حکومت کے اعضاء ہیں اور سب کا مقصد بالکل ایک سا ہے۔ بلکہ ان سب کو تعاون اور اتفاق سے کام کرنے کی تاکید ہے اور سب میں "تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" کی رُوح کارفرما ہے۔

اِس قانون میں تمام اس کے ماننے والوں کے لیے برابر کے حقوق اور فرائض ہیں اور اس کے آگے کسی کو رنگ و نسل (الا بدین وتقویٰ) کوئی اِمتیاز حاصل نہیں[1]۔ یہ قانون حاکم یا اُمیر سے بھی اسی قدر پابندی چاہتا ہے جس قدر کے ایک ادنیٰ شہری سے آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس کی آئینہ دار ہے۔ باوجود اس کے کہ آپ معصوم تھے اگر کوئی آپ پر اعتراض کرتا تو آپ اُس کو تشفی بخش جواب دیتے اور اگر کوئی حق مانگتا تو اُس کو دیدیتے۔ حق تو کیا لوگ ناحق آپ سے کوئی چیز مانگتے تو آپ دے دیتے۔ چنانچہ ایک وقت ایک بدوی نے آکر آپ سے آپ کی ردائے مُبارک مانگ لی اور آپ نے اُس کو دے دی حالانکہ آپ کے پاس خود دوسری چادر نہیں تھی۔ ایک اور دفعہ ایک شخص نے آکر کہا کہ آپ نے ایک وقت مجھے کوڑا مارا تھا۔ میں اَب آپ سے بدلہ چاہتا ہوں۔ آپ نے اپنی ننگی پیٹ پر اس کو بدلہ لینے کی اجازت دی۔

ایک دفعہ ایک مخزومی عورت نے چوری کی۔ لوگوں نے اُس کے خاندان کا خیال کرکے حضرت اُسامہؓ کو آپ کے پاس سفارش کے لیے بھیجا۔ آپ بہت خفا ہوئے اور فرمایا

انما اھلك الذین قبلکم، انھم کانوا اذا سرق فیھم الشریف ترکوہ واذا سرق فیھم الوضیع، اقاموا علیہ الحدود۔ ایم اللہ، لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا (بخاری۔ الشفاعۃ فی الحدود)

---

[1] اقیموا حدود اللہ علی القریب والبعید ولا تاخذکم فی اللہ لومۃ لائم (ابن ماجہ کتاب الحدود)

یہ تو تھے قانونی حقوق۔ اور حقوق بغیر فرائض نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا قرآن نے جہاں اپنے ماننے والوں کو بشارتیں دیں اور حقوق عطا کئے ان سے وہیں چند فرائض کی پابجائی بھی چاہی ان میں سب سے بڑے فرائض تو وہی اسلام کے پانچ بڑے اراکین ہیں یعنی اس حکومت کے تسلیم کرنے کا عہد و حلف و توحید۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ اِن کے علاوہ اس حکومت کی بقا کے لیے اُن سے اِنتہائی ایثار بھی طلب کیا کہ اگر وقت پڑے تو تمہیں اس خدا کی حکومت کے لیے اپنی جان سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیئے (جہاد) اِن اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیل اللہ صفاً کانھم بنیان مرصوص[1] (الصف۔۴) اور چونکہ کوئی حکومت بغیر تنظیم اور حاکم یا امیر کی اطاعت کے بغیر چل نہیں سکتی اِس لئے جہاں اُنہیں آزادی اعتراض کی اجازت دی وہیں اُن پر اَمیر کی اطاعت کو لازم کر دیا۔ وما ارسلنا من رسولٍ الا لیطاع باذن اللہ عہ یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ و رسولہ ولا تولوا عنہ و اَنتم تسمعون ہے یا اَیُّھَا الذین اٰمنوا اَطِیعوا اللہَ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فاِن تنازعتم فی شیئٍ فردوہ الی اللہِ والرسول عہ مَا کانَ لمومنٍ ولا مومنۃٍ اِذا قضی اللہُ ورسولہٗ امراً اَن یکونَ لَھُم الخیرۃ مِن اَمرِھم ۳۶ [2] اور آپ کی ہدایت ہے۔ اسمعوا و اطیعوا ولو استعمل علیکم عبد حبشی۔

---

[1] اور دوسری آیت یہ ہیں:۔ وما لکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنسأ والولدَ ان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم اھلھا (النساء۔۱۰) روزہ کی فرضیت کے لئے یہ آیت ہے: کُتبَ عَلیکُمُ الصیام کما کتب علی الذین مِن قبلکم اور نماز کے لیے: اِنَّ الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتبا موقوتا (النساء۔۱۵) زکوٰۃ کے لئے: خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم و تزکیھم بھا (توبہ ع۔۱۳) اور حج کے لئے: وللہ علی الناس حج البیت من استطاعَ الیہ سبیلا (آل عمران ع۔۱۰)

[2] دیگر آیات یہ ہیں: ومایشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدی ویتبع غیر سبیل المومنین نولہ ما تولی

عدلیہ | جیسے آپ کے زمانہ میں مقننہ نہیں تھی (یعنی فروعی قوانین بنانے کی جماعت) اِسی طرح کوئی عدلیہ اور عاملہ کی علیحدہ علیحدہ جماعتیں بھی نہیں تھیں۔ یہاں تفریقِ اختیارات تھی نہ فرائض میں بہت زیادہ علیحدگی تھی۔ بیک وقت امیر فروعی قوانین بھی بنا سکتا تھا فیصلے بھی کر سکتا تھا اور سزا بھی اپنے ہاتھ سے دے سکتا تھا۔ جب آپ عاملین کو بھیجتے تو انہیں تبلیغ دین کی بھی تاکید فرماتے۔ ایک ہی صحابی امن کے زمانہ میں قاضی یا والی کا کام بھی کرتا تھا اور میدانِ جنگ میں امیر العسکر بھی ہوتا تھا اور پھر خود فیصلہ بھی صادر کرتا تھا۔ ھم باللیل رھبان وبالنھار فرسان۔

آپ کی ذات تو جامعیت کا انتہائی نمونہ تھی۔ آپ جہاں قرآن کو سمجھاتے اور سمجھانے اور اُس کی روشنی میں دوسرے قوانین بناتے وہیں آپ خود تمام مدینہ واطراف مدینہ کے لوگوں کے قضیوں اور مقدموں کا فیصلہ بھی کرتے۔ لیکن پھر بھی آپ نے چند صائب الرائے اور راسخ العلم صحابہ کو فیصلوں کی اجازت دے رکھی تھی۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ اور معاذ رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کام کو آپ کی زندگی ہی میں انجام دیتے تھے۔ حضرت علیؓ اور معاذؓ کو آپ نے یمن روانہ کیا تھا تاکہ وہاں کے لوگوں سے مختلف رقومات وصول کریں اور انہیں قرآنی احکامات سمجھائیں۔ پہلے خود آپ نے اُنہیں تمام طریقے سکھا دئے۔ چنانچہ یمن روانہ کرتے وقت معاذؓ سے آپ نے جو فصل مقدمات سے متعلق پوچھا تھا وہ آج تک معیاری طریقہ ہے۔ وھو ھذا: قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) لمعاذ بن جبل حین وجھہ الی الیمن بم تقضی قال بما فی کتاب اللہ قال فان لم تجد بما فی سنۃ رسول اللہ قال فان لم تجد قال اجتھد رائی فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)

ملاحظہ ہو حاشیہ (ص۳۲۲) ونصلہ جھنم ۴/۱۱۵ ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ ۴/۸۰ فان تولیتم فانما علی رسولنا البلاغ المبین ۶۴/۱۲ انما کان قول المومنین اذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا واطعنا واولئک ھم المفلحون ۲۴/۵۱ قل اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول فان تولوا فانما علیہ ما حمل وعلیکم ما حملتم وان تطیعوہ تھتدوا ۲۴/۵۴ واوحی الی ھذا القرآن لانذرکم بہ ومن بلغ ۶/۱۹

ملا یحب رسول اللہ صلعم۔ آپ کا فیصلہ کرنے کا طریقہ بھی یہی تھا کہ اگر قرآن کی آیات اِس خصوص میں نازل ہوگئی ہوتیں تو پھر بالکل اُسی کے مطابق فیصلہ کیا کرتے ورنہ آپ صحابہ سے مشورہ[1] کرکے قرآن کے بتلائے ہوئے اصول: وامرھم شوریٰ بینھم (۴۲: ۳۶)۔ وشاورھم فی الامر ۳: ۱۵۹ پر عمل کرتے۔ آپ ایسی صورت میں اہل کتاب سے دریافت فرماتے، (اِس لئے کہ اسلام بھی اُنہی گذشتہ ادیان کی تصدیق اور تکمیل کے لیے آیا تھا) اور اُن پر غور فرماکر اکثر اسی کے مطابق فیصلہ فرماتے اور آپ کے بھی فیصلے نظائر کی حیثیت سے فروعی قوانین کی شکل اختیار کرلیتے۔

عاملہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا مقننہ (فروعی قوانین بنانے والی جماعت) اور عدلیہ کی طرح عاملہ کی بھی علیحدہ جماعت نہ تھی بلکہ ایک عامل یا حاکم عامل ہونے کے ساتھ عادل بھی ہوتا تھا اور قاضی بھی۔ چنانچہ جب آپ صحابہ کو والی بناکر بھیجتے تو اُن کو عدل وانصاف اور نرمی کی تاکید فرماتے آپ کی ذات تو ان صفات کی اکمل طور پر حامل تھی۔ جہاں آپ ملک کے مہمات اُمور انجام دیتے وہیں معمولی سے معمولی کام حتیٰ کہ لوگوں کا سامان اُٹھا دینا، جنازہ اُٹھانا اور اِس قسم کے کام بھی خود اپنے دست مبارک سے انجام دیتے۔

اِن حاکموں کو خود آپ منتخب فرماتے اور جو خود اپنے کو پیش کرتا اس کو نہ بناتے۔[2] انکو منتخب فرمانے کے بعد اُن سے رعایا کے ساتھ حسن سلوک، نرمی، عدل وانصاف اور تبلیغ وتعلیم کی تاکید فرماتے۔ اور جب یہ لوگ واپس آتے تو اُن کا محاسبہ فرماتے اور اگر کسی نے غلطی کی ہوتی تو اُس کو سزا بھی دیتے۔ ایک بار اللیتہؓ کو زکوٰۃ جمع کرنے کے لیے روانہ فرمایا

---

[1] لایجتمع امتی علی الضلالہ (حدیث) یداللہ علی الجماعۃ فمن شذ، شذ فی النار (الترمذی) مارأہ المسلمون حسناً فھو عنداللہ حسن۔

[2] تفصیلات سیرۃ النبی صلعم از سلیمان ندوی جلد دوم باب "تاسیس حکومت" ص۵

وہ واپس آئے اور کہا یہ مال صدقہ کا ہے اور یہ میرا۔ آپ نے اس پر خفا ہو کر فرمایا "تمہیں یہ ہدیہ گھر بیٹھے بیٹھے کیوں نہ مل گیا" اور پھر خطبہ دیکر سب کو اس قسم کے کام سے منع فرمایا۔ ایک دفعہ حضرت خالدؓ نے غلطی سے چند لوگوں کو قتل کر دیا تو آپ کو معلوم ہونے پر آپ نے اپنی براۃ ظاہر کی اور خدا سے مغفرت طلب کی اور ان مقتولین کا معاوضہ اُن کے وارثین کو ادا فرمایا۔

جنگ جنگ کا لفظ بہت وسیع المعنیٰ ہے اور اس میں ہر قسم کی بھلی اور بُری جنگ شامل ہے خواہ وہ محض وسعت سلطنت اور سامراجیت کے لیے ہو، خواہ دوسروں کو غلام بنا کر زمین میں فساد و شر پھیلانے اور لوٹ کھسوٹ کرنے کے لئے ہو خواہ کسی اچھے مقصد اور خاص خیالات کی ترویج کے لیے ہو یہ سب جنگ ہی میں شامل ہیں۔ تمام دُنیا کے شریف اور عقلمند انسان اُس کو ایک بدی اور ناگزیر بُرائی سمجھتے ہیں۔ اِسلام نے بھی محض جنگ کو کبھی اچھا نہیں کہا۔ لیکن وہ برائی اور روائی بدی کو جنگ سے زیادہ بری سمجھتا ہے " الفتنۃ اشد من القتل"۔ انما یحاربون اللہ و رسولہ ویسعون فی الارض فساداً ان یقتلوا ۳۳/۵

اِسلامی جنگ کا مقصد کبھی محض جنگ کی خاطر جنگ یا کوئی دنیاوی و مادّی فائدہ کی خاطر جنگ نہیں رہا اور نہ ہی زمین میں فساد و فتنہ پھیلانا ہے۔ بلکہ بالکل اُس کے برعکس اُسکا مقصد امن کی خاطر جنگ ہے[1]۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُس کی تمام جنگیں مدافعانہ ہوتی ہیں[2]۔ وہ

---

[1] وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لایحب المعتدین۔ اور وقاتلوھم حتیٰ لاتکون فتنۃ ویکون الدین للہ (بقرۃ - ۱۸۹)

[2] اُذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر۔ الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ۔ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومسجد یذکر فیھا اسم اللہ۔ اور فان قاتلوکم فاقتلوھم (۱۷۲:۲) فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدی علیکم ۲/۱۹۴

اس وقت تک جنگ کی اجازت نہیں دیتا جب تک کہ دوسرا فریق نقض امن نکرے یا امن قائم کرنے میں رکاوٹ پیدا نکرے یا امن کوشوں سے جنگ شروع نکردے۔ فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما جعل اللہ علیکم سبیلا (النساء-۹۰) اذن للذین یقٰتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر۔ الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ۔ اور فان قاتلوکم فاقتلوھم (۲: ۱۹۱) واقتلوھم حیث ثقفتموھم واخرجوھم من حیث اخرجوکم والفتنۃ اشد من القتل۔

اسلامی جنگ کا مقصد ہمیشہ بدی کی بیخ کنی اور نیکی و بھلائی کا دنیا میں قیام رہا ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ (آل عمران-۱۱) اور اُن اسلامی مجاہدین اور دیگر جنگجویوں کا فرق یہ ہے کہ: الذین اٰمنوا یقاتلونَ فی سبیل اللہ والذینَ کفروا یقاتلونَ فی سبیل الطاغوت (النساء-۱۰۰)

اسی انما الاعمال بالنیات کے نقطہ کو علامہ اقبالؒ نے کیا خوب ادا کیا ہے۔

قرب حق از ہر عمل مقصود دار　　　تا ز تو گردد جلالش آشکار

صلح شر گردد چو مقصود است غیر　　　گر خدا باشد غرض جنگ است خیر

اور اسی نیک مقصد اور پاک نیت کو ظاہر کرنے کے لیے اسلام نے ایسی جنگوں کا نام "جہاد"[1]

1. An eminent Muslim Jurist has defined Jihad as: "Jihad in the technology of law is used for expending ability and power in fighting the path of God by means of life, property tongue and other than these"—"Muslim conduct of State"—Dr. Hamidullah, Islamic Culture Vol. XV No. 3 P. 273.

رکھا ہے۔ اور یہ اسلامی جہاد صرف مقاتلہ و محاربہ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ اُس مسلسل جنگ کا نام ہے جو مومن رات دن اپنے نفس اَمّارہ، اپنے ناپاک ماحول، اور اپنے نجس معاشرہ کے خلاف مصروف پیکار رہتا ہے۔ اور مقاتلہ و محاربہ اس کا ایک انتہائی اور خون ریز مظاہرہ ہے۔ لیکن اُن سب میں مشکل ترین اور نتیجۃً افضل ترین جہاد وہی ہے جس کو ذات اقدس صلعم نے "جہاد بالنفس" فرمایا ہے۔ ود رمن قال۔

مردِ مومن زندہ و باخود بجنگ   برخود افتد ہم چو بر آہو پلنگ

اور ان تمام قسم کے جہادوں کا مقصد بس ایک ہی ہے یعنی "اعلائے کلمۃ الحق"۔ فرق اتنا ہے کہ کہیں اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انسان خود اپنے آپ سے برسرِ پیکار رہتا ہے، کہیں ماحول اور معاشرہ کے خلاف مصروف جہاد ہو جاتا ہے اور کہیں پورے ملک بلکہ ساری ساری دنیا کے مخالفین کے خلاف سرگرم قتال ہو جاتا ہے[1] اور یہ تمام جد و جہد اور کوشش

(بقیہ حاشیہ صفحہ: ۳۲۵)

4. "The lawful reasons" says Dr. Hamidullah in his essay "Muslim Conduct of State," for Muslims to wage war may fall into the following categoies: (1) The continuation of the existing war; (2) Defense; (3) Sympathetic; (4) Punitive, and (5) Idealistic.

[1] لا یستوی القٰعدون من المؤمنین غیر اولی الضرر والمجاہدون فی سبیل اللّٰہ بأموالہم وانفسہم۔ فضل اللّٰہ المجٰہدین بأموالہم وانفسہم علی القٰعدین درجۃ۔ وکلا وعد اللّٰہ الحسنٰی۔ وفضل اللّٰہ المجٰہدین علی القٰعدین اجراً عظیما (نساء: ۱۳)

وکاوش اس لیے ہے کہ وہ اپنا بہترین نظام دُنیا میں قائم کرکے ایک دائمی امن، الٰہی قانون اور خدائی حکومت دنیا میں قائم و استوار دیکھنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ مولوی ابوالاعلیٰ مودودی نے کہا ہے "اسلام محض ایک مذہبی عقیدہ اور چند عبادات کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک جامع سسٹم ہے جو دنیا سے زندگی کے تمام ظالمانہ اور مفسدانہ نظامات کو مٹانا چاہتا ہے اور اُن کی جگہ اپنا ایک اصلاحی پروگرام نافذ کرنا چاہتا ہے جس کو وہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے سب سے بہتر سمجھتا ہےؔ" الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر (حج-۶) لیکن خدا کو معلوم تھا کہ ایک فریق مسلمانوں کے ان نیک ارادوں کی مزاحمت کرے گا اور اُنہیں سخت محن و فتن مصیبت و تکلیف اور امتحان و ابتلا میں گرفتار کریگا اور اُن سے گھر، وطن، مال و دولت، خویش و اقربا حتیٰ کہ جان تک کی قربانی طلب کریگا اور جب اُنہیں اِن تمام آزمائشوں میں ثابت قدم اور مضبوط پائیگا تو اُس کو مجبوراً اُن کے لیے جگہ خالی کردینا پڑیگی۔ چنانچہ قرآن نے آگاہ کردیا کہ: لا یزالون یقاتلونکم حتیٰ یردوکم عن دینکم ان استطاعوا۔ اور اس کے رسول نے (صلوات اللہ علیہ) کھلے طور پر کہہ دیا کہ اگر تم باطل کے سامنے دب گئے تو پھر تم حق کو کسی طرح سے بھی قائم کرنے کے قابل نہ رہوگے۔ والذی نفسی بیدہ لتامرن بالمعروف ولتنھون عن المنکر ولتاخذن علی یدالمسیئ ولتاطرنہ علی الحق اطراً او لیضربن اللہ قلوب بعضکم علی بعض

بقیہ حاشیہ صفحہ (۳۲۶) انما المومنون الذین اٰمنوا باللہ و رسولہ ثم لم یرتابوا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ، اولٰئک ھم الصادقون (حجرات-۲) فالذین ھاجروا واخرجوا من دیارھم واوذوا فی سبیلی وقاتلوا وقتلوا لاکفرن عنھم سیاتھم ولادخلنھم جنت (آل عمران-۲۰)

ؔ "الجہاد فی الاسلام" از سید ابوالاعلیٰ صاحب۔ ترجمان القرآن جلد ۱۴۔ عدد ۳۔

اَو لیلعنکم کما لعنھم (الترمذی وابو داؤد) انہی باتوں کو جانتے ہوئے جہاں آپ نے اپنے آپکو "انا نبی الرحمۃ" فرمایا وہیں "انا نبی الملحمۃ" بھی فرمایا کیوں کہ بغیر اس کے "وجاء الحق وزھق الباطل۔ اِنَّ الباطل کان زھوقا" کی پیش گوئی پوری نہیں ہوسکتی تھی۔ لہذا خدا نے پہلے تو اُنہیں اپنا کام صلح و آشتی[1] اور نرمی سے انجام دینے کو کہا اور ہر قسم کے ایثار و قربانی کی تلقین کی اور اگر اس پر بھی کفار خاموش نہوں تو پھر اُن کی گردنیں اُڑا دینے کی اجازت دے دی۔ اِنما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا[3] اذن للذین یقتلون بانھم ظلموا الخ اور اگر یہ لوگ اس وقت بھی صلح کی طرف جھکیں تو شمشیروں کو نیام میں کر لینے کا حکم دیا کہ مقصد اگر بغیر لڑائی اور جنگ کے حاصل ہو جاتا ہے تو پھر کیوں خون ریزی ہو فان جنحو للسلم فاجنح لھا وتوکل علی اللہ ۸/۶۱ اور اگر بیچ معرکہ میں بھی صلح جوئی کریں تو اُنہیں چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما جعل اللہ علیکم سبیلا (۴-۹۲) لیکن اگر وہ نہ مانیں اور جنگ و قتال پر تُلے ہوئے ہوں تو پھر اُن کی گردنیں گاجروں کی طرح اُڑا دینے کی اجازت دی: فاذ لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء حتی تضع الحرب اوزارھا (محمد ع-۱) چنانچہ جنگ بدر میں خوب خون ریزی ہونے سے پہلے کفار کو اسیر بنانے اور پھر اُنہیں فدیہ لے کر چھوڑنے پر خدا کا عتاب نازل ہوا[2]۔ ماکان لنبی ان یکون لہ اسری حتی یثخن فی الارض (انفال) اور بغیر کسی ظلم و زیادتی اُن کو ترکی بہ ترکی جواب دینے کی اجازت دی۔ واقتلوھم

---

[1] دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیۓ بیچین نہو بلکہ اُن کو امن و صلح کی طرف بلاؤ اور اس پر بھی اُن سے تمہارا مقابلہ ہو جائے تو پھر ثابت قدم رہو اور صبر کرو اور جان لو کہ جنت تلوار کے سایہ میں ہے (بخاری) "وجادلھم بالتی ھی احسن" ۱۶/۱۲۵

[2] لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم (انفال)

حیث ثقفتموھم واخرجوھم من حیث اخرجوکم۔ والفتنۃ اشد من القتل۔

قوانین جنگ اس کے معنی یہ نہیں کہ میدان جنگ میں اُتر آنے کے بعد ہر قسم کی بہیمیت وسبعیت جائز کردی جاتی ہے۔ بلکہ اس میدان کارزار میں بھی قوانین اور قیود کا پابند کردیا گیا ہے کہ درندگی اور انسانی جنگوں میں فرق رہے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے: ثم امر بلالا ان یدفع الیہ اللواء فدفعہ الیہ۔ فحمد اللہ وصلی علی نفسہ ثم قال: خذہٗ یا ابن عوف اغزوا جمیعا فی سبیل اللہ فقاتلوا من کفر باللہ ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا ولا تقتلوا ولیداً ولا امرأۃ۔ فھذا عھد اللہ وسیرۃ نبیہ فیکم (ابن ہشام) چنانچہ آپ کا دستور تھا کہ جب کبھی کہیں فوج روانہ فرماتے تو سردار فوج کو بلا کر احکام دیتے کہ شہری اور غیر متحارب آبادی کا لحاظ رکھیں۔ ابوداؤد میں ہے۔ لا تقتلوا شیخاً فانیا ولا طفلا ولا صغیراً ولا امرأۃ۔ یہ احکامات اسلئے تھے کہ جنگ کا مقصد کبھی اسلام میں جنگ اور خونریزی نہ تھا بلکہ وہ امن قائم کرنے کا ایک ناگزیر ذریعہ سمجھی جاتی تھی اور اگر یہ مقصد صلح سے حاصل ہوسکے تو پھر جنگ کی اجازت ہی نہیں تھی، فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما جعل اللہ علیکم سبیلا (نسا۔ ۹۲) اور اگر دوران کارزار میں عین غلبہ کے وقت بھی وہ صلح جوئی کریں تو مان لینے کا حکم تھا: فلا تھنوا وتدعوا الی السلم وانتم الاعلون (محمد۔ ۳۷)

صلح اسلام اپنے نام ہی میں ہمیشہ صلح کی دعوت رکھتا ہے اور اُس کا کام بھی دنیا میں لوگوں کو صلح و آشتی سے رہنے کے طریقے سکھلانا ہے تاکہ قیام امن کے بعد ایک دائمی صلح وسلامتی زمین میں قائم و برقرار رہ سکے۔ اس لئے جب وہ انسانوں کو اپنی طرف بلاتا ہے تو حقیقت میں صلح ہی کی طرف بلاتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو اُٹھتے بیٹھتے اور لوگوں کے آپس میں ملتے اور جُدا ہوتے وقت ایک دوسرے کی سلامتی چاہنے کی تلقین کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ درمیان کارزار بھی اور عین غلبہ کے وقت بھی دشمن

صلح جوئی کرے تو خونریزی روک کر صلح کر لینے کا حکم ہے۔ ایک دفعہ حضرت خالدؓ کی غلط فہمی سے چند لوگوں کو قتل کر دینے پر آپ نے اِس واقعہ سے اپنی براۃ کا اظہار فرمایا اور خدا سے مغفرت طلب کی اور مقتولین کے وارثین کو اُن کی دین دِلوائی۔

صلح ایک معاہدہ ہے۔ یہ معاہدہ بعض وقت جنگ ملتوی کرنے کے لیے کیا جاتا ہے کبھی لڑائی سے پہلے ہی امن کی زندگی بسر کرنے کے لئے تعین مدت کے ساتھ خاص خاص شرائط پر طے پاتا ہے جیسے صلح حدیبیہ میں ہوا اور بعض وقت غالب ومغلوب قوموں میں بھی طے پاتا ہے کہ اب آئندہ ان ان طریقوں سے اِن دونوں قوموں کو زندگی گذارنی ہوگی۔ الغرض اِن سب کا مقصد زمین میں سلامتی، امن اور چین قائم کرنا ہے۔ اور ایک بار صلح کے شرائط طے پا جائیں تو پھر دونوں فریقوں پر تا ختم مُدت معینہ یا نقض عہد اُس کی پابندی لازمی ہوتی ہے تا آنکہ کوئی فریق تراضی فریقین سے کسی شرط میں ترمیم کرنی چاہیئے جیسے کہ کفار قریش صلح حدیبیہ کے بعد "کفار مسلمانوں کے پاس مدینہ جائیں تو واپس کر دیئے جائیں" والی شرط سے دست بردار ہو گئے تھے۔ اور جب صلحنامہ طے پا جائے تو پھر مسلمانوں کو فریق ثانی سے نیک برتاؤ نرمی اور انصاف کرنے سے منع نہیں کیا گیا۔ لا ینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبرّوھم وتقسطوا الیھم فقولا لہ قولا لینا لعلہ یتذکر او یخشی ۲۰؎ اور اگر مغلوب قوم ہے تو اس سے بھی کسی قسم کی بدسلوکی رَوا نہیں رکھی گئی اور آپ نے صحابہ کو ناانصافی اور بدسلوکی سے سختی سے رُوکا ہے۔ الا من ظلم معاھدًا او انتقصہ او کلفہ فوق طاقتہ او اخذ منہ شیئًا بغیر طیب نفس فانا حجیجہ یوم القیامۃ (ابوداؤد جلد دوم صفحہ ۷۷)

معاہدہ معاہدہ ایک تہ نامہ ہوتا ہے جس پر فریقین آپس کے بحث و مباحثہ اور مشورہ کے بعد تراضی طرفین سے عمل کرنے کا وعدہ کر لیتے ہیں اسلام نے

معاہدہ کی بہت تکریم کی جاتی ہے۔ نہ اس کو "کاغذ کے پُرزہ" کے برابر سمجھا جاتا ہے اور نہ کوئی معاہدہ "محض توڑنے" کے لیے کیا جاتا ہے۔ قرآن اس کی تحریم کا سختی سے حکم دیتا ہے۔ واوفوا بالعھد ان العھد کان مسئولا (۱۷:۳۶) اور اگر فریق ثانی معاہدہ کی کسی دفعہ کو توڑے نہیں اور دشمنوں کی مدد نہ کرے تو پھر اس معاہدہ پر مدت معینہ تک عمل کرنا ضروری ہے الا الذین عاھدتم من المشرکین ثم لم ینقصوکم شیئاً ولم یظاھروا علیکم احداً فاتموا الیھم عھدھم الی مدتھم ان اللہ یحب المتقین (۹:۴) الذین عاھدتم عند المسجد الحرام فما استقاموا لکم فاستقیموا لھم ان اللہ یحب المتقین (۹:۷)

معاہدے کئی قسم کے ہوتے ہیں:- اشخاص کے درمیان کسی کاروبار میں یا کسی معاملہ پر، ملک کی حاکم و محکوم قوموں کے درمیان، قبیلوں یا ملکوں سے کسی کاروبار کے سلسلہ میں یا غیر جانبداری وغیرہ کے لیے، جنگ ملتوی کرنے یا روکنے اور صلح کرنے، اور جنگ کے بعد مفتوح فریق سے اور مختلف ممالک کے درمیان بین ملکی معاہدے۔ سوائے آخری قسم کے جس میں بجز ان خطوط کے جو سلاطین اور ملوک کے نام لکھے گئے تھے (اور یہ کوئی معاہدے نہیں تھے) دوسری قسم کے معاہدوں کی مثالیں آپ کی سیرۃ میں کافی ملتی ہیں۔

شخصی معاملات اور لین دین میں پہلے تو ایمانداری کی تلقین کی گئی اور پھر تاکید کردی گئی کہ جب کوئی معاملہ کرو تو اسے لکھ بھی لیا کرو تاکہ بعد میں جھگڑا اور فساد نہ ہونے پائے اور ہر اس قسم کے مستقبل کے لین دین کے لیے جس غلط فہمی یا شر و فساد کا ڈر ہو غیر مبہم الفاظ میں ٹھیک ٹھیک طور سے پہلے ہی تصفیہ کرنے کو کہا گیا اور دوسرے معاشرتی عہد جس میں عقد نکاح بھی ہے ان سے متعلق صراحتاً بتلا دیا گیا کہ کس طرح عمل کیا جائے۔ اسی طرح جماعتوں میں بھی معاہدے ہوتے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کے مدینہ میں یہودیوں سے معاہدے تھے

اور اُن کی برابر مسلمان پابندی کرتے تھے تاآنکہ اُنھوں نے جنگ احزاب میں کفار کے ساتھ ملکر مسلمانوں کے خلاف لشکر آرائی کی اور اُن قدیم مدینہ کے معاہدوں کی تنسیخ کردی آپ اکثر قبیلوں سے پہلے ہی غیر جانبداری کے معاہدے طے کر لیتے تھے تاکہ کفار حملہ کی جراءت نہ کرسکیں چنانچہ بنی قریظہ اور بنی نضیر وغیرہ سے آپ نے معاہدے کئے تھے۔ اگر کوئی فریق جنگ میں صلح چاہتا تو آپ فوراً اس کے لیے راضی ہوجاتے اور مفتوحین سے بھی معاہدہ طے کرکے اس کی پابندی فرماتے جیسے خیبر وغیرہ میں ہوا۔

الغرض اُن تمام معاہدوں کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ دُنیا میں امن قائم ہو سکے اور ہر طرح سے شر و فساد کے منافذ بند ہو جائیں لیکن معاہدوں سے اُس وقت تک اطمینان اور چین حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس کی پوری طور پر تحریم نہ کی جائے۔ آپ نے اس سلسلہ میں اپنی ایسی مثال پیش کی کہ آج تک دُنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی، صلح حدیبیہ کے وقت ابوجندلؓ کو کفار کے حوالہ کرنا، اور اُس کے بعد ابو بصیرؓ کو مدینہ میں کفار کے مطالبہ پر اُن کے حوالہ کردینا یہ اور اِس قسم کے کئی واقعات آپ کی سیرت میں موجود ہیں۔ آپ صحابہ کو بھی اُس کی تحریم کا خیال رکھنے کی سختی سے تاکید فرماتے تھے: چنانچہ آپ کا ارشاد ہے: الا من اظلم معاهداً او انتقصه او كلفه فوق طاقته او اخذ منه شيأ بغير طيب نفس فانا حجيجه يوم القيامة (ابو داؤد جلد دوم صفحہ ۴۴)

رواداری۔ دو مختلف الخیال اور متفرق المسلک اشخاص یا جماعتوں میں دوستی اور محبت ہونا بالکل فطری امر ہے کیونکہ محبت اور دوستی کی اساس ہی خیالات کی ہم آہنگی، اعمال کی یکرنگی اور مقاصد کی یکجہتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے جب دو مختلف المذاہب قومیں ایک ہی ملک میں بستی ہوں تو ملک کے امن وچین کو برقرار رکھنے کے لیے اُن کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، دوسروں کے کاروبار و معاملات میں ناجائز مداخلت نہ کرنا، ہر ایک کو اُن کے حقوق سے استفادہ کا موقع دینا

اور ہر ایک طریقہ سے آپس میں لڑائی جھگڑا نہ ہونے دینا اُس کا نام رواداری ہے۔

اِسلام کی تمام تعلیمات، رواداری سے بھری ہوئی ہیں اور اگر اُن پر سختی سے عمل کیا جائے تو اُس سے بہتر قسم کی اور کوئی رواداری نہیں ہوسکتی۔ بقول علامہ محمد پکتھال مرحوم کے مسلمانوں میں اگر رواداری کا فقدان پایا جاتا ہے تو یہ صرف اُس وقت سے پایا جاتا ہے جب سے کہ اُنھوں نے اپنے دین پر عمل کرنا چھوڑ دیا۔[1] نہ مذہب اِسلام میں جبر و اکراہ جائز ہے "لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی ۲۵۶/۲ اور نہ ہی اُس مذہب نے امن جو اور صلح کل لوگوں سے اچھے طریقہ سے ملنے اور نیکی کرنے سے روکا ہے۔ لا ینھکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم و تقسطوا الیھم (۲۸۔ ممتحنہ ع۔۲) اور اگر دوسرا فریق درپے آزار ہے اور قسم قسم کی سازشیں اور مخالفانہ چالیں چل رہا ہے تو پھر مسلمان مجبور ہیں کہ اُن سے ترک موالات کریں۔ انما ینھکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین و اخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم ومن یتولھم فاولئک ھم الظالمون (ممتحنہ ۲ع پ۲۸)

اگر اُنہیں اپنے مسلک کی طرف بلانا ہو تو بہترین طریقہ سے بلانے کا حکم ہے: ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن ۱۲۵/۱۶ اور آپ کی

---

1. "It was not until the Western Nations broke away from their religious law that they became more tolerant, and it was only when the *M*uslims fell away from the religious law that they declined in tolerance and other evidences of the highest culture." P. 90 "Tolerance"—"The Cultural Side of Islam"—"Md. Pickthall.

ذاتِ مُقدس صلعم خود انتہائی اَخلاق اور رحمت کا مجسمہ تھی: فبما رحمۃٍ من اللہ لنتَ لھم ولو کنتَ فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولك (پ۴ ال عمران ۔ ۱۷ ع) وانك لعلٰی خلق عظیم (القلم پ۲۹) اور آپ نے اُسی طریقہ کی اپنے صحابہ کو بھی تلقین کی تھی۔ چنانچہ حضرت معاذ کو یمن بھیجتے وقت آپ نے جو ہدایتیں کی تھیں وہ یہ تھیں، "انك تاتی قومًا من اھل الکتاب فادعھم الی الشھادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وانی رسول اللہ فان ھم اطاعولذالك فاعلمھم ان اللہ افترض علیھم صدقۃ توخذ من اغنیائھم وترد الی فقرائھم فان ھم اطاعوالذالك فایاك وکرائم اموالھم واتق دعوۃ المظلوم فانہ لیس بینھا وبین اللہ حجاب" اور پھر آخر میں فرمایا۔ "یسر ولاتعسرا وبشرا ولاتنفرا وتطادعا ولا تختلفا" اور فرمایا۔ احسن خلقك للناس (ابن سعد) آپ اکثر اُن دیگر قوموں سے معاہدہ فرمالیتے تاکہ دونوں کے حقوق کھلے طور پر متعین اور واضح ہوجائیں اور اُس پر سختی سے عمل فرماتے۔ الامن اظلم معاھداً او انتقصہ او کلفہ فوق طاقتہ اواخذ منہ شاءً بغیر طیب نفس فانا حجیجہ یوم القیامۃ (ابوداؤد جلد۲) اِس طرح اِسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو معاہدوں کے مطابق پورے حقوق حاصل تھے اور اگر وہ سازشیں اور بدعہدی نہ کرتے اور فساد و طغیان نہ مچاتے تو اُن کی جان و مال وآبرو اور مذہبی آزادی کے ضامن خود مسلمان ہوتے تھے۔

معاشرت میں سیاسیات کا دخل مغربی سیاسیات اور مشرقی سیاسیات میں بھی قدیم سے معاشری کاروبار کو سیاسیات سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کی گئی اور اُس کو باشندگانِ مُلک کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے معاشرہ کی آفرینش اور ارتقا میں عقل وحکمت سے زیادہ خواہشات وجذبات کارفرما رہے اور نتیجۃً عورتوں کے مَردوں کے برابر حقوق، ضبط تولید، زنا، مخلوط تعلیم، شراب خواری، جوا، اور

قسم قسم کی تعیشات میں اسراف و بے اعتدالی اُن کے معاشرہ کا جزو لاینفک بن گئے۔ لیکن جب فطری حدود سے تجاوز کے قدرتی نتائج برآمد ہوئے تو اُنہیں آخر میں اپنی ناوانیوں کا اعتراف کرنا پڑا چنانچہ مارشل پیتین نے حال میں فرانس کی شکست کے جو تین اہم اسباب بتلائے اُن میں سے دو انہی معاشری خرابیوں کا نتیجہ تھے یعنی "بہت کم لڑکے اور زنانہ اخلاق"

لیکن ؎ آنچہ دانا کند کند ناداں لیک بعد از خرابیٔ بسیار

لیکن اسلام جس کی وسعت انسانوں کی ہر دو زندگیوں کو محیط ہے اُس کی دُور رَس نگاہوں نے اِس عدم مداخلت کی حکمتِ عملی کو روزِ اول ہی اپنی سیاسیات میں جگہ نہیں دی اور اُس فعل میں جو اُس کے بتلائے ہوئے آساسی اُصولوں کے خلاف پڑتے ہوں مداخلت کو اپنا جائز حق قرار دیا چنانچہ شادی بیاہ، پردہ، عورتوں کے حقوق، اور اُن کی سرگرمیوں کے حدود، سب مقرر کر دئے۔ چنانچہ جہاں مردوں کو "الناس قوامون علی النسا" قرار دیا وہیں اُن کی اور اُن کے اولاد کی کفالت اور اُن کے حقوق کی نگہداشت کی ذمہ داری بھی اُن پر عائد کر دی۔ آپ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر فرمایا کہ: عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے"۔ اور قرآن نے اُن کا باہمی تعلق "ھن لباسٌ لکم وانتم لباسٌ لھن" بتلایا۔

اِس کے بعد زنا، متعہ وغیرہ جیسے فاسد معاشری اعمال کی ممانعت کر دی۔ اسی طرح شراب، جوا، انصاب وازلام وغیرہ کو بھی جتنے معاشری خرابیاں پھیلتی تھیں بالکل حرام قرار دے دیا۔ یسلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما۔ اور اُن تمام چیزوں کو نجس قرار دیا: انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ (مائدہ) اور اُس کی حکمت بھی تبلادی: انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلوۃ فھل انتم منتھون (مائدہ)

غلامی جس کو اتنی مذمت کرنے کے باوجود بھی آج تک یورپ اپنے معاشرہ سے نکال نہ سکا اسکی اجازت سے متعلق قرآن میں کوئی نص صریح تو نہیں ہے لیکن "ماسلکت ایمانکم" جیسے الفاظ کا اس طرف اشارہ ہے۔ اور اس نے ان کے لیے زکوٰۃ کے اخراجات میں ایک حصہ رکھا ہے (وفی الرقاب) اور آنجنابؐ (روحی فداہ) کے ان سے حسن سلوک کا یہ عالم تھا کہ آپ نے حضرت انس کو باوجود ان کے ہمیشہ حاضر خدمت رہنے کے کبھی کسی بات پر "لما فعلت" نہیں فرمایا اور صحابہ کو ان سے حسن سلوک کی تاکید کی ایک صحابی کو جو اپنے غلام کو مار رہے تھے فرمایا "یہ تمہارے بھائی ہیں جو خود کھاؤ ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنو ان کو پہناؤ" اور اسی قسم کے الفاظ حجۃ الوداع کے موقع پر بھی فرمائے۔ ان کے ساتھ آپ کے حسن سلوک کا یہ عالم تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر خاص معاشری اور معاشی مصالح پیش نظر نہ ہوتے تو آپ ہمیشہ کے لیے غلامی کا انسداد فرما دیتے۔

الغرض اسلامی حکومت معاشرتی سرگرمیوں میں اتنی آزادی نہیں دیتی جیسی کہ آج کل کی ناعاقبت اندیش حکومتیں دے رہی ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ بڑی بڑی سیاسی خرابیوں کا سبب یہی معاشری خرابیاں رہی ہیں اور اسلامی حکومت کا زوال خود انہی نفس پرستوں کا رہین منت ہے۔

معاشی نظام فن معاشیات کو کبھی سیاسیات کا محض ایک جزو سمجھا جاتا تھا لیکن مغرب کی مادہ پرستی نے اس فن کو اب اتنی اہمیت دیدی ہے کہ تمام سیاسی سرگرمیوں کا محور یہی معاشی کاروبار ہو گئے ہیں۔ فن کے اعتبار سے ایسا ہو تو ہو لیکن عملی زندگی میں سیاسی اور معاشی سرگرمیوں کا تعلق ہمیشہ چولی دامن کا رہا ہے۔ لیکن اسلام نے کبھی مادیت کو اتنی اہمیت نہیں دی کہ وہ ایک مقصد حاصل کرنے کے ذریعہ سے ہٹ کر خود بذاتہ مقصد بن جائے۔ اسی لیے اس نے انسان کی معاشی سرگرمیوں کو ان کے حدود[1] میں رکھنے کے لیے معتدل بنیادوں پر ایک صالح معاشی نظام پیش کیا جو

[1] کلوا واشربوا ولا تسرفوا (اعراف ع) ولا تجعل یدک مغلولۃ الی

سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے افراطی و تفریطی میلانات سے پاک ہے۔ خیرالامور اوسطہا

اسلام کے ہر نظام کا مرکز خدا کی ذات ہے کیونکہ وہی ہمارا مقصد وحید اور ہماری ہر حرکت کا محور ہے۔ وھوالذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً (بقرہ) لیکن نائب سلطنت کو حقوق دئے کہ وہ اُن میں انتظام کرے "عادی الارض للہ و رسولہ ثم ھی لکم منی" (حدیث)

جہاں یہ کہا گیا کہ وما من دابتہٍ فی الارض الاعلی اللہ رزقھا (ہود) وہیں اس ذمہ داری کے ساتھ آسمان و زمین کے تمام خزانوں کو انسان کے لیے مسخر کرکے اُس کے سامنے پھیلا دیا: وفی السماء رزقکم وما توعدون۔ اور اُس سے استحصال کی ایک ہی شرط رکھی یعنی لیس للانسان الاما سعیٰ تاکہ اُنہیں جد وجہد اور کوشش کرنا پڑے اور حکمت بتلادی کہ لو بسط اللہ الرزق لعبادہ لبغوا فی الارض ولکن ینزل بقدر ما یشاء۔ انہ بعبادہ خبیر بصیر۔ (الشوریٰ ع ۲) لیکن انسان کی محنت اور اس کی جد وجہد کے میدان کی وسعت میں کسی قسم کے ناجائز حدود قرار نہیں دئے بلکہ اُس کو خاص اُصول اور قوانین بتلائے کہ جس طرح اُس کو آزادی ملی ہے اُس طرح وہ بھی اپنے عمل سے دوسروں کی آزادی کو سلب نہ کرے: "لا یرضی لاخیہ الامایرضی لنفسہ" (حدیث) اور تمدنی زندگی کی بقا و صلاح کے لیے ایک دوسرے سے نیکی میں تعاون کرے: تعاونوا بالبر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (پ۶) اور اگر پھر بھی اپنے عمل یا مواقع کی وجہ سے اُس کو دوسروں پر فضیلت یا بہتری حاصل ہو جائے۔ کما قال اللہ تعالیٰ، وھوالذی جعلکم خلٰئف فی الارض ورفع بعضکم فوق بعض درجٰت لیبلوکم فی ما اٰتٰکم (پ۸) تو چونکہ اس کی فضیلت کے حاصل کرنے میں خدا کی مہربانی و عنایت اور معاشرہ کا تعاون حاصل ہے اس لیے اُسے چاہیے کہ اپنی اس مکتسب آمدنی میں کچھ نہیں تو بطور شکر اپنے

ملاحظہ ہو تقیہ حاشیہ صفحہ (۳۴۶) عنقک ولاتبسطھا کل البسط فتقعد ملوما محسورا (بنو اسرائیل ع ۳)

دوسرے محروم بھائیوں کو بھی شریک کرے اور ان کے لیے بھی ایسے مواقع بہم پہنچائے:
وفی اموالھم حق للسائل والمحروم (۵۱: ۱۹)

یہ اس معاشی نظام کے چند اساسی اصول وحکم ہیں۔ اس کے علاوہ اجازت اور روک تھام کے لیے بھی چند قوانین بتلا دیے گئے ہیں اس معاشی نظام میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ فرد کی انفرادیت و آزادی کو پوری طور پر قائم رکھتے ہوئے اسکو لت کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنایا جائے۔ یعنی فرد وجماعت باہم معاون ہوں مخالف نہوں جن کاروبار سے معاشرہ کو نقصان نہیں پہنچتا ان سے اکتساب دولت کی پوری پوری اجازت بلکہ ہدایت ہے: فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ (جمعہ) آپ کی بھی صحابہ کو بھی ہدایت تھی اور آپ خود کبھی تاجر تھے جسکا نتیجہ یہ تھا کہ مہاجرین مدینہ آنے کے چند ہی روز بعد اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہوگئے اور انھوں نے انصار کو اپنی ذمہ داریوں سے بہت جلد سبکدوش کردیا۔ آپ نے محنت کو اس قدر باوقار صفت بنادیا کہ صحابہ معمولی سے معمولی کام کو بھی نکھٹو رہنے سے معزز سمجھتے تھے۔ اور اس سے بے روزگاری کا مسئلہ بہت جلد حل ہوگیا۔ اور اس طرح صنعت وحرفت، زراعت، تجارت وغیرہ میں بہت جلد صحابہ نے اپنے آپ کو مصروف کرلیا۔ فتوحات کے بعد جب زمینیں ہاتھ آئیں تو ان کو بھی آپ نے صحابہ میں تقسیم فرمادیا۔ اور بنجر زمین پر جو پہلے قبضہ کرکے اپنی روزی کمانے کا اسے ذریعہ بنائے اس شخص کو اس میں مالکانہ حقوق عطا کردے۔ من احیٰ ارضاً میتۃ فھی لہٗ (حدیث) لیکن رفاہ عام کی چیزوں میں کسی قسم کے حقوق مالکانہ عطا نہیں فرمائے۔ لاحمی الا اللہ ورسولہ

آنکہ الرسول
لہ الذین ینفقون اموالھم باللیل والنہار سرًا وعلانیۃ فلھم اجرھم عند ربھم
واتی المال علیٰ حبہ ذوی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب (۱۷۷: ۲)

اور دوسری جگہ فرمایا: "پانی اور چارہ اور آگ یہ ایسی چیزیں ہیں جن میں سب مسلمان شریک ہیں"
بعض چیزوں کی خرید و فروخت کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے۔ مثلاً وہ چیزیں جو حرام ہیں۔ یا وہ چیزیں جو نجس ہیں جیسے مُردار، خون، جانوروں کا فضلہ وغیرہ یا ایسے معاملات جو نزاع کا دروازہ کھولتے ہیں مثلاً بلا تعین شکل یا شروط طریقہ پر بیع و شری جس میں بعد میں قیل و قال کا اندیشہ ہو۔ آپ نے فرمایا "جو چیز تمہارے ہاتھ میں نہ ہو اس کی بیع نہ کرو" اور "جو کوئی گیہوں خریدے اُس وقت تک بیع نہ کرے جب تک کہ اُس کو اپنے قبضہ میں نہیں کر لیتا" اور دوسری جگہ فرمایا: "سو جو اللہ تعالیٰ نے پھلوں کو نیست و نابود کر دیا تو پھر کوئی کس طرح شئے کے عوض بھائی کا مال لیتا ہے" اور ایسے طریقہ سے نفع کمانے کی کوشش بھی منع کر دی گئی جو عامۃ الناس کے لیے موجب نقصان و تکلیف ہوں جیسے احتکار آپ نے فرمایا: "من احتکر فھو خاطی" اور دوسری جگہ فرمایا "الجالب مرزوق والمحتکر ملعون"۔ معاملات میں دھوکہ بازی، ڈنڈی مارنا اور اس قسم کی فریب دہی ممنوع قرار دیگئی: ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون۔ واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون (التطفیف) آپ نے بازار میں ایک مرتبہ اناج کے ڈھیر میں ہاتھ ڈال کر دیکھا کہ نمی ہے تو فرمایا کیوں اس کو کھلا رکھکر لوگوں کو بتلا نہیں دیتے پھر فرمایا "جو دھوکہ دیتا ہے وہ ہم میں سے نہیں" اور کاروبار میں تعاون کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے مقابلہ میں ایسی باتوں سے روکا گیا جن میں کوئی شخص اپنی طاقت و دولت سے فائدہ اٹھا کر دوسروں کو اکتساب رزق سے محروم کر دے اور خود اجارہ حاصل کرلے کیونکہ اکثر اس کا نتیجہ بغض، عناد اور حسد ہوتا ہے جو جھگڑوں اور لڑائیوں پر منتج ہوتا ہے اس مثال میں دوسروں کو مجبور کر کے خود فائدہ اٹھانے کی کوشش تھی اور دوسری طرف ایک طریقہ دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کا ہے یعنی ربوا۔ اس لیے قرآن نے ربا کو حرام قرار دے دیا کہ اس سے تمام معاشرہ کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر انہیں ہمیشہ مجبوریوں میں رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے[1]: لاتاکلوا الربوا اضعافاً مضاعفہ (آل عمران)

---

[1] یمحق اللہ الربوا و یربی الصدقات واللہ لا یحب کل کفار اثیم (بقرہ) وما اٰتیتم

احل اللہ البیع وحرم الربوا (بقرہ) اور آپ نے سود کے ہر کاروبار کو قطعاً ناجائز قرار فرمایا: عن جابر قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربوا وموکلہ وکاتبہ وشاہدیہ وقال ھم سواء (مسلم) جب سود حرام کیا گیا تو آپ نے بعض یہودیوں سے جو معاہدے کئے تھے ان میں ایک شرط یہ بھی رکھی تھی کہ سودی کاروبار وہ لوگ نہ کریں۔ نزول آیت کے بعد سودی کاروبار بند ہو گئے اور راس المال واپس لے لینے کا حکم ہو گیا کہ اس سے فریقین میں سے کسی کا بھی نقصان نہ تھا: یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوا ان کنتم مومنین فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ (بقرہ) اور وَاِنْ تبتم فلکم رؤس اموالکم لا تَظْلِمون و تظلَمون (بقرہ) اور تلقین کی کہ بجائے انکی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کے ان کی ایسے وقت امداد و اعانت کرو اور انہیں قرض حسنہ دو: من یقرض اللہ قرضاً حسناً فیضاعفہ لمن یشاء اور اس قرض میں "تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" کی روح کارفرما ہونی چاہیئے آپس میں تعاون، ایثار اور جائز محنت یہی وہ چیزیں ہیں جس سے ایک صالح معاشی نظام چل سکتا ہے۔ آپ نے ایسی نیک اور پرخلوص محنت کرنے والے کی ستائش فرمائی: خیر الکسب کسب العامل اذا نصح (مسند جلد ۲) اور مزدوروں کو ان کا حق یعنی اجرت فوراً ادا کرنے کی تاکید فرمائی: اعط الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ (بیہقی) اور بغیر قبل از قبل تصفیہ کے معاملہ کرنے سے منع فرمایا: نھی عن استیجار الاجیر حتی یبین لہ اجرہ" اور انفاق فی سبیل اللہ کی تلقین فرمائی [1]

بقیہ حاشیہ صفحہ (۳۳۹) من ربا لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ (روم) الذین یاکلون الربوا لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطان من المس ذالک بانھم قالوا انما البیع مثل الربوا (بقرہ) یہ ربوا سے متعلق دوسری اور آیتیں تھیں۔

[1] واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیاء وبالوالدین

الحاصل اسلامی معاشی نظام نہ اشتراکیت کی طرح روبہ عمل کرکے سب کچھ معاشرہ ہی کو قرار دیتا ہے اور نہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح دولت کو چند ہاتھوں میں جمع کرکے خدا کی ایک کثیر مخلوق کے لیے عرصۂ حیات تنگ کرتا ہے بلکہ وہ بین بین مسلک پر چلکر فرد و جماعت دونوں کی فلاح کی تدبیریں پیش کرتا ہے دولت کی ساری تقسیم اور اس کو ایک جا سمٹنے یا جمع ہونے سے روکنے کے لیے زکوٰۃ کا طریقہ رکھا: "توخذ من اغنیاء ھم وترد الی فقرائھم[1]" (ترمذی ص۲۲۳) اور مالداروں کے انتقال کے بعد اُن کی دولت کو اُن کے ورثاء میں تقسیم کا قانون بنادیا: للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون مما قل منه اوکثر نصیبا مفروضاً۔

اسلامی سیاسیات کا مقصد کوئی خیال یا کوئی کام جو بغیر مقصد کے ہو وہ قابل اعتنا نہیں۔ یہ مقصد ہی ہوتا ہے جو ہمارے ہر ارادے، ہماری ہر حرکت اور ہماری ہر جد و جہد کو متعین کرتا ہے۔ اور نہ صرف راہ متعین کرتا ہے بلکہ تمام لائحہ عمل، پورے ارتقائی مدارج اور اُس تک پہنچنے کے سارے ذرائع میں اُسی کی رُوح جاری و ساری رہتی ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسیات کی بزرگی اور برتری کا راز تمام تر اسی میں مضمر ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ (۳۴۰) احساناً وبذی القربی والیتامی والمساکین والجار ذی القربی والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبیل وما ملکت ایمانکم (والمحصنٰت)

[1] واتوا الزکوٰۃ (بقرہ) اور اس کی حکمت یہ بتلائی گئی لایکون دولۃ بین الاغنیاء اور جمع کرنے والوں کے وعید ہے، والذین یکنزون الذهب والفضة ولا ینفقونها فی سبیل الله فبشرهم بعذاب الیم اور ان سرمایہ داروں کا انجام بتلایا: اولم یعلم ان الله قد اهلک من قبله من القرون من هو اشد قوة واکثر جمعاً۔ قارون کی تباہی کا بھی یہی نخوت و بغاوت سبب ہے۔ (توبہ)

آپؐ نے حکومت کا نقشہ پیش کرنے سے پہلے اس کا مقصد پہلے متعین فرمالیا۔ اور اپنی تمام جدوجہد کا محور اسی مقصد وحید یعنی "توحید" کو بنالیا۔ اس مقصد کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مقصد تمام وسعتوں کو محیط، زمان و مکان کی قید سے آزاد، ہمیشہ قائم و دائم، اور وحدت نوع انسانی کا حامل ہے۔ بظاہر یہ مقصد ناقابل حصول معلوم ہوتا ہے لیکن جس قدر اس تک پہنچنے کی کوشش کی جائے گی اسی قدر نوع انسانی اپنی اصلی بزرگی اور اشرفیت سے قریب تر ہوتی جائیگی حتیٰ کہ ایک نوبت ایسی آجائے گی جہاں پہنچکر حکومت کی سرے سے ضرورت ہی نہ ہوگی۔ گو اس مقام کا حاصل کرنا ایک جماعت اور قوم کے لیے بے انتہا مشکل ہو لیکن ناممکن نہیں۔ انہی مقامات کو حاصل کرنے کے لیے حکومت کی داغ بیل ڈالی جاتی ہے، دستور اور قوانین بنائے جاتے ہیں۔ عدلیہ و عاملہ کی تشکیل کی جاتی ہے۔ ان بتلائے ہوئے الٰہی احکامات و ہدایات کو نافذ کیا جاتا اور ان پر سختی سے عمل کرایا اور کیا جاتا ہے، اپنے خیالات کی تبلیغ کی جاتی ہے اور ہر طرح سے امن و امان کو قائم کیا جاتا ہے اور دشمنوں سے بھی اچھا سلوک کیا جاتا ہے کہ آج نہیں تو کل یا یہ نہیں تو ان کی اولاد ان کے خیالات کو قبول کرے گی اور یہ سب کچھ اسی لیے کیا جاتا ہے کہ تمام بنی نوع انسان اپنے مقصد وحید تک پہنچ سکے۔

اسلامی سیاسیات کی امتیازی خصوصیات

یہ مقصد جس قدر بلند و برتر ہے، اور اس کا حصول جس قدر کٹھن و مشکل اور ایک عمر نوح کا طالب ہے اسی قدر وہ اپنے ماننے والوں کو سخت مصیبت و تکلیف، امتحان و ابتلا اور محن و فتن میں ڈال کر ان کو جلا دینا چاہتا ہے اور ان سے بڑی سے بڑی قربانی و ایثار کا مطالبہ کرتا ہے لیکن یہ ابتدائی مراحل اس وقت تک طے نہیں ہوسکتے جبتک کہ اس کی سیاسی تعلیمات اور اس کی حکومت کی ہیئت ایسی نہو جو سارے عالم کے لوگ قبول کرسکیں۔ اسی لیے چونکہ یہ عالمی حکومت ہے اور اس کے قیام کی تکمیل کی مدت نامعلوم ہے اس لیئے اس کے قوانین زمان و مکان کے قیود سے آزاد ہیں، اس کے عدل کے سامنے تمام انسان مساوی المرتبہ ہیں

ور اس حکومت کے عامل یا حاکم کے لئے "الا بدینٍ وتقویٰ" کسی رنگ و نسل یا مقام کے امتیاز کی ضرورت نہیں۔ یہی وہ اساسی اصول ہیں جو اسلامی سیاسیات کو دیگر اقوام کی یاسیات سے ممتاز بناتے ہیں۔ انہی اعلیٰ خیالات یعنی "حریت" "مساوات واخوت" کو ؛سے بڑے مفکرین بڑی بڑی ترقی یافتہ اور متمدن قوموں نے اپنا مقصد بنائے رکھا بلکن یہ مقصد کبھی کتابوں اور دماغوں سے نکلکر اس چلتی پھرتی دنیا میں ان سے رائج نہ ہوسکا بلکن انہی تعلیمات کو، انہی قوانین کو اور اسی حکومت کو عرب کے ایک امی ہادی نے پنے صحابہ میں، اپنی حکومت میں اور خود اپنا اعلیٰ نمونہ پیش کرکے عملی طور پر قائم کرکے سارے الم کو دکھا دیا۔ اور یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسیات کی سب سے بڑی امتیازی ان ہے۔ کان خلق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) القرآن (عائشہؓ)

حقیقت یہ ہے کہ اچھے سے اچھا خیال اور اعلیٰ سے اعلیٰ مقصد بے روح ہے اگر ں کے پیچھے عملی قوت کارفرما نہو۔ آپ نے کوئی خیال کوئی ہدایت اور کوئی حکم ایسا نافذ ہیں کیا جب تک اس کو اپنے آپ پر بھی عائد نہ کرلیا اور یہی چیز تھی جس نے صحابہ میں عملی روح ھونک کر انہیں دیکھتے ہی دیکھتے "استخلاف فی الارض" کا مستحق بنادیا۔ اسی کے متعلق عروج وزوال روم" کے مشہور مصنف گبن نے لکھا ہے: "قوائے عمل اور زندہ دلی جو ہومعون اور خانقاہوں میں سوئی پڑی تھی عسکر حجاز کے آواز دہل سے چونک پڑی اور اسلام ں ملت کا ہر رکن حسب استعداد و فطرت وحوصلہ اپنے اپنے مرتبہ پر پہنچ گیا" لیکن اسلامی حکومت مقصد تو انسان کو اس کے انتہائی مقام تک پہنچنے کی سہولت بہم پہنچانا ہے جہاں سے ں کو سوائے اپنے "مقصد وحید" کے تمام چیزیں ہیچ نظر آئیں۔

۔دست جنون من جبریل زبون صیدے — یزدان بکمند آور اے ہمت مردانہ

لیکن یہ تمام سیاسیات اپنے اعلیٰ مقصد، بہترین لائحہ عمل اور پرخلوص قوانین یہاں ہے کہ اس کے پیچھے ایک عملی نمونہ کے ہوتے ہوئے بھی ایک دائمی اور عالمی حیثیت اختیار

نہیں کرسکتی اگر اس کے ماننے والوں میں بغیر کسی بیرونی اور مادی خوف کے خود دل سے اس کے قائم کرنے، اس پر عمل کرنے اور کروانے اور اس کی حفاظت ہر قربانی سے لینے کی خواہش ہو اور یہ چیز اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جبکہ غیبی احتساب ہو، ایمانی قوت ہو اور خدا کے ہر جا و ہمہ وقت حاضر و ناظر وجود کو انسان دل سے تسلیم کرے: الم تر ان اللہ یعلم ما فی السموات وما فی الارض ما یکون من نجوی ثلثۃٍ الا ھو رابعھم ولا خمسۃ الا ھو سادسھم ولا ادنی من ذالک ولا اکثر الا ھو معھم این ما کانوا ثم ینبئھم بما عملوا یوم القیامۃ (۵۸:۷) ۔

لن ترجع الانفس عن غیھا ما لم یکن منھا لھا زاجر
(ابونواس)

صلوۃ اللہ علیہ وتحیہ

لٹریچر:-

علاوہ قرآن پاک وحدیث شریف کے اس مضمون کی تیاری میں حسب ذیل کتب اور مضامین سے مدد لی گئی:-

(۱) سیرۃ النبی صلعم از شبلی نعانی رح جلد اول
(۲) " " " جلد دوم
(۳) تاریخ الامت جلد اول (سیرۃ) از محمد اسلم صاحب جیراجپوری
(۴) تاریخ السلام " از شاہ معین الدین "
(۵) خطبات مدراس - سید سلیمان ندوی مدظلہٗ وفیوضہٗ
(۶) تفہیمات از ابوالاعلیٰ صاحب مودودی
(۷) الحریت فی الاسلام الہلال ۱۹۱۳ء جلد ۳۔ مدیر احمد المکنی بابی الکلام الدہلوی
(۸) اسلام کا نظام حکومت " " " "

(۹) اولیاء اللہ و اولیاء الشیاطین الہلال ۱۹۱۴ء جلد ۵ مدیر: احمد المکنی بابی الکلام الدہلوی
(۱۰) الحیتہ فی الاسلام 〃 〃 〃 〃 〃
(۱۱) الحرب والاسلام 〃 〃 〃 〃 〃
(۱۲) غزوات اسلامیہ 〃 〃 〃 〃 〃
(۱۳) پابندی عہد اور قرآن حکیم 〃 〃 〃 〃 〃
(۱۴) الحرب 〃 〃 〃 〃 〃
(۱۵) مقاصد حج 〃 〃 〃 〃 〃
(۱۶) اسوہ حسنہ (آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم میدان جنگ میں) 〃 〃 〃 〃
(۱۷) اسلام کا نظریہ سیاسی۔ ابوالاعلیٰ صاحب مودودی "ترجمان القرآن" جلد ۱۲، عدد ۱
(۱۸) تفریق دین و سیاست۔ ابوالحسن علی صاحب "ترجمان القرآن" جلد ۱۶، عدد ۲
(۱۹) اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے۔ ابوالاعلیٰ صاحب 〃 〃 〃 〃
(۲۰) 〃 قانون معیشت از افادات شاہ ولی اللہ 〃 〃 〃 جلد ۱۴، عدد ۳، ۴
(۲۱) 〃 نظام۔ محمد اسلم صاحب جیراجپوری "جامعہ" جلد ۲۹، عدد ۴
(۲۲) عہد نبوی کی سیاست کاری۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب۔ "سیاست" جلد ۱، نمبر ۱
(۲۳) اسلام دونوں جہان کی بادشاہی۔ سید سلیمان ندوی "معارف" جلد ۴۵، نمبر ۳

24. The Cultural side of Islam, Muhamad Pichthall.
25. The Religious Polity of Islam, Abdullah Yusuf Ali – "Islamic Culture" 1933.
26. The Political Theory of Islam, Bashiruddin – 1934
27. The Administration of justice in Early Islam, Md. Hanudullah – 1937.
28. The Origin of Islamic Polity – H. K. Sherwani 1936
29. The Quranic State – H. K. Sherwani 1936.
30. Muslim Conduct of State – Dr. Hamidullah – " 1941

سلاجقہ کی سیاست

(از)

قاضی احمد کبیر الدین (عثمانیہ)

چوتھی صدی ہجری کے اواخر اور پانچویں صدی کی ابتداء میں مشرق قریب اور مشرق وسطی کے اسلامی ممالک کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور اسلامی سیاست میں تخریبی عناصر نشو نما پا رہے تھے بنی اُمیّہ نے خلیفہ بغداد کی وقعت اتنی گھٹا دی تھی کہ اب سیاسی لحاظ سے اون کا عدم و وجود دونوں برابر تھے۔ آل سامان اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہے تھے اُن کی جگہ ایک نئی قوت وجود میں آکر باقتدار ہو رہی تھی۔ یہ غزنی کی حکومت تھی۔ یہی ابتری کا زمانہ ہے جب کہ سلاجقہ پہلی مرتبہ سیاسی میدان میں ظاہر ہوئے اور اُن کی ترقی و عروج کے سامان خود بخود پیدا ہوتے چلے گئے۔

سلجوق ترکی قبیلہ غز سے تعلق رکھتے تھے۔ غز اسلامی سرحد کے قریب رہتے تھے اور اکثر خطرہ کا باعث سمجھے جاتے تھے۔ اِن ترکوں کا اصلی وطن ترکوں کا علاقہ تھا۔ وہاں کے بادشاہ بیغو کے زمانہ میں سلجوق کا باپ وقاق یا تقاق بہت مشہور ہوا۔ اُسی بادشاہ کے دور حکومت میں سلجوق پیدا ہوا۔ اُس کی تمام تربیت شاہی محل اور نگرانی میں ہوئی سلجوق کی بادشاہ کے ساتھ وابستگی اس قدر بڑھی کہ ملکہ کو اندیشہ ہوا اور وہ اُس کے قتل کے درپے ہو گئی۔ جب اس کی اطلاع سلجوق کو ہوئی تو وہاں سے بھاگ نکلا اور سمرقند کے والی کے یہاں

پنے قاصد روانہ کر کے اُس سے پناہ طلب کی ، اِسلام قبول کر کے دریائے سیحون کے کنارے
ند کے مقام پر آباد ہو گیا۔ سلجوق اور اُس کے ساتھی جو نقل مقام کر کے چلے آئے تھے بلا امتیاز
ل سلجوق یا سلاجقہ کہلاتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی تعداد پچاس ہزار سے بھی زیادہ
ی اور یہ لوگ عقائد کے اعتبار سے بہت جلد پکے مسلمان بن گئے۔ اسلامی تعلیمات اور
ملی روایات نے ان میں بہت جلد وہ خصوصیات پیدا کر دیں جو ان دنوں اسلامی دنیا
ں اخلاقی انحطاط کی وجہ سے جو سیاسی انتشار کا لازمی نتیجہ تھا مفقود ہو چکی تھیں۔

ان لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کا نقل مقام کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی بلکہ اُن کے
ئے وطن میں اُن کے لیے نئے نئے مسائل پیدا ہو گئے اور اُن مسائل کی پیچیدگی نے آگے چلکر
ختلف شکلیں اختیار کیں۔ گو جند کا علاقہ اسلامی سرحد میں شامل تھا۔ لیکن اس دور دراز کے
اقے میں کوئی خاص انتظام قائم نہیں تھا یہاں تک کہ بعض مرتبہ غیر مسلم ترک بھی مسلمانوں
ے خراج کا روپیہ لیا کرتے تھے۔ اُن ہی روایات کے مطابق ترکوں کی ایک جماعت نے سلجوقیوں
ے خراج طلب کیا تو بجائے خراج ادا کرنے کے یہ جنگ پر آمادہ ہو گئے۔ اس جنگ سے دو
تیجے پیدا ہوئے۔ ایک تو یہ کہ اسلامی ممالک میں اُن کی اہمیت کا احساس ہوا اور اُس کے
وہ دوسرے ترک اُن سلجوقیوں سے آکر ملتے گئے۔ اس طرح اُن کی مجموعی قوت میں
ضافہ ہوتا گیا۔

یہ وہ دور ہے جبکہ سامانی خاندان کی خانہ جنگی اُن کی اپنی بربادی کا باعث ہو رہی
ی۔ ابراہیم سامانی کے خلاف ہارون بن ایلک خاں نے بغاوت کی اور اس بغاوت
فرو کرنے کے لیے ابراہیم سامانی سلجوق سے مدد کا طالب ہوا۔ سلجوق ہی کی کوشش کی
دولت ہارون بن ایلک خاں کو شکست ہوئی اور وہ فرار ہو گیا۔ یہ سلاجقہ اور آل سامان
پہلا تعلق تھا اور سلجوقی اقتدار و قوت کی ترقی کا دوسرا زینہ۔
[illegible]

اطراف و اکناف کو پسند کیا۔ سلجوق کے چار بیٹے تھے جن کے نام میکائل۔ موسیٰ اور ارسلان تھے اور ارسلان کا لقب بیغو تھا۔ اس کا ایک اور بیٹا عنفوان شباب میں مرگیا۔ ایلک خان کی بغاوت فرو کرنے کے وقت میکائل کام آیا۔ اِس حادثہ سے سلجوق بہت متاثر ہوا اور میکائل کے بیٹوں کو اعلیٰ درجہ کی سیاسی اور فوجی تربیت دِلائی۔ یہ دونوں بھائی طغرل بک اور چغری بک اپنے دادا سلجوق کے انتقال کے بعد سلاجقہ کے سرغنہ بنے۔

سلجوق محمد داؤد کے انتقال کے وقت سلجوقیوں کی شہرت قابلیت اور دلیری کا رعب ماوراء النہر کے حکمرانوں پر بہت گہرا پڑ چکا تھا۔ مگر وہ یہ فیصلہ نہ کرسکے کہ سلجوقیوں کو دشمن سمجھیں یا دوست۔ کبھی تو وہ دوستانہ تعلقات سلجوقیوں سے بڑھاتے اور کبھی اُن سے خوفزدہ ہوجاتے۔ اُس کی اچھی مثال بغراخاں اور ایلک خاں کے طرزِ عمل سے ملتی ہے۔ هارون بن ایلک خاں اِن بھائیوں کو سدِ راہ سمجھتا تھا اِس لئے چاہتا تھا کہ اُن کا قلع قمع کردیا جائے۔ اِس غرض سے اُس نے فوجیں جمع کرنا شروع کردیا۔ چغری بک کو ان تیاریوں کی اِطلاع اُس وقت ملی جب اُس کی جمعیت منتشر تھی اور اُسے جمع کرنا آسان کام نہیں تھا اُس نے اِس موقعہ پر مصلحت اُس میں دیکھی کہ بغراخاں سے مل کر غنیم کا مقابلہ کیا جائے۔ بغراخاں نے اُس کے ایلچیوں کی خاطر و مدارات کی۔ گو فریقین میں دوستانہ تعلقات پیدا ہوگئے۔ لیکن طغرل بک اور چغری بک کو بغراخاں کی طرف سے اطمینان نہ تھا۔ اِسلیے اِن دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ دونوں بوقتِ واحد بغراخاں کے پاس جمع نہوں۔ اُس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بغراخاں ایک طرف تو اون سے دوستی بھی کرنا چاہتا تھا تو دوسری طرف اُن کی قوت سے بھی خایف تھا اِس لیے اُن پر سخت نگرانی قائم کرنا چاہتا تھا۔ یہ دونوں بھائی معلوم ہوتا ہے کہ صورتِ حال سے اچھی طرح واقف تھے۔ اِس وجہ سے انھوں نے یہ احتیاط کی تھی کہ بغراخاں دونوں کو بوقت واحد گرفتار نہ کرسکے۔ جب بغراخاں کو اِس طرح سیاست کاری کے میدان میں شکست ہوئی تو اُس نے اپنے اِرادہ کو فوجی قوت کے ذریعہ

ر ا کرنا چاہا۔ اس نے طغرل بک کو قید کر کے ایک لشکر چغری بک کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ
یا۔ اس کا لازمی نتیجہ ایک فیصلہ کن جنگ تھی۔ میدانِ جنگ میں بغراخاں کو شکست ہوئی
ور وہ مصالحت کرنے پر مجبور ہوا۔ دونوں بھائیوں کی اس کامیابی سے علی تگین حاکم سمرقند
ریشان ہوا اور چاہا کہ ترکستان کے حکمرانوں کی مدد سے اُن کا زور توڑے۔ اس موقعہ
ر اُن دونوں بھائیوں نے یہ طے کیا کہ طغرل بک جنگلوں میں پناہ لے اور چغری بک
خراسان کی طرف روم کے والی بغراخاں کے پاس چلا جائے۔ چغری بک جب رُوم کی
جانب منزلیں طے کرنے لگا تو غزنی کے فرمانروا سلطان محمود کو فکر دامن گیر ہوئی اور سلطان
نے طوس کے والی سے جواب طلب کیا کہ کس طرح چغری بک کو اس علاقہ میں سے گذرنے
کا موقعہ دیا گیا۔ اس پر حاکم طوس نے اُس کی واپسی کے وقت گرفتاری کے انتظامات
کئے لیکن چغری بک نے بھیس بدل کر اس علاقہ کو پار کیا۔

۳۸۹ھ ۹۹۹ء میں سامانیوں کے خاتمہ کے بعد سلجوقیوں کا اثر و نفوذ اور بھی
زیادہ ہوگیا۔ لیکن سامانیوں کا اصلی جانشین اور وارث غزنی کا فرمانروا سلطان محمود سبکتگین
تھا۔ اس نے دریائے جیحون کو عبور کر کے ماوراء النہر پر قبضہ کر لیا تھا۔ محمود کی نظر میں سلجوقی
ماوراء النہر میں فساد اور کشت و خون کا باعث تھے۔ اس لیے اُنہیں زیر کرنا ضروری تھا۔
چنانچہ اسی بنا پر سلطان محمود نے اُن کے سردار ارسلان کو جو بیغو کے نام سے مشہور تھا
بہت سے وعدے کر کے بلایا تھا اور پھر اُس کو قید کر لیا تھا۔ یہی وہ واقعہ ہے جہاں سے
سلجوقیوں کی حقیقی آوارہ گردی شروع ہوتی ہے۔ اس وجہ سے کہ اب اُنہیں وسط ایشیا
کے حکمرانوں کے قول و فعل پر بھروسہ نہیں رہا۔ یہ لوگ دریائے جیحون اور خراسان کے
سارے علاقہ پر چھا گئے اور آذربائیجان تک پہنچے۔ ۴۲۹ھ ۱۰۳۷ء میں سلاجقہ کی
کیفیت یہ ہوئی تھی کہ وہ نہ تو کسی کو پناہ دیتے اور نہ کسی کی پناہ تلاش کرتے۔ محمود کا جانشین
مسعود اپنے باپ کی طرح غیور اور جفاکش نہیں تھا۔ اس نے حماقت سے سلجوقیوں کو

اپنا دشمن بنالیا۔ خوارزم شاہ چاہتا تھا کہ سلطان مسعود کی قوت کے ذریعہ سلجوقیوں کا خاتمہ کردیا جائے۔ اُس نے اِس موقع پر چالبازی سے کام لیا اور سلجوقیوں کو یہ باور کروا دیا کہ وہ بیچ بچاؤ کرکے سلجوقیوں اور سلطان مسعود میں دوستی پیدا کروا دے گا۔ لیکن جب طغرل بک اور چغری بک نساء کے علاقہ میں پہنچے تو مسعود نے اُن کو اس علاقہ سے نکل جانے کا حکم دے کر اُن کی توہین کی۔ اِس طرح اَب مسعود اور سلاجقہ میں جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا اور پہلے ہی معرکہ میں سلطان مسعود کی فوج کو شکست ہوئی۔ اَب سلطان مسعود بذات خود سلجوقیوں سے لڑنے کے قصد سے غزنی سے نکلا۔ مگر اُس کی قوت فیصلہ بالکل جواب دے چکی تھی۔ وہ کبھی اُنھیں دوستی کا پیغام دیتا اور کبھی اُن سے لڑنے کی تیاری کرتا۔ رفتہ رفتہ سلجوقیوں کو اُس کے قول و فعل پر اعتبار باقی نہ رہا۔ اُنھوں نے بجائے اُس کی دوستی کے جنگ کو پسند کیا۔ تین سال تک مسعود اور سلجوقیوں میں جنگ و جدال کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ عمائد سلطنت کے مشورہ سے مسعود خود جنگ کے میدان میں نہیں آیا لیکن ایک سپہ سالار سیاشی کو بھیجا جس کو پے در پے شکستیں ہوئیں اور چند علاقے غزنی کی حکومت نے کھو دیے۔ حتیٰ کہ ۴۳۱ھ ۱۰۳۹ء میں خود سلطان کو اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔ لیکن اُس نے ہرات، مرو اور نیشاپور کے علاقے ہمیشہ کے لیے کھو دیئے۔ اسی سال طغرل بک نیشاپور کے علاقہ کا بادشاہ بنا اور چغری بک مرو کا مالک ہوا۔

اِس طرح سلجوقیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ باعزت جماعت اور ایک زبردست سیاسی قوت بن گیا۔ اَب سلجوق اس قابل تھے کہ اسلامی دنیا کی دوسری سیاسی قوتوں کا مقابلہ کریں اور اُن پر بھی اپنی برتری ثابت کریں۔

اِس طرح نیشاپور اور مرو کے علاقوں پر قبضہ جمانے کے بعد طغرل بک اور چغری بک نے اپنی نوزائیدہ سلطنت کے استحکام کی طرف توجہ کی چغری بک بلخ کی طرف متوجہ ہوا یہاں بھی مسعود کے طرفداروں کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد خوارزم شاہ ہم ۱۱۱، سے

سیلاب سے نہ بچ سکے۔ ملک شاہ شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اب طغرل بک پہلے دہستان کی طرف اور اس کے بعد جرجان کی طرف متوجہ ہوا۔ ۴۴۶ھ ۱۰۵۴ء کا وہ سنہ ہے جب کہ طغرل بک نے آذر بائیجان کو فتح کر لیا۔

اس کے بعد ۴۴۷ھ ۱۰۵۵ء میں سلجوقیوں کی توسیعی حکمت عملی دو خطوط پر کام کرنے لگی۔ ایک تو خط وہ بنے جہاں یونانیوں کا (بازنطینیوں کا) پہلے ہی سے محاذ قائم ہے اور دوسرا خط بغداد کی طرف ہے۔

جب طغرل بک بغداد کی طرف متوجہ تھا تو اس دوران میں چغری بک کے بیٹے الپ ارسلان نے ارمینیہ کے عیسائی ریاستوں کا زور توڑنے کی کوشش کی جو ہمیشہ بازنطین کے بل بوتے پر مسلمانوں کے لیے خطرہ کا باعث بنے رہتے تھے۔ لیکن اس دور کا سب سے اہم کارنامہ دوسرے خط پر اقدامی حکمت عملی ہے۔

ان دنوں بغداد کی حالت بہت خراب تھی۔ آل بویہ کا عروج ختم ہو چکا تھا اور ملک الرحیم دیلمی ان کا آخری بادشاہ تھا۔ اس میں اتنی بھی قوت اور اہلیت نہیں تھی کہ وہ بغداد کی چار دیواری کے اندر ہی امن و امان قائم رکھ سکے۔ شہر میں رات دن شورش کے طوفان برپا ہوتے رہتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بغداد میں ایک بہت بڑے سیاسی انقلاب کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ سلطان بہاء الدولہ بویہ کا ایک غلام وہ کام کرنا چاہتا تھا جو خود آل بویہ نے نہیں کیا تھا۔ اس نے فاطمی خلیفہ مستنصر سے خط و کتابت کی اور یہ سازش مکمل کر لی گئی کہ عباسی خلیفہ کو مستقل طور پر خلافت سے علیحدہ کر کے فاطمی خلافت کا اعلان کر دیا جائے۔ عباسی خلیفہ کو جب اس سازش کا پتہ چلا تو اس کو ساتھ ہی اس بات کا احساس ہوا کہ ملک الرحیم دیلمی محض عضو معطل ہے اور اس سے مدد کی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔ ادھر بساسیری نے بغداد [illegible]

خلیفہ کو بیرونی مدد طلب کرنی پڑی۔ ظاہر ہے کہ اس وقت اسلامی دنیا میں طغرل بک کے سوا کوئی شخص اُس کی مدد کرنے کے قابل نہیں تھا۔ چنانچہ اُس نے خط لکھ کر اُس کو مدد کے لیے بلایا۔ نہروان کے قریب طغرل بک کا شایان شان اِستقبال کیا گیا۔ طغرل بک ۴۴۷ھ ۱۰۵۵ء میں بغداد پہونچا اور چند روز کی کشمکش کے بعد ملک الرحیم دیلمی گرفتار کر لیا گیا۔ وقتی طور پر فاطمی خطرہ زائل ہو گیا تھا اول تو بغداد میں طغرل بک کے پیر نہیں جمے تھے اور دوسرے یہ کہ بساسیری ایسی سازشوں میں لگا ہوا تھا کہ ۴۵۶ھ ۱۰۶۳ء میں طغرل بک کے ماموں ینال نے بغاوت کی اور چاہا کہ ہمدان کے خزانہ پر قابض ہو جائے۔ اَب مجبوراً طغرل بک بغداد سے ہمدان کی طرف متوجہ ہوا۔ بساسیری نے اِس موقعہ سے فائدہ اُٹھایا اور موصل پہونچا۔ قریش ابن بدران سے جو اس وقت موصل کا والی تھا سازش کر کے بغداد پر حملہ آور ہوا۔ اور اسی سال بساسیری کے حکم سے خلیفہ القائم کو قید کیا گیا اور المستنصر کے نام کا خطبہ بغداد میں پڑھا گیا۔ اِدھر صورت حال یہ تھی کہ خراسان میں چغری بک کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کا جانشین اُس کا بیٹا اَلپ اَرسلان مقرر ہوا۔ وہ فوراً ہی اپنے چچا کی مدد کو آگیا۔ دونوں نے اشتراکِ عمل ذریعہ ابراہیم نیال کو شکست دی اور اس قضیہ سے مطمئن ہونے کے بعد عراق عرب کا رُخ کیا۔ یہاں سے چند لوگ بساسیری کے کے پاس روانہ کیئے تاکہ وہ خلیفہ کو بحال کر دے۔ لیکن بساسیری نے اُس کے برخلاف عمل کر کے خلیفہ کو برسہ کی طرف روانہ کر دیا۔ اس کے بعد طغرل بک نے اپنے ایک لائق وزیر عمید الملک الکندری کو خلیفہ کی رہائی کے لیے روانہ کیا ۴۵۱ھ و ۱۰۵۹ء میں طغرل بک کے آدمیوں نے خلیفہ کو بساسیری کے پنجہ سے چھڑا کر بغداد کا رُخ کیا۔ خود طغرل بک نے ۴۵۱ھ و ۱۰۶۰ء میں خلیفہ سے ملاقات کی اور شایان شان سلوک کیا۔ طغرل بک اِس کے بعد رے پہونچکر مر گیا۔ الپ اَرسلان اس کا جانشین بنا۔ اس نئے سلطان نے اپنے چچا کے ملک کو عملی جامہ پہنایا اور سلطنت اور خلافت کے استحکام کی طرف متوجہ ہوا۔

اَلپ اَرسلان کے زمانہ کے کارناموں کا جائزہ لیتے وقت اس کی سیاست اور حکمت عملی کے دو پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں. ایک تو وہ فوجی کارروائیاں دوسرے وہ بنیادی اُصول جن پر نہ صرف وہ خود کاربند رہا بلکہ اُس کے بیٹے ملک شاہ کے زمانے میں بھی اُون پر عمل ہوا۔ قبل اِس کے کہ اُس کے زمانہ کی فوجی کارروائیوں کو زیر مطالعہ لایا جائے بہتر یہ ہوگا کہ اُس کی سیاست اور حکمت عملی کا تجزیہ کیا جائے. سلجوقی حکمت عملی کا بنیادی اُصول یہ تھا کہ بغداد کی سیاست اَین فاطمی یا باطنیہ کی مداخلت کو رُوکا جائے ۳۵۸ھ ۹۶۸ء تک شمالی اَفریقہ میں رہے اور ۳۵۶ھ ۹۶۶ء میں اُن کے سپہ سالار جوہر نے مصر فتح کیا ۳۵۵ھ ۹۶۶ء خلیفہ معز مصر میں منتقل ہوا۔ اَب یہاں سے فاطمی سلطنت کی توسیع شروع ہوئی۔ شام اور فلسطین پر اُنھوں نے آسانی سے قبضہ جما لیا اور کچھ مدت تک حرمین بھی اُن کے قبضہ میں رہے۔ اَب وہ صرف اِن علاقوں پر اپنا قبضہ کافی نہیں سمجھ رہے تھے بلکہ اُس کے خواہاں تھے کہ عباسی خلافت کے طول و عرض میں اپنے مخصوص اُصولوں کی تبلیغ کر کے اُس کو نقصان پہونچائیں۔ اُنھوں نے نہ صرف قرامطہ سے ساز باز کیا تھا اور اپنی سازش کا جال عباسی خلافت میں خاموشی سے پھیلانے میں کامیاب ہوئے تھے بلکہ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ وہ یہاں تک کامیاب ہوئے تھے کہ عباسی خلیفہ القائم بامر اللہ کو تخت سے علیحدہ کر کے خود بغداد پر قبضہ کر لیں۔ برخلاف اسکے بغداد کی یہ حالت تھی کہ بنی بویہ عباسی خلیفہ کے خیرخواہ نہ تھے۔ اُنھوں نے نہ صرف اُسکے وقار کو صدمہ پہونچایا بلکہ خلافت کو کمزور کرنے لگے۔ لیکن اپنے ذاتی اغراض کی بنا پر اُنھوں نے خلافت عباسیہ کو برائے نام باقی رکھا مگر وہ خود اِتنے کمزور ہو گئے تھے کہ باطنی فتنہ کا سدِ باب نہیں کر سکتے تھے۔ سلجوقیوں نے اِس کام کو بکمال فوجی انجام دیا اور اپنے مخالف عناصر کا قلع قمع کرنے کے بعد وہ فوراً باطنی فرقہ کے ازالہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

بساسیری کے خاتمہ کے بعد بہ ظاہر اس خطرہ کا سدباب ہوگیا تھا لیکن فی الحقیقت اندرونی اور خفیہ خطرہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ حسن بن صباح نے خود ایران میں باطنیہ کا ایک مرکز قائم کر لیا تھا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ مصر کے مرکز سے ایشائی ممالک میں تبلیغ کے کام کی نگرانی کی جائے۔ حسن بن صباح اب الموت میں بیٹھ کر اور بھی زیادہ آسانی کے ساتھ اسماعیلی عقاید کی تبلیغ کر سکتا تھا۔ اس کی روک تھام اس طرح کی گئی کہ نظام الملک طوسی نے محسوس کیا کہ تعلیم پر سرکاری نگرانی قائم کی جائے اور ر عقاید کے تبلیغ کی ممانعت اور روک تھام کی جائے جو حکومت وقت کی حکمت عملی کے خلاف ہوں۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر مدارس نظامیہ قائم کئے جن کے ذریعہ عوام کی ذہنیتوں میں تبدیلی پیدا ہونے لگی۔ یہ مدرسے بہت مشہور ہوئے جن میں امام غزالی جیسے اُستاد پڑھاتے تھے اور بلند پایۂ شاگرد تعلیم پاکر نکلتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ امام غزالی جیسی بزرگ ہستیوں نے طریقت کے اُصولوں کے ذریعہ باطنی اثرات کا تدارک کیا اس طرح باطنی عقائد کے کاٹ کے لئے ایک ایسی جماعت کھڑی ہوئی جس کو امام غزالی جیسے جید عالم سے بہت بڑی مدد ملی۔ علماء ان مدرسوں میں تربیت پاتے اور اصحاب طریقت ملک کے طول وعرض میں پھیل کر ایسے اُصولوں کی تعلیم دیتے تھے جو عوام کے عقاید کو باطنی فرقہ کی خفیہ تبلیغ اور پروپگنڈے سے محفوظ رکھ سکیں۔ ان چیزوں سے باطنی دعوت اور خفیہ سازشوں کی روک تھام ہونے لگی نیشاپور اور دوسرے مقاموں کی درسگاہیں بالخصوص مدرسہ نظامیہ علم وفضل کی دنیا میں ہردلعزیز ہوگئیں اور لازمی طور پر باطنی مخالفت کا مرکز بن گئیں۔ اور بہت تھوڑے ہی عرصہ میں یہ مدرسے جامعہ ازہر کے ہم پلہ ہوگئے۔

الپ ارسلان اس خطرہ سے بھی آگاہ تھا جو عیسائی حکومتوں کی وجہ سے لاحق تھا۔ ارمینہ کی عیسائی ریاستیں یونان (بازنطین) اور اسلامی ممالک کے درمیان حد فاصل تھیں۔ یہ ریاستیں عیسائیت کے دوسرے بڑے مرکز بازنطین، کے اشارہ پر چلتیں اور

فوجی نقطۂ نظر سے اُس کی حفاظت کرتی تھیں۔ اَلپ اَرسلان نے سنہ ۴۶۰ھ ۱۰۶۷ء
میں اُن کے مشہور رامن اَنی پر قبضہ کر کے اُن کی طاقت کو کمزور کر دیا تھا۔ اَنی کا مسلمانوں
کے ہاتھ میں آجانا بزنطین کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوا۔ کیونکہ ارمینہ کے عیسائی
اب بے بس ہو گئے تھے۔ گو اول اول قیصر قسطنطنیہ اِس خطرہ سے اچھی طرح آگاہ نہ تھا
لیکن اَنی کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد بازنطینی نہ صرف اِسلامی خطرہ کا سدّ باب کرنا
چاہتے تھے بلکہ اُن کے نزدیک نوزائیدہ سلجوقی حکومت کو شکست دینا اور مشرق میں
اِقدامی حکمت عملی اختیار کرنا ضروری تھا۔ اِس قسم کے منصوبوں کے ساتھ بازنطینیوں نے
جنگ کی زبردست تیاری کی تھی جیسا کہ طریقہ تھا۔ آرمنی، یونانی، صقلبی، فوجوں کے
دستے بہت جلد تربیت دے کر خود شہنشاہ نے فوج کی اعلیٰ کمان اپنے ہاتھ میں لی
اور پیش قدمی کا حکم دیا۔ اَلپ ارسلان کو جب اِس ناگہانی حملہ کی اطلاع ملی تو وہ بہت
تھوڑی سی مُدت میں جس قدر تیاری ممکن ہوسکی کر کے جنگ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔
یُوروپین اور اِسلامی مورخوں کے بیان کی بموجب اَلپ اَرسلان اور رومانوس چہارم
کی افواج کا ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یونانی افواج کی امداد اِسلامی
افواج کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھی۔ اِس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اَلپ اَرسلان نے آخری
وقت تک صلح کی کوشش کی تھی۔ مگر جب یہ کوشش بے سود ہوئی تو اُسے لڑنا ہی پڑا اور
ملازکرد کے مقام پر یہ جنگ سنہ ۴۶۳ھ ۱۰۷۱ء میں ہوئی جس میں قیصر کو شکست فاش
نصیب ہوئی اور وہ گرفتار ہو کر اَلپ اَرسلان کے دربار میں لایا گیا۔ ترکی دستور کے مطابق
اَلپ ارسلان نے اُس کی گردن پر اپنا پیر رکھا اور اُس کے بعد شاہانہ سلوک مرعی رکھا۔
فریقین میں ایک عہد نامہ ہوا جس کی رُو سے طے پایا کہ قیصر رومانوس چہارم اَلپ اَرسلان
کا مطیع رہے گا۔ اپنی بیٹی کو شہزادہ ملک ارسلان کے حبالۂ عقد میں دے گا[1]۔ نیز یہ کہ

---

[1] روضۃ الصفا، باب متعلقہ آل سلجوق، صفحہ ہشتم

کثیر بطور تاوان ادا کرے گا۔ ابھی تیسری شرط پوری ہونے نہیں پائی تھی کہ خود قیصر کے لاف قسطنطنیہ میں بغاوت شروع ہوگئی۔ اور اُس کو تخت سے برطرف کر دیا گیا جتنی رقم جمع کر سکا تھا اُسے سلطان کے پاس بھیجدیا اور باقی کے لیے وہ معذرت کا خواہاں ہوا۔ رُومانوس چہارم[1] کی تخت سے برطرفی مسلمانوں کے خلاف اُس کی شکست کا لازمی نتیجہ تھی۔

رومانوس ناکام ہوا تھا۔ قسطنطنیہ کے لیے سلجوقی خطرہ بجائے زائل ہونے کے اور زیادہ شدید ہوگیا تھا۔ مگر حکومت اس طرف توجہ نہیں کر سکی۔ کیونکہ اندرونی طور پر قسطنطنیہ کی حالت بہت خراب تھی۔ اِس طرح بازنطینی دوبارہ مستقبل قریب میں ایشیائے کوچک کے میدانوں میں قسمت آزمائی کرنے سے باز رہے۔ اِس جنگ کے بعد ایشیاء کوچک میں مسلمانوں کے قدم آہستہ آہستہ جمنے لگے۔ لیکن اِس اثناء میں جب کہ سلطان اَلپ ارسلان دریائے جیحون کے کنارے پر کے قلعہ دار کو سزا دے رہا تھا۔ اِس قلعہ دار نے سلطان کو مار ڈالا۔ واقعات یہ بیان کئے جاتے ہیں کہ یہ شخص تکین کا قلعہ دار تھا اور سُلطان اس سے کچھ اطلاعات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سلطان کے سپاہیوں کی تعیش کی وجہ سے اس نے خود سلطان پر حملہ کر کے اُس کو قتل کرایا۔

اَلپ ارسلان کے بعد اس کا بیٹا ملک شاہ حسب وصیت تخت نشین ہوا۔ اُسکے پیش نظر دو اہم اُمور تھے۔ ایک تو یہ کہ علمی ترقی کو فروغ دیا جائے تاکہ عوام کے عقاید درست ہیں اور وہ علم کی روشنی سے مالامال ہوں۔ اور دوسرے بیرونی مسائل سلطان ملک شاہ خود علم پرست عادل اور با اخلاق شخص تھا۔ وہ عالی دماغ صاحب تدبیر سیاست دان تھا اور مذہب کا سخت پابند تھا۔ غالباً یہ پہلا سلجوقی حکمران ہے جو لکھنے پڑھنے کے فن سے

---

[1] Romanus IV. Deogenes Condact of Educa

واقفیت رکھتا تھا۔ اُس نے علم وفضل کی ترقی کی شروع میں بہت کوشش کی اور نہایت مستعدی کے ساتھ نظام الملک طوسی کا ہاتھ بٹایا۔ الپ ارسلان کی حکمت عملی کے اہم اُصول اُس کے دَور میں بدستور روبہ عمل لائے گئے۔

دوسری طرف بزنطین میں انقلاب کے بعد لازماً وہ عہد نامہ منسوخ ہو گیا جو الپ ارسلان اور روما نوس چہارم دیوجانس میں طے ہوا تھا۔ جب ملک شاہ برسر اقتدار آیا تو اُس کو بھی اُس کا خیال تھا لیکن اِس دَوران میں فلوری طوس نامی ایک آرمنی سردار نے جو روما نوس چہارم کی فوج کے ایک بڑے دستے کی کمان کر رہا تھا قسطنطنیہ کے خلاف سر اُٹھایا اور اُس انقلاب سے فائدہ اُٹھایا جو رُوما نوس چہارم کے خلاف بیزنطین میں رُونما ہوا تھا۔ اُس نے بزنطین کے ایشیائی علاقوں میں اپنے قدم جمائے اور روما نوس چہارم کی موت کے بعد خود قیصر کا لقب اختیار کیا۔ بالآخر اُس کو دربار قسطنطنیہ نے انطاکیہ کا امیر علم تسلیم کر لیا۔ جس زمانہ میں یہ شخص قیصر ہونے کا دعوےدار ہوا تھا اتفاقاً ملک شاہ اپنی چھوٹی سی جماعت کے ساتھ اُس کے پاس گرفتار ہو گیا۔ ملک شاہ نے بکمال خُوبی اپنے آپ کو چھپایا اور نظام الملک طوسی نے اُس کو اپنے حُسن تدبّر سے چھڑا لیا۔ ملک شاہ نے فلوری طوس کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھے۔ اور جب تک وہ زندہ رہا ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں کی جانب سے کسی قسم کا اقدام نہیں کیا گیا۔ فلوری طوس کے انتقال کے بعد ملک شاہ نے سُلیمان ابن قتلمش ابن اسرائیل ابن سلجوق کو ایشیائے کوچک کے مُہمون پر نیم خود مختارانہ اختیارات دے کر مامور کیا۔ یہی شخص سلاجقہ روم کا بانی تھا۔

سلیمان نے ملک شاہ کے زیر ہدایت ایشیائے کوچک کے معاملات میں بہت کامیاب طریقہ کار اختیار کیا۔ اِس جانب اسلامی مملکت کی توسیعی حکمت عملی کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ سیاسی حالات جو وقتاً فوقتاً پیدا ہوئے اور دوسرے وہاں کی رعایا کی عام حالت۔

جس زمانہ میں ایشیائے کوچک پر اسلامی مُہمون کی ابتداء ہوئی اُس وقت دربار

قسطنطنیہ کے خلاف اورسل جان ڈوکس نے بغاوت کی ۱۰۷۴ء / ۴۶۶ھ میں میکائل چہارم نے جو اس وقت قیصر قسطنطنیہ تھا اُن باغیون کی سرکوبی کا ارادہ کرلیا۔ اِس لیے اُس نے سلجوقیون سے دوستانہ تعلقات قائم کرکے نو مفتوحہ علاقوں پر مسلمانون کا قبضہ تسلیم کرلیا۔ اِس عہدنامہ کی ملک شاہ نے بھی توثیق کی۔ اُس کی رو سے سلمان ایشیا، کوچک کے بہت بڑے علاقہ کے مالک تسلیم کئے گئے۔ قیصر نقفور ہفتم نے بھی معاہدہ کی تجدید کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی سلطنت کے یورو پین معاملات میں اُلجھا ہوا تھا اور چاہتا تھا کہ اِس طرح وہ نہ صرف سلیمان کی دوستی کو حاصل کرے بلکہ اُس سے فوجی مدد بھی لے۔

سلجوقی مہم جون کی غیر معمولی دلیری اور جفاکشی کے علاوہ ایشیا، کوچک کے اُن علاقوں میں حالات کچھ ایسے تھے کہ مسلمانوں کا قبضہ مستحکم ہوتا گیا۔ اِس علاقہ میں اُنھوں نے رُومی باغیون کے جاگیردارانہ و زمیندارانہ حقوق چھین کر وہاں کے کاشتکارون اور دہقانوں کے مفاد کو اُن کے حقوق محفوظ کرکے ترقی دی۔ اِس طرح ایسا طبقہ وجود میں آیا جو اپنی بقاء کے لیے سلجوق حکمرانوں کی مدد کا طالب ہوتا تھا۔ علاوہ برین یہاں بہت سے ترک نو آباد کار لاکر بسائے گئے اور رفتہ رفتہ ترک نو آبادیاں کثرت سے پھیلنے لگین اِن علاقوں میں ترک نو آبادیاں پھیلنے کی وجہ سے ترکی اقتدار اور بھی مستحکم ہوتا گیا۔ اِس طرح رعایا، حکمرانوں سے خوش بھی تھی اور ہاتھ پیر بھی نہیں ہلا سکتی تھی۔ یہ سب واقعات ملک شاہ کے عہد کے زرین کارنامے ہیں۔

الکسیوس کامے نوس کی آنکھیں اُس وقت کُھلیں جب قسطنطنیہ کے بلند مقاموں پر سے مسلمانوں کے مقبوضہ علاقے نظر آنے لگے تھے۔ خلیج مارمورا اور باسفورس تک مسلمانوں کا قبضہ نہایت مستحکم ہوگیا تھا اور اب اس وجہ سے بازنطین کو حقیقی خطرہ تھا۔

ملک شاہ حقیقت میں سلجوقیون کا آخری بڑا سلطان تھا۔ اصل یہ ہے کہ اُس کے دور کی تمام تر کامیابی نظام الملک طوسی جیسے تجربہ کار اور لائق وزیر کے سر ہے۔ مگر

نظام الملک نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ اس کے حاسد دربار میں بہت ہو گئے تھے خود
ملکہ ترکان خاتون بھی جانشینی کے مسئلہ میں اس کی مخالف ہو گئی۔ آخرکار سلطان کو اس سے
بدظن کیا گیا۔ لیکن اس کا رسوخ اتنا زیادہ تھا کہ کوئی شخص بھی اس کے خلاف آسانی
سے ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ایک اسیر کو اس کام کے لیے تیار کیا گیا۔ اس کے اشارہ
سے خواجہ نظام الملک طوسی قتل ہوا مگر یہ مشہور کیا گیا کہ اس کو ایک باطنی نے قتل کیا ہے
مرنے سے پہلے وزیر نے سلطان کو کہلا بھیجا کہ میری دوات اور میرا تاج دونوں ایک
دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ایک کے بعد دوسری چیز باقی نہیں رہ سکتی۔ اتفاق
سے ایسا ہی ہوا۔ اس کے مرنے کے بعد سلطنت میں بڑے اختلافات رونما ہوئے۔
ان اختلافات کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے اس بات کا دیکھنا ضروری ہے کہ وہ
کس نوعیت کے تھے اور کس طرح وہ سلطنت کی بقاء کے لیے خطرناک ثابت ہوئے۔

نظام الملک طوسی کے دور وزارت میں ملک شاہ نے سلجوقی دستور اور انتظامی
مصلحتوں کے مدنظر اپنی سلطنت کو بہت سے حصوں میں تقسیم کر کے ان کی عنانِ حکومت
مختلف امراء کے سپرد کر دی تھی۔ تنہکین تونکین کو خوارزم دے دیا تھا، قیم الدولہ اقسنقر کو
دنارس کے آتابکون کا جداعلیٰ تھا دیار بکر و شام و حلب کے لیے نامزد کیا تھا۔ رکن الدولہ
مارتکین کو فارس کا علاقہ دے دیا تھا۔ لیکن شام کی حکومت آگے چل کر اپنے ایک اور
وزیر کے حوالہ کی۔ اب ان مختلف علاقوں کو مرکز کے ساتھ وابستہ کر لینے کے لیے زبردست
مرکزیت اور تدبر کی ضرورت تھی۔ لیکن ملک شاہ کے بعد یہ مرکزیت باقی نہ رہی۔ خواجہ
نظام الملک طوسی ان ہی حالات کے مدنظر چاہتا تھا کہ سلطان ملک شاہ کا جانشین ایسا
شخص ہو جو تمام صوبوں پر اچھی طرح قابو رکھ سکے اور اندرونی انتظامات کا شیرازہ بکھیرنے
نہ دے۔ اس لیے نظام الملک سمجھتا تھا کہ برکیا رون جو ذہین اور قابل تھا اپنی فطری
صلاحیتوں کے باعث ملک شاہ کا موزون جانشین ثابت ہوگا۔ سلطان کی ملکہ ترکان

خاتون چاہتی یہ تھی کہ اس کا بیٹا محمود جو ابھی بچہ تھا جانشین ہو۔ شہزادہ کی ماں کو نظام الملک کے منصوبوں کا پتہ چل گیا۔ اول سلطان کو بدظن کیا گیا اور بعد میں اس کو قتل کروا دیا گیا۔ نظام الملک کے قتل کے بعد ملکہ کے حمایتی برسراقتدار آئے۔ حالانکہ یہ اہل نہ تھے۔ لازماً تمام اہل ملک ملکہ کے جوڑ توڑ کو بری نظر سے دیکھتے تھے۔ اور اس طرح سیاسیات میں عورتوں کے عمل دخل کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اِس طرح سیاسی تفریق شروع ہوئی۔ ملک شاہ کے بعد نظام الملک طوسی کے خیال کی موافقت میں فوجوں سے محمود کی مخالفت کی اور برکیا روق کو سلطان بنانا چاہا۔ خلیفہ کو اُس کی اطلاع دے دی گئی۔ لیکن خلیفہ نے جو فرمان مرتب کیا تھا وہ خلیفہ کے سامنے تھا اور دستخط ثبت ہونے سے پہلے ہی خلیفہ کا اچانک اِنتقال ہوگیا اور خانہ جنگی شروع ہوئی۔ برکیا روق کی تمام عمر اس خانہ جنگی میں کٹی۔ محمود کو سلطان بنادیا گیا۔ لیکن دو برس بعد ہی اُس کا اِنتقال ہوگیا۔ برکیا روق گیارہ برس تک حکمران رہا۔ مگر اس کی زندگی بھی سخت پریشانیوں میں گذری۔ اِس کے بعد اس کا بھائی غیاث الدین ابو شجاع محمد سلطان ہوا۔ یہاں تک کہ عنان حکومت سنجر کے ہاتھ میں آئی اس کا عہد بھی گیارہ برس رہا۔ ان میں اس نے اپنے عہد کے آخری دن قید میں کاٹے ۵۲۳ھ ۱۱۲۸ء میں اُس کا انتقال ہوا۔ یہی سلطان سلاجقہ اعظم کے سلسلہ کا آخری سلطان تھا۔ جیساکہ واقعات شاہد ہیں سنجر کے اِنتقال کے قبل ہی سلجوقیوں میں اِنتشار کے آثار رونما ہو چکے تھے۔ آخری سلجوق اعظم سنجر کے بعد جب یہ سلطنت پارہ پارہ ہوگئی تو اُس کے پانچ ٹکڑے ہوگئے۔ سلاجقہ کرمان۔ سلاجقہ عراق۔ سلاجقہ شام۔ سلاجقہ روم اور سلاجقہ فارس۔ سلجوقی قوت کے اِس طرح منتشر ہو جانے سے مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کی سیاست میں بہت دور رَس اثرات پیدا ہوئے۔ مشرق وسطیٰ کی سلطنتیں اُس کی خانہ جنگیوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو رہی تھیں اور اون کی جگہ اتابکہ سر اُبھار رہے تھے۔ ان خانہ جنگیوں اور پریشانیوں سے مشرق قریب

کے سلاجقہ بھی بچ نہ سکے۔ لیکن سلجوقیوں کے اس طرح منتشر ہو جانے سے مشرق قریب کی سیاست میں غیر معمولی تبدیلی پیدا ہوئی اور سلجوقیوں کے خلاف مشرق قریب میں ایک زبردست ردِ عمل پیدا ہوا جس نے انہیں تباہ و برباد کر دیا۔

اوّل تو سلطنت قسطنطینیہ کو جو خطرہ سلاجقہ اعظم کی وجہ سے پیدا ہوا تھا اس کا ردِ عمل شروع ہوا اور قسطنطنیہ کی حکومت نے سلجوقیوں کے خلاف یورپ کے احساسات اُبھارے اس لیے یہ ردِ عمل "مغرب بمقابلہ مشرق" بن گیا۔ اس ردِ عمل کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ مین اُس وقت مصر سیاسیات کے میدان میں ظاہر ہوا اور بنو عباس کی کمزوریوں کی وجہ سے فائدہ اُٹھانا چاہا۔

ایشیاء کوچک میں سلطان ملک شاہ نے سلیمان بن قتلمش بن اسرائیل سلجوقی کو نیم خود مختار حاکم بنا کر بھیجا تھا جب تک ملک شاہ زندہ رہا اس وقت تک اسلامی قوت برابر ایشیاء کوچک کے مغربی جانب پھیلتی گئی۔ لیکن جیسا کہ واقعات شاہد ہیں۔ ملک شاہ کے انتقال کے بعد سلاجقہ اعظم میں جو پھوٹ پڑی اس سے مشرق قریب کے اُس حصہ میں دو قسم کے نتائج پیدا ہوئے۔ ایک تو یہ کہ مرکزی حکومت سے اُن کی وابستگی ختم ہو گئی دوسرے یہ کہ مغربی جانب اُن کی توسیعی حکمتِ عملی رُک گئی۔ اَب سلیمان بن قتلمش کی اولاد کی حکومت ایشیاء کوچک میں مقامی قوت بن کر رہ گئی۔ اُس کا اثر د صرف مقامی سیاسیات تک تھا اور جو ردِ عمل اس سرزمین میں اسلامی دُنیا کے خلاف اُس وقت ہونے والا تھا اُس سے نجات دلانے کے لیے یہ سلطنت خاطر خواہ طور پر انتظام نہیں کر سکتی تھی۔ اگر اسلام کی فوری مخالفت شروع نہیں ہوتی تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ سلاجقہ روم طاقتور رہے بلکہ قسطنطنیہ اور اس کے مخصوص حالات اُس کے ذمہ دار تھے جوں جوں حالات بدلے اور سیاسی اختلافات بڑھتے گئے مسلمانوں کے خلاف ردِ عمل کا عملی پہلو ظاہر ہوا لیکن

مشرق قریب میں مسلمانوں کے خلاف جو ردِعمل رونما ہوا اس کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے پیشتر بہتر یہ ہوگا کہ مصر اور شام کے تعلقات پر ایک نظر ڈالی جائے اور دیکھا جائے کہ اُن کا اثر سلاجقہ روم کی سیاسیات پر کیا پڑا۔

مصر کے حالات پر غور کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ شام کی تاریخ کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے کیونکہ شام ہی وہ علاقہ ہے جہاں اِس ردِعمل کا عملی پہلو کی ابتدا ہوئی۔ اور دوسرے یہ غور کرنا ضروری ہے کہ فاطمین جو عباسیوں کے خلاف ریشہ دوانیاں کر رہے تھے۔ مشرقی علاقوں میں جغرافی وسعت چاہتے تھے۔

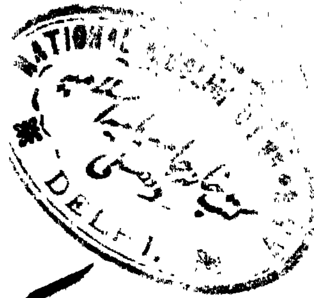
اخشیدیہ حکومت کے بانی محمد بن طغج نے جو خلافت عباسیہ کی جانب سے مصر کا حاکم بنا کر روانہ کیا گیا تھا مصر میں عباسیوں کا نائب السلطنت ہونے سے پہلے خود دمشق کا حاکم کا بیٹا تھا۔

جب مصر میں اخشیدیہ حکومت ختم ہوگئی اور اُس کی جگہ فاطمین نے لی تو انھوں نے دعوت اور فوجی کارروائیوں کے ذریعہ قرامطہ کے ساتھ ساز باز کرنے کے بعد حجاز اور شام میں اپنے اثرات پھیلائے۔ لیکن سلجوقی ترک جنھوں نے فاطمی خطرہ کے اِزالہ کا ذمہ لیا تھا اُس سے غافل نہیں رہ سکتے تھے۔ انھوں نے مصر کے سیاسی انتشار سے فائدہ اُٹھا کر ۴۶۱ھ ۱۰۶۸ء میں بیت المقدس پر قبضہ کر لیا اور اُس کے بعد ۴۶۸ھ ۱۰۷۵ء میں دمشق پر قابض ہوگئے۔ سلجوق گو چاہتے یہ تھے کہ مصر پر بھی حملہ آور ہوں چنانچہ ایک سلجوقی سپہ سالار اتسنر نے اس کام کا بیڑا بھی اُٹھایا تھا۔ مگر مصر میں بدر نامی ایک مدبر کی کوشش سے بہت جلد امن و امان تو قائم ہوگیا لیکن بدر اس قابل نہیں تھا کہ ترکوں کے خلاف کوئی فوجی کارروائی کرے۔ وہ رشوتوں کے ذریعہ کام نکالنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف اتسنر کے پاس بھی ساز و سامان کی اتنی کمی تھی کہ وہ مصر پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس بدر نے ملک میں امن کو

قائم کر کے فلسطین اور شام کا رُخ کیا۔ اُس وقت اتسز نے بیت المقدس کا تخلیہ کر دیا اور اپنی مرکزی حکومت سے مدد مانگی۔ طوطش سلجوقی اُس کی مدد کے لیے آ گیا اس نے اتسز کو بیت المقدس کا تخلیہ کرنے پر بہت بُرا بھلا کہا اور قید کر کے قتل کر دیا۔ ۷۷۴ھ ۱۰۸۱ء سے طوطش شام اور حلب کے علاقوں میں عباسیوں کی طرف سے حاکم مقرر رہا۔ طوطش کے انتقال کے بعد اس کے دو بیٹے اس کے جانشین ہوئے۔ دقاق دمشق کا حاکم بنا اور دوسرے بیٹے رضوان نے حلب کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ یہ دونوں بھائی ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے

اَب مشرق قریب کی سیاست پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ یہاں تین قوتیں ہیں۔ ایک تو بازنطینی دوسری فاطمی اور تیسری سلجوقی۔ سلجوقی قوت میں اِنتشار نمایاں ہو چکا ہے۔ اُدھر بازنطینی ایک طرف تو سلجوقیوں کو مشرقی علاقوں میں پیچھے ڈھکیل دینے کی سوچ رہے ہیں تو دوسری طرف فاطمیئن اور سلجوقیون کی شام کے معاملات میں اَن بن چلی آ رہی ہے۔ چنانچہ اِن تمام چیزوں کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جب یورپ کی جانب سے عیسائی قوتوں نے مشرق قریب میں ایک زبردست کارروائی کا آغاز کیا تو فاطمین نے اُنہیں خوش آمدید کہا۔ کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ وہ اور عیسائی قوتیں آپس میں ملکر خلافت عباسیہ کو تقسیم کر لیں گے۔ اِس کے معنے یہ ہوئے کہ وہ سلطنت عباسیہ کی تباہی میں برابر کا حصّہ لینے کا اِرادہ کر رہے تھے۔ لیکن یہاں اُن دونوں قوتوں کے نظریوں میں فرق تھا عیسائی چاہتے تھے کہ فاطمین اور عباسیوں کی کشمکش سے فائدہ تو اُٹھائیں لیکن فاطمین کو اپنا شریک نہ بنائیں۔

اَب ہم مشرق قریب میں جو یورپی قوتوں کے جانب سے ردعمل شروع ہوا اُسکا مطالعہ کرینگے کیونکہ یہیں سے صلیبی جنگوں کا آغاز ہوتا ہے۔



ہندوستان کی مالیاتی پالیسی

(از)

جناب ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی پی، ایچ، ڈی، صدر شعبۂ معاشیات جامعۂ عثمانیہ

"ہندوستان کی مالیاتی پالیسی" بی، پی ادار کر ریڈر معاشیات الہ آباد یونیورسٹی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کے باطنی محاسن پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ظاہری خوبیوں کے متعلق بھی کچھ تذکرہ کر دیا جائے۔ اس کتاب کے ناشران "کتابستان" قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے حال ہی میں کئی ایک کتابیں ایسی شائع کی ہیں جو ظاہری دیدہ زیبی کے لحاظ سے کسی یورپ یا امریکہ کی اچھی سے اچھی شائع شدہ کتاب سے کم نہیں اور موجودہ کتاب بھی انہیں کتابوں میں سے ایک ہے۔ کتاب کا ٹائپ اور چھپوائی اس قدر نفیس ہے کہ پڑھنے میں لطف آتا ہے کاغذ نہایت اعلیٰ استعمال کیا گیا ہے اور سرورق اور جلد بھی قابل تعریف ہے۔

مجھے یہاں اس بات کے بیان کرنے سے چنداں شرم معلوم نہیں ہوتی کہ اگر اس کتاب میں ظاہری دلچسپی اور جاذبیت اس قدر نہ ہوتی تو غالباً میں اس کتاب کو نہ پڑھتا۔ حالانکہ مسٹر ادار کر ہندوستان کے معاشین میں بہت ممتاز درجہ رکھتے ہیں اور ان کے قلم میں روانی اور صاف بیانی اس قدر ہوتی ہے کہ ان کا نام اس بات کا ضامن ہو گیا ہے کہ کتاب پڑھنے کے لائق ضرور ہو گی لیکن بڑے سائز کے چھ سو سے اوپر صفحات کی

کتاب کو پڑھنے کا ہیّہ کرنا ہی کچھ کم ہمت کا کام نہیں ہے۔

یہ کتاب ۳۲ ابواب پر مشتمل ہے۔ کتاب کے تین حصّے کئے گئے ہیں۔

تعارف۔ حصہ اول و حصہ دوم۔ تعارف ۵۲ صفحے کا ہے یہ وہ رسمی تعارف نہیں جس میں یا تو مصنف اپنی مشکلات کا رونا روتا ہے یا کسی نے اس کے کام کی تعریف کی ہو۔ تعارف میں نفسِ مضمون کی نوعیت پر نہایت فاضلانہ روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کو چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں مالیاتی نظریہ کی اضافی حیثیت واضح کی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں اسی نظریہ کو صاف کرکے دوبارہ بیان کیا گیا ہے۔ تیسرے حصہ میں امتیازی تاین پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے اور چوتھے حصہ میں نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔

کتاب کا حصہ اوّل ۱۵ ابواب پر مشتمل ہے جو زیادہ تر واقعاتی ہے۔ ان ۱۵ ابواب میں ان تمام صنعتوں کا تذکرہ ان کی تاریخ اور نشوونما درج ہیں جن کو تاین دی گئی ہے جس میں مندرجہ ذیل صنعتیں شامل ہیں۔

(۱) لوہے اور فولاد کی صنعتیں۔ (۲) لوہے اور فولاد کی دیگر ذیلی صنعتیں (۳) سوتی پارچہ بانی کی صنعت (۴) پارچہ بانی کی دیگر صنعتیں۔ (۵) شکرسازی کی صنعت (۶) کاغذسازی کی صنعت۔ (۷) دیا سلائی کی صنعت۔ (۸) نمک سازی کی صنعت۔ (۹) دوسری چھوٹی چھوٹی صنعتیں جن کو تاین دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس حصہ میں اُن صنعتوں کا بھی ذکر ہے جنھوں نے تاین حاصل کرنے کے لیے حکومت کے پاس درخواستیں پیش کیں لیکن بعض وجوہ کی بنا پر اُن کو تاین کے قابل نہیں سمجھا گیا۔ ایسی صنعتوں میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

(۱) سمینٹ سازی کی صنعت۔ (۲) بھاری کیمیا کی صنعت (۳) کوئلہ اور تیل کی صنعتیں۔ (۴) کانچ بنانے کی صنعت وغیرہ۔

کتاب کا دوسرا حصہ ۷ ابواب پر مشتمل ہے جن میں ہندوستان کی مالیاتی پالیسی پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے۔

کتاب نہایت محنت سے لکھی گئی ہے۔ ہندوستان کے مالیاتی مسایل کی حد تک یہ حوالہ کی کتاب کا کام دیتی ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُس کی بنیاد معاشی نظریوں پر رکھی گئی ہے اور اُنہیں نظریوں کی روشنی میں مالیاتی مسایل پر بحث کی گئی ہے۔ ہندوستان میں معاشی مسایل پر اکثر جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُن میں بڑا نقص یہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر واقعاتی اور جذباتی ہوتی ہے۔ محض واقعات کے جاننے یا اُن کو بیان کرنے سے چنداں زیادہ فایدہ نہیں جب تک کہ اِن واقعات سے کچھ نتایج حاصل نہ کئے جائیں اور اُن نتایج کو معلومہ علم کی روشنی میں جانچا اور پرکھا نہ جائے اور اُنہیں معاشی ارتقائی کڑی کے کسی جزو کے ساتھ نہ ملایا جا سکے۔ جب تک ایسا عمل نہ کیا جائے کوئی علم ترقی نہیں کر سکتا۔ یہ ہماری بڑی بدقسمتی ہے کہ ہندوستان میں اکثر جو کتابیں معاشی مسایل پر لکھی گئی ہیں اُن کے لکھنے والوں کو خود نظریاتی مسایل سے دلچسپی نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ خود علم کی گہرائیوں تک پہنچے ہوتے ہیں میں نے اکثر جامعات میں ہندوستانی طلباء کو کہتے سنا ہے کہ اُن کو اس قدر زیادہ نظریاتی معاشیات پڑھانے سے کیا فائدہ ہے اُن کے زیادہ پرچے تو عملی معاشیات اور ہندوستان کے معاشی مسایل پر ہونے چاہیں۔ کیا عملی معاشیات اور ہندوستان کے معاشی مسایل نظری معاشیات سے کوئی الگ اور جدا چیزیں ہیں؟

اشتراکیت کے میدان میں مختلف مجتہد اور ریفارمر آئے لیکن کامیابی کا سہرا کارل مارکس کے سر ہی رہا۔ کیوں؟ مارکس پہلا شخص تھا جس نے اشتراکیت کو جذبات اخلاق۔ مذہب۔ ہمدردی اور انسانیت کے کمزور پنجوں سے چھڑا کر علمی بنیادوں پر اُس کی عظیم الشان عمارت قائم کی۔ مارکس لوگوں کے جذبات ترحم اور اخلاق کو اپیل

نہیں کرتا۔ بلکہ علمی نظریوں کی بنا پر وہ کہتا ہے کہ کس طرح اشتراکیت بام ارتقا کا آخری زینہ ہے اور اس پر پہنچے بغیر چارہ ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان اشتراکین کا عوام تو کیا خواص تک نام بھی نہیں جانتے جو ابتدائی اُنیسویں صدی میں مارکس سے کہیں زیادہ مشہور تھے۔ مسٹر ادارکر نے بھی اپنی کتاب میں معاشی نظریوں کا سہارا لیا ہے جس کی وجہ سے اس کی کتاب کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے اور اس کے دلایل مضبوط ہوگئے ہیں اُستادی معاشیات (کلاسیکل) میں آزاد تجارت کی اہمیت پر بہت زور دیا گیا ہے اور اس مفروضہ پر اس علم کی بنیادیں قایم ہیں۔ چنانچہ جب کبھی شروع شروع میں ہندوستانی صنعتوں کو تامین دینے کا تذکرہ کیا گیا اور ملک کی طرف سے آہستہ آہستہ یہ مطالبہ زیادہ شدید ہوتا گیا تو ان کو ہمیشہ یہی کہا گیا کہ یہ معاشی اصولوں کے خلاف چیز ہے۔ ہندوستان بس پہلے پہل تامین کے لئے جتنے مطالبے اور تقاضے ہوتے رہے وہ زیادہ تر سیاسی ور قومی وجوہ کی بنا پر تھے۔ لیکن حال میں ملک میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا ہے جو کہتا ہے کہ تامین معاشی بنا پر ضروری ہے۔ مسٹر ادارکر بھی اسی گروہ کے رکن ہیں بنانچہ تعارفی حصہ میں انہوں نے معاشی دلایل سے یہ ثابت کیا ہے کہ موجودہ حالت کے لحاظ سے آزاد تجارت کے نظریئے درست نہیں ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وجودہ حالات کے لحاظ سے یہ نظریے بے معنی ہوگئے ہیں کیونکہ وہ مفروضات جن کی ما پر آزاد تجارت کے نظریئے قائم کئے گئے تھے اب موجود نہیں ہیں۔ آزاد تجارت سب سے پہلا اور اہم مفروضہ یہ ہے کہ آزاد تجارت اس وقت کسی ملک کے لیے نفع بخش در فایدہ رساں ہوسکتی ہے جب کہ ملک میں سب لوگ کام پر لگے ہوئے ہوں اور اُنکو مر مختلف کام منتخب کرنے کا اختیار حاصل ہو لیکن جب ملک میں ایک کثیر حصہ بیکار ہو ور ان کو انتخاب کا موقع ہی حاصل نہ ہو تو اس وقت نظریہ مصارف متوازن کل بے معنی چیز ہوجاتی۔ دوسرا اہم مفروضہ آزاد تجارت کا یہ ہے کہ آزاد تجارت کے ساتھ

زادی نقل و حمل ہی ہو لیکن وہ لوگ جو ہمیشہ عدم مداخلت کی تعریف و توصیف کا ڈھونڈا
پیٹا کرتے رہتے ہیں خود اپنے ممالک میں اسی اُصول کے دوسرے جزو پر کہاں تک
ل کرتے ہیں۔ اِن حالات میں آزاد تجارت بے معنی چیز ہو جاتی ہے اور وہ لوگ
تا مین کا مطالبہ کرتے ہیں کم سے کم اُصولی لحاظ سے کفر و شرک کے مرتکب نہیں ہوتے
اب کے اس حصہ میں انھیں اُصولوں کی روشنی میں مسٹر ادارکر نے ثابت کیا ہے کہ
صول عدم مداخلت اَب فرسودہ ہو چکا ہے اور اُصولی لحاظ سے تامین ہندوستان کے
یے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ ادارکر کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اُنھوں نے
ندوستان کے لئے تامین کا مطالبہ صرف سیاسی یا قومی اُصولوں کی بنا پر نہیں کیا بلکہ
عاشی اُصول کی بنا پر کیا ہے۔

کتاب کا پہلا حصہ جیسا کہ اُوپر ذکر کیا جا چکا ہے واقعاتی ہے جس پر تبصرہ کرنا بہت
دالت کا کام ہے۔ ہاں اتنا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر ادارکر نے ٹیرف
رڈ کی رپورٹوں کا نہایت وسیع اور گہرا مطالعہ کیا ہے اور بہت کام کا مواد یکجا جمع کر دیا ہے
ر کوئی شخص ہندوستان میں مختلف صنعتوں کی تاریخی نشو و نما اور اُن کی موجودہ حالت
کم سے کم فرصت میں زیادہ سے زیادہ صحیح اور مستند معلومات حاصل کرنا چاہے تو اُسکو
ں کتاب کے اس حصہ میں مل جائینگی۔

کتاب کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ وہ ہے (دوسرا حصہ) جس میں مسٹر ادارکر نے
ین کی اُس پالیسی پر تبصرہ کیا ہے جو ۱۹۲۳ء سے اس ملک میں کارفرما ہے۔ حکومت
ند کا ہمیشہ سے دعویٰ رہا ہے کہ وہ تامین دینے کے متعلق ہمیشہ بے لاگ اور انصاف
ند رہی ہے۔ مسٹر ادارکر نے حکومت کے رویہ پر بڑی کڑی نکتہ چینی کی ہے اور وہ
یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ حکومت نے ہر ممکن طریقے سے اس پالیسی کو جو بذات خود پہلے
ے ڈھیلی تھی اس طریقے سے بر سر عمل رکھا ہے کہ ملک کو اُس سے چنداں فائدہ نہ پہنچے

ٹیرف بورڈ جو قائم کیے گئے اُن کے اراکین حکومت کے منتخب کردہ ہوتے تھے۔ لیکن حکومت نے ہمیشہ اپنے منتخب شدہ اراکین کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ یہ بذات خود کوئی ایسی بُری بات نہیں ہے لیکن حکومت کی نیت پر شبہ اس وجہ سے ہونے لگتا ہے کہ جب کسی صنعت کو تامین دینے کے متعلق ٹیرف بورڈ نے سفارش کی یا اس کے تامین کی کوئی خاص شرح مقرر کی تو حکومت کو کئی وجوہات کی بنا پر بورڈ کی رائے سے اختلاف کرنا پڑا لیکن جب کبھی بورڈ نے کسی صنعت کو تامین نہ دینے کی سفارش کی تو حکومت نے ہمیشہ بورڈ کی رائے سے اتفاق کیا اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل حقایق دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ اس کتاب کے صفحہ ۳۶۳ پر مندرجہ ذیل جدول پیش کیا گیا ہے۔ صنعتوں کو اس تجزیہ کے لیے پانچ جماعتوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

جماعت اوّل	ٹیرف بورڈ کی سفارش	حکومت کا رویہ	صنعتوں کی تعداد
الف	ٹیرف بورڈ نے تامین یا مالی امداد کی سفارش کی۔	حکومت نے اسے منظور کر لیا۔	۲۵
ب	ٹیرف بورڈ نے تامین یا مالی امداد کی سفارش کی۔	حکومت نے اس میں ترمیم کر دی۔	۱۱
ج	ٹیرف بورڈ نے تامین یا مالی امداد کی سفارش کی۔	حکومت نے اسے مسترد کر دیا۔	۶
د	ٹیرف بورڈ نے تامین دینے سے انکار کر دیا۔	حکومت نے بورڈ کی رائے سے اتفاق کیا۔	۷
ح	ٹیرف بورڈ نے انکار کیا۔	حکومت نے مداخلت کی۔	×

اِن اعداد کا مصنف نے مزید تجزیہ کیا ہے۔ وہ صنعتیں جن کو حکومت نے ٹیرف بورڈ کی سفارش پر تامین عطا کی اُن کی تعداد جیسا کہ جدول سے ظاہر ہے ۲۵ تھی اُن میں سے صرف پانچ اہم صنعتیں تھیں باقیوں کی کوئی زیادہ اہمیت نہ تھی۔ اس کے برعکس وہ چھ صنعتیں جس میں ٹیرف بورڈ نے سفارش کی اور حکومت نے انکار کیا سب کی سب اہم صنعتیں تھیں جس میں سیمنٹ، پارچہ بافی (پارچہ بافی کی صنعت کو ابتداءً تامین دینے سے حکومت نے انکار کر دیا تھا۔ بعد میں مخصوص حالات کے تحت اُسے تامین دی گئی)

بھاری کیمیائی صنعتیں۔ شیشہ سازی۔ ریشم اور اُون سازی کی صنعتیں ہیں۔

اِس سلسلہ میں حکومت پر بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اگر حکومت کے سامنے ملک کا مفاد پیش ہوتا تھا اور اسی جذبہ کے تحت اُسے اکثر اپنے منتخب شدہ اراکین ٹیرف بورڈ کی آراء سے اختلاف کرنا پڑا تو کیا ایسا کبھی موقعہ نہ آیا کہ حکومت نے اُس صنعت کو تامین دی ہو۔ جب بورڈ نے کسی صنعت کو تامین دینے سے انکار کیا تو حکومت نے ہمیشہ آمناً و صدقنا کہہ کر ہمیشہ بورڈ کی سفارش کو بسر و چشم تسلیم کر لیا مسٹر اوار کرنے حکومت کی نیک نیتی پر ایک اور زاویہ نگاہ سے بھی اعتراض کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب کسی صنعت کو طوعاً و کرہاً تامین دی بھی گئی تو وہ بھی نہایت خاص انداز سے بہت کچھ نخروں اور ٹال مٹول کے بعد دی گئی مثلاً دیا سلائی کی صنعت کو تامین دینے میں دو سال کا طویل عرصہ لگ گیا۔

پارچہ بافی کی صنعت کے متعلق بورڈ نے تو رپورٹ پیش کر دی لیکن حکومت نے اس کے متعلق فیصلہ کرنے میں اڑھائی سال گذار دیئے اِس طرح شکر سازی کے متعلق بھی دو سال لگ گئے۔ نمک سازی کا بھی یہی حشر ہوا۔

میگنیشم کلورائیڈ کو مدد دینے میں تین سال لگ گئے۔ یہ تمام وہ صنعتیں ہے جن کے متعلق بورڈ نے سفارش کی تھی کہ اُن کو تامین دی جائے اور حکومت نے بالآخر کئی کئی برس سوچ کر بورڈ کی رائے سے اتفاق کر لیا۔ جماعت ب کی صنعتیں جن کے متعلق حکومت کو بورڈ کی سفارشات میں ترمیم کرنا پڑی اُس میں سے بھی زیادہ وقت لگا۔ رَسّی سازی کی صنعت کو مدد ملنے میں چار برس لگ گئے اسی طرح بعض دوسری صنعتوں کو مدد ملنے کے لیے تین سے پانچ برس کا عرصہ لگا۔ شاید کچھ ایسے ہی موقعوں کے لیے غالب مرحوم نے فرمایا تھا ؎

میں نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

اس طرح وہ صنعتیں جن کے لیے بورڈ نے سفارش کی تھی لیکن حکومت نے اس سفارش کو مسترد کر دیا ان صنعتوں کو مدتوں امید و بیم کی حالت میں منتظر رہنا پڑا اون کی صنعت کو ۱۹۳۲ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک انتظار کرنا پڑا اور اس طول انتظار کے بعد اُسے بتایا گیا کہ تامین نہیں دی جائیگی۔ کانچ کی صنعت جس کے متعلق ۱۹۳۱ء میں درخواست پیش کی گئی تھی اور اُس کو ٹیرف بورڈ کے حوالے کیا گیا تھا۔ بورڈ نے ۱۹۳۲ء میں اُسکے متعلق رپورٹ پیش کر دی اور سفارش کی کہ اس صنعت کو تامین ملنی چاہیئے۔ اس رپورٹ کو ۱۹۳۴ء میں شائع کیا گیا اور حکومت نے تامین عطا کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ کچھ اس قسم کے حالات میں یاس یگانہ لکھنوی نے فرمایا ہے۔

اُمید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

حکومت کے دفاتر میں ایسی دیری اور تساہل کچھ تعجب انگیز امر نہیں ہے لیکن سب سے حیرانی اور تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ صنعتیں جن کو تامین نہ دینے کے لیے

بورڈ نے سفارش کی ایسی رپورٹیں حکومت نے فوراً شائع کر دیں اور جبٹ سے بورڈ کی رائے کے ساتھ اتفاق کر لیا۔ یہاں ایک یہ بھی اہم سوال مسٹر ادارکر نے اٹھایا ہے کہ یہ رپورٹیں حکومت کے منتخب شدہ ماہرین نے ملک کا دورہ کرکے نہایت محنت اور جانفشانی سے مرتب کی تھیں پھر حکومت کے محکمہ کامرس کے افسران کو جو باوجود اپنی دوسری اہلیتوں اور قابلیتوں کے اس کے فن کے ماہر نہ تھے کیا حق حاصل تھا کہ وہ اُن ماہرین کی سفارشات پر اپنے فتوے صادر فرمائیں۔ ویسے تو اکثر اوقات ملک کے آزاد خیال لوگوں نے ٹیرف بورڈ کی ہئیتِ ترکیبی پر سخت اعتراضات کئے ہیں کیونکہ اس بورڈ کے اکثر اراکین سرکاری عہدے دار ہوتے تھے۔ تمام بورڈوں کے جملہ ۱۱۲ اراکین میں سے ۱۰۷ سرکاری اراکین تھے اور صرف ۴ غیر سرکاری۔ سرکاری اراکین کے متعلق اکثر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ حکومت کے اگر زیر اثر نہیں تو کم سے کم ایسے حلقہ میں رہنے سے اکثر ہر چیز کو حکومت کے زاویہ نگاہ سے ہی دیکھنے کے عادی ہو رہتے ہیں ان حالات میں یہ بات اور بھی قابل افسوس ہی نہیں بلکہ سخت قابل اعتراض ہے کہ حکومت نے کیوں ان اراکین کی متفقہ سفارشات کے خلاف عمل کیا۔

یہی نہیں بلکہ مسٹر ادارکر نے تو یہاں تک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پس پردہ بہت کچھ کش مکش جاری تھی اس سلسلہ میں مسٹر ادارکر کے اہم نتائج ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ وہ صنعتیں جن کو تامین دینے سے غیر برطانوی کارخانوں کو نقصان پہنچتا تھا در و یسے تامین کے لیے درخواست گذاروں کا معاملہ مضبوط تھا ایسے تمام حالات میں حکومت نے ہمیشہ تامین دینا منظور کریں۔

۲۔ جہاں تامین سے برطانوی مفاد کو نقصان پہنچتا تھا وہاں ٹال مٹول سے کام چلایا گیا۔ اور بالآخر انکار کر دیا گیا۔

۳۔ جہاں ایسا سمجھوتا ہوسکتا تھا کہ باوجود تاین کے بعض اقسام کا برطانوی مال ...چے داموں پر آکر فروخت ہوسکے وہاں تاین دے دی گئی۔

۴۔ بعض ایسی صنعتوں کو تاین دی گئی جن کے پہلے ہی سے برطانوی کارخانے ...ہندوستان میں موجود تھے بمسٹر ادارکر امتیازی تاین کے سخت مخالف ہیں۔

اگر امتیازی تاین کا اُصول درست تسلیم نہیں کیا جاتا اور اس کے برعکس یہ مطالبہ ...جاتا ہے جیسا کہ مسٹر ادارکر نے کہا ہے کہ تاین نہایت فراخدلی سے عام طور پر دی جائے ...ایسی صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فراخدلی سے کیا مراد ہے۔ تاین کی ایک ...مدار ایک شخص کے لیے فراخ ہوسکتی ہے اور دوسرے کے لیے نہایت معمولی اور تنگ ...۔ اس فراخدلی کا کچھ اُصول اور معیار بھی تو مقرر ہونا چاہیئے مسٹر ادارکر نے اپنی کتاب ...کوئی ایسا اُصول اور معیار پیش نہیں کیا حالانکہ یہ انتہائی ضروری تھا۔

اُنھوں نے امتیازی تاین کے اُصول پر جابجا کڑی نکتہ چینی کی ہے جو اکثر ...فات حدِ اعتدال سے گزر گئی ہے۔ اگر عام طور پر فراخدلی سے تاین دینے کی ...بسی اختیار کی جائے تو یہ حد کہاں تک ختم ہوگئی۔ اس فراخدلی کے بھی کچھ اُصول ...ر ہونا چاہیں۔

میری رائے یہ ہے کہ امتیازی تاین کا جو فارمولا قائم کیا گیا ہے وہ نہایت ...ست ہے۔ یاد دہانی کی خاطر اس کلیہ کے تین آہم جزو یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) وہ صنعت جس کو تاین دی جائے ایسی ہو کہ اس کی ترقی کے لیے تمام قدرتی ذرائع ملک کے اندر موجود ہوں۔ تمام خام مال ملک میں کافی طور پر بکثرت پایا جاتا ہو۔ ملک میں اُس کے لیے مزدور اور کاریگر موجود ہوں اور اُس صنعت کی پیدا شدہ اشیاء کے لئے ملک میں مانگ موجود ہو۔

(۲) صنعت کی ... [illegible]

اتنی جلدی ترقی نہ کر سکتی ہو۔

(۳) صنعت کی نوعیت ایسی ہو کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکے۔

قصور دراصل فارمولا کا نہیں ہے بلکہ اُس سے معنی نکالنے کا ہے۔ مثلاً اس فارمولا کی پہلی شرط یہ ہے کہ خام مال کثرت سے ملک میں پایا جاتا ہو۔ حکومت ہند نے کانچ کی صنعت کو تامین دینے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ ملک میں راکھ سوڈا نہیں پایا جاتا جو کانچ کے لیے ضروری ہے حالانکہ ٹیرف بورڈ نے اس فارمولا کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سفارش کی تھی کہ راکھ سوڈا ایک معمولی جزو ہے جو آسانی سے باہر سے منگوایا جا سکتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس فارمولا کے اندر رہ کر بھی ایسی صنعتوں کو تامین دی جا سکتی ہے جس کے لیے خام مال کے اکثر اجزا ملک کے اندر موجود ہوں لیکن جزوی طور پر بعض چیزیں باہر سے منگوانی پڑیں۔ اور یہ بات بھی عام فہمی کی ہے لیکن حکومت ہند نے اس فارمولا کو بالکل لغوی معنی پہنائے اور تامین دینے سے انکار کیا جو صریحی طور پر غلط ہے۔

اگر اس فارمولا کو ہمدردانہ طور پر استعمال کیا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ ملک کی صنعتی ترقی کے راستہ میں یہ فارمولا حائل ہوگا۔

ملک میں صنعتی ترقی کے ہم کتنے ہی حامی کیوں نہ ہوں اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر قسم کی صنعت کو تامین نہیں دی جا سکتی۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں ہلٹن ینگ کمشن کی سفارش پر حکومت نے روپیہ کی پونڈ کے ساتھ شرح تبادلہ ایک شلنگ چھ پنس مقرر کر دی تھی۔ جنگ عظیم سے پہلے یہ شرح تبادلہ ایک شلنگ چار پنس تھی۔ مسٹر اوارکر نے کتاب میں بار بار اس شرح کے تباہ کن اثرات کا تذکرہ کیا ہے اور اس ... کو اس قدر اُلاپا ہے کہ پڑھنے والے کے سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔

وقت بے وقت موسم بے موسم موقع بے موقع وہ اِس تان کو اڑاتے چلے گئے ہیں کہ اِس شرح نے ہندوستان کی صنعتوں کو تباہ کر دیا ہے۔ اگر کسی سیاسی کتاب میں اِس قسم کی بے سُری باتیں ہوتیں تو قابل معافی تھیں لیکن ایک متین علمی کتاب میں جس کی بنیاد معاشی نظریات پر رکھی گئی ہوں اِس قسم کا طرز بیان زیادہ شایانِ شان نہیں مسٹر ادارکر نے جا بجا اِس شرح کی مذمت کی ہے اور اُس کے نقصانات بتائے ہیں لیکن اِس شرح سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں اُن کا تذکرہ صرف ایک اَدہ جگہ دبی زبان سے کرنے کے بعد اُنھوں نے بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ ۱۹۲۷ء اور ۱۹۳۵ء کے درمیان ہندوستان میں بہت نمایاں صنعتی ترقی ہوئی۔ ذرائع نقل وحمل میں موٹر لاریوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اِس صنعتی ترقی کے لیے جو مشنری منگوائی گئی وہ مروجہ شرح تبادلہ کی وجہ سے بہت سستی پڑی اور ملک کو یقیناً اُس سے بہت فائدہ پہنچا۔ وہ ملک جو صنعتی ترقی چاہتا ہو اور جو مشنری تمام کی تمام باہر سے خریدتا ہو اُسکے لیے یہ فائدہ کچھ کم اہم نہیں ہے۔ اِس طرح جب مسٹر ادارکر تاوان کے بار کا تجزیہ کرتے ہیں تو اُن کا تجزیہ حقیقت سے دور ہو جاتا ہے۔ تاوان کے بار سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا ہاں اُسکے متعلق اختلاف ہونا ممکن ہے کہ آیا یہ بار ملک برداشت کرنے کے قابل ہے یا نہیں اور یہ بار آیندہ چلکر ملک کے لیے فائدہ کا سبب بنے گا۔ مثلاً دیا سلائیوں کے متعلق ٹیرف بورڈ کا حوالہ دیتے ہوئے مسٹر ادارکر لکھتے ہیں کہ "دیا سلائی کی ڈبیہ کی قیمت رسمی ہے جو ملک کے چھوٹے سے چھوٹے سکے کے حساب سے مقرر کی جاتی ہے ہندوستان میں عام رائج الوقت چھوٹے سے چھوٹا سکہ چونکہ پیسہ ہے اِس لیے خواہ محصول عائد کیا جائے یا نہ کیا جائے دیا سلائی کی قیمت ایک پیسہ ہی رہیگی۔ چنانچہ دیا سلائی کی صنعت کو جو تاوان دی گئی ہے اس کا صارفین پر کوئی بار نہیں پڑا۔ یہ استدلال حقایق اور واقعات سے قطعی ہٹا ہوا ہے اگر ملک میں چھوٹے سے چھوٹا رائج الوقت سکہ

ایک پیسہ ہے تو کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ دیا سلائی کی ڈبیہ ایک پیسے کو فروخت ہونے کی بجائے ایک پیسہ کی دو ڈبیہ کے حساب سے کوئی فروخت نہ کی جا سکے۔ اگر محصول کی وجہ سے ایک کی بجائے پیسہ کو دو ڈبیہ نہیں ملتیں تو یقیناً صارفین کو اور بالخصوص غریب صارفین کو بہت کافی نقصان پہنچا ہے۔ بنگلوں اور کوٹھیوں میں رہنے والے ہندوستانی معاشیں کے نزدیک یہ کوئی ایسا اہم بار نہ سمجھا جائے تو یہ الگ بات ہے لیکن میں ذاتی مشاہدے کی بنا پر جانتا ہوں کہ غریب لوگ محلوں میں دوسرے گھروں سے آگ مانگ کر لاتے ہیں تاکہ اس کی مدد سے آگ جلائی جا سکے اور ایک کاڑی کی بچت ہو جائے برسات کے دنوں میں مدتوں پھونکیں مار مار کر مغز خالی ہو جاتا ہے تب کہیں جا کر ایک کاڑی کی بچت ہوتی ہے۔ اِن حالات میں یہ کہنا کہاں تک مناسب ہے کہ اس کا صارفین پر بار نہیں پڑتا۔ میرا استدلال یہ ہے کہ صارفین پہ بار ضرور پڑتا ہے لیکن چونکہ دیا سلائی پر خرچ مزدور کی آمدنی کا اِس قدر خفیف حصہ ہوتا ہے کہ وہ اسے برداشت کر سکتا ہے۔ بالخصوص جب یہ بار برداشت کرنے سے وہ خود لپنے لیے نہیں تو کم سے کم اپنے اولاد کے لیے صنعتی ترقی کی صورت میں روزی کا سامان پیدا کرتا ہے۔

دوسرے مسٹر اوارکر کا یہ استدلال بھی غلط ہے کہ تامین کی صورت میں اُن کا بار غریبوں پر نہیں بلکہ اعلیٰ طبقوں پر پڑتا ہے۔ مٹی کا تیل دیا سلائیاں۔ نمک اور سوتی کپڑا یہ سب غریب ہی زیادہ استعمال کرتے ہیں اور اُن پر محصول کا بار پڑتا ہے۔

مسٹر اوارکر کی کتاب میں میری رائے میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ انھوں نے اِن مسایل پر روشنی نہیں ڈالی جو فراخدلی سے تامین کی پالیسی پر عمل کرنے سے ملک میں پیدا ہوں گے۔ صارفین پر تامین کا بار ضرور پڑتا ہے اور میں اس کو مان چکا ہوں کہ وہ اس بار کو قہر درویش بر جان درویش کی صورت میں برداشت کر سکتے ہیں لیکن یہ کوئی

وجہ نہیں کہ ملک کے تاجر پیشہ لوگوں اور کارخانہ داروں کو ڈھیلی رسی سے چھوڑ دیا جاتے۔ تامین کی وجہ سے کارخانہ دار جو غیر معمولی منافع حاصل کرتے ہیں اُنپر ان کا کیا حق ہے؟ کیا وہ عوام کے ایثار کا نتیجہ ہیں۔ اور کیا عوام یا ان کی نمایندہ جماعت یعنی حکومت کو اس منافع سے حصہ وصول کرنے کے کوئی حق نہیں۔ کارخانہ دار جو اپنی لاپروائی اور دیگر کمزوریوں کی وجہ سے اپنے اخراجات پیدائش کو کم نہیں کرتے کیا اُنپر عوام کا کوئی حق نہیں کہ وہ ان کو اپنی حالت درست کرنے کے لئے مجبور کریں۔ جب تامین کی وجہ سے منافع بڑھ جاتا ہے اور بڑھتے ہوئے منافع اور آیندہ توقعات کی بنا پر حصوں کی قیمتیں دھڑا دھڑ بڑھنی شروع ہوجاتی ہیں اور سو روپیہ کا حصہ پانچ سو روپیے میں فروخت ہونے لگتا ہے تو کیا اس صورت میں حکومت پر کوئی پابندی لاحق نہیں ہوتی کہ وہ اس سٹہ بازی کا ابتدا ہیں سدّباب کرے۔ یہ تمام مسائل تامین کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور مسٹر ادارکرنے اُنپر کچھ روشنی نہیں ڈالی۔ بہ وقت فرصت کسی علیحدہ مضمون میں میں اُنپر روشنی ڈالونگا۔

کتاب کے ملنے کا پتہ۔ کتابستان۔ الہ آباد۔ قیمت ۵ اروپئے صفحات (۶۱۹)

نا یت کا معاشی پہلو

جناب امتیاز حسین خاں صاحب۔ بی کام (لندن) لکچرار معاشیات جامعۂ عثمانیہ۔

قبل اس کے کہ یہ بیان کیا جائے کہ نازی جماعت نے جرمنی میں سیاسی اقتدار پانے کے بعد کس قسم کا معاشی نظام قائم کرنے کی کوشش کی یا پھر یہ کہنا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے نو سال میں ان کی کس قسم کی معاشی پالیسی رہی ناتیت کا معاشی پس منظر پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ موجودہ دور میں آج تک کوئی ایسی بڑی سیاسی تحریک پیدا نہیں ہوئی جس کے وجود میں آنے کے اہم معاشی اسباب موجود نہ رہے ہوں۔ انقلاب فرانس محض ایک سیاسی مظہر سمجھا جاتا ہے لیکن اس کے نمودار ہونے کے بھی اہم معاشی اسباب موجود تھے۔ انقلاب روس کی کامیابی میں سیاسی اسباب سے زیادہ معاشی اسباب نے حصہ لیا۔ اسی طرح سے ناتیت کے وجود میں آنے اور عروج پانے کے اہم معاشی اسباب پائے جاتے تھے۔ اس تحریک کے ظہور کا اہم سبب افراط زر (Inflation) تھا اور نازی جماعت کو قوت ۳۲ - ۱۹۲۹ کی عالمی کساد بازاری کی وجہ سے حاصل ہوئی۔

ناتیت کا معاشی پس منظر جرمنی میں پچھلی جنگ عظیم کے دوران اور اس کے بہت بعد تک افراط زر کی پالیسی پر عمل ہوتا رہا۔ ان

معاشی اصلاح اور اس کی وجہ سے معاشرہ کے لئے جس قسم کے اثرات پیدا ہوتے ہیں ان کی تشریح کی ضرورت ہے۔ افراط زر کی تعریف ہر ماہر معاشیات نے مختلف الفاظ میں کی ہے اور اسی لئے اس کے سمجھنے میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ آسان اور مفید تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ افراط زر سے مراد ایسی حالت ہے جبکہ عام طور پر قیمتوں میں اضافہ ہو یا اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ زر کی قدر یا اسکی قوت خرید گھٹے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ قیمت میں ہر قسم کے اضافہ کو افراط زر سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے یہ لازمی شرط ہے کہ عام طور پر قیمتوں میں اضافہ ہو۔ افراط زر کے حالات عموماً جنگ کے دوران اور اس کے بعد پیدا ہوتے ہیں جکومتوں کے لئے موجودہ جنگیں بہت زیادہ مہنگی ثابت ہوئی ہیں اسی لئے ان کے اخراجات حکومتوں کے معمولی ذرائع آمدنی سے پورے نہیں کئے جا سکتے اور مجبوراً افراط زر کی پالیسی اختیار کرنی پڑتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زر کی مقدار میں اضافہ کرکے حکومت اپنی بڑھتی ہوئی ضروریات پوری کرتی ہے۔ ایک طرف زر کی مقدار تو بڑھ جاتی ہے لیکن اس کے مقابلہ میں اشیاء اور خدمات کی مقداریں بہت کم ہوتی ہیں۔ عام طور پر مانگ بڑھنے کی وجہ سے ہر چیز کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے موجودہ جنگ کا بھی یہ اثر ہوا ہے کہ قیمتیں کافی بڑھ گئی ہیں لیکن پھر بھی ابتک حالات اتنے زیادہ خراب نہیں ہوئے ہیں جتنے کہ پچھلی جنگ کے دوران میں ہر ملک کی قیمتوں میں اضافہ ہوا تھا۔ انگلستان میں قیمتیں تین گنی تک بڑھی تھیں فرانس میں قیمتوں میں اضافہ پانچ گنا اور اٹلی میں چھ گنا ہوا تھا۔ ان ممالک کے مقابلے میں جرمنی کی حالت بہت زیادہ ابتر تھی۔ ۱۹۲۳ء میں ۱۹۱۴ء کے مقابلہ میں قیمتوں کی سطح ۵۰، ۶ گنا زیادہ تھی۔

جب کبھی معاشرہ میں (۱) قسم کا افراط زر نمودار ہو تو مختلف معاشی طبقات

کے لئے بُرے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ ۱۹۲۳ء کے افراط زر نے جرمنی کی معاشرتی اور سیاسی ہیئت میں بہت سی اہم تبدیلیاں کردیں۔ اس کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان اَوسط طبقہ کو اُٹھانا پڑا۔ اِس طبقہ میں عموماً ایسے لوگ شامل ہوتے ہیں جن کی آمدنیاں مقرر ہوتی ہیں۔ اِسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ، سرکاری اور نیم سرکاری ملازمین اور ایسے لوگ جو کچھ تھوڑا بہت بچا رکھتے ہیں اور اپنی پس انداز کی ہوئی دولت سے مختلف قسم کی تمسکات خرید لیتے ہیں یا پھر مقررہ شرح سود پر قرض دیتے ہیں ان لوگوں پر قیمتوں کے بڑھنے کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح سے وہ لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں جن کی آمدنی کا ذریعہ پنشن یا پھر مکانات وغیرہ کے کرائے ہوتے ہیں۔ اور اسی قسم کی دوسری آمدنیاں ایسی ہیں جن میں جلد جلد تبدیلیاں نہیں ہوتیں۔ بعض ان میں سے تو ایسی آمدنیاں ہیں جو ہمیشہ مقرر رہتی ہیں اور بعض دوسری ایسی ہیں جو قیمتوں میں اضافہ کے ساتھ ساتھ نہیں بڑھتی۔ جرمنی میں افراط زر کا نتیجہ یہ ہوا کہ اوسط طبقہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھا۔ اُن کی پس انداز کی ہوئی دولت بالکل ختم ہوگئی یا پھر اس کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔ مزدور جماعت کے مقابلہ میں اوسط طبقہ کو بہت زیادہ نقصان اُٹھانا پڑا۔ صنعتی ممالک میں مزدور جماعت منظم ہوتی ہے۔ جب کبھی قیمتوں میں اضافہ ہو مزدور سبھائیں اپنے ارکین کی اُجرتوں میں بھی اضافہ کا مطالبہ کرتی ہیں اور بڑی حد تک انہیں اپنے اِس مطالبہ میں کامیابی بھی ہوجاتی ہے۔ اَوسط طبقہ کسی ملک میں بھی منظم نہیں ہوتا اس لئے ان کی آمدنیاں حالات کے ساتھ ساتھ نہیں بدلیتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے طبقات کے مقابلہ میں اوسط طبقہ کو افراط زر سے بہت زیادہ نقصان پہونچتا ہے جرمنی میں اَوسط طبقہ کے ہزاروں خاندان بالکل غریب ہوگئے اور انہیں بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں کے لئے ایک جدید اِصطلاح 'نئے غریب' (New Poor)

ایجاد کی گئی ۔ جنگ سے پہلے اس طبقہ کے معاشی حالات بہت بہتر تھے اور اس کے افراد چین کی زندگی گذارتے تھے ۔ حالات بدلنے کی وجہ سے جب انھیں مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا تو انھوں نے بہت زیادہ محسوس کیا ۔ انھوں نے اپنی معاشی حالت بہتر کرنے اور پستی کو دور کرنے کی ایک ہی صورت پائی اور وہ یہ کہ اپنے ملک کی حکومت پر قبضہ کیا جائے ۔ چاہے ایسا کرنے میں انہیں کسی قسم کے ذرائع کیوں نہ اختیار کرنے پڑیں ۔ حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش نے نازی تحریک کی شکل اختیار کی ۔ نازی جماعت کے قائدین پر نظر ڈالنے سے فوراً معلوم ہوجاتا ہے کہ ان کی اکثریت اوسط طبقہ سے تعلق رکھتی ہے ۔ شروع شروع میں اس تحریک کے حمایت کرنے والے بھی اوسط طبقہ کے افراد تھے ۔ یہی حال فسطائیت کا دوسرے ممالک میں بھی ہے ۔

ہم نے دیکھا کہ نازی جماعت کی ابتدا، افراط زر کے بدترین حالات میں ہوئی یعنی اس تحریک کے ظہور میں آنے کا ایک اہم معاشی سبب موجود تھا ۔ یہاں نازی تحریک کی سیاسی تاریخ بیان نہیں کی جائے گی ۔ صرف اتنا بتلانے پر اکتفا کیا جائیگا کہ اس کے قوت پانے کا بھی ایک اہم معاشی سبب موجود تھا ۔ ۱۹۲۳ء میں جرمنی کے زر کو استحکام دینے کے لئے نئی قسم کا مارک جاری کیا گیا ۔ دوسرے ممالک سے قرضے حاصل کرکے صنعتوں کی نئے سرے سے تنظیم کی گئی ایسا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ سستی چیزیں تیار کرکے برآمد میں اضافہ کیا جائے اور تاوان جنگ ادا کیا جاسکے ۔ نئے انتظامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو سال کے قلیل عرصے میں جرمنی میں خوشحالی کا دور دورہ شروع ہوا ۔ اس کی تجارت خارجہ کو ترقی ہوئی ۔ لوگوں کو مختلف قسم کے کاروباروں میں کام ملنے کی وجہ سے بیروزگاری گھٹی ۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ نازی تحریک کے بہت کم حامی رہ گئے تھے ۔ ہٹلر سیاسی قوت حاصل

کرنے کی پہلی کوشش ۱۹۲۳ء میں کرچکا تھا اور اب بالکل گمنامی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ لیکن دنیا میں خوشحالی کا دور دورہ کچھ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہا۔ ۱۹۲۹ء میں مشہور عالمی کساد بازاری شروع ہوئی۔ اس کی ابتدا، توریاستہائے متحدہ امریکہ سے ہوئی لیکن اس کے بڑے اثرات سے دنیا کا کوئی ملک بھی محفوظ نہیں رہ سکا۔ ۱۹۲۹ء کے آخر میں طوفان کی طرح اس کے اثرات جرمنی میں بھی پھیل گئے۔ کساد بازاری کے اثرات سے بچنے کے لئے بہت سے ممالک نے معاشی خودکفالت کی پالیسی اختیار کی۔ ان تمام حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت بین الاقوام پہلے کے مقابلہ میں آدھی رہ گئی اور خاص طور پر ان ممالک کو نقصان بہت زیادہ پہونچا جن کی معیشت کا انحصار تجارت خارجہ پر زیادہ تھا۔ جرمنی نے اپنی صنعتوں کی نئے سرے سے تنظیم اس مفروضہ پر کی تھی کہ دوسرے ممالک والے اس کی سستی مصنوعات بہت زیادہ مقداریں خریدتے رہیں گے اور بھاری تاوان جنگ ادا کرنے کی یہی ایک صورت ہوسکتی تھی۔ جرمنی کا یہ مفروضہ غلط ثابت ہوا۔ نئے حالات پیدا ہوجانے کی وجہ سے دوسرے ممالک والے اس سے زیادہ مقداریں مال خریدنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ برآمد میں کمی نے بہت سی صنعتوں کو نقصان پہونچایا اور بہت سے مزدور بے روزگار ہوگئے۔ مانگ کم ہونے کی وجہ سے دوسری صنعتوں کو جو اندرونی بازار کے لئے چیزیں تیار کرتی تھی یہی نقصان پہونچنا لازمی تھا۔ اس طرح سے کساد بازاری کا بُرا چکر جرمنی میں بھی شروع ہوگیا۔ بیروزگاری میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ ۱۹۳۲ء میں بے روزگار مزدوروں کی تعداد ۶۰ اور ۷۰ لاکھ کے درمیان تھی۔ ان بے روزگار لوگوں میں بہت سے ایسے نوجوان شامل تھے جن کے باپ افراط زر کے زمانے اپنی ساری پونجی کھوچکے تھے۔ انھوں نے نازی جماعت کی طرف نظریں اُٹھائیں۔ ہٹلر اس موقعہ کا منتظر بیٹھا تھا اس نے

بھوکے مزدوروں کی خوب آؤ بھگت کی اور نازی تحریک کے مختلف قائدین نے روزگار مہیا کرنے کے وعدے شروع کر دے۔ بے روزگار مزدور کے لئے روزگار حاصل کرنے سے زیادہ کوئی دوسری چیز اہمیت نہیں رکھتی۔ بھوک کی شدت میں وہ اپنے عقائد تک کو بھول جاتا ہے۔ اس امید میں کہ نازی تحریک کی کامیابی انہیں روزگار دلائے گی۔ مزدور طبقہ نے اس کی حمایت شروع کر دی جس کا ثبوت چند اعداد و شمار سے ملتا ہے۔ ۱۹۲۸ء کے عام انتخاب میں نازیوں کو تمام جرمنی میں صرف ۸ لاکھ ووٹ حاصل ہوئے تھے۔ لیکن کساد بازاری کے بعد جو پہلا انتخاب ۱۹۳۰ء میں ہوا اس میں نازی جماعت کو ۶۵ لاکھ ووٹ ملے تھے ان اعداد و شمار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح سے ناتیت کی مقبولیت میں کساد بازاری نے مدد دی۔ رفتہ رفتہ اس جماعت کا اقتدار بڑھتا گیا اور بہت جلد ۱۹۳۳ء میں جرمن حکومت ان کے قبضہ میں آگئی۔

ناتیت کا معاشی پروگرام نازیوں کے اقتدار میں آنے سے پہلے اُنھوں نے جرمن قوم کے سامنے جو معاشی پروگرام پیش کیا تھا اس پر زیادہ اثر فیڈر (Fader) کے خیالات کا پڑا تھا۔ اس کی رائے میں اگر سود کی بندھنوں کو توڑ دیا جائے تو معاشرتی نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس نے بتلایا کہ سرمایہ کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک قومی سرمایہ جو پیدا آور ہوتا ہے اور دوسرا یہودیوں کا سرمایہ جس کا مقصد قوم کا استحصال کرنا ہے۔ مارکس کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح سے قومی سرمایہ ختم ہو جائے تاکہ یہودیوں کا بین الاقوامی سرمایہ قومی معیشت پر اپنا اقتدار قائم کر سکے۔ فیڈر کے خیال میں نازی معیشت میں سود کے لئے کوئی جگہ نہ ہونی چاہیئے۔ نازی جماعت نے اقتدار پانے کے بعد سود کو ختم کرنے کی کچھ بھی کوشش نہیں کی۔ البتہ بنک کاری کے نظام پر قابو

پاکر اتنا ضرور کیا گیا کہ جہاں تک ہو سکے اس کی شرح کم کی جائے تاکہ ملک کی صنعت وحرفت، زراعت اور تجارت کو فروغ ہو۔ معاشی پروگرام کے دوسرے حصوں کا مطالعہ کیا جائے تو بعض دفعات ایسی ضرور ملتی ہیں جن میں اشتراکیت کی بُو پائی جاتی تھی۔ لیکن قوت پانے کے بعد ان میں سے کسی پر نازی جماعت نے عمل نہیں کیا اس لئے اس پروگرام کے متعلق تفصیلات بیان کرنا بے سود ثابت ہوگا۔

جب سے نازی جماعت نے جرمنی کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی ہے جرمن معیشت کے عام رجحان کے متعلق لوگوں میں مختلف خیالات پائے جاتے ہیں۔ بعضوں کا کہنا ہے کہ نازیت کی شکل میں سرمایہ دارانہ نظام نے مزدوروں کے خلاف آخری محاذ قائم کیا ہے۔ اس قسم کے دوسرے اور خیالات بھی پائے جاتے ہیں۔ ان مختلف خیالات میں تھوڑی بہت صداقت ضرور ہے۔ لیکن سب سے زیادہ صحیح غالباً یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ نازیت اصل میں ایک قسم کی فوجی آمریت ہے جس میں ایک پارٹی نے قوت حاصل کرنے کی غرض سے قوم کی پوری معیشت کو اپنے قابو میں کرلیا ہے۔ آگے چلکر جیسے جیسے نازی جماعت کی معاشی پالیسی کے مختلف اجزاء کی تشریح کی جائے گی یہ بات واضح ہوجائے گی کہ کس طرح سے قومی معیشت کے ہر پہلو پر حکومت کی نگرانی قائم ہے۔ اس لئے جرمنی کے موجودہ معاشی نظام کے لئے جو اصطلاح استعمال کی جاتی ہے وہ (Controlled Capitalism) ہے نازی جماعت سے پہلے دوسرے مغربی ممالک کی طرح جرمنی میں بھی سرمایہ دارانہ نظام قائم تھا۔ اس نظام میں عاملین پیدائش ذاتی ملکیت میں ہوتے ہیں۔ لوگوں کو کاروبار کرنے میں ہر قسم کی آزادی حاصل ہوتی ہے یعنی آزاد مقابلہ موجود ہوتا ہے۔ اس معاشی نظام کی قوت محرکہ منافع ہے۔ سرمایہ داری کے نظام میں آجر منافع کمانے کی غرض سے اشیاء تیار کرتے ہیں اور اسی طرح سے خدمات انجام پاتی ہے ہر بلیوطی

کی یہ اہم خصوصیات جرمنی کے معاشی نظام میں بھی پائی جاتی تھیں۔ صرف مقامی حالات کی وجہ سے تھوڑا سا فرق تھا۔ دوسرے ممالک کے مقابلہ میں جرمنی میں اجارہ کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اجارہ کی جو شکل جرمنی میں رونما ہوئی اُس کو کارٹل کہا جاتا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں اِس قسم کے تقریباً تیس ہزار کارٹل مختلف قسم کے کاروبار میں قائم تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جرمن سرمایہ داری میں آزاد مقابلہ کو وہی حیثیت حاصل نہیں تھی جو دوسرے مغربی ممالک میں۔ لیکن اُنیسویں صدی کے آخر میں دوسرے ممالک بالخصوص امریکہ میں بھی اِجارہ کو فروغ ہوا تھا۔ مزدور سبھائیں بھی جرمنی میں دوسرے ممالک کے مقابلہ میں زیادہ منظم تھی جس کا مطلب یہ ہے کہ مزدور تحریک میں بھی اِجارہ دارانہ رجحان پایا جاتا تھا۔ اِن معمولی اختلافات کے علاوہ جرمن سرمایہ داری کی ایک اور اہم خصوصیت یہ تھی کہ بہت سے کاروبار مرکزی اور مقامی حکومتوں کی طرف سے انجام دئے جاتے تھے۔ یا تو یہ صورت تھی کہ حکومت کی ملکیت میں بہت سے کاروبار چلتے تھے یا ہر کمپنیاں قائم تھیں جن کے زیادہ حصوں کی مالک حکومت تھی۔ لیکن یہ رجحان دوسرے ممالک کے معاشی نظام میں بھی پیدا ہو چلا تھا۔ خاص طور پر ۱۹۲۹ء کی عالمی کساد بازاری کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام میں بعض اہم تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ یہ تبدیلیاں جرمن نظام میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ نازیوں کو جب جرمنی کی حکومت ملی اس وقت سرمایہ دارانہ نظام اپنا بہت کچھ رنگ روپ بدل چکا تھا۔

اَب نازیت کی معاشی پالیسی کے اہم اجزاء بیان کئے جائیں گے جن سے یہ واضح ہو جائے گا کہ حکومت کی نگرانی قومی معیشت کے ہر پہلو پر قائم ہے ظاہر ہے کہ تھوڑے سے وقت میں نہ تو معاشی پالیسی کے اجزاء کی تفصیلات ہی بیان کی جا سکتی ہیں اور نہ اس کے ہر جزو کو شامل کیا جا سکتا ہے۔

نازیت اور اشتراکیت نازیت کا پورا نام (National Socielism) یا قومی اشتراکیت ہے۔ اس نام کی وجہ سے بڑی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ مغربی ممالک میں عام طور پر اشتراکیت سے جو مراد لی جاتی ہے قومی اشتراکیت کو اس سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ کسی کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اشتراکیت کی حیثیت ایک ایسی ٹوپی کی سی ہے جس کو بہت سے لوگوں نے پہنا ہو اور اسی وجہ سے اس کی شکل بالکل بگڑ گئی ہو۔ لوگوں نے اشتراکیت کی تشریح اور تعریف مختلف انداز سے کی ہے۔ اس کی بہت سی قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔ لیکن پھر بھی بعض خصوصیات ایسی ہیں جن کا ہر قسم کی اشتراکیت میں موجود ہونا ضروری ہے۔ اشتراکیت کی پہلی اہم خصوصیت یہ ہے کہ عاملین پیدائش پر ذاتی ملکیت کے بجائے اجتماعی ملکیت قائم ہوتی ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں اشتراکیت کے نظام میں مزدور یا کسان طبقہ کو زیادہ اقتدار حاصل ہونا چاہیئے۔ یہ دونوں خصوصیات نازی تحریک میں بالکل نہیں پائی جاتیں۔ اب بھی عاملین پیدائش ذاتی ملک ہیں۔ نازی یہ کہتے ہیں کہ جرمنی کی قومی اشتراکیت اور مارکس یہودی کی بین الاقوامی اشتراکیت میں بین فرق ہے۔ مارکس کی اشتراکیت کے لئے عاملین پیدائش پر اجتماعی ملکیت کا قائم ہونا ضروری ہے۔ لیکن قومی اشتراکیت کے لئے یہ چیز ضروری نہیں۔ اسی طرح سے نازی جرمنی میں مزدور طبقہ کو پہلے سے زیادہ اقتدار حاصل نہیں ہے۔ اس کے برخلاف (جیسا کہ بیان کیا جائے گا) مزدور جماعت اپنی تمام سیاسی اور معاشی مراعات کھو چکی ہے۔ ان کی سبھائیں اور سیاسی تحریک کا خاتمہ کر دیا گیا ہے اور وہ نازی جماعت کا آلہ کار بن کر رہ گئی ہے۔ ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ نازیت میں اشتراکیت کی دو اہم خصوصیات موجود نہیں ہیں۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر تحریک کے نام میں اشتراکیت کا لفظ کیوں شامل کیا گیا۔ اس کی

محض وجہ ایک خاص مقصد حاصل کرنا تھا۔ اشتراکیت کے لفظ کو اپنا کر نازی یہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح مزدور جماعت کے اراکین اور اداروں کی ہمدردیاں اور حمایت حاصل کریں اور اُنہیں آسانی سے دُہوکا دے سکیں۔ جب کبھی بڑے بڑے سرمایہ داروں اور زمینداروں (جنھوں نے شروع ہی سے تحریک کی مالی امداد کی تھی) نے تحریک کے نام پر یا پھر اُس کے معاشی پروگرام کے بعض اجزاء پر اعتراضات کئے تو اُنہیں یقین دلایا گیا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ایسا صرف ایک خاص مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کیا گیا ہے اور سرمایہ داروں کے مفاد کی حفاظت کا وعدہ نازی جماعت برابر کرتی رہی۔

نازی جماعت اور معاشی خودکفالت کی پالیسی

اُوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ ۱۹۳۳ء میں مارک کو استحکام دینے اور دوسرے ملکوں سے بہت کافی مقدار میں قرضے حاصل کرنے کے بعد جرمن صنعتوں کو نئے سرے سے تنظیم دی گئی تھی۔ نئی تنظیم کی وجہ سے جرمن صنعتیں بہت زیادہ مقدار میں سستی چیزیں تیار کرسکتی تھیں لیکن اس سے پورا پورا فائدہ اُسی وقت اٹھایا جاسکتا تھا جبکہ مصنوعات کی بہت زیادہ برآمد کی جاتی۔ صرف جرمنی کا بازار ان مصنوعات کے لئے ناکافی تھا۔ کسادبازاری کے اثرات نے عالمی بازار کو بہت ہی محدود کردیا تھا۔ حکومت پر قابو پانے کے بعد نازی جماعت کے سامنے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ کس طرح سے جرمن صنعتوں اور زراعت کی حالت سدھاری جائے۔ اس مشکل مسئلہ کے حل کے لئے انھوں نے ایک طرف تو معاشی خودکفالت کی پالیسی اختیار کی۔ ایسا کرنے سے وہ زراعت اور چھوٹی صنعتوں کی حالت تو بہتر کرسکتے تھے۔ لیکن جرمنی کی بھاری صنعتوں کا مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہوتا تھا۔ اس کے لئے برآمد کو ترقی دینا اور دوسرے ممالک کے بازار پر قبضہ کرنا ضروری تھا۔ اُن کی

معاشی پالیسی کا دوسرا اہم پہلو یہ تھا کہ جرمن مصنوعات کے لئے بازار تلاش کئے جائیں۔ اس طرح سے انھوں نے معاشی خود کفالت کی پالیسی اور برآمد کو ترقی دینے کی پالیسی میں مصالحت پیدا کرنے کی کوشش کی۔

زراعت اور چھوٹی صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے معاشی خود کفالت کی پالیسی پر عمل کیا گیا۔ اس پالیسی سے مراد یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے اپنی ضروریات کی چیزیں اپنے ہی ملک میں تیار یا پیدا کی جائیں۔ اگر اس پالیسی کو انتہا تک پہونچایا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دوسرے ممالک سے تمام تجارتی اور مالیاتی تعلقات منقطع کرے جائیں۔ ظاہر ہے کہ موجودہ دَور میں کوئی ترقی یافتہ قوم ایسا نہیں کرسکتی۔ قوموں کے درمیان تجارتی تعلقات اس قدر اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کو بالکل ختم کر دینا تقریباً ناممکن ہے۔ انسانی ضروریات نے اتنی وسعت حاصل کر لی ہے کہ ان کو پورا کرنے کے لئے ہر چیز ایک ہی ملک کے ذرائع سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لئے یہ لازمی امر ہے کہ ہر ملک کو دوسرے ممالک سے اشیاء اور خدمات کی خرید و فروخت کرنی پڑے گی۔

معاشی خود کفالت کی پالیسی پر عمل تو بہت پہلے ہو چکا تھا لیکن اس میں کامیابی حاصل کرنے کا جو طریقہ خاص طور پر اختیار کیا گیا وہ دوسرا چہار سالہ لائحہ عمل تھا جس کی ابتدا ستمبر ۳۶ء سے ہوئی۔ اس لائحہ عمل کے تحت یہ کوشش شروع کی گئی کہ جہاں تک ہوسکے قومی ضروریات پوری کرنے کے لئے ضروری اشیا خوراک اور دوسری خام اشیاء کی زیادہ سے زیادہ مقدار میں ملک کے اندر ہی پیدا کی جائیں۔ جو چیزیں آب و ہوا کے اختلاف یا پھر کسی دوسری وجہ سے ملک کے اندر پیدا نہیں کی جاسکتی تھیں ان کے بدل دریافت کرنے کی کوشش کی گئی

جس کی بہترین مثالیں مصنوعی ربر اور کوئلہ سے پٹرول تیار کرنا ہے۔ اس طرح سے معاشی اور سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لئے جدید سائنس سے بھی پوری پوری مدد لی گئی۔

معاشی خود کفالت کی پالیسی اختیار کرنے کا ایک اہم معاشی سبب ہے اس کے حامیوں کا خیال ہے کہ اس کے ذریعے سے قومی معیشت کو تجارتی چکر کے بُرے اثرات سے محفوظ کیا جاسکتا ہے لیکن اس پالیسی پر عمل کرنے اور کامیابی حاصل کرنے سے ایک سیاسی فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ جرمن قوم کا کہنا ہے کہ معاشی لحاظ سے خود مکتفی نہ ہونے کی وجہ سے جرمنی کو پچھلی جنگ میں شکست اُٹھانی پڑی۔ وہ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ جرمن فوجوں کو میدان جنگ میں کبھی بھی شکست نہیں ہوئی البتہ اشیاء خوراک کی کمی نے عام آبادی کو بغاوت کرنے پر مجبور کیا اور بالآخر فوجوں کو بھی ہتھیار ڈالنے پڑے۔ حکومت برطانیہ کی معاشی ناکہ بندی بہت زیادہ کامیاب تھی اور اسی لئے جرمنی دوسرے ممالک سے اشیاء خوراک اور دوسری چیزیں خرید نہیں سکا اور جرمن قوم کو بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر قوم خود مکتفی ہوجائے تو پھر اس قسم کا خطرہ باقی نہیں رہتا۔ اسی خیال کو پیش نظر رکھکر اٹلی میں بھی معاشی خود کفالت کی پالیسی اختیار کی گئی ہے۔ اٹلی کو جنگ حبشہ کے دَوران میں معاشی حدود (Sanctions) کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔

نئی معاشی پالیسی نے جرمنی کے عام لوگوں کا معیار زندگی پست کر دیا ہے اس پالیسی کے تحت باہر کا سستا مال ملک میں آنے سے روکا جاتا ہے اور اس قسم کی چیزیں ملک کے اندر تیار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن جب چیزیں غیر موافق حالات میں تیار کی جاتی ہیں تو ان کے مصارف پیدائش بڑھ جاتے ہیں اور عام لوگوں کو ان کی ضروریات کی چیزیں زیادہ قیمت پر ملتی ہیں جس کا

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی مقررہ آمدنی سے اشیاء اور خدمات کی کم مقداریں خرید سکتے ہیں اور ان کا معیار زندگی پست ہو جاتا ہے۔ لیکن معاشی خود کفالت کے حامی معیار زندگی کے پست ہونے کی زیادہ پروا نہیں کرتے وہ اتنی قربانی کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں بشرطیکہ ایسا کرنے سے قوم کو معاشی خود مختاری حاصل ہو جائے۔ اُن کی نظر میں معاشی خود مختاری معیار زندگی کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

نازی معاشی پالیسی کے پہلے جزو یعنی معاشی خود کفالت کے ذریعہ سے کسانوں، بڑے بڑے زمینداروں اور چھوٹی صنعتوں کے مالکوں کی حالت کو بہتر کیا جا سکتا تھا لیکن بھاری صنعتوں کو سدھارنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ برآمد کو ترقی دی جاتی۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں کی مالی امداد نے نازی تحریک کو کامیاب بنایا تھا اِس لئے ان کو بھی خوش رکھنا ضروری تھا۔ اس زمانہ میں ہر ملک خود مکتفی بننے کی کوشش میں لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے مغربی یورپ کے ممالک میں جرمن مصنوعات کے لئے گنجائش بالکل نہیں تھی۔ دوسرے صنعتی ممالک کا بھی یہی حال تھا۔ جرمنوں کے پاس نوآبادیات بھی نہیں تھیں جہاں وہ اپنی مصنوعات کی کھپت کر سکتے۔ جرمنی کے لئے صرف جنوب مشرقی یورپ کے ممالک کے بازاروں پر قبضہ کرنے کا موقعہ تھا۔ یہ تمام ممالک زرعی ہیں اور ان کی معاشی حالت بالکل ہندوستان جیسی ہے۔ یہاں مختلف قسم کی صنعتوں نے بہت کم ترقی کی ہے اور صنعتی ممالک کی اشیاء کے لئے اچھے بازار ثابت ہو سکتے ہیں۔ جرمنی نے مختلف طریقوں سے اِن ممالک کے بازاروں پر قبضہ جمانا شروع کیا۔ لیکن ایسا کرنے میں جرمنی کو اپنی مصنوعات کے بدلے میں ان کی خام اشیاء خریدنی پڑیں۔ یہ ممالک بھی بہت سی ایسی چیزیں پیدا کرتے ہیں جن کے لئے جرمنی، خود مکتفی ہونے کا اِرادہ کر چکا تھا۔ اس طرح سے نازی

جماعت کی معاشی پالیسی کے دو اہم اجزا میں تصادم ہونے کے بہت زیادہ امکانات تھے۔ اِس تصادم کو دور کرنے کے لئے جرمنی نے مشرقی یورپ کے ممالک کو ایسی خام اشیاء پیدا کرنے پر مجبور کیا جن کی اسے ضرورت تھی۔ دوسرے لکچر میں اسکے متعلق اور زیادہ تفصیلات بیان کئے جائیں گے اور یہ بتلایا جائے گا کہ کس طرح سے جرمنی نے اپنے مفاد کے لئے ان ملکوں کی معیشت کو اپنے قابو میں کر رکھا۔

نازیت اور بیروزگاری کا مسئلہ

نازی جماعت کے اِقتدار میں آتے ہی سب سے اہم اور پیچیدہ مسئلہ جس کا اُنہیں سامنا کرنا پڑا وہ مسئلہ بیروزگاری تھا۔ جب ہٹلر کے ہاتھوں میں حکومت آئی تو اس وقت جرمن قوم عالمی کساد بازاری کے بدترین اثرات سے گذر رہی تھی جس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ ۱۹۳۲ء کے آخر میں تقریباً ۶۰ لاکھ مزدور بیکار تھے۔ یہ ہم معلوم کر چکے ہیں کہ بیکار مزدوروں سے روزگار مہیا کرنے کا وعدہ کر کے نازیوں نے ان سے ووٹ حاصل کئے تھے۔ یہ کہنا تو غالباً صحیح نہ ہوگا کہ نازی جماعت نے محض اپنے وعدہ کو پورا کرنے کی غرض سے بیروزگاری کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی۔ اصل وجہ یہ تھی کہ اس کے بغیر نازی تحریک کو معاشی اور سیاسی استحکام حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر بے روزگار مزدوروں کی بڑی تعداد موجود رہتی تو نازیوں کو ہر وقت اس بات کا خطرہ لگا رہتا کہ معلوم نہیں کس وقت مزدور طبقہ ان سے منحرف ہو جائے اور ان سے سیاسی قوت چھیننے کی کوشش کرے۔

نازی عہد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ جرمنی میں بیروزگاری کا بالکل خاتمہ ہو چکا ہے اِس حقیقت سے کوئی شخص انکار بھی نہیں کر سکتا اگر بیروزگاری کے تعداد شمار پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ۱۹۳۳ء کے بعد سے بہت جلد بیکار مزدوروں کی تعداد میں ہر سال کمی ہوتی گئی ۱۹۳۴ء

کے شروع میں ۶۰ اور ۷۰ لاکھ کے درمیان مزدور بیکار تھے۔ ۱۹۳۶ء میں انکی تعداد صرف پانچ لاکھ سے کچھ زیادہ تھی۔ اس کے بعد سے جرمنی میں مزدوروں کی کمی محسوس کی جانے لگی اور اس کمی کو دور کرنے کے لئے دوسرے ملکوں مثلاً پولینڈ اور اٹلی وغیرہ سے مزدوروں کی درآمد کی گئی۔ جب سے موجودہ جنگ شروع ہوئی ہے جنگ کے قیدیوں سے بھی مختلف کام لئے جا رہے ہیں تاکہ جرمن صنعتوں اور زراعت کے مختلف شعبوں میں مزدوروں کی کمی نہ پڑے اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس وقت قیدیوں کے علاوہ دوسرے ملکوں کے تقریباً ۲۰ لاکھ مزدور جرمنی میں کام کر رہے ہیں۔ جرمنی میں اب جو کچھ تھوڑے بہت مزدور بیکار رہ گئے ہیں وہ یا تو کاروبار بدلنے کی وجہ سے یا روزگار پانے کے مستحق نہیں سمجھے جاتے وہی شخص اس کارنامہ کی اہمیت کی قدر کر سکے گا جو بے روزگاری کی مصیبتوں اور دقتوں کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ لیکن اس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے اگر ہم یہ معلوم کریں کہ کن طریقوں سے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ایسا کرنے میں مزدوروں کو کس قسم کی قربانیاں ادا کرنی پڑ رہی ہیں۔

اب ہم ان طریقوں کی طرف متوجہ ہوں گے جن کو نازی جماعت نے بیروزگاری کو دور کرنے کے لئے اختیار کیا۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ہٹلر نے یکم مئی ۱۹۳۳ء کو چہار سالہ لائحہ عمل کا اعلان کیا اور بہت جلد اس پر عمل بھی شروع ہو گیا۔ اس لائحہ عمل کے تحت سب سے پہلے تو رفاہ عامہ کے کاموں پر دل کھول کر روپیہ صرف کیا گیا جس کی بہترین مثال وہ سڑکیں ہیں جو جرمنی میں نازیوں کے بعد تیار کی گئیں۔ ان سڑکوں کی تیاری پر ساڑھے تین ارب مارک خرچ کئے گئے۔ عمدہ سڑکیں بنانے سے دو مقاصد حاصل کئے جا سکتے تھے ایک

لوگوں میں موٹر رکھنے کا شوق بڑھا جس کی وجہ سے موٹروں کی صنعت کو ترقی ہوئی دوسری طرف سڑکوں کی تیاری میں بہت سے مزدور لگ گئے اور بیروزگاری میں کمی ہوئی رفاہ عامہ کے دوسرے کاموں پر بھی بہت زیادہ روپیہ خرچ کیا گیا۔ بعض خاص خاص حالات میں انکم ٹیکس کی شرح کم کر دی گئی تاکہ آجروں کو نئی نئی مشین وغیرہ خریدنے اور اپنے کاروبار کو ترقی دینے کی ترغیب دلائی جائے شادی کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے ایک ایک ہزار مارک کے قرضے دیئے گئے جنکے ساتھ شرط یہ تھی کہ بیوی کسی قسم کی ملازمت یا مزدوری نہیں کر سکتی تھی۔ بہت سی عورتیں اس طرح سے روزگار حاصل کرنے کی مستحق نہیں سمجھی گئیں اور ان کی جگہ مرد مزدوروں نے لے لی۔ ان قرضوں پر کسی قسم کا سود نہیں لیا جاتا تھا اور ہر مہینہ ایک فیصد کے حساب سے قرضہ کی ادائیگی کرنی پڑتی تھی۔ قرضے دینے کا ایک اور فائدہ بھی ہوا۔ جن لوگوں نے قرضے حاصل کئے تھے انھوں نے اس رقم کو اپنی مختلف قسم کی ضروریات کی چیزوں مثلاً فرنیچر وغیرہ پر خرچ کیا جس کی وجہ سے مختلف قسم کی صنعتوں کو فروغ اور روزگار میں اضافہ ہوا۔ بیروزگاری میں کمی کرنے کے لئے ایک اور طریقہ بھی اختیار کیا گیا۔ قانوناً ہر نوجوان لڑکے اور لڑکی کے لئے مزدوری کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ ہر سال جو نوجوان پیدائش دولت کے مختلف شعبہ جات میں مزدوری کرنے کے لئے بلائے جاتے ہیں انھیں زر کی شکل میں اجرت ادا نہیں کی جاتی بلکہ صرف ان کی معمولی قسم کی ضروریات زندگی مہیا کر دی جاتی ہیں۔ ایسا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کم خرچ کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مزدوری دی جا سکے۔ بہت سے یہودی، اشتمالی اور اشتراکی مزدوروں کو بیروزگار مزدوروں کی تعداد سے خارج کر دیا گیا ہے اور یہ لوگ روزگار حاصل

کرنے کے مستحق نہیں سمجھے جاتے

مندرجہ بالا طریقوں سے ایک طرف تو روزگار میں اضافہ کرنے یا پھر مزدوروں کی مانگ بڑھانے اور دوسری طرف مزدوروں کی رسد میں کمی کرنے کی کوشش کی گئی اور ایک حد تک بیکار مزدوروں کی تعداد میں کمی ضرور ہوئی لیکن اصل میں بیروزگاری کا مسئلہ اس وقت حل ہوا جبکہ نازی جماعت نے جرمنی میں اپنی حیثیت مستحکم کر لی اور ۱۹۳۵ء میں انجمن اقوام کو چھوڑ کر جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ ہٹلر نے لوگوں کو روزگار دیا اور انھوں نے اُس کے لئے جہاز، ہوائی جہاز، دبابے، توپیں اور آبدوز تیار کئے، جنگی تیاریوں نے بے روزگاری کے خطرہ کو دور کیا۔ اس کے علاوہ جنگی تیاریوں کی وجہ سے ایک اہم سیاسی مقصد بھی حاصل ہوا۔ شروع شروع میں جرمن فوج اور نازی پارٹی میں کوئی خاص اتحاد نہیں تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ایک حد تک اختلافات پائے جاتے تھے۔ اب جبکہ نئی پالیسی اختیار کی گئی تو اُس کا مطلب یہ ہوا کہ جرمن سیاست میں فوج کی اہمیت کو مان لیا گیا۔ بہت جلد دونوں جماعتوں کے اختلافات دور ہو گئے اور فوجی قائدین اور نازی جماعت میں اتحاد قائم ہو گیا۔

آخر میں مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ بے روزگاری کے مسئلہ کو حل کرنے میں نازی جماعت کامیاب ضرور ہوئی ہے۔ مزدوروں کو روزگار مل گیا ہے لیکن اُس کے ساتھ ساتھ اُنھیں بہت سی قربانیاں کرنی پڑ رہی ہیں۔ اُن کی سبھاؤں اور سیاسی تحریک کو ختم کر دیا گیا ہے اور مزدور طبقہ نازی تحریک کا ایک اہم جزو بن کر رہ گیا ہے پچھلی صدی اور موجودہ صدی میں اُنھوں نے اپنی جدوجہد کے ذریعہ جو کچھ مراعات اور سیاسی اور معاشی آزادی حاصل کی تھی اس کو وہ جرمنی کے نئے نظام میں بالکل کھو چکے ہیں۔ اُن کا معیار زندگی پہلے کے مقابلہ میں بہت پست ہو گیا ہے بیروزگاری کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے معاشی نظام پر سخت قسم کی قیود عائد کی گئی ہیں معاشی

زندگی کے ہر پہلو (قیمتوں، منافع، اُجرتیں، اوقاتِ کار، صرف دولت، زر اور مبادلاتِ خارجہ) پر قابو پالیا گیا ہے۔ قومی معیشت کو معیشت جنگ میں تبدیل کرکے بیکار مزدوروں کو کام پر لگایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جنگی تیاریاں صرف اُسی وقت تک قائم رہیں گی جب تک جنگ جاری ہے۔ جنگ کے خاتمہ پر نئے مسائل پیدا ہوں گے اور معاشی نظام میں جو کچھ بے ترتیبیاں نمودار ہو گئی ہیں اُنہیں دور کرنا پڑے گا۔ بہت سے مزدور جو اس وقت جنگی صنعتوں میں کام کر رہے ہیں یہ بیکار ہو جائیں گے۔ لاکھوں آدمی جو اس وقت جنگی خدمات انجام دے رہے ہیں جنگ کے خاتمہ پر معمولی کاروبار میں روزگار تلاش کریں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ بیکار مزدوروں کی ایک بڑی فوج تیار ہو جائے گی جسے کام پر لگانا کوئی آسان کام نہ ہوگا۔ بیروزگاری کے مسئلہ کو نازی معیشت میں صرف وقتی طور پر حل کیا گیا ہے اور کسی طرح سے بھی یہ نازی جماعت کا بہت بڑا کارنامہ نہیں سمجھا جا سکتا۔

مزدور تحریک اور نازی جماعت کسی جماعت میں مزدوروں کی حالت اور اس بات کو دیکھکر کہ انہیں کس قسم کی سیاسی آزادی حاصل ہے اس جماعت کی خوشحالی اور معاشی بہبودی کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نازی عہد میں جرمن مزدوروں کی حیثیت میں غیر معمولی تبدیلی ہوئی ہے۔ ۱۹۳۳ء سے پہلے جرمنی میں مزدوروں کی جماعت دوسرے صنعتی ممالک کے مقابلہ میں بہت زیادہ منظم اور ترقی پسند تھی۔ مزدوروں نے اپنی جدوجہد سے بہت سے حقوق حاصل کر لئے تھے۔ صنعتی انقلاب کے ساتھ ساتھ مزدور طبقہ کی تحریک کی ابتداء ۱۸۶۰ء سے ہوئی۔ رفتہ رفتہ یہ تحریک ترقی کرتی گئی اور مزدور رہنماؤں کا اقتدار بڑھتا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں اُن کے اراکین کی تعداد ۹ لاکھ تک پہونچ گئی تھی۔ بعد [illegible]

تعداد کم ہونا شروع ہوئی پھر بھی ۱۹۲۹ء میں اُن کے ارکین ۶۰ لاکھ تھے۔ مزدور طبقہ نے اپنی آواز حکومت تک پہونچانے اور اس پر قبضہ کرنے کے لئے اپنی سیاسی پارٹی بھی علٰحدہ قائم کی۔ یہ پارٹی ۱۹۱۲ء کے عام انتخاب میں کل ووٹوں کے ایک تہائی ووٹ حاصل کر چکی تھی۔ جنگ عظیم کے خاتمہ پر جب جرمنی میں جمہوریت قائم ہوئی تو مزدور طبقہ نے اپنے اقتدار میں اور زیادہ اضافہ کیا اور بہت سی مراعات حاصل کیں۔

نازی جماعت کے اقتدار میں آنے کے بعد سے مزدور تحریک کے بڑے دن شروع ہوئے۔ نازیوں کے سیاسی فلسفہ کے مطابق ان کی پارٹی کے علاوہ ملک میں کوئی دوسری پارٹی قائم نہیں رہنا چاہیئے تھی۔ انھوں نے اپنے اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے یکم مئی ۱۹۳۳ء کو مزدور سبھاؤں کو خلاف قانون قرار دیدیا۔ ان کی عمارتیں اور دوسری املاک ضبط کر لی گئیں۔ مزدور سبھاؤں کے سب قائدین گرفتار کر لئے گئے ان کی سیاسی تحریک کو بھی ختم کیا گیا۔ کوئی نئی مزدور سبھا یا سیاسی پارٹی بنانے کی بالکل منادی کر دی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مزدور تحریک کا پوری طرح سے خاتمہ ہو گیا۔ اور یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اس کے بعد جرمنی میں مزدور طبقہ کی کوئی تنظیم (جن معنوں میں دوسرے صنعتی ممالک میں سمجھی جاتی ہے) باقی نہیں رہی۔

صرف مزدور تحریک کو ختم کرنے ہی پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ وقتاً فوقتاً بہت سے ایسے قوانین پاس کئے گئے جن کی رو سے مزدور جماعت کی ہر قسم کی آزادی سلب کر لی گئی۔ ۱۹۳۵ء میں ایک قانون پاس ہوا جس کے تحت ہر نوجوان لڑکے اور لڑکی سے چھ مہینے کے لئے جبری خدمت لی جاتی ہے۔ اُن کی اُجرتیں زر کی شکل میں ادا نہیں کی جاتیں بلکہ ضروریات زندگی مہیا کر دی جاتی ہیں۔ ۱۸ اور ۲۵ سال کی عمر کے درمیان اس خدمت کے لئے بلایا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں

ہر سال تقریباً ۲ لاکھ لڑکوں اور ایک لاکھ لڑکیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک دوسرے قانون نے حکومت کو یہ حق دیا کہ وہ ایک ایسے علاقہ میں جہاں بیروزگاری زیادہ ہو دوسرے علاقوں کے مزدوروں کو کام کرنے سے روک سکتی تھی۔ اس طرح کے ایک اور قانون نے زرعی مزدوروں کو سرکاری عہدہ داروں کی اجازت کے بغیر اپنا پیشہ یا علاقہ چھوڑنے کی منادی کر دی جو زرعی مزدور دوسری صنعتوں میں کام کر رہے تھے اور انھیں اپنا پرانا پیشہ چھوڑے ہوئے تین سال سے زیادہ نہیں ہوئے۔ اس قانون کے تحت مجبور کئے جا سکتے تھے کہ وہ زراعت کو پھر اپنا پیشہ بنائیں۔ یہ حالات قرون وسطیٰ کے حالات سے بھی کہیں بدتر ہیں۔ قرون وسطیٰ میں کسانوں کو جن کے پاس تھوڑی بہت اپنی زمین ہوتی تھی زمین کو چھوڑ کر کسی دوسرے علاقہ میں منتقل ہونے کی منادی تھی۔ بیسویں صدی میں جرمنی میں زرعی مزدوروں کو نہ صرف زمین سے باندھ دیا گیا ہے بلکہ زرعی پیشہ جسے وہ چھوڑ چکے تھے پھر سے اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا۔ جون ۱۹۳۸ء میں ایک اور قانون پاس کیا گیا جس کی رو سے ہر شخص کو حکومت مجبور کر سکتی ہے کہ وہ اپنا پیشہ اور گھر بار چھوڑ کر کسی دوسرے پیشہ یا علاقہ میں کوئی اہم قومی خدمت انجام دے۔ اسی قسم کے بعض دوسرے قوانین نے مزدور طبقہ کو بہت سی بندشوں میں جکڑ دیا ہے اور وہ روزگار پانے کا پورا پورا فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔

مزدور سبھاؤں کو ختم کرنے کے بعد نازیوں نے مزدور تحریک کو نئے سرے سے منظم کیا۔ نئی تحریک کا نام "جرمن مزدوروں کا محاذ" (German Labourfronts) رکھا گیا۔ جرمنی میں صرف یہی ایک ایسی تنظیم ہے جس میں مزدوروں کو شرکت کی اجازت دی جاتی ہے۔ لیکن حقیقی معنوں میں اسے مزدور طبقہ کی تنظیم نہیں کہا جا سکتا۔ مزدوروں کا محاذ ایک بہت بڑا ادارہ ہے جس میں مزدور اور آجر دونوں

شریک ہیں۔ اِس ادارے پر پوری طرح سے نازی جماعت حاوی ہے ہر مزدور کے لئے اس تحریک کا رکن بنا قانوناً لازمی قرار نہیں دیا گیا ہے لیکن تقریباً سب جرمن مزدور اس میں شامل ہیں۔ اِس کا سرمایہ جبری طور پر اراکین سے حاصل کیا جاتا ہے اس طرح سے مزدوروں کے محاذ کو مختلف قسم کے محاصل وصول کرنے کا ایک اہم ذریعہ بنایا گیا ہے۔ ایک نئی تحریک کے شروع کرنے کا مقصد یہ تھا کہ مزدور جماعت اپنی علیحدہ تنظیم نہ کر سکے اور نازی جماعت کا ایک جزو بن جائے۔

مزدوروں کا محاذ تین اہم کام انجام دیتا ہے۔ پیشہ وری تعلیم کی نگرانی کرنا۔ مزدوروں کی بہبودی کے لئے مختلف کام انجام دینا اور ان کے لئے تفریح کے مختلف ذرائع فراہم کرنا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نئی تحریک نے مزدوروں کے لئے بہت سے کام انجام دئے ہیں۔ لیکن جو مراعات و حقوق وہ اپنی نئی تحریک کے ذریعہ سے اَب حاصل کر رہے ہیں نازیوں سے پہلے کے معاشی نظام میں اپنی سبھاؤں کے ذریعہ سے حاصل کر چکے تھے۔

مزدوروں کا محاذ وہ تمام کام جو آزاد سرمایہ داری کے نظام میں اپنے اراکین کے لئے مزدور سبھائیں کرتی ہیں انجام نہیں دے سکتا۔ اجرتوں اور اوقاتِ کار پر اسے کسی قسم کا اقتدار حاصل نہیں ہے۔ اِن معاملات میں وہ کسی قسم کی مداخلت نہیں کر سکتا۔ اِن مسائل کو طے کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے عہدہ دار (Labur Trusters) کہا جاتا ہے مقرر کئے جاتے ہیں۔ مزدوروں کو ہڑتال کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اِس طرح سے اُنھوں نے اپنے مطالبات منوانے کا سب سے بڑا حربہ بھی کھو دیا ہے۔

حکومت کا منافع، اجرتوں اور قیمتوں پر قابو اشتمالی نقادوں کا خیال ہے کہ نازیت نے بڑے بڑے کاروبار کرنے والوں کے

مفاد کی حفاظت کی اور مزدوروں کی قوت کو توڑا۔ یہ کہنا ایک حد تک ضرور صحیح ہے کہ ہٹلر کی کامیابی میں سرمایہ داروں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ان کی مالی امداد کی وجہ سے ہٹلر جرمنی کی حکومت حاصل کر سکا تھا اور انہیں کے معاشی مفاد کی خاطر مزدوروں کی سیاسی جماعتوں اور سبھاؤں کا خاتمہ کیا گیا۔ لیکن اِس تشریح میں اِس بات کا خیال نہیں رکھا جاتا کہ بڑے بڑے کاروبار کو بھی نازیت اپنے مفاد کی خاطر اسی طرح سے قابو میں رکھتی ہے جس طرح سے مزدور جماعت کو۔ جرمن صنعتوں کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں ہے اُن کے منافعوں پر اِس قسم کی نگرانی قائم ہے جس طرح کی مزدوروں کی اُجرتوں پر۔ سرمایہ داروں کو بھاری قسم کے محاصل ادا کرنے پڑتے ہیں۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں کو اب مزدور جماعت کی طرف سے تو کسی قسم کا خطرہ باقی نہیں رہا ہے لیکن وہ نازی پارٹی کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ان سے نازی یہ کہتے ہیں کہ تھوڑے دنوں تک انہیں تکالیف اُٹھانی پڑیں گی۔ جب نازی جماعت تمام یورپ پر اپنا تسلط قائم کرے گی تو پھر جرمن مصنوعات کے لئے بازار بہت زیادہ وسیع ہو جائے گا اور وہ خوب منافع کما سکیں گے۔

سرمایہ داروں کے منافع کے علاوہ مزدوروں کی اُجرتوں اور قیمتوں پر بھی نازیوں نے سخت قسم کی نگرانی قائم کر رکھی ہے۔ اُنھوں نے اِقتدار پاتے ہی توسیع اعتبار کی پالیسی اختیار کی تاکہ بیروزگاری دور کی جا سکے لیکن انہیں ہر وقت اِس بات کا خطرہ لگا رہتا تھا کہ کہیں ۲۳-۱۹۲۲ء کے حالات یعنی ملک میں افراط زر کے اثرات پیدا نہ ہو جائیں اِس لئے اُنھوں نے شروع ہی سے قیمتوں کو استحکام دینے کی پالیسی پر عمل کیا۔ قیمتوں کو اِستحکام کے ساتھ ساتھ اجرتوں کا استحکام بھی لازمی تھا وقتاً فوقتاً حکومت کی طرف سے قوانین نافذ ہوئے جن کا مقصد قیمتوں کو بڑھنے سے روکنا تھا جیسا کہ آجکل مختلف ممالک میں ہو رہا ہے جب سے جنگ چھڑی ہے

رسد بندی (Rationing) کا طریقہ عام طور پر اختیار کیا گیا ہے اس طریقہ کو اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنی ضروریات کی بہت تھوڑی مقدار میں حاصل کر سکتے ہیں اور اشیاء اور خدمات کی قیمتیں بہت زیادہ نہیں بڑھنے پاتیں اور معاشرہ افراط زر کے بڑے اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔

مبادلات خارجہ اور تجارت خارجہ پر حکومت کی نگرانی۔ نازی جماعت سے پہلے جرمنی کی مالیاتی حالت بہت زیادہ خراب تھی جن بیرونی اداروں اور دوسرے ملکوں کے افراد نے اپنا سرمایہ جرمن صنعتوں اور بلدیات کی تمسکات وغیرہ میں لگا رکھا تھا انھوں نے ۱۹۳۱ء کے مالیاتی ہیجان شروع ہونے سے پہلے اپنے سرمایہ کو واپس لینا شروع کر دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جرمنی کے مرکزی بنک (Reoihsbank) کے سونے کا ذخیرہ صرف ایک ارب مارک سے کچھ زیادہ رہ گیا تھا۔ یہ صورت قوم کی ساکھ کے لئے بہت زیادہ خطرناک تھی۔ سونے کے ذخیرہ کی حفاظت کی غرض سے حکومت بندش تبادلہ (Ex change Control) قائم کرنے پر مجبور ہوئی۔ بندش تبادلہ کی صورت میں حکومت مبادلات خارجہ کے بازار پر اپنی نگرانی رکھتی ہے اور کسی شخص کو اس بات کی اجازت نہیں ہوتی کہ جتنی مقدار میں چاہے بیرونی زر حاصل کر سکے۔ باہر والے اپنا سرمایہ بھی واپس نہیں لے سکتے اور نہ ہی اس ملک کے افراد اور ادارے اپنا سرمایہ دوسرے ممالک کو منتقل کر سکتے ہیں۔ مرکزی بنک کے ذریعہ سے مبادلات خارجہ کے معاملات طے پاتے ہیں۔

نازیوں سے پہلے جرمنی میں بندش تبادلہ بحرانی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا ایسا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے ممالک والے اپنا سرمایہ جرمنی سے واپس نہ لے سکیں۔ نازی جماعت نے اس ذریعہ کو سیاسی مقاصد ...

ب اہم آلہ کار بنالیا ہے۔ اب جرمن حکومت (Recihsbank) رائش بنک کے
ریعہ سے پوری تجارت خارجہ کو اپنے قابو میں رکھتی ہے۔ کوئی جرمن تاجر بغیر خاص
م کا اجازت نامہ حاصل کئے۔ بیرونی ممالک کے مال کی درآمد نہیں کر سکتا۔ حکومت
بسی خام اشیاء جو جنگی تیاریوں کے لئے ضروری ہوں اور دوسری ضروری اشیاء کی
۔آمد کو ترجیح دیتی ہے اور انھیں کے لئے اجازت نامے پہلے جاری کئے جاتے ہیں
یشات کی چیزوں کے لئے اجازت نامے بالکل نہیں دیئے جاتے۔ اجازت نامے
ری کرتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ کن ملکوں سے تجارتی تعلقات
م کرنا جنگی اور سیاسی نقطۂ نظر سے زیادہ بہتر ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ بندش
بادلہ کے ذریعہ کو اختیار کرکے حکومت تجارت خارجہ کے ہر پہلو پر قابض ہے۔

زی جماعت اور نو آبادیات کا مسئلہ موجودہ جنگ سے پہلے نازی جماعت کی
طرف سے برابر اس بات کا دعویٰ کیا جاتا
ا کہ جرمنی کی آبادی بہت زیادہ ہے اور اس کے لئے ملک کا رقبہ ناکافی ہے۔ دوسری
موں کے پاس نو آبادیات ہیں جہاں وہ اپنی زائد آبادی کو منتقل کر سکتے ہیں۔
پھر اپنی آبادی کے لئے اشیاء خوراک اور صنعتوں کے لئے خام اشیاء حاصل
سکتی ہیں۔ انگلستان اور فرانس کے علاوہ ہالینڈ اور بلجیم جیسی چھوٹی قوموں
ے قبضہ میں دنیا کے بڑے بڑے رقبہ ہیں جہاں سے وہ اپنی ضروریات کی
تلف چیزیں حاصل کرتی ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں جاپان نے منچوریا پر قبضہ کیا اور
۱۹۳۶ء میں اٹلی نے حبشہ کو فتح کیا۔ اس طرح سے ان دونوں قوموں کو بھی زرخیز
قبے مل گئے۔ صرف جرمنی ایک ایسی بڑی قوم باقی رہ گئی تھی جو نو آبادیات سے
روم تھی۔ اس لئے اس کی سابق نو آبادیات واپس ملنی چاہئیں۔
لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو جرمنی کا یہ کہنا کہ اس کی آبادی بہت زیادہ ہے

صحیح نہیں کیونکہ خود حکومت کی پالیسی یہ رہی ہے کہ آبادی کو جس طرح سے بھی ہوسکے بڑھایا جائے۔ اُوپر ذکر کیا جاچکا ہے کہ شادی کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے قرضے دیئے جاتے ہیں۔ ہر بچہ پیدا ہونے پر قرضے کا ایک چوتھائی حصہ معاف کردیا جاتا ہے۔ ایسے خاندانوں کو جن میں بچوں کی تعداد زیادہ ہو خاص قسم کی مراعات حاصل ہوتی ہیں۔ مختلف طریقوں سے غیر شادی شدہ اشخاص کو ترغیب دلائی جاتی ہے کہ وہ جلد سے جلد شادی کرلیں۔ جو لوگ شادی نہ کریں انھیں بھاری محصول ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے۔ ۳۷ء کے بعد سے زراعت اور صنعت کے ہر شعبہ میں مزدوروں کی کمی محسوس کی جارہی ہے اس کمی کو دور کرنے کے لئے دوسرے ملکوں کے مزدوروں سے کام لیا جارہا ہے اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ زائد آبادی کو منتقل کرنے کے لئے نوآبادیات کا مطالبہ کرنا کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ سابق جرمنی نوآبادیات کی آب وہوا کسی طرح سے بھی یورپی اقوام کے لئے موزوں نہیں ہے۔ جنگ عظیم سے پہلے بھی بہت کم جرمن ان علاقوں میں آکر بسے تھے۔

خام اشیاء اور اشیاء خوراک حاصل کرنے کی دلیل پھر بھی باقی رہ جاتی ہے۔ اشیاء خوراک کے معاملے میں جرمنی دوسرے ممالک کے مقابلہ میں بہت زیادہ خود مکتفی ہے۔ جرمن قوم اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے اشیاء خوراک کا ۸۳ فیصد اپنے ملک کی پیداوار سے حاصل کرتی ہے۔ یورپ میں بہت سے ایسے ممالک ہیں جو اس سے بہت کم اپنے یہاں پیدا کرتے ہیں اور ان ممالک کے پاس نوآبادیات بالکل نہیں ہیں۔ ناروے اپنی ضروریات کا صرف ۴۳ فیصد اپنے یہاں پیدا کرتا ہے۔ سوئٹزرلینڈ ۴۷ فیصد۔ ان ممالک کو دوسرے ملکوں سے اشیاء

خوراک حاصل کرنے میں کسی قسم کی دقت پیش نہیں آتی۔ خام اشیاء کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ جرمنی اپنی پرانی نوآبادیات سے کچھ بہت زیادہ مستفید نہیں ہو سکتا اگر جبری خدمت کے اصول پر کام کیا جائے تو خام اشیاء کی مقداروں میں تھوڑا بہت اضافہ ضرور کیا جا سکے گا لیکن یہ مقداریں جرمن ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بالکل ناکافی ہونگیں۔

نازیت کی معاشی پالیسی کے اہم اجزاء کی تشریح سے اہم نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ اس پالیسی کا مرکزی خیال یہ ہے کہ قومی معیشت کے ہر پہلو پر حکومت کی نگرانی قائم ہو ایسا اس لئے کیا گیا کہ نازی جرمنی اور یورپ میں اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے قومی معیشت کو آلہ کار بنا سکیں۔ انہیں اس بات کا پہلے سے یقین تھا کہ قوت حاصل کرنے کے لئے یورپ میں ایک نہ ایک روز بہت بڑی جنگ کرنی پڑے گی۔ اس لئے موجودہ جنگ کے لئے انھوں نے اقتدار پاتے ہی تیاریاں شروع کر دی تھیں اور ان تمام ذرائع پر جنھیں حکومتیں مجبوراً جنگ کے دوران میں اختیار کرتی ہیں پہلے سے عمل شروع کر دیا تھا۔ قیمتوں، منافع، اجرتوں اوقات کار، تجارت خارجہ اور مبادلات خارجہ پر نگرانی اسی غرض سے قائم کی گئی مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ نازیوں نے امن کی معیشت کو جنگ کی معیشت میں تبدیل کرنے کی کوشش ۱۹۳۳ء ہی سے شروع کر دی تھی۔

رفتارِ عالم

روس کی لڑائی روز بروز تیز اور غضب ناک ہوتی جا رہی ہے

—— راسٹو پر قبضہ ہو جانے سے جرمن فوجوں کے لئے قفقاز کا دروازہ کھل گیا۔ چنانچہ پچھلے دو ہفتوں کی خبروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جرمن فوجوں کا اقدام شمالی قفقاز میں شروع ہو گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ روسی بڑی بے جگری سے مقابلہ کر رہے ہیں اور داد شجاعت دے رہے ہیں۔ اِسٹالن گراڈ کے قریب ان کی فوجوں نے جرمنوں کو پے درپے پسپا کیا ہے۔ اب صورت حال یہ معلوم ہوتی ہے کہ شمالی قفقاز پر قبضہ ہو جانے سے روسیوں کے تیل کے چشمے چھن جائیں گے جن کے بغیر روسی جنگی صنعت کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ لیکن اِس کا امکان موجود ہے کہ انگریز اور امریکی ذرائع سے پٹرول کی اس کمی کو پورا کیا جا سکے۔ بہرحال قفقاز کی مہم اب شروع ہو چکی ہے۔ لینن گراڈ اور ماسکو کے محاذوں پر پچھلے دنوں خاموشی رہی۔ کبھی کبھی روسیوں کی طرف سے حملے کئے گئے تاکہ جرمنوں کی توجہ قفقاز کی طرف سے کچھ ہٹ جائے لیکن اس میں معلوم ہوتا ہے زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ جرمنوں کی توجہ ہٹانے کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ وسیع پیمانہ پر انگریز اور امریکہ دوسرا محاذ قایم کر دیں۔ اِس طرح جرمنوں کو دو طرف الجھنا پڑے گا اور ان کی قوت تقسیم ہو جائے گی۔

مصر کے مورچہ پر انگریزی فوجوں نے رومل کے بڑھتے ہوئے لشکروں کو

روک لیا ہے اور یقین ہے کہ اب وہ انھیں آگے نہیں بڑھنے دیں گی۔ محوری دول کا مصر پر یہ تیسرا حملہ ہے۔ پہلا حملہ اطالوی فوجوں نے کیا تھا جبکہ وہ سدی برانی تک بڑھ آئی تھیں۔ دوسرا حملہ جرمن قیادت میں اطالوی اور جرمن فوجوں نے مل کر کیا تھا اور محوری افواج سولم تک پہونچ گئی تھیں۔ لیکن دونوں مرتبہ انگریزی فوجوں نے محوری لشکروں کو مصر سے باہر نکال کر لیبیا کے اچھے خاصے علاقے پر قبضہ و تصرف حاصل کر لیا تھا۔ اب یہ محوری دول کا تیسرا حملہ ہے۔ جنرل آکن لک نے بڑی قابلیت اور ہمت سے العالمین پر جو اسکندریہ سے ۰۰ میل ہے رومل کو روک لیا ہے۔ امید بندھتی ہے کہ جنرل موصوف حسب سابق اس دفعہ پھر محوری فوجوں کو پسپا کر کے انھیں لیبیا میں ڈھکیل دیں گے۔ مصر کی لڑائی برطانوی اقتدار کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مصر میں اگر خدانخواستہ اتحادیوں کو شکست ہو گئی تو مصر کا سیاسی مستقبل بالکل تاریک ہو جائے گا۔ ہماری رائے میں برطانوی حکومت کو چاہیئے کہ وہ اس وقت اعلان کر دے کہ ۱۹۳۶ء کے معاہدہ کی رو سے مصر نے جو شرائط منظور کر لی تھیں انھیں ختم کر دیا جائے گا اس کا بہت اچھا اخلاقی اثر مترتب ہوگا اور مصری قوم کی عملی امداد حاصل ہو جائیگی جو اب تک اتحادیوں کو بدقسمتی سے حاصل نہیں ہے۔ نحاس پاشا نے اپنے اعلان میں صراحت کی ہے کہ مصر حسب سابق غیر جانبدار رہے گا۔ لیکن ایسے نازک موقع پر جبکہ ان کے ملک کی موت و زیست کا سوال درپیش ہے اور ان کی سرزمین پر جنگ ہو رہی ہے ضرورت اس کی ہے کہ اہل مصر اتحادیوں کے ساتھ عملی تعاون کا ثبوت دیں کہ مستقبل میں بھی ان کے ملک کے حقوق کی ضمانت ہوگی۔

مشرق بعید مشرق بعید میں جاپان نے برما کی فتح کے بعد اپنے جنگی وسائل کا رخ چین کی طرف پھیر دیا ہے۔ چین کی جنگ کا اب چھٹا سال

شروع ہوگیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اہلِ چین نے جس جرأت، استقلال اور حوصلہ مندی کا ثبوت دیا ہے وہ مشرق کی دوسری قوموں کے لئے ایک مثال ہے۔ دولت و صنعت میں، جن کے بغیر موجودہ زمانہ میں جنگ کرنا بہت دشوار ہے، چین کا جاپان سے کوئی مقابلہ نہیں۔ لیکن پھر بھی چینی سپاہ جس جانبازی سے جاپانی غاصبوں کا مقابلہ کر رہی ہے اس کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ حق اور انصاف میں باوجود بے چارگی کے بے پناہ قوت موجود ہے۔ اس وقت چین کے کمک و رسد کے بیشتر راستوں پر بھی جاپانی قابض ہو چکے ہیں۔ لیکن تبت اور روس کے راستے ابھی کھلے ہوئے ہیں جدھر سے اتحادی زیادہ سے زیادہ مدد بھیج سکتے ہیں۔ چین کی جنگ آزادی کی اہمیت ہندوستان کے لئے بھی کچھ کم نہیں۔ اگر چین کی طرف جاپان کو یکسوئی حاصل ہوگئی اور وہ اس وسیع ملک کے وسائل کو اطمینان سے اپنے تصرف میں لے آیا تو ہندوستان کے لئے یہ امر سخت تشویش کا موجب ہوگا۔

ہندوستان

کانگریس کی مجلس عاملہ کی قرارداد جس میں انگریزوں کو ہندوستان سے دستبردار ہونے کی دعوت دی گئی تھی بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں بھی منظور ہوگئی۔ چونکہ اس قرارداد کے ضمن میں کانگریس کے پیش نظر سارے ملک میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنا تھا اس لئے حکومت نے کانگریس کے صدر اور مجلس عاملہ کے سب ارکان کو گرفتار کرلیا۔

کانگریس کی مجلس عاملہ کی تحریک کے متعلق ہمارا یہ خیال تھا کہ پیشتر اس کے کہ ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں میں اتحاد و اتفاق قائم ہو سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنا سخت خلفشار کا موجب ہوگا۔ دوران جنگ تک کے لئے ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں میں مفاہمت ہو جانا کچھ زیادہ دشوار نہ تھا خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ مسٹر جناح اس کے لئے آمادہ تھے جیسا کہ انھوں نے مختلف

قعوں پر اظہار کیا ہے۔ لیکن اب گاندھی جی اور اُن کے رفقائے کار کی گرفتاری
سے بالکل نئی سیاسی صورت پیدا ہو گئی ہے جس کے نتائج کا اِس وقت جائزہ لینا
ل از وقت ہوگا۔ اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کے ذمہ دار قائدین کا یہ فرض
ہے کہ ملک میں امن وامان کے قیام کی پوری کوشش کرتے رہیں ورنہ اگر ملک میں
امنی اور خلفشار پیدا ہوا تو اس سے خود اہل ملک کو نقصان ہوگا۔ اور محوری دول
ں سے پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں گی۔ بہر نوع یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہندوستان
مسئلہ دنیا کے مسائل سے الگ تھلگ کوئی چیز نہیں۔ اس کی قسمت کا فیصلہ اس
لمگیر جنگ کے فیصلہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس میں مطلق شک وشبہ کی گنجائش
ہیں کہ اہل ہند کی ہمدردی اتحادیوں کے ساتھ اور محوری دول کے خلاف ہے
ن سے کوئی کمزور قوم عدل وانصاف کی توقع نہیں رکھ سکتی۔ جاپان سے جس کے
تھ اہل چین کے خون سے رنگے ہوئے ہیں اہل ہند کو کوئی اُمید نہیں رکھنی چاہئے

دوسرے رسائل

The Indian Journal of Economics بابتہ اپریل ۱۹۴۲ء

معاشی کانفرنس کے پچیسویں سالانہ اجلاس میں ڈاکٹر نیوگی پروفیسر معاشیات جامعہ کلکتہ نے خطبہ صدارت پڑھا۔ یہاں اس خطبہ کا خلاصہ پیش کرنے پر اکتفا کیا جائے گا۔

پروفیسر نیوگی نے ہندوستانی جامعات میں معاشیات کی تعلیم پر اپنے بعض خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ہندوستان میں باقاعدہ طور پر معاشیات کی تعلیم کی ابتداء بیسویں صدی کے شروع سے ہوئی۔ لیکن پچھلے چند سالوں سے اس نے ایک جدا اور اہم مضمون کی حیثیت اختیار کی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ معاشیات کی تعلیم نے جو کچھ ترقی کی ہے اس کا جائزہ لیا جائے اور اس میں جو کچھ خامیاں پائی جاتی ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ معاشیات کے نصاب کی یہ خصوصیت ہونی چاہیئے کہ اس کے ذریعہ سے طالب علموں میں تنقیدی نظر، واقعات کی چھان بین ان کو جمع کرنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے کی قابلیت پیدا کی جاسکے۔ ہمارے نظام تعلیم کا بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں بہت سی معلومات حاصل کرنے پر زور دیا جاتا ہے اس کے ذریعہ سے دماغی تربیت کی طرف بالکل توجہ نہیں کی جاتی۔ یہی حال معاشیات کے نصاب کا بھی ہے ہندوستانی مسائل کی بہت سی تفصیلات طالب علموں کو بتلائی جاتی ہیں لیکن نظری معاشیات

کے متعلق اُن کی معلومات بہت ہی معمولی ہوتی ہیں۔ کم سے کم بعد طیلسانی نصاب
بن نظری معاشیات اور معاشیات عملی میں ایک خاص توازن قائم ہونا چاہیئے۔
س معیار پر پہونچنے کے بعد طالب علموں کو نظری معاشیات کا عمیق مطالعہ کرنا چاہئے
بخیال کہ نظری معاشیات کا مطالعہ حقیقی زندگی میں کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں
ہوتا صحیح نہیں ہے۔ قابل صدر نے بعض مثالیں دے کر یہ ثابت کرنے کی
وشش کی ہے کہ معاشیات کے مضمون میں جو جدید نظریئے پیش کئے گئے ہیں
ن سے ہم اپنے ملک کے معاشی مسائل کے حل کرنے میں بہت کافی مدد لے سکتے
یں۔ اس لئے ضرورت اِس بات کی ہے کہ ان جدید نظریوں اور خیالات کو جو
مختلف ممالک میں پچھلے بیس سال کے عرصے میں پیش کئے گئے ہیں اپنے نصاب
بں شامل کریں تاکہ ان سے طالب علموں کی ذہنی تربیت میں مدد مل سکے۔

معاشیات کے نصاب میں دوسری خرابی یہ پائی جاتی ہے کہ اس میں
شماریات (Statistiecs) کی تعلیم کی طرف بالکل توجہ نہیں کی گئی ہے۔
معاشیات کے ہر طالب علم کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ شماریات کی مبادیات سے
واقف ہو اس کے بغیر وہ بہت سے معاشی مسائل کا صحیح طرح سے مطالعہ نہیں
ر سکتا۔ حکومت کی طرف سے مختلف مسائل کے متعلق بہت سے اعداد و شمار وقتاً
و قتاً شائع ہوتے رہتے ہیں اُن کو سمجھنے، کام میں لانے اور ان سے نتائج اَخذ
رنے کے لئے شماریات کا جاننا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ دَور کے
معاشیین کا یہ عام رجحان ہے کہ وہ مسائل کی تشریح میں ریاضی سے بہت زیادہ
کام لیتے ہیں۔ ان کی تصانیف سے بھی پورا پورا فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے جبکہ
س علم سے اچھی خاصی واقفیت ہو۔

بعد طیلسانی نصاب میں نظری معاشیات اور شماریات کو اہمیت دینے

اچھے نتائج اسی وقت نکلیں گے جبکہ علمی معاشین اور مختلف قسم کا کاروبار کرنے والوں میں خاص ربط قائم ہو تاکہ وہ ایک دوسرے کو اپنے علم اور تجربہ سے فائدہ پہونچا سکیں۔ اِن دونوں کا اتحادِ عمل ملک و قوم کے فائدہ کے لئے بہت ضروری ہے بعض مغربی ممالک خاص طور پر انگلستان میں اِس اتحادِ عمل کی اہمیت کو محسوس کر لیا گیا ہے اور اس کو قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی گئی ہے۔ اگر یہ دونوں گروہ ایک دوسرے سے جدا رہیں تو اُن کے اختلافات کی وجہ سے قومی مفاد کو بہت کچھ نقصان پہونچ سکتا ہے۔ انگلستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی تاریخ سے اِن اختلافات کی چند مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ہندوستان اِن ملکوں کے حالات سے فائدہ اُٹھاکر ان دونوں گروہوں میں تعلق قائم کر سکتا ہے۔ اب تک معاشی مسائل کے متعلق جو تحقیقاتی کام مختلف جامعات کی طرف سے ہوا ہے۔ وہ کافی نہیں ہے۔ ڈاکٹر نیوگی کی رائے ہے کہ مختلف کاروباری افراد اور اداروں کو چاہیئے کہ اپنی طرف سے تحقیقاتی ادارے قائم کریں۔ یورپی اور امریکی ممالک میں اِس قسم کے بہت سے ادارے قائم ہو چکے ہیں اور یہ مفید کام انجام دے رہے ہیں۔

(ا - ح)

The Indian journal of Political Science بابتہ جولائی۔ ستمبر ۱۹۴۲ء

اِس اشاعت میں تین مضمون خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پہلا مضمون "اخلاق سیاسیات، اور میکیاولی" لکھنو یونیورسٹی کے مسٹر مینن کا ہے۔ اس میں موصوف نے بتایا ہے کہ میکیاولی کا نقطۂ نظر اخلاق کے خلاف نہیں ہے بلکہ غیر اخلاقی ہے لیکن یہ فرق منطقی طور پر چاہے صحیح ہو عملی طور پر اس کے نتائج میں بہت کم فرق رہتا ہے۔ اگر انسانی عمل کا محرک اخلاق نہیں تو اس کا قوی امکان ہے کہ وہ عمل صرف غیر اخلاقی نہیں رہے گا بلکہ زندگی میں فساد اور خلل کا موجب بن جائے گا۔

ہم موصوف کے اِس خیال سے بھی متفق نہیں ہیں کہ بیشتر سیاسی اعمال کوئی اخلاقی نوعیت نہیں رکھتے۔ ہمارا تو خیال ہے کہ ہر انسانی عمل کو کسی نہ کسی معیاری کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے۔ ہمیں تعجب ہے کہ مضمون نگار صاحب نے یہ دعویٰ کیسے پیش کر دیا کہ صدر مملکت کی مدت عہدہ یا کابینہ کی ساخت ایسے مسائل ہیں جنھیں اخلاق سے کوئی واسطہ نہیں۔ (ص ۳) حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں مثالیں اِسبات کو واضح کرتی ہیں کہ ان کے تعین میں بھی اجتماعی مسائل کی بھلائی یا برائی کا تصور موجود رہتا ہے۔ دراصل سیاست کو اخلاق سے علیحدہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اخلاق اجتماعی مسائل کی جان ہے چاہے وہ مسائل سیاسی ہوں یا معاشرتی۔

دوسرا مضمون "عمومی حکومتوں کے رجحان" ڈاکٹر بول چند کا ہے۔ اِس میں بڑی خوبی سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ہر عہد اپنے سیاسی مسئلہ کو نئی شکل میں پیش کرتا ہے۔ چنانچہ بیسویں صدی کی عمومیت کو جن معاشرتی مسائل سے واسطہ پڑ رہا ہے اس کا شائبہ بھی ہمیں انیسویں صدی کی عمومیت میں نہیں دکھائی دیتا۔ سوشل لیجس لیشن کی وجہ سے پارلیمانی حکومت میں بعض نہایت اہم تبدیلیاں پیدا ہو گئی ہیں جس کی مثالیں اِنگلستان اور امریکہ میں نظر آتی ہیں۔ پھر پچھلی جنگ عظیم کے بعد سے مملکت نے منصوبہ بندی کی جو معاشی ذمہ داریاں اپنے سپرد کر لیں اس سے بھی حکومت کے کام میں بنیادی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ اور اس جنگ میں جو ہمہ گیر جنگ ہے مملکتوں کو بہت کچھ کرنا پڑ رہا ہے جس کے متعلق چند سال قبل کسی کو گمان بھی نہ تھا۔ پھر اِس کے علاوہ عمومی حکومت مفاہمت اور مصالحت کے اصول پر مبنی تھی جو مختلف سیاسی جماعتوں میں معاشی نوعیت کے بنیادی اختلاف نہ ہونے کے باعث آسانی سے ممکن تھا۔ لیکن اب مثلاً اس مسئلہ پر بنیادی اختلاف پیدا ہو گیا ہے کہ ٹکس کا کیا مقصد ہے؟ آیا ٹکس کا مقصد مملکت کے لئے آمدنی ہے

یا تقسیم دولت میں مساوات پیدا کرنا ہے۔ ان بنیادی اختلافات کے باعث جو روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں پارلیمانی سسٹم خطرہ میں پڑ گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تک عمومی حکومتوں کے عاملانہ اقتدار میں بمقابلہ وضع قوانین کے اقتدار کے اضافہ نہ ہو جائے اسوقت تک ملکی مشین کا چلنا دشوار ہے۔

تیسرا مضمون ڈاکٹر ای، اشیر واتھم کا "ملی جلی کابینہ" ہے۔ اس مضمون میں اس اصول کی حمایت کی گئی ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں انگریزی پارلیمانی نظام کے مطابق حکومت چلانا دشوار ہے۔ اس دشواری کا حل یہ ہے کہ صوبوں میں اور مرکز میں ملی جلی (کمپوزٹ) کابینہ قائم کی جائے جو سوئٹزرلینڈ کے دستور کے موافق ایک معینہ مدت کے لئے ہو تاکہ آئے دن اس میں تبدیلی کی نوبت نہ آنے پائے۔ اگر اس کو قبل از وقت ہٹانا ضروری ہی ہو تو ایوان زیرین کی ⅔ آراء اس کے لئے درکار ہوں۔ یہ کابینہ پوری مقننہ کی نمائندہ ہونی چاہیئے نہ کہ مختلف پارٹیوں کی۔ اس کی نوعیت ایک انتظامی کمیٹی سے زیادہ نہ ہو جسے مدت معینہ کے لئے اختیارات تفویض کئے گئے ہوں ہمارے خیال میں بھی ہندوستان کا سیاسی مسئلہ کمپوزٹ کابینہ کے بغیر حل نہیں ہو سکے گا۔ بہرحال اس کا تجربہ ضرور کرنا چاہیئے تاکہ اس کے نتائج کا جائزہ لینا ممکن ہو۔

نہایت اہم ہے اور ہماری خواہش ہے کہ مضمون نگار صاحب اس پر مستقل مقالہ تحریر فرمائیں اور اپنی تحقیقات سے دوسروں کو مستفید کریں۔ اس ضمن میں بعض مغربی مصنفوں کا خیال ہے کہ اسلامی فقہ پر قانون روما کا اثر پڑ رہا ہے۔ لیکن ان کی رائے ہمارے لئے قابل قبول نہیں اس واسطے کہ اُن کے نزدیک اہل مشرق کوئی بڑا کام بغیر کسی کی مدد کے انجام ہی نہیں دے سکتے۔ دوسری طرف ہمارے قدامت پسند مولوی صاحبان ہیں جو کسی بیرونی اثر کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ مقالہ نگار صاحب کی رائے ہے کہ فقہ اسلامی کی توسیع و ارتقا میں متعدد بیرونی ماخذوں سے مدد لی گئی ہے۔ لیکن قرآن و حدیث نے جن چیزوں کو حرام کر دیا اُسے کسی بیرونی اثر نے جائز نہیں بنایا اور جو چیزیں واجب قرار دی گئی تھیں بیرونی اثرات کبھی اِن کو مسلمانوں کے نزدیک ناجائز نہیں قرار دے سکے۔ صرف جن چیزوں سے قرآن و حدیث ساکت تھے ان کے متعلق معقول رواجات جو قرآن و حدیث کے الفاظ اور روح کے خلاف نہ تھے قبول کئے گئے یا جاری رہنے دیئے گئے" (ص ۴۴) ہمیں اُمید ہے کہ اس مسئلہ پر زیادہ تفصیل سے علٰحدہ مقالہ میں بحث کی جائیگی جو نہایت ضروری علمی خدمت ہوگی۔

جواہر العلوم (کتابستان بمبئی۔ قیمت عا)

یہ علامہ طنطاوی جوہری مصری کی کتاب کا ترجمہ ہے جو مولوی عبدالرحیم صاحب پروفیسر عربی، اسلامیہ کالج پشاور نے کیا ہے۔ اس کتاب میں مکالمہ کے انداز میں بعض آیات قرآنی کی تفسیر کی گئی ہے۔ علامۂ طنطاوی مصر کے جید علماء میں سے ہوئے ہیں جنھوں نے جدید سائنس کے مسائل کا حل بھی قرآن میں تلاش کیا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ قرآن علوم کا خزانہ ہے لیکن بعض دفعہ سائنٹفک تفسیر میں بڑی کھینچ تان معلوم ہوتی ہے۔ لیکن باین ہمہ علامۂ طنطاوی کی تصانیف کا معیار نہایت بلند ہے۔
اسلامی مدارس کے نصاب میں اگر ان تصانیف کو رکھا جائے تو مناسب ہے [illegible]

جمہ سلیس اور عام فہم ہے۔

تان خدا (مولفہ عبید الرحمٰن عاقل رحمانی۔ کتابستان۔ پوسٹ بکس ۳۱۶۴۔ بمبئی نمبر ۴۔ صفحات ۱۷۵)

اس رسالہ میں ذات واجب تعالیٰ کی ہستی کو عقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔ ں ضمن میں مغربی فلاسفہ کے اقوال اور مادہ پرستوں کے فلسفۂ حیات پر سخت تنقید ں گئی ہے اور ان کے اعتراضوں کا جواب دیا گیا ہے۔ مولف کا مقصد یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتوں میں جو الحاد اور بے دینی کے خیالات پیدا ہو رہے ہیں انھیں ر کیا جائے اور خدا کے وجود کو عقل سے منوایا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ مولف صاحب کو اس کا احساس ہے کہ یقین و ایمان عقلی چیز نہیں بلکہ وجدانی ہے۔ یہ رسالہ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ضرور پڑھنا چاہیئے۔

محمد رسول اللہ (مترجمہ مولوی عبید الرحمٰن صاحب عاقل رحمانی۔ کتابستان پوسٹ بکس نمبر ۳۱۶۴۔ بمبئی نمبر ۳۔ صفحات ۹۳ قیمت ۸/)

یہ کارلائل کی کتاب ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ کارلائل نے اس میں عیسائی پادریوں کے اعتراضوں کے جواب دینے کے علاوہ یہ بتایا ہے کہ حضرت کی ذات ستودہ صفات انسانیت کے لئے رحمت تھی۔ وہ آپ کا شمار دنیا کے اُن بزرگ ہستیوں میں کرتا ہے جنھوں نے اقوام کی سیرت میں انقلاب پیدا کر دیئے۔ ترجمہ اچھا ہے۔



جغرافیہ اور اٹلس تاریخی و جغرافیہ

(مرتبہ :- مولوی سید شرف الدین صاحب قادری ایم اے بی ٹی)

جیبی اٹلس تاریخ و جغرافیہ۔ یہ اردو زبان میں ایک پہلا اٹلس ہے۔ قریب قریب نصابی حیثیت سے مکمل ہونے کے علاوہ عام شائقین کی دلچسپی کا باعث ہے طلباء کے لئے تو نہایت ہی مفید ہے جس میں عکسی بلاکوں کے (۲۴) عدد نقشے رنگین اور بشیار سادہ نقشہ جات و نقشہ کے علاوہ تاریخ اور جغرافیہ کے متعلق پوری پوری شرح موجود ہے ضخامت ۸۵ صفحہ۔ قیمت ۶ر کلدار یا ۸ر حالی

مصور جیبی اٹلس دنیا۔ یہ اٹلس شروع سے آخر تک عکسی بلاکوں کے ذریعہ قیمتی آرٹ پیپر پر نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ ابھی چند ہی روز ہوئے طبع و شائع ہوئی ہے۔ سب نقشہ جات و تصاویر رنگین بلاکوں پر چھپے ہیں جس کا مطالعہ طالب علموں کے لئے ہر حیثیت سے مفید اور کارآمد ہے۔ قیمت ۷ر کلدار یا ۸ر حالی

مرقع عالم۔ اس کو مولف نے برسوں کی محنت اور سالہا سال کے وسیع تجربہ کے بعد اہل ملک کے سامنے پیش کیا ہے امید کی جاتی ہے کہ علم دوست حضرات شوق و رشوق اس کے مطالعہ سے دلچسپی لے کر مولف صاحب کی رہنمائی فرمائیں گے۔ یہ سہ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ہاف ٹون بلاک کی رنگین و سادہ (۴۶) تصویریں اور دوسرے حصے میں لائن بلاک کے ۶۴ رنگین نقشے ہیں۔ تیسرے حصہ میں ہر دو کا خلاصہ بہ شکل مضمون دیا گیا ہے۔ آج تک تاریخ اور جغرافیہ عام معلومات کے لئے کوئی کتاب اس نوعیت کی شائع نہیں ہوئی۔ قیمت مجلد عا؎ کلدار یا عا؎ ۱۴ر حالی

جدید تاریخ ہند۔ ہندوستان کی ایک صحیح، مستند اور جامع تاریخ ہے جو پانچ جلدوں میں طبع و شائع ہو رہی ہے **پانچ جلدوں میں** اور ہر جلد اپنے مخصوص مضامین کے اعتبار سے ایک مکمل حیثیت رکھتی ہے۔ جلد دوم جلد سوم جو علی الترتیب سلاطین افغانیہ اور شاہان مغلیہ کے عہد ہائے حکومت ظاہر کرتی ہے (یعنی ہندوستان میں مسلمانوں کے دور فرمانروائی کی تاریخ ہے) طبع ہوئے ہیں جس میں تصاویر اور نقشے موزونیت کے لحاظ سے شریک کئے گئے ہیں۔ اور عثمانیہ میٹرک سے لے کر بی۔ اے تک یہ کتابیں بڑی خوبی سے کام دے سکتی ہیں۔ چونکہ یہ محدود تعداد میں طبع ہوئی ہیں۔ اس لئے ہم پبلک سے عموماً جامعہ عثمانیہ کے انڈر گریجویٹوں سے خصوصاً درخواست کرتے ہیں کہ یہ دونوں جلدیں اپنی اولین فرصت میں خرید کر فائدہ اٹھائیں۔ ہمارا یہ ایقان ہے کہ شائقین، جدید تاریخ ہند کو خرید کر کبھی مایوس نہ ہوں گے۔ قیمت عہ کلدار یا عہ ۱۲ر حالی

ناشر

سید عبد القادر اینڈ سنس تاجران کتب چادر گھاٹ حیدرآباد دکن

کتہ

حیدرآباد میں یوں تو کئی کتب خانے ہیں لیکن کمیاب، نادر، اور جدید اردو، ادبی تاریخی، مذہبی و اخلاقی کتب کمل طور سے ایک جگہ کہیں بھی دستیاب نہیں ہوسکتی تھیں۔ یہ کمی حیدرآباد کے قدیم پچاس سالہ کتب خانہ "سید عبدالقادر اینڈ سنس" چار مینار نے پوری کردی ہے۔ مثال کے طور پر مولوی سید علی بلگرامی مرحوم کی شہرۂ آفاق کتاب "تمدن عرب" کو جو کہ مدتوں سے نایاب تھی اور جو سو روپیہ پر بھی نہیں مل سکتی تھی اس کتب خانہ کے مالک نے ہمت کرکے دوبارہ نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کی اور اس کی قیمت صرف ۵ روپیہ رکھی۔ فون نمبر ۳۴۰۱۔

اس کتب خانہ کے زیر اہتمام ایک شعبہ قائم ہے جو مشہور مؤلفین و مصنفین کی کتب کے شائع کرنے کا انتظام کرتا ہے۔ جو اہل قلم حضرات اپنی تصانیف کو شائع کرنا چاہتے ہیں اس کے متعلق ہر وقت مشورہ فرما سکتے ہیں۔ اس کتب خانہ کے تحت ایک پریس بھی ہے جو **اعظم اسٹیم پریس** کے نام سے مشہور ہے۔ جہاں ہر قسم کا رنگین و سادہ کام بکفایت اور وعدہ کی پابندی کے ساتھ ہوتا ہے۔ فون نمبر ۳۴۰۲

معزز حضرات کی سہولت کی خاطر اس کتب خانہ کی ایک شاخ موسومہ سید عبدالرزاق تاجر کتب عابد روڈ پر بھی قائم کی گئی ہے جہاں اردو، انگریزی لٹریچر کا کثیر اسٹاک موجود ہے۔ جہاں تشریف فرما ہو کر کتب ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں

فون نمبر ۲۸۰۷

سیاست

جلد ۳ | اکتوبر ۱۹۴۲ عیسوی | نمبر ۴

فہرست مضامین

سیاست، ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء

ازمنۂ وسطیٰ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی اور عمرانی زندگی کے چند پہلو

(از)

جناب ایم ہمنت راؤ صاحب ایم اے۔ (عثمانیہ)

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام سے قبل کے دور کی نمایاں خصوصیت سیاسی وسماجی انتشار و پراگندگی ہے۔ گیارہویں اور بارہویں صدیوں کو دورِ لامرکزیت کہنا زیادہ مناسب ہے تمام ہندوستان کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ ہر ایک ریاست تقریباً آزاد و خودمختار تھی۔ مختلف مرکز گریز قوتیں ملک میں ہر طرف کام کر رہی تھیں جن سے ملک میں انتشار، طوائف الملوکی اور خانہ جنگی برپا تھی۔ راجا ہرش وردھن اور پلی کیشن کے بعد سے جس سیاسی زوال کی ابتدا ہوئی تھی وہ اب پایۂ تکمیل کو پہونچ چکا تھا۔

شمالی ہند کے بیشتر اور جنوبی ہند کے کچھ حصہ پر ایک نسل حکمران تھی جو راجپوت یا راج پتر کے نام سے موسوم تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کے پرانوں کا عہد ختم ہو چکا تھا اور راجپوتوں کے مختلف خاندان مختلف علاقوں پر مسلط و حکمران تھے۔ جن میں اجمیر و سامبر کے چوہان، میواڑ کے گہیل۔ دھار کے پارمار۔ بندھیل کھنڈ کے چندیل چیدی کے کالاچوری، گہاروال اور راٹھور۔ انہلواڑہ کے چلوکیہ، بنگال کے پال اور لکھنوتی کے سین خاص شہرت رکھتے ہیں۔

اِن راجپوت راجاؤں کے درمیان بجائے اتحاد و یگانگت کے باہمی نفاق و مخاصمت کا زور تھا۔ اِن مختلف سلطنتوں کے درمیان آئے دن جنگ وجدل برپا رہتا کیونکہ باہمی رقابت و خونریزی اِن راجپوتوں کی ہمیشہ سے خصوصیت رہی ہے۔ لیکن اِن لڑائیوں اور جنگوں کا مقصد بجائے وسعت سلطنت یا حصول ملک کے محض دوسری ہمسایہ ریاستوں پر اپنی فوقیت و برتری جتلانا تھا اسی عہد میں ہم رائے پرتھوی راج چوہان کو تین ہمسایہ سلطنتوں گجرات، بندھیل کھنڈ اور قنوج سے جنگ میں مصروف دیکھتے ہیں۔ یہ لڑائیاں اکثر نہایت خونریز ہوا کرتی تھیں جن میں فریقین کے ہزارہا سپاہی ضائع ہوجاتے تھے۔ اِن چار طاقتور سلطنتوں یعنے چوہان۔ راٹھور، چندیل اور سولنکی کی جنگی قوت دن بدن کمزور ہوتی گئی۔ اور آخرکار ہر ایک قوت ایک ایک کرکے ایک زبردست و قوی حملہ آور کے مقابلہ میں تباہ ہوگئی۔ آپس کی رقابت و خصومت کا یہ حال تھا کہ ایک غیرملکی حملہ آور اور ایک مشترک دشمن کا خوف بھی اُنہیں متحد نہ کرسکا۔

ہر راجپوت فرماں روا اپنے تئیں چکرورتی تبلاتا اور ہمسایہ ریاستوں کو اپنا مطیع بنانے کی سعی کرتا تھا۔ لیکن اِن ریاستوں کو الحاق کرکے اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کا مطلق خیال نہ تھا۔ اِس طرح فاتح و مفتوح دونوں کی قوت میں زوال اور کسی کو بھی استحکام حاصل نہیں ہونے پایا تھا۔ مثال کے طور پر مالوہ کے راجا بھوج نے دوسری راجپوت ریاستوں کے ساتھ جنگ کی اور اُنہیں زیر کیا اور سارواچکرورتی کا لقب حاصل کیا۔[1] اسیطرح کرن راجا اور کمارپال نے اس عزت کو حاصل کرنے کی سعی کی۔ مسلسل تیس سال تک کمار وال و چوہان خاندانوں میں رقابت جاری رہی۔ پہلے جے چند اور وگرپال اور بعد میں پرتھوی راج اور جے چند برابر جنگ وجدل میں مصروف رہے۔ جیساکہ صاحب پرتھی راج راسو چاند بردی کا بیان ہے کہ سنجوگتا کے سویمبر کے سلسلہ میں پرتھوی راج کے نوّے فیصد سمنت (فوجی جاگیردار جنرل)

---

[1] وی۔ سی۔ ویدیا۔ ڈاؤن فال آف ہندو انڈیا۔ صفحہ (۳۶۲)

مارے گئے[1]۔ حکمرانوں کی اِس باہمی جنگ وجدل کے علاوہ اِن ریاستوں کے باشندوں میں احساس قومیت کا فقدان نظر آتا ہے۔ اِس عہد کے ہند میں بھی ایشیاء کے دیگر ممالک کیطرح صرف حکمرانوں کا ڈنکا بجتا تھا۔ اور عوام کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ رعایا کو اِس بات کا احساس نہیں تھا کہ مملکت اُن کی ہے اور حکمران بھی اُنہی کا ہونا چاہیئے برخلاف اِس کے اُن کا خیال تھا کہ ملکیت بادشاہ کی ہے اور وہی بادشاہ ہوتا ہے "جس کو خدا مقرر کرتا ہے" اور ظاہر ہے کہ مملکت کی نسبت اِس قسم کا تخیل نہ تو قومیت کا احساس پیدا کرتا ہے اور نہ حب الوطنی کا جذبہ۔

اس میں شک نہیں کہ باشندوں میں وفاداری کا جذبہ نہایت قوی تھا۔ اور پرتھوی راج راسو میں اِس کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ جذبہ نہایت شدت سے تھا۔ اپنے آقا کی خاطر زندگی قربان کرنا راجپوت کا عین "دھرم" تھا اور اگر آقا کو شکست ہو جائے اور "خدا کی مرضی" سے دوسرا شخص آقا بن جائے تو راجپوت سپاہی اُس کے لئے بھی مرنے کو تیار رہتا تھا۔ اِسی بنا پر ہم چھتری سپاہیوں کو اپنے مسلمان آقاؤں و حکمرانوں کی خاطر قربان ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اور یہ خیال غیر راجپوت باشندوں میں بھی عام تھا۔ زبان کی یکسانیت بھی اُن باشندوں میں احساس قومیت پیدا کرنے میں ناکام رہی۔

ایک زبردست اور فرض شناس مستقل فوج کا وجود ہر ایک مملکت کا اوّلین فرض ہے لیکن اِس عہد کی ہندو مملکتیں اِس فرض سے غافل تھیں۔ راجا ہرش اور راجا بھوج کے بعد سے مستقل فوج کے قیام کا خیال معدوم ہو گیا، بلکہ اُس کے بجائے فوجی جاگیرداری تنظیم کا رواج ہو گیا تھا جس کو "سمنت" کہا جاتا تھا[2] طریقہ سمنت تقریباً اسی طرز کا تھا جیسا کہ بعد میں چلکر

---

[1] وی۔ سی۔ ویدیا۔ ڈاؤن فال آف ہندو انڈیا صفحہ (۲۶۲)

[2] فوربس۔ راس مالا صفحہ ۲۴۳۔

مُغلوں کے عہد میں منصب داری کا طریقہ تھا۔ سمنتوں کی نوعیت فوجی جاگیرداروں کی سی تھی۔ پرتھوی راج کے عہد میں کسی مستقل فوج کا حال نہیں ملتا۔[۱]

یہ فوجی جاگیردار ضرورت کے موقعوں پر اپنی اپنی فوجوں سے بادشاہ کی مدد کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان فوجی سرداروں سے نہ تو کافی مدد ملتی تھی اور نہ اُن کی امداد زیادہ مفید و کارآمد ہوتی تھی۔

اِس عہد کے ذہنی رُجحان نے فنِ جنگ سے بے اعتنائی برتی۔ مُملکت کے صحیح تصوّر کا احساس بھی مفقود تھا۔ برہمن و چھتری لوگ بجائے مُفید و کارآمد علوم کے شعر و اَدب کی طرف زیادہ راغب تھے۔ حُسن و عشق کے اَفسانے اور نکاتِ شعر و اَدب اِس عہد کے اہلِ علم کا عام شغلہ تھا۔ حتیٰ کہ حکمران بھی فنونِ لطیفہ بالخصوص شعر و شاعری و ڈرامانگاری کے شوقین تھے۔ بلاشبہ ان دلچسپیوں سے اِس عہد کے ہندوؤں کی خوش مذاقی اور نفاستِ طبع کا پتہ چلتا ہے لیکن ہندو حکمران اپنے فوجی سرداروں سے زیادہ درباری شعرا کی طرف متوجہ تھے۔ میدانِ جنگ سے زیادہ اسٹیج کا خیال تھا۔ اِن مشاغل شعر و سخن و فنونِ لطیفہ کا نتیجہ رفتہ رفتہ آرام و عیاشی میں ظاہر ہوا جس سے اَخلاقی انحطاط کی ابتدا ہوئی۔ اِس تدریجی انحطاط و عیش و عشرت کی تصویر ہمیں راج شیکھر کی تصنیف "کپور منجری" اور نیائے چندر کی "رمبھا منجری" میں نظر آتی ہے۔ اِسلامی حکومت کے قیام سے قبل کی صدیوں میں ہندوستان نہایت درجہ خوش حال و مرفہ الحال تھا۔ اِس عہد کے عام تموّل، معاشی ترقی و زرعی بہتری کی نسبت اِس عہد کے تصانیف پُر زور اَلفاظ میں ذکر کرتی ہے۔ بھویشیہ پران کا ایک شلوک اِس عہد کی معاشی خوشحالی کو یُوں ظاہر کرتا ہے۔

"گاؤں گاؤں میں دیوتا تھے۔ دیش دیش میں قربانیوں کا رواج تھا۔ گھر گھر میں

---

[۱] ویدیہ۔ ڈون فال آف ہندو انڈیا صفحہ (۳۷۰)

دَولت کی فراوانی تھی۔ دھرم لوگوں کی زندگی کا جزو لاینفک تھا۔

عام مرفہ الحالی و آسایش جو اِس عہد میں نظر آتی ہے یہی یہاں کے باشندوں کے جسمانی انحطاط و اخلاقی زوال کا باعث ہوئی۔ بالکل یہی خیال رومیوں، عربوں اور بعد میں ترکوں و مغلوں کا ہوا۔ آرام و آسایش، اور باہمی جنگ و جدل اور رقابت و نفاق کی وجہ سے حکمران طبقہ رعایا کی بہتری و بہبودی سے غافل ہوتا گیا۔

حکمرانوں کو اپنے تفریحی مشاغل کے علاوہ باہمی جنگ و جدل سے اِس قدر فرصت نہ تھی کہ وہ رعایا کی طرف متوجہ ہوتے اور ملکی تنظیم کا خیال کرتے۔ برخلاف اِس کے رعایا بھی اخراجات جنگ سے سخت زیر بار تھی۔[1]

صرف سیاسی اِنتشار و نراجیت ہی اِن دو صدیوں کی عام خصوصیت نہیں تھی بلکہ اِس دَور کی معاشرت بھی انقلابی دَور سے گذرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ سیاسیات کی مانند معاشرہ میں بھی اِنتشار نظر آتا ہے۔ مسلسل کئی صدیوں کی جدوجہد اور کشمکش کے بعد برہمنیت بدھ مت پر غالب ہو چکی تھی۔ ایک طرف تو راجپوت راجاؤں کی سرپرستی، دوسری طرف سری شنکر۔ سری رامانج اور سری مدھو آچاریوں کی فلسفیانہ مذہبی تحریکیں اِس برہمن غلبہ کی ممد و معاون بنیں۔ شیو اور وشنو متوں کا زور ہوتا گیا۔ اِس طرح نویں و دسویں صدی میں ہندو مت سارے ہندوستان پر حاوی ہو چکا تھا۔ لیکن گیارہویں صدی میں پھر مذہبی اختلافات کا زور ہوا۔ گجرات اور راجپوتانہ میں جین دھرم کی اِشاعت ہونے لگی، اور دکھن اور جنوبی ہند سے جین مت خارج کر دیا گیا۔ بدھ دھرم ہندوستان سے ابھی پورے طور پر نہیں مٹا تھا۔ سندھ، پنجاب اور کابل میں اِسلام کا اثر بڑھ رہا تھا۔ غرض کہ مختلف مذہبی تحریکوں کی اِشاعت ہو رہی تھی۔

---

[1] ویدیہ۔ ڈوون فال آف ہندو انڈیا۔ صفحہ (۳۷۵)

بدھ دھرم کے زوال کے ساتھ ہی ہندو عقاید عام ہوتے گئے۔ ذات پات یا ورن ویوستھا کی تنظیم پر پورے جوش کے ساتھ عمل ہو رہا تھا لیکن یہ تنظیم قدیم آریائی تنظیم سے بہت سی باتوں میں مختلف تھی۔ اُس زمانے میں ہندو دھرم میں نئے عناصر شامل ہو گئے تھے۔ جن کی وجہ سے اس کی شکل تبدیل ہو گئی تھی۔ ذات پات کے اصول کی سختی سے پابندی ہونے لگی تھی۔ یہ خاص طور پر بدھ مت کے خلاف ردِعمل کا اثر تھا۔ چار اہم ذاتوں یعنی برہمن، چھتری، ویش اور شودر کے علاوہ اور بھی فرقے در فرقے ہوتے گئے۔ برہمنوں میں کئی قسم کے برہمن تھے۔ اسیطرح سمادت، رائج رہوا فرقوں نے ان ذاتوں کو اور بھی پارہ پارہ کیا۔ اِن فرقوں کے درمیان آئے دن نزاعات میں اضافہ ہونے لگا۔ بالکل غیر اہم عقاید اور اُصول کی نسبت اِن فرقوں میں اختلاف و فساد برپا تھا۔ ہندو دھرم کی وحدت فنا ہو گئی تھی۔ اس سے قبل کی صدیوں میں ان چاروں ذاتوں میں آپسمیں شادیاں ہوا کرتی تھیں۔ ابن خردادبہ نویں صدی میں بیان کرتا ہے کہ برہمن چھتری عورتوں سے شادی کرتے ہیں لیکن اپنی بیٹیاں اُنھیں نہیں دیتے[۱]

چنانچہ راج شیکھر کا مشہور واقعہ ہے کہ اُس نے سن ۹۰۰ئہ میں چوہان خاندان میں شادی کی تھی۔ البرونی نے بھی بیان کیا ہے کہ برہمن دیگر ذاتوں کی عورتوں سے شادی کرتے تھے لیکن بعد میں شادی بیاہ صرف اُسی ذات تک محدود ہو گئی ہے[۲] نہ صرف شادی بیاہ بلکہ اُسوقت ان ذاتوں کے آپسمیں کھانے پینے تک کی ممانعت ہو گئی تھی۔ اُسیطرح اَب تک جو معاشرتی یک جہتی ہندوؤں میں پائی جاتی تھی وہ اِس ذات پات کی تنظیم اور فرقہ واری نزاع کی وجہ سے فنا ہونے لگی اور آپسمیں مغایرت بڑھتی گئی۔

اُصول ذات پات پر سختی سے پابندی کی وجہ سے سلطنتوں کی فوجی و جنگی قوت میں کمی ہونے لگی۔ کیونکہ فوجی ملازمت یا سپہ گری ایک خاص طبقہ تک محدود ہوتی جا رہی تھی۔ اور

---

[۱] ایلیٹ۔ ہسٹری آف انڈیا جلد دوم۔ [۲] ویدیہ۔ ڈاؤن فال آف ہندو انڈیا صفحہ ۳۰۵۔

دوسرے طبقات آبادی کی فوجی صلاحیت میں زوال شروع ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ راجپوت و چھتری طبقوں کے علاوہ دیگر طبقے فوجی اور جنگی خصوصیات سے معرا ہوتے گئے۔

بدھ دہرم کے متعدد اصول و عقاید ہندو مت میں شامل ہو گئے تھے۔ بالخصوص "اہنسا" کے عقیدہ کو ہندوؤں نے عام طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ اصول اہنسا شیوا اور وشنو متوں کا بھی مذہبی عقیدہ بن گیا۔ جانوروں کی قربانی اور گوشت خوری ممنوع قرار پائی۔ جنگ و قتل و غارت سے بیزاری پیدا ہو گئی۔

مذہبی جوش میں اضافہ کے ساتھ کٹرپن اور توہم پرستی میں بھی اضافہ ہو گیا۔ عام طور پر ہندوؤں کو یہ وہم ہو گیا تھا کہ کل جگ میں "ملیچھ" (غیر ملکی) ہند پر حاوی ہو جائیں گے۔ لکھنوتی کے راجا لکشمن سین کی نسبت نجومیوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ ایک لمبے ہاتھوں والا ملیچھ اس کے ملک کو فتح کرے گا۔ اور اس پر لکھنوتی کے باشندوں اور خود راجا کو کامل یقین تھا۔ یہانتک کہ جب بختیار خلجی نے بنگال پر حملہ کیا تو راجا نے اس بات کی تصدیق حاصل کرنے کے لئے کہ آیا بختیار خلجی کے ہاتھ لمبے ہیں یا نہیں، اپنے آدمیوں کو روانہ کیا، جنھوں نے اس کی تصدیق کی۔ جب باشندوں کو اس کی خبر ہوئی تو وہ شہر کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے اور راجا کو بھی اپنی شکست کا یقین ہو گیا[۱]۔ یہ واقعہ اس عہد کے وہم پرستی کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔

تیاگ و ترک دنیا، نجات اور مکتی کے حصول کی خواہش عام ہو گئی تھی۔ چتا میں زندہ جل مرنا نہ صرف بیواؤں بلکہ امراء اور راجاؤں میں بھی عام تھا، جو اپنے گناہوں کے کفارہ کے طور پر خود کو جلتے شعلوں کے حوالے کرتے تھے۔ بعض راجا لوگ کچھ عرصہ کی حکومت کے بعد اپنے وارث کے حق میں تخت سے دست بردار ہو جاتے اور اپنی زندگی کا آخری عہد کسی مذہبی تیرتھ یا خانقاہ میں گذارتے تھے۔ مصنف رتن مالا اور پربھودچنتامنی بہت سے ایسے راجپوت راجاؤں کا

---

[۱] طبقات ناصری۔

حال بیان کرتے ہیں جنھوں نے یا تو چتا میں جلکر جان دی یا تپسیا کی خاطر راج تیاگ کرکے کسی تیرتھ کو اپنے آخری ایام بسر کرنے چلے گئے۔[1]

اس ابتری کی حالت میں ہندوستان میں ایک نئی قوم کی آمد تاریخ میں نہایت اہم نتائج پیدا کرتی ہے۔ غیر ملکی حملہ آور اپنے ساتھ ایک نیا تمدن، ایک نئی تہذیب، ایک نیا مذہب اور نئے معاشرتی و سیاسی ادارات لائے۔ اس نئی نسل کو ہند کے اس لامرکزیت اور طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ ایک مجموعی قوت کے عدم وجود سے انہیں اپنے حملوں میں کامیابی ہوئی اور رفتہ رفتہ سارے شمالی ہند پر قابض ہوگئے۔ پہلے پہل آٹھویں صدی میں عربوں نے سندھ پر قبضہ کرلیا تھا۔ لیکن اُن کی حکومت مقامی حیثیت کے علاوہ کوئی اثر ہندوستان میں پیدا نہ کرسکی۔ مسلمانوں میں یہ فخر ترکوں کو نصیب ہوا کہ وہ سارے شمالی ہند پر تسلط جمائیں۔ ان حملہ آوروں کو یہاں پر بجائے کسی متحدہ قوت کے انفرادی طور پر راجاؤں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ سارا شمالی ہند بالکل ہی قلیل عرصہ میں غیر ملکی اقتدار کے زیر آگیا۔

بعض مورخین بالخصوص اسلامی مورخین کا خیال ہے کہ مسلم حملہ آوروں میں مذہبی جوش زیادہ تھا۔ اور ان حملوں کی حیثیت مذہبی تھی۔ لیکن حالات و واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ غزنیوں اور غوریوں کا مقصد تبلیغ یا اشاعتِ اسلام نہیں تھا بلکہ اُن کا مقصد حصولِ دولت اور وسعتِ سلطنت تھا۔ اگر ان حملوں کا مقصد اشاعتِ مذہب تھا تو پھر بعد فتح اس کی کوشش کیوں نہ کی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ پنجاب کے ہندوؤں میں مذہبی جوش نہایت کم تھا لیکن شمالی و وسطِ ہند خاص کر گنگا و جمنا و سرسوتی کے درمیانی علاقوں کے باشندوں اور راجپوتوں میں ہمیشہ سے مذہبی جوش رہا۔ اور یہ علاقہ ہند و مذہب کا مرکز کہا جاسکتا ہے۔ اس بناء پر یہ دعویٰ غلط نہ ہوگا کہ مذہبی احساس دونوں فریقوں میں مساوی تھا۔

---

[1] فوربس۔ راس مالا صفحہ (۱۰۱)

ہندوؤں کے اِس قدر جلد بغیر کسی قابل ذکر جد وجہد کے محکوم بننے کی وجہ زیادہ تر اُنکی باہمی رقابت اور خانہ جنگی تھی جس کے باعث اُنمیں نفاق پیدا ہو گیا تھا۔ دوسرے تنظیم ذات پات کی سخت گیری سے فن سپہ گری کا ایک خاص طبقہ تک محدود ہو جانا اور عام باشندوں کا اس قومی جد وجہد میں حصہ اور دلچسپی نہ لینا اور غیر ملکی جوئے کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کرنا ہی وہ وجوہ تھے جو غیر ملکی اقتدار کے قیام کے معاون ہوئے۔ جب یکے بعد دیگرے راجپوت قوتوں کو شکست ہوتی گئی تو سارا شمالی ہند بغیر کسی قابل ذکر مقابلہ کے زیر ہو گیا اور حملہ آوروں کی تاب نہ لا سکا۔ ذات پات کی تنظیم کے سبب سے یہاں کی آبادی کا ۹/۱۰ حصہ یا تو قومی محافظت کے ناقابل تھا یا بے پروا راجپوتوں کا طبقہ باہمی نفاق و خانہ جنگی سے کمزور ہو گیا تھا۔ اِن دو اہم وجوہ سے ہندوستان نے آسانی سے حملہ آوروں کے تحکم کو تسلیم کر لیا۔ اولاً پنجاب اور سندھ میں ان اسلامی فاتحین نے اشاعت مذہب کی کوشش ضرور کی مندروں کو توڑنے اور اُن کی جگہ مسجدوں کو تعمیر کرنے کا کام کچھ عرصہ تک ہوتا رہا۔ اس کی وجہ ایک تو اس عہد کا عام مذہبی رجحان ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ مذہب حملہ آوروں کی زندگی کا ایک اہم عنصر تھا۔ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ جہاں کہیں بھی اُن کو فتح ہوئی وہاں اُنھوں نے اپنے مذہب کی اشاعت کا کام کیا۔

رفتہ رفتہ جب اُن کی حکومت کو استحکام ہو تا گیا تو اُنھوں نے محسوس کیا کہ اشاعت مذہب میں جبر و قوت سے کام لینا کسی حالت میں بھی ہندوستان میں مفید ثابت نہ ہوگا۔ خواہ ہندوؤں کے مندروں کو توڑا جائے۔ پجاریوں کو قتل کیا جائے اور اُن کے پاسبانوں پر بیشمار مظالم ہوں پر بھی برہمنوں کا اثر ہندوؤں پر سے نکلنا محال ہے۔ اور صرف قوت و جبر سے یہاں کے باشندوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا ناممکن ہے۔[1]

یہی وجہ ہے کہ پنجاب اور سندھ میں جس قدر مسلمانوں کی آبادی ہے اُس سے نہایت

---

[1] ٹائٹس۔ انڈین اسلام صفحہ ۱۵۰ - ۱۵۱ -

درجہ کم وسط و جنوبی ہند میں ہے۔

اگر اسلامی فاتحین کو اپنے تہذیب و تمدن، صداقتِ مذہب، پاکیزگی عقیدت اور سادگی پر فخر تھا تو ہندوؤں کو اپنے تاریخی قدامت۔ ذخیرہ علوم و فنون۔ فلسفہ مذہب اور پاکیزگی نسل پر ناز تھا۔ اس طرح ان دو قوموں کے ملاپ اور تصادم سے مستقبل کی ہزار سال کی تاریخ۔ تہذیب و تمدن معاشرتی و سیاسی اداروں کی اس عہد میں داغ بیل ڈالی گئی۔

شمال سے اسلامی فاتحین کے آنے سے قبل ہی ہندو ایک حد تک مسلمانوں سے واقف ہو چکے تھے جنوبی ہند۔ عربوں سے بخوبی واقف تھا۔ مختلف عرب سیاح یہاں کے راجاؤں کے مسلمانوں کے ساتھ روادارانہ طرزِ عمل کی تعریف کرتے ہیں۔ نہ صرف مسلمانوں کی حد تک بلکہ ہندوؤں کی تاریخ میں دیگر مذاہب کے ساتھ رواداری کا اصول بالکل قدیم چیز ہے حتیٰ کہ جنوبی ہند میں ان عربوں کو اپنے مذہب کی اشاعت میں حکومت کی امداد بھی حاصل تھی۔ دسویں صدی ہی میں گجرات، سندھ اور دکن میں مسلمان اور ہندو ایک دوسرے سے واقف ہونے لگے تھے۔

اسلامی حکومت کے قیام کے وقت اگر یہاں کے باشندوں کو مسلمانوں سے نفرت تھی تو اس بنا پر کہ وہ محکوم بنائے گئے، اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ ہندوؤں نے مسلمانوں سے محض مذہب کے اختلاف کی بنا پر نفرت کی ہو۔ اگر مذہبی تعصب ان میں تھا بھی تو نہایت کم۔ پھر بھی ابتدا میں ان دو قوموں کے درمیان جس خصومت کا اظہار ہوتا ہے وہ بالکل قدرتی ہے کیونکہ فاتح قوم۔ اپنا اقتدار تسلیم کروانے پر مصر ہوتی ہے اور مفتوح قوم جو اب تک آزاد رہی ہو وہ قدرتاً اپنے فاتح سے نفرت کرنے لگتی ہے اپنی محکومی اور ذلت کا احساس اسے مخالفت پر آمادہ کرتا ہے جس کا نتیجہ مختلف بغاوتوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ قوموں کی ابتدا میں ایک دوسرے کو نہ سمجھنے کے باعث بھی ناگوار نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو اپنی محکومی و غلامی کو خوشی سے قبول کرے اسی سبب سے وہ فاتحین کو اپنا دشمن سمجھنے اور ان سے نفرت کرنے لگتی ہے لیکن رفتہ رفتہ

جب ایک قوم دوسرے سے واقف اور ایک دوسرے کے خیالات و مقاصد کو سمجھنے و جاننے کی کوشش کرتی اور سمجھنے لگتی ہے تو یہ نفرت و حقارت زائل ہوتی جاتی ہے۔ اور مغائرت دُور ہو جاتی ہے۔

شہاب الدین غوری کے بعد جب مسلمانوں کے قدم ہندوستان میں جم گئے اور ترکوں کو یہاں سلطنت و حکومت قائم کرنیکا خیال ہوا۔ تو اُس کے ساتھ ساتھ ہندو آبادی جو اب تک ان حملہ آوروں کو محض لٹیرے سمجھتی تھی اُن کی طرف متوجہ ہوئی۔ ہندوستان کی تاریخ میں ترکوں و افغانوں کا عہد ان دو متضاد اور مخالف قوموں کے آپسی تصادم اور ملاپ کا عہد ہے۔ اِنہی اسباب سے اس عہد کی عمرانی و مذہبی تاریخ نہایت اہم ہے۔

یُوں تو ہندوستان میں اِسلامی حکومت کا آغاز آٹھویں صدی یعنے سندھ پر عربوں کے قبضے سے ہوتا ہے لیکن صحیح معنوں میں اِسلامی حکومت ہندوستان میں اُس وقت سے قائم ہوئی جبکہ پرتھوی راج چوہان کی شکست کے بعد شہاب الدین غوری نے قطب الدین ایبک کو مفتوحہ علاقوں کا نایب مقرر کیا۔ سندھ پر عربوں کی حکومت ایک تو قلیل عرصہ تک رہی دوسرے اس کی حیثیت بالکل صوبہ واری تھی۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں اس اِسلامی حکومت کا کوئی اثر نہ پڑا۔ پنجاب پر محمود غزنوی کے حملے کسی مستقل حکومت کے خیال کے تابع نہ تھے راجا جے پال کی روز افزوں قوت کو کم کرنے کی خواہش اور ہندی دولت کے افسانے محمود غزنوی کے حملوں کے محرک نظر آتے ہیں۔ وسعت سلطنت کا خیال بھی اِن حملوں کا باعث ہو سکتا ہے لیکن اِن حملوں اور فتوحات کا ہندوستانی سیاسیات اور زندگی پر کوئی قابلِ ذکر اثر نہیں پڑا اور نہ اِسلامی حکومت پورے طور پر قایم ہونے پائی۔ چونکہ محمود غزنوی کا تعلق بھی زیادہ تر ہندوستان کے شمال مغربی حصے سے رہا، اِس سبب سے اِن فتوحات کو ہندوستان میں اِسلامی حکومت کا قیام سمجھنا درست نہیں ہے۔ بحیثیت مجموعی عربوں اور محمود غزنوی کے حملوں اور فتوحات کی اہمیت صرف اِس قدر ہے کہ اُنھوں نے بعد کے اِسلامی فاتحین

کے لئے رہبری کا کام کیا۔ اور ایشیا کے دیگر قوموں اور اسلامی سلطنتوں کو ہندوستانی سیاست سے واقف کرایا۔

قطب الدین ایبک کی صوبہ داری سے ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام کی کوشش شروع ہوئی، جس کی تکمیل علاء الدین خلجی کے عہد میں ہوئی۔ مسلمانوں میں پنجاب اور وسط ہند کو زیر کرنے کے بعد پورے ہندوستان کو زیر کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ تیرہویں صدی کے ابتدا سے چودہویں صدی کی ابتدا تک پورے ایک سو سال میں ہندوستان میں اسلامی حکومت قایم اور مستحکم ہوگئی اور تمام شمالی ہند پر ترکوں کا تسلط ہوا۔ اس ایک صدی کے دوران میں ابتدائی چالیس برس ہندوستان کی مختلف ہندو سلطنتوں کو زیر اور الحاق کرنے میں صرف ہوئے۔ اور جب سلطنت کافی وسیع ہوگئی تو اس کے استحکام کی کوشش کی گئی۔

اجمیر، دہلی، قنوج، اور بنارس کی فتح اور دو طاقتور راجپوت سلطنتوں کے الحاق کے بعد شمالی ہند کی دیگر راجپوت سلطنتیں رُبع صدی کے عرصہ میں بغیر کسی قابل ذکر جد و جہد کے اسلامی حکومت کے زیر ہوگئیں۔ ان فتوحات کی تفصیل ہمعصر تاریخوں یعنے طبقات ناصری اور تاج الماثر میں ملتی ہے۔

۱۱۹۷ء میں شہر انہلواڑہ اور سلطنت گجرات پر سلطنت دہلی کا قبضہ ہوگیا۔ لیکن یہ علاقہ کامل طور پر فتح نہ ہوسکا۔ جو ایک صدی بعد علاء الدین خلجی کے زمانے میں سلطنتِ دہلی سے ملحق ہوا۔

اسلامی حکومت کے قیام سے پورا ہندوستان ایک مرکز کے تحت آگیا۔ ساتھ ہی تمام مرکز گریز قوتیں فنا ہوگئیں۔ ملک کی از سرِ نو شیرازہ بندی سے اندرونِ ملک امن قایم ہوا۔ اور بارہویں صدی کی انتشاری کیفیت و نراجیت دفع ہوگئی۔ مختلف بغاوتوں کے انسداد اور حصول ملک کی خاطر فوجی مہمات سے حکومت کو استقلال نصیب ہوا۔ تین صدیوں کی لامرکزیت کے بعد ایک آزاد و ہمہ گیر قوت تقریباً تمام ہندوستان پر حاوی ہوگئی۔ سلطنتِ دہلی

کے علاوہ دیگر علاقے یا تو سلطنت دہلی سے ملحق کر لئے گئے یا ان سلطنتوں نے دہلی کی اطاعت و برتری کو تسلیم کر لیا۔ انہی اسباب سے اسلامی حکومت کا قیام دراصل ایک طاقتور مرکزیت کے قیام کے علاوہ ایک قومی حکومت کا قیام تھا۔

لفظ اسلامی سے کسی غیر ملکی قوت کا اقتدار سمجھنا غلطی ہے کیونکہ قطب الدین ایبک کے بعد ہی سے سلطنتِ دہلی دیگر اسلامی ممالک سے بالکل آزاد ہو چکی تھی اور ترک حکمرانوں کا تمام تر دار و مدار صرف ہندوستان پر تھا۔ اسلامی ممالک سے سیاسی تعلقات منقطع ہو چکے تھے۔ اب کوئی ایسی کشش باقی نہ تھی جو ہندوستان کے ان ترک حکمرانوں کو اسلامی ممالک سے تعلقات قایم رکھنے پر مجبور کرتی۔ جہانتک مذہب کا تعلق تھا ان کو دیگر اسلامی ممالک بالخصوص خلافت سے ہمدردی ضرور تھی۔ لیکن اس ہمدردی کا اثر ہندوستان کی سیاسیات پر کچھ زیادہ نہ تھا۔

علاء الدین خلجی کی تمام تر کوشش یہ رہی کہ غیر ملکی مسلمانوں (ترکی) کے مقابلہ میں ہندی مسلمانوں کو ترجیح دیجائے۔ اسی بنا پر اس حکمران کے اکثر عہدہ دار و سپہ سالار ہندی نژاد مسلمان تھے۔ علاء الدین کے چار مشہور سپہ سالار ظفر خاں۔ نصرت خاں۔ الپ خاں اور الغ خاں ہندی نژاد تھے، جن کی مدد سے اس نے ترکی امراء کی قوت کو کم کرنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب ہوا۔

امورِ حکومت اور معاملاتِ سلطنت کے باب میں صرف مسلمان ہونا کسی خاص رعایت کا استحقاق نہیں پیدا کرتا تھا۔ بلکہ سیاست مذہب سے علیحدہ ہو گئی تھی علاء الدین نے بیس ہزار نومسلم مغلوں کو تہ تیغ کیا۔ اس طرح باغیوں کی سزا میں ان کے مسلمان ہونے سے کوئی رعایت ملحوظ نہیں رکھی گئی۔ امورِ حکومت کے سامنے ہندو اور مسلمان دونوں کی حیثیت مساوی تھی۔ اس خاص حکمتِ عملی سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ ان حکمرانوں کا تخیل مملکت خالص دنیوی اور قومی حکومت تھا نہ کہ مذہبی راج۔ اس عہد کی حکومت میں

علماء کے اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان علماء دین کا وقتاً فوقتاً حکمرانوں کو شرع کی پابندی و قرآنی احکام کی تعمیل کی طرف توجہ دلانا حکومت میں اس طبقہ کے اثر اور اہمیت کو ظاہر کرتا ہے لیکن غیاث الدین بلبن کے عہد سے جو خیال مذہب کو سیاسیات سے الگ کرنے کا پیدا ہوا تھا وہ علاء الدین خلجی کے عہد میں پورے طور پر ظاہر ہوا۔ غیاث الدین بلبن، علاء الدین خلجی اور بعد میں محمد بن تغلق شاہ کا جو تخیل مملکت رہا وہ خالص ایک دینوی اور قومی مملکت کا تخیل ہے ان حکمرانوں کے عہد کی حکومت ایک قومی حکومت تھی۔ علاء الدین خلجی اور قاضی مغیث الدین کی گفتگو سے اس حکمران کے تخیل و تصور مملکت پر روشنی پڑتی ہے۔ علاء الدین قاضی کو ایک موقع پر کہتا ہے کہ

"اگرچہ من علمے وکتابے نہ خواندہ ام۔ اما ازین چند پشت مسلمان و مسلمان زادہ ام بہر چیزے کہ در آن صلاح ملک و صلاح ایشان (عوام) باشد بر خلق امر می کنم و مردمان بے التفاتی نمی کنند و بجائے نمی آرند۔ مرا ضرورت می شود کہ چیزہا درشت در باب ایشان حکم کنیم کہ ایشان بدان فرمانبرداری کنند و نمی دانم کہ آن حکم مشروع است یا نامشروع ومن درچہ ہرچہ صلاح ملک خود می بینم و مصلحت وقت مرا در آن مشاہدہ می شود حکم می کنم ونمی دانم کہ خدا تعالیٰ فردا قیامت برمن چہ خواہد کرد"[1]

اسی قسم کے خیال کی بناء پر علماء دین علاء الدین خلجی اور محمد تغلق کی سیاسی حکمت عملی سے ناراض تھے۔ اسلامی حکومت کے قومی حکومت ہونیکا ثبوت ان حکمرانوں کی سیاسی حکمت عملی سے بھی ملتا ہے کہ انھوں نے کسی ہندو کو صرف اس کے مذہب کی بناء پر قتل کرنے یا دبانے کی کوشش نہیں کی اور نہ کسی مسلمان باغی یا دشمن سلطنت کو صرف اس کے مسلمان ہونیکی وجہ سے رعایت کا مستحق سمجھا، بلکہ بلا تفریق مذہب وعقاید ان کا مقصد استحکام سلطنت

---

[1] ضیاء برنی تاریخ فیروز شاہی۔

و امن آمان و فلاح ملک تھا۔ انہی اسباب سے ان کی حکومت کو قومی حکومت کہنا نامناسب نہ ہوگا۔
بودھ مت کے عروج و زوال سیاسی حالات کی تبدیلی اور ہندوستان کی آریوی معاشرت میں نئے عناصر کے شامل ہونے سے ہندو معاشرہ میں ایک عظیم تغیر شروع ہوا۔ غیر ہندی اقوام مثلاً ھن، شک وغیرہ کے داخلے جنھوں نے خود کو ہندوستان کے معاشرہ میں جذب کر دیا اور ہندو سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ یہاں کی عمرانی زندگی میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ قدیم آریوی معاشرہ میں امتداد زمانہ سے کئی تبدیلیاں ہوئیں اور ہو رہی تھیں ان حالات میں مسلمانوں کی آمد کا اثر ہندو تمدن و معاشرہ پر لابد تھا۔ چونکہ مذہب ہندی معاشرت کا ایک اہم عنصر تھا اس کے علاوہ ان کے معاشرت و مذہب میں اس قدر گہرا تعلق تھا کہ ان کے اصولوں میں تمیز و تفریق مشکل ہے۔ اس عہد کی ہندو معاشرت کے مختلف پہلو مختلف اثرات کا نتیجہ ہیں۔ حاکم طبقہ راجپوتوں کا تھا اور اس طبقہ کا اثر ہندوؤں کی زندگی کے ہر شعبہ پر پڑا۔ راجپوت طرز زندگی۔ اُن کے اخلاق و عادات۔ رسوم و رواج اور مشاغل کی تصویریں اس عہد کی تصانیف میں نظر آتی ہیں۔ چاند بردی کی "پرتھی راج راسو" اور مشہور رزمیہ نظم "الہا کہانڈ" اس نسل کے دلچسپ کارنامے اور معاشری خصوصیات کو ظاہر کرتے ہیں۔

جیسا کہ تمہید میں اوپر بیان ہو چکا ہے۔ مذہبی اختلافات و عدم اتحاد نے ہندو مذہب کی وحدت کو فنا کر دیا تھا اور مختلف مذہبی تحریکیں ملک میں کام کر رہی تھیں۔ بودھ دھرم کے زوال سے جین دھرم و برہمنیت کا زور رہا۔ گجرات اور راجپوتانہ میں جین مت فروغ پانے لگا۔ شمال مغربی ہند میں اسلام کی اشاعت ہو رہی تھی رفتہ رفتہ ہندو مذہب میں مختلف تحریکیں پیدا ہوئیں لے جین مت جنوبی ہند سے خارج ہو کر وسط و مغربی ہند میں فروغ پانے لگا۔

لے ڈاکٹر ہنڈاکر۔ سیویٹ اینڈ وشنویٹ دسنٹس ان انڈیا۔

حیرت کا مقام ہے کہ عقیدہ "اہنسا" کا حامی اور اشاعتی جین دھرم نے شیومت کے حامی اور جنگ و جدل کے عادی راجپوتوں کے تحت فروغ پایا۔ تمام راجپوت ریاستوں۔ سامبر۔ میواڑ۔ مالوہ اور گجرات میں اس کی اشاعت ہونے لگی۔ گو اِن علاقوں کے حکمران جنوب کے چھتری راجاؤں کی طرح کٹر سیومت کے پیرو تھے۔ پر بھی پہلے بودھ مت اور بعد میں جین دھرم کے اہنسا کے عقیدہ کا اثر ان پر بھی ہوا اور جیسے جیسے یہ عقیدہ تسلیم کیا جانے لگا۔ ویدوں کی تعلیم قربانی فراموش ہوتی گئی۔ گجرات اور راجپوتانہ میں جین دھرم کی اشاعت بیشتر پنڈت ہیم چندر کی رہین منت ہے۔ پنڈت ہیم چندر۔ جین دھرم کا مشہور پرچارک شوتپامبر فرقہ سے تھا۔ اُن کی پیدائش ۱۰۸۸ء میں گجرات کے ایک جینی ویش خاندان میں ہوئی[1]۔ اِبتدائی تعلیم کے بعد جب اچاریہ کا رتبہ حاصل ہوا تو وہ اَنہلواڑہ چلا آیا اُن کا انتقال ۱۱۶۸ء میں ہوا۔ یہ پنڈت اپنی تصانیف سنسکرت و پراکرت گرامر اور "کاویہ دوسارایہ" (جو کہ گجرات کے چالوکیہ راجاؤں کی تاریخ ہے) کی بدولت بہت مشہور رہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی ہندو پنڈت نے طنزاً اس سے کہا کہ وہ جین ہونے کے باوجود ایک ہندو کی مصنفہ گرامر پانینی سے مستفید ہو رہا ہے اس سے متاثر ہو کر اُس نے سنسکرت و پراکرت کی ایک بہترین گرامر تصنیف کی۔ اِس پنڈت کا راجپوت راجاؤں پر جو اثر تھا اُس کا حال اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بعض مقررہ دِنوں میں جانورکشی کی ممانعت کے اَحکام جاری کروائے تھے اور اس کی کوشش سے ان علاقوں کے جین مشنریوں کو بعض خاص حقوق بھی مِل گئے[2]۔ گجرات میں اہنسا کے عقیدہ کو جو اہمیت و قبولیت حاصل ہے اُس کی ابتدا اُسی عہد سے ہوتی ہے۔

چوہانوں کے علاقہ میں دریائے ستلج تک اُنہیں صدیوں میں جین دَہرم کی اشاعت ہوئی یہاں تک کہ مارواڑ کے پورے ویش طبقہ نے جین مت کو قبول کیا۔ اور مارواڑ کا تاجر

---

[1] ویدیہ۔ ڈون فال آف ہندو انڈیا صفحہ (۱۱۴)۔ [2] ویدیہ۔ ڈون فال صفحہ ۴۱۲۔

طبقہ جین مت کو دور دراز علاقوں تک لے گیا۔ مالوہ اور میواڑ کے آخری راجہ جو شیومت کے سخت حامی تھے وہ بھی جین مت کی عام اشاعت اور اس کی بڑھتی ہوئی لہر کو نہ روک سکے۔ عام طور پر ان راجاؤں کا طرز عمل جین مت کی نسبت بہت اچھا رہا۔ جس کی مثالیں۔ اس عہد کی تاریخ میں ملتی ہیں۔

شمالی ہند کے دوسرے علاقوں میں جین دھرم عوام اور راجاؤں دونوں میں مقبول نہ تھا گہاروال پال اور سین راجاؤں کی نظروں میں جین مت کی کچھ زیادہ وقعت نہ تھی۔ اسی سبب سے وسط ہند اور شمال مشرق میں اس دھرم کی زیادہ اشاعت نہ ہو سکی۔ گو ان علاقوں میں جین مت پھیلنے نہ پایا لیکن اس کا اہم عقیدہ یعنے "اہنسا" کا احساس یہاں کے باشندوں میں کچھ کم نہ تھا جین مت کے اس عقیدہ کی اشاعت ایک اور شکل میں ہونے لگی تھی۔ اور یہ شکل نئی ویشنوی تحریک تھی[۱]۔

بنگال میں یہ نئی ویشنوی تحریک بودھ اور جین مت کی طرح عقیدہ اہنسا کی حد درجہ حامی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ نئی ویشنوی تحریک جین مت اور سری کرشن (وشنو) کی پرستش دونوں عقاید کے ملاپ کا نتیجہ تھا۔ تو غلط نہ ہوگا[۲]۔ علاقہ مگدھ کے سوا اور علاقوں میں بودھ دہرم تقریباً مُردہ ہو چکا تھا۔ اور عام طور پر گوتم بودھ کو وشنو کا اَوتار سمجھا جانے لگا تھا۔

اِس طرح اِس نئی ویشنو تحریک نے جینیوں کے عقیدہ اہنسا کو اپنا بنایا۔ اور اُس کی سختی سے پابندی پر زور دیا۔ ساتھ ہی ویدوں کے اُصول قربانی کو بالکل ترک کر دیا۔ رسم قربانی۔ بودھ اور جین مت کے مشنریوں کا زبردست حربہ تھا جس کو اُنھوں نے ویدک مذہب اور برہمنیت کے خلاف استعمال کیا۔ لیکن ویشنوی تحریک نے اِس حربہ کو اپنے ہاتھ میں لیکر وشنومت کو پھر سے زندہ کیا۔ اور سری کرشن جی کی پرستش کو رواج دیا۔ جو عوام میں بہت جلد پھیل گئی۔ اِس تحریک نے نہ صرف ویدوں کے اُصول قربانی یا جانورکشی کی ممانعت کی بلکہ گوشت خوری

---

[۱] ویدیہ۔ ڈون خال صفحہ ۲۱۴ [۲] ویدیہ۔ ڈون خال صفحہ ۲۱۴۔

کو بھی ممنوع قرار دیا۔ دریائے سندھ سے برہم پترتک کے علاقہ میں یہ تحریک اس صدی میں عام ہوتی گئی۔ کشمیر کی تاریخ میں راجہ اونتی ورمن نے جو وشنو مت کا معتقد تھا جانورکشی یعنے جانوروں کی قربانی کے خلاف احکام نافذ کئے[1]۔ مہاراجہ پرتی ہارا بھوج بھی ایک پرم وشنو تھا۔ گھارول راجپوت جو لکشمی یا "سری" کے پرستار تھے۔ اور جن کا سمارتھ ہونا کتبات سے ظاہر ہے۔ "مہیشور" کہلاتے تھے اس کے باوجود یہ راجپوت عطائے زمینات وغیرہ کے موقعوں پر "واسودیو" (وشنو) کی پوجا کرتے تھے۔ مشرقی بنگال کے سین راجہ ابتدا میں سیوامت کے پیرو تھے لیکن ان کا مشہور اور آخری راجہ لکشمن سین پرم وشنو بن گیا۔ اور اہنسا کی حمایت کی۔ اس راجہ پر وشنوی تحریک کا اثر اڑیسہ کے جگناتھ (پوری) سے ہوا ہوگا۔ جو ان دنوں نئے وشنو مت کا مرکز تھا۔

اس طرح بارہویں صدی کی ابتدا میں شمالی ہند کے مغربی علاقے میں جین مت اور شمال و مشرقی علاقوں میں وشنو مت عام تھا۔ جین مت اور اس نئی وشنو تحریک میں نمایاں فرق یہ تھا کہ وشنوی تحریک لذت حیات کا پیغام لیکر اٹھی۔ اور جینی دھرم کا اصول ترک خواہشات تھا۔

سری کرشن کی زندگی کی اس پیرایہ میں تاویل کی جانے لگی جو عوام کو لذتِ حیات سے آشنا کرتی تھی۔ بہت جلد ہی سری کرشن کی اس قسم کی پرستش وسط ہند اور بنگال میں زندگی سے پورے طور پر لطف و لذت اٹھانے کے خیال کو تقویت دینے کا باعث ہوئی۔ چنانچہ اس تحریک نے ایک طرف تو جینیوں کی طرح اہنسا کے اصول کی اشاعت کی اور دوسری طرف ان کے اصول ترک دنیا و سنیاس کے خلاف لذت و عیش دنیا کے خیال کو پیش کیا۔ رفتہ رفتہ جب اس تحریک کو زیادہ عروج حاصل ہوا تو اس کا نتیجہ عام عیش و عشرت کی شکل

---

[1] راج ترنگینی مصنفہ کلہن ایڈیٹڈ رسٹن کنون۔

میں ظاہر ہوا۔ اِس عہد کے شمال مشرقی ہند کی ویشنو آبادی سری کرشن جی اور گوپیوں کی روایت یعنے سری کرشن کے عشق و محبت کے افسانوں کو صحیح سمجھتی تھی۔ اِس کا ثبوت اِس عہد کے مشہور پران۔ بھاگوت پران سے ملتا ہے جو کہ ویشنو یت کی تعلیم دیتا ہے۔ اِس میں کرشن اور گوپیوں کا قصہ تفصیل سے درج ہے۔ یہ قصہ اسی رنگ کے ساتھ درج کیا گیا ہے جیسا کہ اس عہد کے لوگ تصور کرتے تھے جس کو کہ بعد میں چلکر ویدانت کے اِستعارہ میں پوشیدہ کیا گیا۔ بھاگوت میں راجہ پریکشت۔ شک منی سے سوال کرتا ہے کہ "آیا ان بزرگ ہستیوں کے غیر اخلاقی افعال کی پیروی۔ عوام کو کرنی چاہیئے یا نہیں" تو اس کے جواب میں یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ واقعات محض تمثیلی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان کا مقصد تمثیلی پیرایہ میں انسانی روح کی اَعلیٰ خواہشات اور وصل بالحق ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ بلکہ شک جواب دیتا ہے کہ "بزرگوں کے افعال کی نہیں بلکہ اقوال کی پیروی کرنی چاہیئے"[1] کچھ عرصہ میں اس قسم کی تعلیم وعقائد کا نتیجہ رادھا مسلک کی شکل میں ظاہر ہوا اور بنگال کے راجہ لکشمن سین کے درباری شاعر جےدیو کی تصنیف "گیت گوبند" کرشن اور رادھا کے اِس قصہ کو نہایت دلچسپ پیرایہ میں بیان کرتی ہے۔ بنگال کی اس ابتدائی ویشنوی تحریک نے لذّتِ دنیا کو ترک دنیا سے اہم تر ہونے کی تعلیم دی۔ جس میں کہ چودہویں صدی میں سری ولبھاچاریہ اور چیتنیا آچاریہ کی تعلیم سے تبدیلی ہوئی۔ وشنومت کا یہ پہلو اہنسا کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عوام میں زیادہ مقبول ہوا اور ان علاقوں میں جین مت کی اِشاعت نہ ہوسکی۔

جنوبی ہند میں بھی اِس نئی ویشنوی تحریک کی ابتداء ہوئی لیکن اس میں اور شمالی ہند کے تحریک میں بہت فرق تھا۔ جنوبی ہند کا ویشنومت کرشن اور رادھا کی عاشقانہ روایت سے پاک تھا اور ایک حد تک ترک دنیا اور نفس کشی کی تعلیم کا حامی تھا۔ جنوب کی اس تحریک

---

[1] سی۔ وی ویدیہ ڈون فال صفحہ ۲۱۵۔

میں ویدوں کی تعلیم کے بہت کچھ اثرات تھے۔ اس نے برہمن تفوق و ورن آشرم دھرم کے اصول کی حمایت کرکے عوام کے کٹر مذہبی احساس کو زیادہ اپیل کیا۔ جنوب کے وشنومت نے شنکر آچاریہ کے مایا وادی فلسفہ کی مخالفت کی جس میں کہ قدیم بھگتی عنصر کی گنجائش نہ تھی۔ جنوب میں اس تحریک کے حامیوں نے اپنشدوں برہم سوتروں اور بھگوت گیتا کی نئی تاویل پیش کی[1] اس تحریک کی اشاعت اور اس کا فروغ بہت کچھ ایک زبردست وشنو آچاریہ کی کوششوں سے ہوا۔ علاقہ تامیل میں جو کہ قدیم سے وشنومت کا مرکز تھا ۱۰۱۶ئہ میں مشہور ویشنو لیڈر رامانج آچاری پیدا ہوئے۔ ویشنومت کے اس نئے مذہبی فلسفی نے شنکر آچاریہ کے فلسفہ ویدانت کی پرزور مخالفت کی۔ رامانج آچاریہ کی ابتدائی تعلیم مقام کنچی میں ایک ادویت گرو یادو پرکاش کے تحت ہوئی جب ان کی تعلیم سے اطمینان نہ ہوا تو انہوں نے الواروں کے پربندوں کا مطالعہ شروع کیا اور بھگتی اثر سے متاثر ہوئے۔ یمناچاریہ کے جانشین کی حیثیت سے انھوں نے سری رنگم میں (جو ترچناپلی کے قریب واقع ہے) ویشنومت کی تعلیم دینا شروع کی۔ اور کتب مقدسہ پر بہاشیہ لکھنے لگے۔ اس عہد کے چولا حکمران شیومت کے پیرو تھے جنھوں نے آچاریہ کی مخالفت کی۔ جس کی وجہ سے ان کو ہوشلہ راجا وشنو وردھن کے ہاں میسور میں پناہ لینی پڑی یہ راجہ جو جین مت کی طرف مائل تھا ان کا معتقد ہوگیا۔ رامانج آچاریہ نے ویشنومت کی اشاعت کا کام صرف جنوب کی حد تک محدود رکھا۔ بعد میں چلکر چودہویں صدی عیسوی میں رامانند نے شمال میں اس تحریک کو پھیلانے کی کوشش کی۔ رامانج آچاریہ کا ویشنومت قدیم پنج تنترا طریقہ کا تھا۔ جس میں نارائن اور ویشنو دیوتاؤں کا زیادہ اثر ہے۔ اور خدائے مطلق کی پرستش "نارائن" کے نام سے ہوتی ہے۔ اس میں مسلک رادہا کا نام و نشان نہیں ہے۔ ان کی تعلیم میں قدیم عقدہ بھگتی کو برہمن جامہ پہنایا گیا ہے۔ شودروں کو حصول مکتی یا موکش کے

---

[1] ڈاکٹر بھنڈارکر۔ ویشنوازم شیوازم اینڈ ویشنویٹ موومینٹس صفحہ ۵۱ و ۵۲

ناقابل سمجھا گیا۔ لیکن بعد میں راماننداس نے شمالی ہند میں اس چیز کو اپنی تعلیم سے خارج کر دیا اور صرف ذات کی بناء پر مکتی کا جو خیال تھا اُس کو دور کیا گیا جس کا تفصیلی ذکر بھگتی تحریک کے سلسلہ میں آئیگا۔

جس وقت کہ وشنوی تحریک مختلف شکلوں سے سیوا اور جین متوں کے خلاف چل رہی تھی جنوبی ہند کے علاقہ کرناٹک میں شیوامت ایک نئے رُوپ یعنی لنگایت یا ویرسیوا فرقہ کی شکل میں نمودار ہوئی۔ بسوا بانی تحریک وجین سپہ سالار سلطنت چالوکیہ کا برہمن وزیر تھا بسوا ایک مصلح مذہب و مفکر تھا۔ بسوا کے عقاید اس قدر صاف اور عجیب ہیں کہ اُسے ایک نئے فرقہ کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ بسوا پران کی رو سے بسوا نندی کا اوتار ہے جس کو کہ شیو نے اپنے پرستش کو پھر سے زندہ کرنے کے لئے دنیا میں بھیجا۔ ویراسیوامت اپنے عقاید و اصول کی نوعیت سے اُس وقت کے دیگر فرقوں سے بہت سی باتوں میں مختلف تھا۔ اولاً بسوا نے ورن آشرم دھرم (ذات پات) کو تسلیم نہیں کیا۔ بسوا۔ کالاچوری کے جین راجہ کا وزیر تھا۔ یہ دونوں ذات پات کے مخالف تھے لیکن اُن کے درمیان چند اور عقاید کی بنا پر اختلاف ہوا۔ بسوا نے خزانہ سرکاری سے ایک کثیر رقم جنگم و لنگایت شیریوں پر صرف کی جس سے راجہ ناراض ہو گیا۔ اور بسوا کو اِس علاقہ سے نکل جانا پڑا۔ اِس واقعہ کا ثبوت اِس سے بھی ملتا ہے کہ ۱۱۶۷ء میں ایک جنگم نے راجہ وجین کالاچوری کو قتل کیا جس سے جین اور لنگایت مذہب کے ہندوؤں میں دشمنی کی ابتداء ہوئی۔ رفتہ رفتہ اس مذہب کی اشاعت علاقہ کنتلا اور جنوبی مہاراشٹر میں ہونے لگی۔ بالاخر یہ جین دھرم کو علاقہ کرناٹک سے خارج کر کے رہا۔ اس فرقہ نے اُصول اہنسا کو تسلیم کر کے عوام کی تائید حاصل کی اور ساتھ ہی ذات پات کو تسلیم نہ کر کے برہمنوں کے سوائے اور دوسری ذاتوں خاص کر ویش اور شودروں کو اپنی طرف متوجہ کیا اس نے صاف طور پر برہمن تفوق کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور ہر شخص کو بلا تفریق ذات پات مکتی کے قابل بتلایا۔ جنوب کے ویشنو ذات پات کے اُصول سے خود کو آزاد نہ کر سکتے تھے۔

لیکن ویرسیوا فرقہ نے نہایت دلیری سے ذات پات کے اُصول کی مخالفت کی اور اُسی فرقہ کی بدولت برہمن اور دیگر ذاتوں حتیٰ کہ چنڈلیوں تک کے درمیان تعلقات قایم ہوئے اِس فرقہ نے سنیاس اور تپ کے اُصولوں کی بھی مخالفت کی۔ اِس طرح جین مت سے بھی سبقت لے گیا۔ اس نے اس پر زور دیا کہ ہر شخص محنت کر کے اپنی زندگی بسر کرے اور مذہبی گداگری کی ممانعت کی۔ اِس مصلح مذہب نے تلقین کی کہ صرف محنت (کا یکہ) کیلاش تک پہونچاتی ہے۔ وہ اخلاقی زندگی کی سختی سے پابندی کے باب میں جین اور بدھ متوں سے بھی آگے بڑھ گیا۔ لنگ کے روپ میں شیو کی پرستش کے قدیم طریق کو زندہ کیا گیا۔ اس فرقہ کے پیرو برہمنوں کے مقدس دھاگہ (جنیؤ) کے بجائے لنگ باندھتے ہیں۔ یہ پہلا مصلح ہے۔ جس نے اپنے مذہبی کتب کو سنسکرت زبان کے بجائے کرناٹک کی کنڑی زبان میں تصنیف کیا۔ اِس فرقہ کے عقائد کی رو سے عورتیں لنگ دھارن کرسکتی اور موکش حاصل کرسکتی ہیں۔ بسوا کی تصانیف میں شٹستھلا وچن۔ آلا گیان وچن۔ راج یوگ وچنا۔ زیادہ مشہور ہیں۔

اِس فرقہ کا دائرہ اِس قدر وسیع تھا کہ اس میں اچھوت بھی شامل ہو سکتے تھے۔ یہ اپنے مردوں کو جلانے کے بجائے دفن کرتے ہیں اور بیواؤں کو شادی کی اجازت ہے۔ اِس فرقہ کا سب سے بڑا مٹھ جنگل ورگ علاقہ ریاست میسور میں ہے۔ بسوا کا مشہور پیرو جن بسوا تھا۔ جس کو کہ اِس فرقہ کے پیرو وشنو کا اوتار بتلاتے ہیں۔ اِس فرقہ کے عقائد سے اِس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اِصلاح مذہب میں یہ فرقہ اور فرقوں سے بہت آگے بڑھ گیا۔ اور اس کے عقائد زیادہ عام فہم تھے جس کی وجہ سے عوام اِس طرف زیادہ راغب ہوئے۔ یہانتک کہ جین مت کو کرناٹک سے خارج ہونا پڑا۔ ذات پات کے اُصول سے انحراف و دیگر لبرل عقائد سے اِس بات کا قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اِس فرقہ کے بانی پر ضرور اِسلام یا اِسلامی عقائد کا اثر پڑا چونکہ جنوبی ہند کی عام فضا میں اِسلامی تعلیمات کا جو اثر تھا اس سے ظاہر ہے کہ

یہ لوگ غیر دانستہ طور پر متاثر ہوئے ہوں گے۔

اِس طرح پٹھانوں کے عہد کے اِبتدائی دَور میں مغربی ہند میں جین مت جنوب میں سیوامت اور مشرق و شمال میں وشنومت پھیل رہے تھے۔ جنوبی ہند کا ایک حصہ بھی ویشنوی عقائد سے متاثر تھا۔ اِن مذہبی فرقوں میں اور بھی چھوٹے فرقے پیدا ہو رہے تھے۔ اِن فرقوں نے مختلف دیوی دیوتاؤں کو اپنا سب سے اعلیٰ معبود مانا۔ نہ صرف اسی حد تک بلکہ دوسرے دیوتاؤں کو اپنے اعلیٰ دیوتا سے کمتر بتلانے کی کوشش کی۔ سیوا۔ وشنو فرقوں کے ساتھ ساتھ درگا یا دیوی اور گنیش کی پوجا کی ابتدا ہوئی اور ان دیوتاؤں کے آگم (طریق پرستش) جُدا جُدا تھے۔ اِن مختلف فرقوں کی تعلیم سے ہندوؤں کی سماجی زندگی میں تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ اور عام لوگ بجائے فلسفیانہ مسائل پر بحث کرنے کے معمولی معمولی عقائد و اُصول پر کہ کونسا دیوتا برتر ہے۔ برہمنوں کی حیثیت کیا ہے۔ مذہبی منتروں کے لیئے تجرّد ضروری ہے یا نہیں۔ آیا عورتیں نجات کے قابل سمجھے جاسکتے ہیں یا کیا۔ غرض اس قسم کے مسائل سے ہندوؤں میں اختلافات میں اِضافہ ہوتا گیا۔

اِن مختلف و متضاد فرقوں۔ اور منون میں جو عقیدہ عام تھا وہ اُصول اَہنسا تھا ہر ایک فرقے نے گوشت خوری کی ممانعت کی اور جانور کشی کو ممنوع قرار دیا۔ شمالی ہند اور مہاراشٹر میں شیوامت کے پیرو کثیر تعداد میں تھے۔ یہ سمارت یعنے شنکر آچاریہ کے معتقد تھے۔ جس میں ہندوؤں کے پانچوں بڑے دیوتاؤں کو بڑا رتبہ دیا گیا تھا۔ مشرقی وجنوبی ہند میں ویشنو اور شیوا فرقوں کے درمیان جنھوں نے جین مت کی جگہ لی تھی آپس کی مخاصمت کے مظاہرے ہو رہے تھے۔ اِن آئے دن کی فسادوں سے تنگ آکر چند کو اِن دو فرقوں کے اتحاد پیدا کرنے کا خیال ہوا۔ وجین سین نے جو شیوامت کا پیرو تھا ایک مندر ”پردمیشور“ کی تعمیر کی پردمینشور کی مورتی شیوا اور وشنو کے اِتحاد سے بنی تھی۔ بنگال کے اِس اِتحادی جذبہ کا اِظہار مہاراشٹر میں بھی ہوا۔ پنڈھرپور کے وٹھوبا کا مندر

اسی کوشش کا نتیجہ ہے۔ مہاراشٹر اور بنگال کے اس اتحادی تحریک میں فرق یہ تھا کہ وٹھوبا کے ساتھ گوپیوں کا قصہ نہ تھا حتیٰ کہ رکمنی دیوی کے بت کا بھی بعد میں ذکر ملتا ہے۔ وٹھوبا کی مورتی میں شیو اور وشنو دونوں کی جھلک موجود ہے۔ وٹھوبا کی پوجا اور بھگتی کی تحریک تیرہویں صدی میں شروع ہوئی۔ مہاراشٹر اور بنگال کے یہ مندر۔ دویت اور ادویت کے مسائل سے پاک ہیں ان میں نہ تو شیومت کی مخالفت ہے اور نہ ویدک رسوم کی۔ ذات پات کی بھی کوئی سختی سے پابندی نہیں کیجاتی۔ بلکہ ہر ذات کے شخص کو اس مندر میں داخل ہونے اور پوجا کرنیکا حق حاصل ہے۔ غرضیکہ یہ بھگوت گیتا کی بھگتی لوگ کا اثر معلوم ہوتا ہے "پردمیشور" اور "وٹھوبا" کی پوجا میں جو جذبہ کام کر رہا تھا وہ تیرہویں و چودھویں صدی میں نام دیو (۱۲۷۰ء) گیانیشور و دیگر بھگتی مصلحین کی تعلیم کی شکل میں ظاہر ہوا۔

اس زمانے کے ہندوؤں میں مکتی و موکش یعنے حصول نجات کے متعلق جو مختلف خیالات و نظریئے تھے ان کا ذکر ان مختلف فرقوں کی تعلیمات میں موجود تھا۔ موکش سے مراد۔ جنم اور کرم سے آزاد ہونا اور معرفت حقیقی ہے۔ البیرونی نے ان کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے "ہندوؤں میں موکش یا نجات کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض کا عقیدہ ہے کہ صرف برہمن و کشتری ہی نجات پا سکتے ہیں کیونکہ صرف انہیں ہی کو ویدوں کے پڑھنے کا اختیار ہے لیکن دوسروں کا خیال ہے کہ ہر ایک کو مکتی کا حق ہے۔ جیسا کہ ویاس نے کہا ہے پچیس[25] کا علم حاصل کرو بلا تفریق مذہب و ذات نجات حاصل ہوگی[1]۔ پھر بھگوت گیتا کی تلقین ہے کہ "ہر ایک عورت ویش اور شودر مجھ تک پہونچ سکینگے اگر وہ میری پیروی کریں دھرم برہمنوں تک ہی محدود نہیں ہے[2]۔ البیرونی کا یہ بیان دسویں صدی کے بعد ہی ہندوؤں کی مذہبی زندگی کے صحیح مطابق

---

[1] البیرونی کتاب الہند ترجمہ ساخو جلد اول صفحہ ۱۰۴۔

[2] " " " " " " صفحہ ۱۰۴

نتیجہ ہے اُپنشدوں کے معتقد آریاؤں کا عقیدہ تھا کہ حصول موکش کا صحیح ذریعہ ترک دُنیا اور سنیاس ہے یہی خیال بودھ اور جینیوں نے لیا۔ برہمنوں نے عورتوں اور شودروں کو سنیاس لینے اور ویدوں کے مطالعہ کی اجازت نہ دی۔ اِس طرح اُن کو مکتی کے ناقابل قرار دیا۔ لیکن بھگوت گیتا نے اُن کو ایک اور ذریعہ نجات کا بتلایا۔ وہ یہ کہ چونکہ عورتوں اور شودروں کو ویدوں کے پڑھنے کا اختیار نہیں ہے پر بھی وہ بھگتی کے ذریعہ اِس رتبہ کو پہونچ سکتے ہیں۔ ویاس نے گیان پر زور دیا جو سانکھیہ کی تعلیم تھی۔ اور تلقین کی کہ خدا کو پہچانو اور نجات پاؤ۔ بارہویں اور تیرہویں صدی میں جب برہمنوں کو زور رہوا۔ تو اُنھوں نے برہمن اور چھتری کے سوا کسی کو وید کے پڑھنے کی اجازت نہ دی۔ گو چھتریوں کو وید پڑھنے کی اجازت تھی لیکن بعد میں اُنھیں بھی سنیاس کا نااہل قرار دیکر مکتی کے ناقابل بنا دیا۔ اور اِس عہد میں صرف برہمن ہی موکش کے حقدار سمجھے جانے لگے۔ وشنو نظریہ نجات۔ ویدانتی نظریہ سے مختلف تھا لیکن رامانج آچاریہ نے جو کٹر مذہبی تھے۔ سنیاس ہی کو ذریعہ نجات بتلایا۔ ویراشیوا نے بتلایا کہ ہر ایک اِنسان کو بشمول عورت نجات یعنی کیلاش میں شیو کی خدمت کا حق حاصل ہے بودھوں نے موکش کو نروان کہا اور نروان کے لئے سنیاس کو لازمی قرار دیا ساتھ ہی عورتوں کو بھی سنیاس کا اختیار دیا۔ جینیوں میں انتہائی ترک دنیا حصول نجات کے لئے ضروری تھی۔

اِن گوناگون تبدیلیوں اور مختلف مذہبی فرقوں کے وجود میں آنے و دیگر وجوہات سے جن کا بیان ہوچکا ہے قدیم ہندو مت یعنے ویدک آریوی مت نے اپنی شکل تبدیل کر کے ہندو مت کی شکل اختیار کی۔ ویدوں کا مطالعہ صرف ایک طبقہ یعنے برہمنوں تک محدود ہوگیا جو ویدوں کو حفظ کیا کرتے تھے۔ کیونکہ ویدوں کی حفاظت انھی کا فرض سمجھا جاتا تھا۔ البیرونی کا بیان ہے کہ بہت کم لوگ (برہمن) ویدوں کے معنے و مطلب کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے اکثر تو بغیر معنی سمجھے اُسے حفظ کرتے تھے۔ بودھ دور سے پہلے ہر ایک برہمن کشتری اور ویش کے لئے ویدوں کا مطالعہ ضروری تھا۔ اور اِس عہد میں برہمن۔ چھتریوں کو ویدوں کی تعلیم

تو دیتے ہیں لیکن چھتریوں کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ وہ برہمنوں تک کو سکھائیں۔ ویش اور شودروں کو ان کے مطالعہ کی اجازت نہیں ہے[1] چونکہ ویش طبقہ کے اکثر افراد بودھ مت کے پیرو تھے اس وجہ سے ان کا ویدوں سے تعلق جاتا رہا۔

ویدوں کو تحریر میں لانے کی ممانعت تھی کیونکہ اس کا تلفظ اور قرأت بعض خاص اصول کے تحت ہوتی تھی۔ اور اس خوف سے کہ کہیں کوئی غلطی سرزد نہ ہو جائے۔ ان کو تحریر میں لانیکی کوشش نہیں کی جاتی یہی وجہ تھی کہ ویدوں کا کچھ حصہ ضائع اور فراموش ہو چکا تھا۔ اس عہد سے کچھ عرصہ قبل کشمیر کے ایک برہمن وشواکرانے ویدون کو تحریر میں لانے اور اس پر تفسیر لکھنے کی کوشش کی۔ اس کا پتہ نہیں ہے کہ یہ تصنیف اس وقت موجود ہے یا نہیں۔ لیکن قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تیرہویں صدی میں مدھواچاریہ اور رودیارنیانے ویدوں کی تفسیر میں اس تصنیف سے مدد لی ہوگی۔

قدیم آریوں میں ویدک قربانیوں۔ ہوم اور یگین کا خاص رواج تھا لیکن موجودہ عہد میں ویدوں کا اثر بہت کم ہو گیا تھا۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کسی گھر میں بھی ویدک آگ روشن نہیں کی جاتی تھی۔ دسویں صدی عیسوی میں بعض برہمن گھرانے ایسے باقی تھے جن میں ہوم اور یگین کئے جاتے تھے اور وہ برہمن جو ایک آگ روشن کرتے "اِسٹھن" کہلاتے۔ اور تین آگ روشن کرنیوالوں کو اگنی ہوتری کہا جاتا تھا[2] لیکن رفتہ رفتہ چودہویں صدی میں ویدک یگین اور رسوم کا وجود بہت کم ہو گیا بعض خاص رسوم مثلاً دان یعنے عطائے زمین یا مذہبی رسم یگنوپیت (اپ نین) زنار بندی اور شادی بیاہ کے وقت ویدک یگن اور ہوم کئے جاتے تھے۔ اور ساتھ ساتھ پورانک دیوتا وشنو اور شیو کی پوجا کی جاتی تھی۔ راجپوت راجاؤں میں بھی یہ رسوم یعنی

---

[1] البیرونی۔ ترجمہ ساخو جلد اول صفحہ ۱۲۸۔

[2] " " " " " ۱۰۲۔

آگ میں گھی ڈالکر ویدک منتروں کو پڑھنے کا رواج خاص خاص رسوم کے وقت موجود تھا حتیٰ کہ جین مت کے پیرو بھی اِن ویدک رسوم کے بعد دان قبول کرتے تھے[1] بالعموم ہندو مذہب پر پرانوں کا اِنتہا درجہ اثر تھا۔ ویدک طریق عبادت یعنے ترپن۔ ہون۔ سوریو اپاستھن کے بجائے پرانک دیوتاؤں شیو وشنو۔ دیوی اور گنیش کی پُوجا عام تھی۔ اور سوریا دیوتا کی اپاسنا روزمرہ کی عبادت میں شامل تھی۔ ویدک سوتروں میں مُورتی پُوجا کا ذکر نہیں ہے اور نہ "ویدک ہند" میں مورتی پوجا کے وجود کا ہی حال ملتا ہے۔ لیکن بودھ مت کے زوال کے وقت گوتم بدھ کی مورتی عام طور پر پوجی جانے لگی۔ اور اس عہد کے تمام مندروں میں گوتم بُودھ کی مورتیاں ملتی ہیں۔ اِسی وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوؤں میں مورتی پُوجا کا رواج بودھ مت کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ اور اسی عہد سے ہر گھر میں مورتی کی پُوجا ہونے لگی۔ اور ہندو مندروں کی تعمیر کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس زمانے کے مذہبی کتابوں میں مورتی پُوجا کے طریقے اور ہدایات ملتے ہیں۔ راجاؤں کے دان پتروں میں مورتی پُوجا کا ذکر ہے مندروں میں سُونے چاندی اور قیمتی پتھروں کی مورتیاں ستاپن کیجانے لگیں۔ گیارہویں صدی میں مُورتی پُوجا عام تھی۔ ملک میں ہر طرف ہندو مندریں موجود تھیں۔ ہندو راجا اور دولتمند تاجر اِن مندروں کی تعمیر میں ایک دوسرے سے سبقت لیجانیکی کوشش کرتے تھے۔[2] مسلمانوں کے آمد کے وقت مُورتی پوجا عام ہندوؤں میں زیادہ رائج تھی اور تعلیم یافتہ پنڈتوں میں اُن کی زیادہ اہمیت نہ تھی۔ بارہویں اور تیرہویں صدی میں مندروں اور مورتی پُوجا کی اہمیت میں اِضافہ ہوتا گیا۔ اور یہ چیزیں اِن کی زندگی کا لازمی جزو بن گئی۔ اِس عہد کے کتبات میں مختلف مندروں دیوتاؤں اور اُن کی پُوجا کا حال ملتا ہے۔ جس طرح جین اور بودھ دھرم کے مشنریوں راہبوں (بھکشوؤں) اور سنیاسوں کے لئے وہار موجود تھے اِس طرح اسلامی

---

[1] سی۔ وی ویدیہ ڈاون فال صفحہ ۴۴۴۔ [2] سی۔ وی ویدیہ ڈاؤن فال صفحہ ۴۲۵۔

عہد کی ابتداء اور اُس کے بعد کی صدیوں میں ہندو مٹھوں کی تعمیر ہوتی گئی یہ مٹھ ہندو سنیاسیوں اور تپسیوں کی جائے سکونت تھے۔ بودھ مت کے زوال کے بعد اُن کے مٹھ پر ہندو قابض ہو گئے یہ اکثر مندروں کے قریب یا دریا کے کنارے ہوا کرتے تھے جہاں کے اُن مذہبی فرقوں کے راہب اور سرگروہ اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ اکثر راجا اور امراء ان وہاروں اور مٹھوں کو اپنے صرفہ سے تعمیر کر کے اُن کے حوالے کرتے تھے۔ جنوبی ہند میں یہ مٹھ کثیر تعداد میں تھے اور اب بھی ہیں۔

اِن مختلف فرقوں اور متوں کے لاتعداد دیوی دیوتاؤں کے پوجا کے طریقے اور اُن کے پیرون کے تپ اور سنیاس کے صدہا اُصول کے تعین کی خاطر بہت سی تنتروں کی ابتداء ہوئی یہ ہندوؤں کے پانچوں دیوتاؤں کے طریق عبادت سے متعلق ہیں۔ اِن پانچ دیوتاؤں کے علاوہ جو دیوتا تھے اُن کے پُوجا کے طریقے بھی الگ ہیں۔ اِن فرقوں میں تمیز کی خاطر اُن کی علامات بھی جُدا جُدا رکھی گئی تھیں۔ جو پیشانی پر ٹیکون کی شکل میں ظاہر کی جاتی تھیں چونکہ ویدک تپ اور سنیاس صرف برہمنوں کے حد تک تھے اس لئے عام ہندوؤں کے لئے سنیاس اور تپ طریقے آگموں میں بتلائے گئے ہیں اِن آگمون اور تنتروں کی اِبتداء سری شنکر آچاریہ کے قبل ہی سے ہو چکی تھی لیکن دن بدن اُن کی اہمیت میں اِضافہ ہوتا گیا اور خاصکر اس عہد کے کتبات میں بھی مختلف سنیاسیوں اور تپسیوں کا ذکر ہے۔

مذہبی اَدب میں اِضافہ کے ساتھ ساتھ مذہبی رسوم میں اِضافہ ہوتا گیا۔ اور ملک کے ہر حصہ میں دھرم شاستر کا مطالعہ عام ہو گیا۔ برہمن پنڈتوں نے اِن رسوم پر بہت کچھ لکھا۔ وگیانیشور کی تصنیف متاکشرا اور راجہ اپرادیتہ کی " اپارکا " کے علاوہ بنگال میں بلّل سین کی دان ساگر وغیرہ تصنیف ہوئیں[1]۔ رائے لکشمن سین کے درباری پنڈتوں کے تصانیف میں برہم کرم سموچہہ

---

[1] فرکہر۔ اوٹ لین آف ہسٹری آف ریلیجیس لیٹریچر ان انڈیا۔

مشہور تصنیف ہے۔ قنوج میں گووند چندر کی سرپرستی میں دھرم شاستر پر مضامین لکھے گئے۔ چودہویں صدی میں پنڈت ہیمادری کی ضخیم تصنیف "چتور ورگ چنتامنی" تصنیف ہوئی[1]۔ ان تصنیفات میں ویدک آریوں مت پران اور تنتریک عہدوں سے گذرتی ہوئی ہندو مت کی موجودہ شکل اختیار کرنیکا حال ملتا ہے۔ نئے نئے رسوم مثلاً ورت اور رتھ یاترا وغیرہ کی ابتدا اسی عہد میں ہوئی غرضیکہ پورانک دیوی دیوتاؤں اور رسوم نے قدیم ہندو مت کی جگہ لیلی۔

پورانک ادب میں مذہبی فرقوں کی پیدائش سے اور بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ان پرانوں میں پانچ ہندو دیوتا۔ شیو وشنو۔ دیوی گنیش اور سوریہ کی عظمت اور برتری بتلائی گئی ہے۔ اور ان کے مختلف مندروں اور اُن کی اہمیت کا اظہار ہے۔ اٹھارہ سمرتیوں اور اٹھارہ پرانوں کے علاوہ گیارہویں صدی کے بعد سے بہت سی چھوٹی چھوٹی سمرتیوں اور پرانوں کا وجود ہوا۔ ان پرانوں اور سمرتیوں کے مطالعہ سے اس عہد کے ہندو مت کا صحیح حال معلوم ہوتا ہے۔ مذہبی رسوم و رواج کی پابندی کی سختی کا یہ حال تھا کہ ان رسوم کے انجام نہ دینے پر ذات سے خارج کیا جاتا۔ ایک مرتبہ ذات سے خارج ہونے کے بعد دوبارہ اس میں داخل ہونا دشوار تھا۔ جب کوئی ہندو مسلمان بنایا جاتا اور بعد میں اگر وہ پھر سے ہندو بننا چاہتا تو ممکن نہ تھا اس عہد کا ہندو دھرم انتہا درجہ عدم رواداری تھا۔

ابتدائی اسلامی دور کے ہندوؤں کی مذہبی زندگی پر ایک سرسری نظر کے بعد اُن کے عمرانی زندگی کے ایک اور پہلو یعنی تنظیم ذات پات کا مطالعہ ضروری ہے کیونکہ یہ معاشری ادارہ ہندوؤں کی معاشرت کا بنیادی ادارہ ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ پر اس ادارہ کا اثر ہے۔ موجودہ ہندوستان کے ہندوؤں کی معاشرت میں ذات پات کو جو اہمیت حاصل ہے اُس سے ہر ہندوستانی واقف ہے۔ یہ ادارہ مختلف دور سے گذرا۔ اور یہاں کی

---

[1] فرکہر۔ آوٹ لین آف ہسٹری آف ریلیجیس لیٹریچر ان انڈیا۔

معاشرتی تاریخ کے ہر دور میں اس کا وجود تھا۔ ویدک عہد کی تنظیم ذات پات اور موجودہ عہد کی تنظیم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ابتداء (ویدک عہد) میں اس ادارہ کی نوعیت تمام تر نسلی اور معاشی تھی علم معاشیات کے اہم اُصول تقسیم عمل پر اس کا انحصار تھا۔ لیکن تیسری صدی یعنی مشہور ہندو مقنن منو کے عہد میں اس کی نوعیت بدل گئی۔ اور یہ معاشی ادارہ معاشرتی زندگی کا اہم جزو بن گیا۔ یہانتک کہ امتداد زمانہ سے اُس نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا۔ اس تنظیم کے اصول و قوانین میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ اور اسلامی حکومت کے قیام کے وقت اس میں وہ تمام خصوصیات داخل ہوگئیں جو موجودہ عہد میں موجود ہیں۔ ابتدا میں ذاتیں بجائے مذہبی طبقوں کے معاشرتی طبقے خیال کئے جاتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان پر مذہبی رنگ غالب آگیا۔ پھر ان ذاتوں کی تقسیم در تقسیم ہونے لگی۔ اور صدہا فرقے بن گئے۔ برہمن کشتری۔ ویش اور شودر کے علاوہ اور ذاتیں وجود میں آئیں اور ہر ایک ذات بہت سی فرقوں میں منقسم ہوگئی۔ ان فرقوں میں آپس میں شادیاں اور کھانا پینا ممنوع ہوگیا۔ اس طرح اسلامی عہد کے ابتدا میں ہندو قوم کا عمرانی اتحاد ان صدہا ذاتوں کے وجود سے فنا ہوگیا۔ اس تنظیم کے خلاف بدھ مت نے زبردست صدائے احتجاج بلند کی اور اس کو اپنی زندگی سے خارج کر دیا تھا لیکن جونہی بودھ مت کو زوال اور برہمنیت غالب ہوئی از سر نو یہ تنظیم نئے جوش سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے اصولوں میں سخت گیری پیدا ہوگئی۔

دسویں صدی عیسوی میں پنجاب کی سماجی زندگی کے متعلق لکھتے ہوئے البیرونی کا بیان ہے کہ" چاروں ذاتوں کے افراد آپس میں ایک دوسرے کے پاس کھاتے اور ایک جگہ بود و باش کرتے ہیں[1] البیرونی کا یہ بیان صرف پنجاب کے ہندوؤں کی حد تک

---

[1] البیرونی ترجمہ ساخو جلد (۱) صفحہ ۹۹ تا ۱۰۱۔

صحیح تھا جہاں کہ تقریباً تمام باشندے گوشت خور تھے۔ لیکن ہندوستان کے دوسرے حصص میں حالات مختلف تھے۔ اگر دسویں صدی میں یہ حالت تھی تو بعد کی صدیوں میں اور اسباب کے علاوہ عقیدۂ اہنسا کی اشاعت سے حالات بہت جلد بدل گئے۔ دسویں صدی تک چار ذاتیں بغیر تقسیم در تقسیم ہوئے قایم رہیں۔ گیارہویں صدی کے بعد سے ہر ایک ذات میں متعدد ذاتیں پیدا ہوگئیں جس کا اظہار اِس عہد کے کتبات سے ہوتا ہے۔ اِن ذاتوں کے اس طرح پارہ پارہ ہونے کے وجوہ ایک تو غیر ملکیوں کی آمد سے نسلی پاکیزگی اور برتری کا خیال دوسرے غذا میں اختلاف تیسرے مختلف حصص ملک کے رسم و رواج میں اختلاف یہ وہ اسباب تھے جن سے ہر ایک ذات اور فرقہ کا دائرہ محدود ہوگیا۔

اِس ابتدائی عہد کے ذات پات کے مطالعے سے ہمیں بعد میں چلکر یہاں کی معاشرت پر جو اسلامی اثرات ہوئے اور اسلامی اثرات سے ہندوؤں میں جو معاشری تحریکیں پیدا ہوئیں اُن کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ اسلامی عہد کے قبل دسویں صدی تک تمام ملک کے برہمن صرف ایک ہی ذات کے تھے۔ اور ان میں تمیز صرف اُن کے گوترا اور شاکہہ سے ہوتی تھی۔ گیارہویں صدی کے ابتدا تک یہی عمل ہوتا رہا۔ سنہ ۱۰۵۰ء کا ایک چنڈیلہ کتبہ معطلی کو بھار دواج گوتر۔ تری پرورا۔ برہمن اور یجروید شاکہہ کا بتلاتا ہے بعد ۱۱۷۰ء کے ایک کالاچوری کتبہ میں برہمنوں کے صرف گوترا اور شاکہہ کا ذکر ہے[۱]۔ اِس کے بعد ان برہمنوں کے جائے سکونت کا نام آتا گیا یعنے کسی برہمن کا ٹگر برہمن یا ٹہاکر برہمن ہونا ظاہر کیا گیا ہے۔ پھر ملک کا نام جس کا کہ وہ باشندہ ہے شامل ہوگیا (مالوہ کا کتبہ ۱۱۳۵ء[۲])۔ جائے سکونت اور ملک کی اِس قدر اہمیت ہوگئی۔ کہ بعد کے بعض کتبوں میں گوترا اور پرور کے بجائے صرف ملک کا نام ہے ۱۲۵۶ء اور سنہ ۱۳۰۱ء کے کتبوں میں گوترو غیرہ کے بجائے

۱؎ اپی گرافیکا انڈیکا جلد (۷) صفحہ ۸۶ — ۲؎ انڈین انٹیکوری جلد (۱۴)

صرف فرقہ یا جاتی کا نام آگیا[1]۔ رفتہ رفتہ خاندانی نام کی اس قدر اہمیت ہوگئی کہ ہر برہمن کے نام کے ساتھ خاندانی موجود تھا۔ یہ نام۔ دکیشت۔ اوت۔ ٹھاکر۔ پہاٹک۔ اپادھیائے پٹور دھن۔ پنڈت۔ دردویدی اور چترویدی وغیرہ ہیں[2]۔ ان خاندانوں اور فرقوں کے نام کے ساتھ ان کی جائے سکونت مثلاً متھرا۔ ترپور۔ ڈنڈوانہ وغیرہ کے نام بھی لگائے جانے لگے۔ ان فرقوں کے درمیان رفتہ رفتہ شادیاں بھی بند ہونے لگیں۔ منو کے عہد میں صرف ہم گوتر نہ ہونا ہی شادی کی شرط تھی لیکن تبدیلی زمانہ سے ان برہمنوں کے چھوٹے چھوٹے فرقوں کے درمیان شادی بیاہ اور کھانے پینے کے تعلقات مفقود ہوگئے تیرہویں صدی سے پنج گوڑ اور پنج دراوڑ۔ سمارت۔ سری ویشنو اور مدہوا وغیرہ کی تفریق شروع ہوئی۔ تقریباً تمام برہمنوں میں گوشت خوری اور منشیات کا استعمال ممنوع تھا۔ اور گوتر کی اہمیت تمام فرقوں میں موجود تھی ان برہمن فرقوں اور ذاتوں کے علاوہ سیاح مارکو پولو (سن ۱۲۹۳ء) جنوبی ہند کے ایک اور فرقہ لاڈ برہمن کا ذکر کرتا ہے[3]۔

چھتریوں میں حکمران طبقہ "راجپوت" کے نام سے موسوم ہوگیا۔ اور ان کے دوسرے طبقے جو زراعت پیشہ تھے اُن کی وقعت میں کمی ہوگئی۔ قدیم سے عام طور پر حکمران خاندان خواہ وہ کسی ذات کا کیوں نہ ہو چھتری ذات میں شمار کیا جاتا تھا اور جب پرانوں کے عہد کے خاتمہ پر راجپوت دَور شروع ہوا تمام راجپوت کشتری سمجھے جانے لگے۔ عام طور پر جنوبی ہند کے حکمران خاندانوں کو خالص کشتری نسل سے سمجھا نہیں جاتا تھا۔ پھر بھی مہاراشٹر کے حکمران خالص چھتری ہونیکا دعویٰ کرتے تھے اور شمال کے راجپوت راجاؤں سے ازدواجی تعلقات

---

[1] انڈین انٹیکوری جلد (۱۱) صفحہ ۲۔
[2] اپی گرافیکا انڈیکا جلد (۹) صفحہ ۱۰۸ اور ۱۲۱۔
[3] میس یول۔ انڈیکا مارکو پولو۔ جلد دوم صفحہ ۳۶۰۔

قایم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ راجپوتوں میں قبیلہ کے نام کی اِس قدر اہمیت تھی کہ کتبات میں قبیلہ کو گوتر بتلایا گیا ہے مثلاً گہیل گوتر پرتی ہار اگوتر وغیرہ۔ پرتھی راج راسو میں مختلف چھتری خاندانوں کی فہرست موجود ہے۔ لیکن مہاراشٹر کے سلہار خاندان کے سوائے جنوبی ہند کے گنگا چولا۔ پانڈیا اور کیرالا خاندانوں کے نام اِس فہرست میں نظر نہیں آتے۔ اِس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ جنوبی ہند کے اِن خاندانوں کو خالص چھتری نسل سے نہیں سمجھا جاتا تھا شمال کے راجپوت راجا۔ دکن کے اُن چھتری خاندانوں سے اِزدواجی تعلقات قایم کرنا ہتک خیال کرتے تھے۔ اِس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ سن ۱۳۰۱ئہ میں گجرات کے راجہ کرن واگھیلہ نے دیوگری کے یادو راجہ کو اپنی بیٹی دیول دیوی کو دینے سے صرف اِسی بنا پر اِنکار کیا کہ وہ خالص چھتری نسل سے نہ تھا۔ پنجاب کے مغربی حصہ کے چھتریوں میں سے اکثر محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کے عہد میں مسلمان بن گئے جو اَب تک قدیم کھتری قبیلوں کے نام اِستعمال کرتے ہیں اور بعض ہندو رسوم برتتے ہیں۔ بچوں کی پیدایش اور شادی کے موقعوں پر برہمنوں کو بلاتے ہیں۔ اِس طرح راجپوت یا چھتری ذات اس زمانے میں تین طبقوں میں منقسم تھی۔ پہلا طبقہ (۳۶) خاندانوں پر مشتمل تھا جو راجپوتانہ۔ کاٹھیاواڑ، گجرات مالوہ اور صوبہ متحدہ کے علاقوں میں آباد تھے۔ دوسرے ہمالیہ کے مغربی علاقوں میں اور تیسرا جنوبی ہند کے حکمران خاندانوں کا تھا۔ اِن تین طبقوں کے درمیان شادی بیاہ و کھانے پینے کے تعلقات قایم نہ تھے۔ اِن تین طبقوں کے علاوہ جو زراعت پیشہ چھتری تھے اُن کو کم تر درجہ حاصل تھا۔

ویش ذات بھی مذہبی فرقوں کے اِعتبار سے تقسیم ہوگئی۔ شمالی ہند کے اکثر ویش جین مت کے تھے ہمالیہ کے علاقوں کے ویش سیو اُست کی پیروی کرتے تھے۔ اور جنوبی ہند میں شیو۔ رامانج اور ویر سیوادیشوں کی آبادی تھی۔

شودر ذات میں اپنے پیشوں اور مقام سکونت کے لحاظ سے مختلف چھوٹے چھوٹے

طبقے پیدا ہوئے اور اُن کی معاشری زندگی بھی اپنی طبقوں تک محدود ہوگئی۔ اِن چار ذاتوں میں جو صدہا فرقے پیدا ہوئے وہ زیادہ تر دسویں صدی سے تیرہویں صدی تک کے عرصہ میں وجود میں آئے کیونکہ البیرونی اپنے عہد میں اِن صدہا فرقوں اور اُون کے اپسی مغایرت کا ذکر نہیں کرتا۔

اِن چار ذاتوں کے علاوہ ایک اور طبقہ اچھوت کا حال بھی قدیم سے مِلتا ہے جس میں اور ذاتوں کی طرح بہت سے فرقے موجود تھے۔ لیکن اُن کی نوعیت مذہبی نہ تھی بلکہ پیشہ وَری تھی۔ اُن کی بُود وباش گاؤں اور قصبات کے باہر یعنی آبادی سے دُور ہوا کرتی تھی۔ بیدا (خاکروب) اور چنڈال (جلاد) اِسی ذات سے ہوتے تھے۔

ذات پات کی بنیاد نسلی تفریق اور پیشوں پر منحصر تھی۔ شُودر اور اَچھوت طبقے ڈراوڑی نسل سے تھے۔ پیشے کے لحاظ سے برہمن کے سپرد تعلیم وتعلّم اور مذہبی رسوم کی ادائیگی تھی چھتریوں یا راجپوتوں کے ذِمّے تحفظ وانتظام مُملکت اور سپہ گری تھی۔ ویش جو بودھ دور سے قبل زراعت پیشہ تھے بعد میں تاجر بن گئے۔ اور اس وقت زراعت صنعت ودستکاری شُودر اور اَچھوتوں کے ہاتھوں میں تھی۔ راجپوت نظم مُملکت وسپہ گری کے علاوہ دوسرے علوم وفنون میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے۔

ہندستانی مالیات

حصہ دوسرا

از

جناب ڈاکٹر جعفر حسن صاحب پی، ایچ، ڈی، صدر شعبۂ عمرانیات جامعہ عثمانیہ سرکار عالی

"اچھی مالیات آمدنی حاصل کرنے سے زیادہ خرچ کرنے کے طریقوں پر منحصر ہے۔"

(گلیڈسٹن)

اخراجات کی سرگزشت خانگی مالیات اور سرکاری مالیات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم نے بیان کیا تھا کہ خانگی مالیات میں آمدنی کو اخراجات پر اہمیت حاصل ہے اور سرکاری مالیات میں اخراجات آمدنی پر مقدم ہیں۔ چونکہ سرکاری آمدنی کا بہت بڑا جزو محصولوں کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور محصولوں میں اضافہ اخراجات کی شدت اہمیت کے مطابق کیا جاتا ہے لہذا محصولوں کا تعین کرنے کے لئے اخراجات کا معین کیا جانا ضروری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عام طور پر حکومتیں من مانے طریق کے مطابق یا استحصال نما محصولوں سے آمدنی حاصل کر کے خود غرضیوں اور تنگ نظریوں پر لٹا دیتی ہیں مگر جہاں تک نظری مالیات کا تعلق ہے اصولی اعتبار سے اخراجات کو آمدنی پر اہمیت حاصل ہے چنانچہ حقیقت میں ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ کے زمانے میں یا کسی بہت بڑے سانحے کے بعد مثلاً بھونچال کے بعد یا بڑی مصیبت مثلاً قحط کے زمانے میں فوری اخراجات کی اہمیت کے مدنظر محصولوں میں اضافہ ہوتا ہے نیز دوسرے طریقوں سے

آمدنی بڑھائی جاتی ہے۔ عوام بھی سرکاری ضرورتوں کی شدت کے مدنظر ایسے زائد بار کو خاموشی سے گوارا کر لیتے ہیں جو وہ عام حالات میں کبھی قبول نہ کرتے۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کہ سرکاری مالیات میں اخراجات کو آمدنی پر فوقیت حاصل ہے اور ہونی چاہیئے بیشمار تاریخی اور عصری مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ہر روشن خیال، ترقی پسند، ہمدرد، اور بہی خواہ حاکم کے عہد میں بیسیوں قسم کی ضرورتیں محسوس ہوتی ہیں جن کا تعلق فلاح عامہ سے ہے۔ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے آمدنی حاصل کیجاتی ہے اور کوشش ہوتی ہے کہ اس آمدنی میں اضافہ کیا جائے۔ اس کے برعکس ہر خود غرض، تنگ نظر اور بے فکرے حاکم کے عہد میں عوام کی شدید ترین ضرورتوں سے بھی غفلت برتی جاتی ہے۔

موجودہ زمانے میں بھی ایسی ترقی پذیر حکومتیں ہیں جو ہر قسم کی اصلاحی، تمدنی، تعلیمی، صنعتی، زراعتی، اور فنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے آمدنی حاصل کرنا اور بڑھانا چاہتی ہیں اور دوسری طرف ایسی بھی حکومتوں کی کمی نہیں جو قحط سالی کے زمانے میں فلاکت زدہ رعایا کے لئے پیسہ خرچ کرنے یا جبری تعلیم کے لئے پیسہ فراہم کرنے سے انجان ہو جاتی ہیں۔ موجودہ زمانے میں ایک طرف ایسی حکومتیں ہیں جن کا آئینی فرض ہے کہ وہ ساری آبادی کی خوشحالی کا اہتمام کریں اور دوسری طرف ایسی بھی حکومتیں جو ان فرائض سے بالکل لاعلم ہیں اور موقع بے موقع اعلان کرتی رہتی ہیں کہ حکومتیں کتنوں کی مدد کریں؟ حکومت کتنوں کو نوکری دے؟

روشن خیال، ترقی پسند اور فرض شناس حکومتیں بخوشی اُن لوگوں کی امداد کرتی ہیں جو نئے نئے کارخانے جاری کرنا چاہتے ہیں، یا پُرانے کارخانوں کو ترقی دینا چاہتے ہیں یا جدید اور بہتر طریقے پر کاشت کرنا چاہتے ہیں یا بیمہ کمپنی کا کاروبار پھیلانا چاہتے ہیں کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ ہر صورت میں بے روزگاروں کے لئے روزگار کا مسئلہ حل ہوگا، ملک کی دولت و پیدائش دولت کی طاقت میں اضافہ ہوگا، پنپنے والے کارخانوں اور ان کے متعلقہ افراد سے حکومت کو نفع ہوگا، اور کچھ نہیں تو محصول آمدنی زیادہ حاصل ہوگا! اس کے برعکس دنیا میں جتنی حکومتیں

غفلت اور رعونت کا شکار بنی ہوئی ہیں وہ نئے نئے کارخانوں یا صنعتوں کے قائم کرنے میں مدد دینا تو بڑی بات ہے پُرانے کارخانوں اور مصیبت زدہ صنعتوں کو ذرا سا سہارا دے کر یقینی بربادی سے نہیں بچاتیں وہ اِس درجہ حاکیت میں مبتلا ہیں اور اِس قدر اپنے فرائض سے غافل ہیں کہ اپنے حلقہ بگوش افراد اور موروثی یا دائمی خوشامد پسندوں کو نوکریاں، بھتے خطاب اور منصب دینے کے علاوہ صناعوں، کاریگروں، تاجروں، کسانوں اور مزدوروں کی ابنا و فلاح سے قطعاً بے خبر اور لاپروا ہیں نہ ان کی تعلیم و تربیت کا خاطر خواہ خیال کیا جاتا ہے نہ بے روزگاروں کی پروا کی جاتی ہے، نہ تہذیب و شائستگی کو سنبھالنے اور اُبھارنے کی فکر ہے صرف راجدھانی کی شاہراہوں اور دو چار بڑے بڑے محلوں کی آرائش کردیجاتی ہے اور شہر کے بقیہ حصوں اور قصبوں اور گاؤں کی طرف سے بے رخی اور چشم پوشی برتی جاتی ہے اگر ترقی ہو بھی رہی ہے تو انتہائی سست رفتار پر جو دوسرے ترقی پذیر ملکوں کے مقابلہ میں ناقابلِ لحاظ ہے۔

ملک و قوم کی مجموعی ضرورتوں کا خیال کر کے عام مُرفہ الحالی اور مالیات نے سرکاری آمدنی کو خرچ کرنے کے بعض اہم اُصول معلوم کئے ہیں سب سے پہلے اخراجات میں حفاظت ملک کا لحاظ مقدم ہے۔ ہر حکومت کا اولین فرض یہی ہے اور رہونا چاہیئے کہ ملک کو بیرونی حملہ آوروں اور اندرونی مفسدوں سے محفوظ رکھے اور امن و امان قائم رہے اِس غرض کو حاصل کرنے اور ملک و قوم کو بیرونی حملوں اور خانہ جنگیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے جو اخراجات کئے جائیں وہ سب سے زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ مقدم ہیں یہ مانا ہوا اُصول ہے مگر " ملک کی حفاظت " کی خاطر " ملک کی توسیع " کے لئے یا " سلطنت کی سطوت " کے لئے ڈراؤنی فوجوں کا اکٹھا کرنا، حرب و ضرب کے مہلک آلے پیدا کرنا، اپنی فوجی طاقت کے بیجا مظاہروں سے پڑوسی سلطنتوں کو مرعوب بلکہ مشتعل کرنا، دوسری ریاستوں کے اندرونی معاملوں میں خواہ مخواہ دخل اندازی کر کے لشکرکشی اور مردم کشی پر آمادہ ہونا، قومیت کی

آڑمیں سامراجیت، بین اقوامیت کے بھیس میں نادرشاہی اُصول پرعمل کرنا نہ صرف ملکی مفاد کے سراسر خلاف بلکہ بین اقوامی اَمن اور ذاتی فائدے کے بالکل برعکس اور متضاد ہے۔

اخراجات کا دوسرا اُصول "مفادعامہ" ہے۔ یعنے سرکاری آمدنی ایسی چیزوں پرخرچ کرنی چاہیئے جن سے عوام فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور جو بالآخر ملک کی عظیم اکثریت کے حق میں مفید ثابت ہوں، ایسے محکموں اور اداروں کو قومی تعمیری محکمے کہا جاتا ہے اور ان سے مراد تعلیمات، آبپاشی، حفظ صحت، گاؤ سدھار، اِتحاد باہمی، حفاظت جنگل، بن بسائی، تعمیرات زراعت اور صنعت وحرفت کے محکموں اور تحریکوں سے ہے۔

سرکاری اخراجات کا تیسرا اُصول فائدہ مندیا پیدا آور غرض وغایت ہونی چاہیئے یعنے یہ کہ سرکاری اخراجات میں بھی جہاں تک ممکن ہو اس امر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ آمدنی پیدا آور اغراض پرصرف ہو مثلاً ایسی نہریں، تالاب اور بندرگاہیں بنانا جن سے اِتنی آمدنی حاصل ہو کہ اِن نہروں، تالابوں اور بندرگاہوں کی لاگت کا سود ملتا رہے اور رفتہ رفتہ اصل لاگت حاصل ہو جائے اور آخر کار وہ قومی سرمایہ کا جزو بنکر دائمی مرفہ الحالی کا ذریعہ ہو جائیں۔ خود کفیل اور فائدہ بخش ریلیں، نئے نئے کارخانے، تالابوں، ندیوں اور زیراثر سمندروں میں مچھلیوں کی نفع بخش نگہداشت اور پرورش پیدا آور غرض وغایت کی دوسری مثالیں ہیں۔

اخراجات کا چوتھا اُصول یہ ہے کہ اُن کی وجہ سے تہذیب وشائستگی میں ترقی ہو اور قوم کا عام معیار زندگی اِنسانوں کے شایان شان رتبہ سے گرنے نہ پائے۔ گذشتہ صدیوں کے تجربے اور موجودہ حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قوم تہذیب وشائستگی میں اس وقت تک ترقی نہیں کرتی تا وقتیکہ حکومت کی طرف سے تہذیب و شائستگی کے لئے منظم کوشش نہ کی جائے۔ اِنسانوں کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے اور بشریت کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ وہ خودغرضیوں اور نفس پرستیوں میں آلودہ ہوتا ہے، اسے فوری

فائدے کی ایسی ہوس ہوتی ہے کہ شاذ و نادر ہی اسے دور کا فائدہ نظر آسکتا ہے۔ بیشتر انسانوں کا مذاق اس قدر پست ہوتا ہے کہ وہ نفسانیت کو بھڑکانے والی چیزوں کے لئے دائمی مفاد اور عرصے تک قائم رہنے والی قدر و قیمت کی پرواہ نہیں کرتے!

قدرت کا یہ اٹل قانون معلوم ہوتا ہے کہ چند ہی لوگوں میں سنجیدہ مذاق، دردمند دل، دوراندیش طبیعت اور ہمدرد فطرت ودیعت کی جاتی ہے۔ ان ہی ہمدرد، روشن خیال، مستقبل شناس اور بامذاق لوگوں پر عظیم اکثریت کی مخالفت اور بے تعلقی کے باوجود تہذیب و شائستگی کو خاطرخواہ معیار پر برقرار رکھنے اور ترقی دینے کا بار پڑتا ہے۔ یہی لوگ علوم، فنون لطیفہ، زبان و ادب کے حامی اور سرپرست ہوسکتے ہیں، ان ہی کی کوششوں سے علم و ہنر کا چراغ روشن رہ سکتا ہے۔

اگر عوام کی مرضی اور قوم کی رائے شماری پر علم و ہنر کی قدردانی منحصر ہو تو چند ہی سال میں بڑی بڑی درس گاہیں اور تحقیقی ادارے، مصوری اور نقاشی کے نگارخانے ختم ہوجائیں گے، تمام بڑے بڑے فلسفی اور شاعر، ادیب اور محقق، مفکر اور ہنرداں بھوکوں مرجائیں گے اور خود "قوم" نہ صرف پست تر معیار تہذیب پر اُتر آئیگی بلکہ اس کا معیار زندگی اور معیار آرام اتنا گھٹ جائیگا کہ زندگی دوبھر ہوجائیگی۔

کون ہے جو آرام نہیں چاہتا؟ خوشنما باغ، تفریح گاہیں، دلچسپ فلم، بے گردی سڑکیں، آرام دہ سواریاں کسے نہیں چاہئیں؟ دکھ درد ہوتا ہے تو کون ہے جو برائے نام معاوضہ پر علاج کا متمنی نہیں ہوتا؟ کون ہے جسے اپنے ملک و قوم کی یادگار تعمیری، ادبی یا فنی کمالوں پر فخر کا احساس نہیں ہوتا؟ لوگ آرام تو چاہتے ہیں، اپنے ملک و قوم کے کمالوں پر کبھی نہ کبھی فخر تو کرتے ہیں مگر اکثر لوگ یہ جانتے ہی نہیں اور اگر جانتے بھی ہیں تو اس کا احساس نہیں کرتے کہ تہذیب و شائستگی کا سرچشمہ مادی مرفہ الحالی ہے اور خوشحالی کا ماخذ علوم و فنون ہیں!!!

سینکڑوں درس گاہوں میں لاکھوں طالب علموں کو جب تعلیم دیجاتی ہے تب ہی کوئی ایسا موجد نکلتا ہے جس کی ایجادوں سے سب کو آرام پہنچتا ہے! ہزاروں طالب علم جب تحقیق وتفتیش میں جانیں کھپاتے ہیں تب ہی چند کو ایسی کامیابی نصیب ہوتی ہے جس سے بہتیروں کا فایدہ ہوتا ہے۔

اَجنتا کی نقاشی پر ماہر اور عامی، فن دان اور سیاح سب خوش ہوتے ہیں! تاج محل مقبرہ ہونے کی حیثیت سے ایک طرح افسردگی پیدا کرنے والی مایوس گاہ ہے مگر اس کی رونق، خوبصورتی اور جاذبیت لاکھوں لوگوں کو خوش کرتی ہے! دور دور سے سیاح آتے ہیں، ہندستان کا نام اس کی وجہ سے منور ہوتا رہتا ہے! کروڑوں کو تعلیم دینے کے بعد ٹیگور، اقبال اور رامن پیدا ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وطن کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل رہی ہے!

ہر سنجیدہ ہندستانی کی یہ حسرت ہے کہ جس طرح فلسفہ وادب، شاعری اور مصوری، صنعت وحرفت، زراعت وتجارت، فن کاری اور فن دانی میں ہندستان قدیم زمانے اور مغل بادشاہوں کے زمانے میں معراج کمال پر پہنچا ہوا تھا اسی طرح وہ پھر علم وادب، کمال وہنر، صنعت وحرفت زراعت وتجارت میں ترقی کرے! ہم دولت مند اور مرفہ الحال بنیں، فوجی طاقت، تدبر، حکمت، سائنس، اور فنون لطیفہ اور زبان وادب میں ترقی پذیر قوموں کے برابر ترقی کریں! یعنے ہمارا عام معیار تہذیب وشائستگی برتر اور بلند تر ہو۔

یہ سب کچھ ناممکن ہے تاوقتیکہ حکومتیں علم وادب، ہنر وکمال کو سنبھالنے اور ترقی دینے کی مستقل اور مسلسل کوشش نہ کریں۔ جب تک حکومتیں فنی درسگاہیں، تجارتی مدرسے صنعتی تربیت گاہیں قائم نہ کرینگی اور مصوری، نقاشی اور اداکاری جیسے فنون لطیفہ کی سرپرستی نہیں کرینگی یہ ناممکن ہوگا کہ ہم ہر جہتی ترقی کرسکیں، یورپ کی تجارتی اور صنعتی ترقی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ وہ لوگ نہ صرف عمدہ چیزیں بناتے ہیں بلکہ نت نئے ڈزائن اور

سجاوٹوں کے ساتھ کارآمد چیزوں کو پبلک تک پہنچاتے ہیں اور انھیں دیکھکر خواہ مخواہ ان چیزوں کو حاصل کرنے کی تمنا ہوتی ہے۔ ہزاروں قسم کے رنگوں اور رنگی ملاوٹوں میں چیزیں بنا بنا کر یورپ نے ترقی کی! ایک ہی قسم کی مٹھائی کو مختلف شکلوں میں ڈھال کر اور پھول پتیوں سے سجانے کے بعد مختلف رنگین ڈبوں میں پیش کیا اور چاکلیٹ کی تجارت کو غیر معمولی فروغ دیا۔ اسی طرح مغربی عطر کو نہ صرف مختلف طریقوں سے بنایا بلکہ بھانت بھانت کی شیشیوں میں ڈالکر نئی نئی وضعوں میں پیش کیا۔ یورپ کی صنعتیں ترقی پذیر ہیں ہماری صنعتیں جمود کی حالت میں ہیں! تیس سال قبل جس طرح مٹھیاں بنتی اور سجائی جاتی تھیں اسی طرح اب بھی بنائی جاتی ہیں! عطار اب بھی پرانی بدوضع شیشی میں اسیطرح عطر بیچتے ہیں جس طرح ان کے باپ دادا بلکہ پردادا اور سگردادا بیچا کرتے تھے!

یورپ اور امریکہ کے فلم محض اس لئے شوق سے نہیں دیکھے جاتے کیونکہ وہ حاکموں کے بنائے ہوئے فلم ہیں! ان فلموں میں اداکاری، آوازبندی اور فوٹوگرافی کا معیار اس قدر بلند ہوتا ہے کہ سنجیدہ اور شوقین لوگ ان کے یکساں دلدادہ ہوتے ہیں!

یورپ اور امریکہ کی سبق آموز، دلچسپ اور تفریحی کتابیں لوگ محض اس لئے نہیں پڑھتے کیونکہ یہ "صاحبوں" کی لکھی ہوئی ہوتی ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ ان میں کاغذ اچھا ہوتا ہے کاغذ سے بہتر لکھائی چھپائی ہوتی ہے، جابجا سادہ اور رنگین تصویریں رہتی ہیں ساتھ ہی کارآمد اور دلچسپ مضمونوں کا معیار قابل رشک ہوتا ہے! اس کے برعکس ہمارے یہاں کی کتابیں اور رسالے طباعتی غلطیوں کی وجہ سے پھیکے رہ جاتے ہیں! ان کا طباعتی معیار معمولی بلکہ اکثر گھٹیا ہوتا ہے! یہ بھی ایک وجہ ہے کہ خود ہندوستانی اپنی زبان کے تفریحی اور دلچسپ ادب کی طرف توجہ نہیں کرتے اور یورپی اور امریکی ادب کے دلدادہ ہوتے ہیں۔

یورپ کے تھیٹر، یورپ کے تصویر گھر، یورپ کے عجائب خانے، یورپ کے نگار خانے یورپ کی تفریح گاہیں، لاکھوں کے لئے معقول ذرائع معاش ہیں اور مغربی مرفہ الحالی کا

ایک اہم ذریعہ ہیں۔ ان میں سے بیشتر ہم لوگوں کے لئے قابل رشک اور قابل تقلید ہیں، ہمارے ہاں بھی تو بھانڈ اور نقال، گویّے اور اُستاد، سوانگی، اور بہروپئے ہیں! ہمارے ہاں بھی تو کتابیں لکھی جاتی ہیں، اخبار چھپتے ہیں، رسالے نکلتے ہیں، ہمارے ہاں بھی تو ناٹک اور سینما ہیں! مطالعہ گھر، اور کتب خانے ہیں، قہوہ خانے اور اور قسم کی تفریح گاہیں ہیں! ہمارے ہاں بھی تو گانا بجانا ناچ رنگ سب ہی کچھ ہوتا ہے! ہمارے ہاں بھی تو کھلونے بنائے جاتے ہیں اور میلے تہوار ہوتے ہیں! ضرورت اِس بات کی ہے کہ حکومت کی نگرانی اور سرپرستی میں مختلف علوم و فنون کی ترقی ہو تاکہ دھچڑے اور گوبر کے کھلونے، چیچک رو کتابیں اور بھنگم تصویریں رفتہ رفتہ مفقود ہو جائیں اور ہمارے ہاں بھی اچھے اچھے تعلیمی اور تفریحی فلموں کی نمائش کرنے والے سینما گھر، با مذاق اور تربیت بخش مگر ساتھ ہی دلچسپ اور مفید ڈراموں کو پیش کرنے والے تھیٹر، ہر قسم کی کتابوں، رسالوں اور اخباروں کو مہیا کرنے والے متعدد کتب خانے اور مطالعہ گھر، مذاق حسن اور لطف زیست کو دوبالا کرنے والے نگار خانے اور تصویر گھر قائم ہو سکیں۔ یہ سب کچھ حکومت کی منظم کوشش اور ہمدردانہ سرپرستی سے ہو سکتا ہے۔ وقتاً فوقتاً موزوں مقاموں اور موزوں اوقات پر مثلاً میلے، تہوار، عرس یا جاترا کے موقع پر نمائش کا انتظام کر کے حکومت نہ صرف قوم کی مرفہ الحالی میں ترقی کا باعث بن سکتی ہے بلکہ عوام کے مذاق حسن اور مذاقِ ادب پر عمدہ اثر ڈال سکتی ہے۔ اِسی طرح مخطوطوں کی قدر کرنا، پرانی مطبوعات اور قلمی تصویریں مرکزی مقاموں پر فراہم کرنا، تصویر گھر اور عجائب خانے قائم کرنا، علمی و ادبی رسالوں کی سرپرستی کرنا، محققوں، ادیبوں، بلند پایہ مفکروں، اور شاعروں، بلند درجہ مصوروں، نقاشوں، اداکاروں کی پرورش کرنا، بے زبان مخلوق اور جنگل کے جانوروں کو ظلم اور غارت گری سے بچانا، قدرت کی حسن کاریوں اور خوشنما منظروں کو انسان کی غارت پسندی اور بربریت سے بچانا صرف حکومت ہی سے ممکن ہے! لہذا یہ حکومت کے فرائض میں داخل ہے اور ہونا چاہیئے کہ وہ

انسان کے انمول کارناموں اور قدرت کے بے بدل کمالوں اور حسن کاریوں کو محفوظ رکھنے کے لئے تہذیبی اخراجات برداشت کرے! حکومتوں کی غفلت اور نادانی سے انسان کے بنائے ہوئے اور قدرت کے پیدا کئے ہوئے ایسے ایسے نمونے تباہ ہوگئے ہیں جن کی تلافی ناممکن ہے اور موجودہ نسل ان نعمتوں سے کس قدر محروم ہوگئی ہے اس کا علم واحساس ہی چند لوگوں کو ہے! یہ ہر حکومت کا فرض ہے کہ کم سے کم آئندہ آنے والی نسلیں انسان کے بنائے ہوئے اور قدرت کے پیدا کئے ہوئے شہکاروں سے حتی المقدور محروم نہ ہوں! متمدن ہندستان کا کیسا ناقابل تلافی نقصان ہوگا اگر انسانی بربریت اور غارت پسندی کی وجہ سے اجنٹا کے غار، تاج محل کا روضہ، مدہورا کا مندر اور دہلی کی جامع مسجد ناپید ہوجائیں! ہندستان کے علم وادب کا دیا جھلملانے لگیگا۔ اگر شکنتلا کے سمجھنے والے، غالب کے الہامی اشعار سے لطف اندوز ہونے والے، دانائے راز کی حکمت کے جاننے والے، تان سین کی راگ راگنیوں کو مضراب کی چھیڑ سے زندہ کرنے والے جو چند لوگ ہیں وہ بھی ہماری بدقسمتی اور شوربختی سے ناپید ہوجائیں! کیا ہی بدقسمت دن ہوگا اگر ٹیگور کی روحانی نظمیں، سورداس جی کے بھجن، تلسی داس جی کی لاثانی رامائن یا ان کے کچھ حصے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناپید ہوجائیں!

کتنے سرسبز علاقے خود ہندستان میں تھے جو انسانوں کی غفلت کی وجہ سے اپنی اصلی زرخیزی کھو بیٹھے! کیسے کیسے وسیع جنگل انسانوں نے تباہ ہونے دیئے اور اپنے ملک کی آب وہوا اور زرخیزی کو نقصان دہ طریقے پر متاثر ہونے دیا! کیسے کیسے خوشنما اور جاذب نظر مورتیوں اور قدرتی پتھروں کو انسانوں نے نفع یا تنگ نظری سے برباد کیا جس کی تلافی نہیں ہوسکتی!!

غنیمت ہے کہ حاکموں کی مخالفت اور امیروں کی غفلت کے باوجود اب تک اتنی شہکار چیزیں اور شہ پارے محفوظ رہ گئے ہیں اور قدرت کی فیاضی کی مثالیں اب بھی بہت ہیں۔ ان کا بچانا اور اپنی تمدنی میراث کو سنبھالنے اور ترقی دینے کے لئے اخراجات گوارا کرنا

ہر حکومت کا پہلا فرض ہے۔

حفاظت، مفاد عامہ، پیدا آور غرض و غایت اور تہذیب و تمدن کی ترقی؛ ان ہی کی خاطر سرکاری اخراجات ہونے چاہیں اور ان ہی کی روشنی میں کسی ملک کے سرکاری اخراجات پر تنقید ہو سکتی ہے۔ کھلم کھلا تنقید یا اظہار خیال کا ہمیں یوں ہی بہت کم موقع حاصل تھا جنگ اور حفاظت ملک کے بہانے مخالفانہ تنقید کا امکان اور بھی کم ہو گیا ہے۔ تاہم دبی زبان میں اور اشاروں اشاروں میں جہاں تک کہنا ممکن ہوگا کہا جائیگا۔ چاہے ذاتی مفاد اور مصلحت کا تقاضہ ہی اس کے متضاد ہو؛ میرا یہ راسخ عقیدہ ہے کہ تا وقتیکہ دلیری اور صاف گوئی سے کام نہیں لیا جائیگا تحقیق کا حقیقی مقصد حاصل نہ ہوگا، کیونکہ حکومتوں کی ہمنوائی کرنا تحقیق کا لازمی مقصد نہیں۔

مرکزی حکومت ہند کے اخراجات

مرکزی حکومت ہند کے اخراجات جدید ترین بجٹ ۱۹۴۰-۴۱ء سے حاصل کئے گئے ہیں۔ ۱۹۴۰-۴۱ء کے بجٹ میں دیئے ہوئے اعداد تین برسوں سے متعلق ہیں ۱۹۴۰-۴۱ء کے اعداد صرف قیاسی ہیں۔ ۱۹۳۹-۴۰ء کے اعداد ترمیم شدہ موازنے کے مطابق متوقع اخراجات ہیں اور ۱۹۳۸-۳۹ء کے اعداد حقیقی ہیں بجٹ کے اعداد میں بسا اوقات بہت فرق ہوتا ہے ترمیم شدہ موازنے کے اعداد میں بھی کمی بیشی ہوتی ہے اس لئے ۱۹۳۸-۳۹ء کے حقیقی اخراجات پیش ہیں۔

۱۔ حفاظتی خدمتیں (فوج، ہوائی بیڑہ، سمندری بیڑہ)	۵۲،۰۶،۹۰،۰۰۰
۲۔ ریلیں	۲۹،۹۲،۷۷،۰۰۰
۳۔ سود	۱۴،۱۲،۲۹،۰۰۰

۴۔ سیول تنظیم (تفصیل کے لئے دوسری جدول دیکھئے)	۱۰،۸۹،۷۱،۰۰۰
۵۔ صوبائی حکومتوں کو امدادی گرانٹ	۳،۰۴،۷۲،۰۰۰
۶۔ بڑھاپا الاونس اور پنشن	۲،۸۱،۴۴،۰۰۰
۷۔ سیول کام	۲،۵۱،۷۲،۰۰۰
۸۔ کروڑگیری کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۱،۱۹،۵۵،۰۰۰
۹۔ نمک ״ ״ ״ ״	۱،۰۳،۸۵،۰۰۰
۱۰۔ پٹہ خانے میں لگائے ہوئے سرمایہ کا سود	۷۳،۷۴،۰۰۰
۱۱۔ محصول آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۶۶،۸۲،۰۰۰
۱۲۔ چھپائی اور اسٹیشنری	۵۳،۳۱،۰۰۰
۱۳۔ مرکزی آبکاری حاصل کرنیکا خرچ	۴۵،۷۵،۰۰۰
۱۴۔ سکہ سازی اور کرنسی	۳۵،۷۵،۰۰۰
۱۵۔ متفرق	۲۷،۳۴،۰۰۰
۱۶۔ افیون کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۲۵،۵۶،۰۰۰
۱۷۔ جنگلوں سے ״ ״ ״	۲۲،۶۵،۰۰۰
۱۸۔ اسٹمپ کی ״ ״ ״	۱۶،۸۱،۰۰۰
۱۹۔ آبپاشی	۹،۸۰،۰۰۰
۲۰۔ کارپوریشن ٹیکس ״ ״	۸،۹۳،۰۰۰
۲۱۔ صوبائی آبکاری کی آمدنی ״ ״	۶،۲۲،۰۰۰
۲۲۔ مالگزاری کی ״ ״ ״	۴،۹۱،۰۰۰
۲۳۔ ڈاک گھروں اور تار گھروں میں لاگت	۳،۹۶،۰۰۰
۲۴۔ موٹرسواری ٹیکس کے اخراجات	۲،۳۳،۰۰۰

۲۵۔ صوبائی حکومتوں سے متفرق حساب	۱،۶۱،۰۰۰
۲۶۔ غیر معمولی اخراجات	۱،۱۸،۰۰۰
۲۷۔ پنشنوں کا عوض	۴۲،۰۰۰
۲۸۔ آبپاشی کے کاموں میں نئی تعمیر	۳۱،۰۰۰
۲۹۔ قحط	۱۴،۰۰۰
۳۰۔ نمک کے کاموں میں نئی لاگت	۱۴،۰۰۰
۳۱۔ رجسٹریشن کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۱۰،۰۰۰
۳۹-۱۹۳۸ء میں کل خرچ	۱،۲۱،۷۶،۴۶،۰۰۰

گویا ایک ارب اکیس کروڑ چھہتر لاکھ چھیالیس ہزار روپیہ ۳۹-۱۹۳۸ء میں خرچ ہوا۔ "سیول تنظیم" کے عنوان سے جو رقم خرچ ہوئی ہے اس کی تفصیل بجٹ میں دیگئی ہے چنانچہ عام دلچسپی کے مدنظر ہم اس کی تفصیل پیش کرتے ہیں، اس جدول میں بھی ہم نے صرف اندراجی سلسلہ بدل دیا ہے تاکہ مختلف مدوں پر خرچ ہونے والی رقموں کی اہمیت کا بہتر اندازہ ہو سکے۔

"سیول تنظیم" پر خرچ ہونے والی رقم کی تفصیل

۱۔ قبیلہ واری علاقے	۱،۹۹،۲۱،۰۰۰
۲۔ عام تنظیم	۱،۸۶،۵۷،۰۰۰
۳۔ تاج کے نمائندے کو ادائیاں	۱،۲۶،۰۴،۰۰۰
۴۔ تنقیح	۹۸،۸۹،۰۰۰
۵۔ علمی محکمے	۶۷،۰۹،۰۰۰

۶۔ بیرونی معاملے	۶۳،۸۷،۰۰۰
۷۔ زراعت	۵۱،۸۸،۰۰۰
۸۔ مذہبی	۳۰،۲۵،۰۰۰
۹۔ پرواز	۲۹،۸۴،۰۰۰
۱۰۔ پولیس	۲۹،۳۸،۰۰۰
۱۱۔ بندرگاہیں اور ناخدائی	۲۷،۴۰،۰۰۰
۱۲۔ جیلخانے اور مجرم گاہیں	۲۳،۹۰،۰۰۰
۱۳۔ تعلیم	۲۳،۷۸،۰۰۰
۱۴۔ ہندستانی سٹور کا محکمہ	۲۳،۰۹،۰۰۰
۱۵۔ علاج	۲۱،۷۸،۰۰۰
۱۶۔ لاسلکی نشر (براڈکاسٹنگ)	۲۰،۵۷،۰۰۰
۱۷۔ متفرق	۱۶،۳۱،۰۰۰
۱۸۔ صحت عامہ	۱۳،۷۵،۰۰۰
۱۹۔ عدالت	۹،۷۹،۰۰۰
۲۰۔ روشنی گھر اور روشن کشتیاں	۹،۱۹،۰۰۰
۲۱۔ صنعت وحرفت	۸،۴۹،۰۰۰
۲۲۔ جانوروں کا علاج	۸،۰۷،۰۰۰
۲۳۔ باہمی امداد	۵۷،۰۰۰
	۱۰،۸۹،۶۱،۰۰۰

سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء سے مرکزی حکومت ہند کے مجموعی سالانہ اخراجات یہ تھے:[1]

سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء	۱،۳۶،۲۰،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء	۱،۳۳،۴۰،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء	۱،۲۳،۹۰،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء	۱،۱۹،۳۷،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء	۱،۲۱،۷۶،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۵-۳۶ء	۱،۲۱،۰۷،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء	۱،۱۹،۶۲،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۷-۳۸ء	۱،۲۲،۵۰،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء	۱،۲۱،۷۹،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء ترمیمی اندازہ	۱،۲۳،۹۶،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء بجٹ	۱،۳۱،۶۸،۰۰،۰۰۰

ان اعداد سے واضح ہے کہ ہندستان کی مرکزی حکومت کے سالانہ اخراجات کا اوسط تقریباً ایک ارب ۲۵ کروڑ ہے۔

---

[1] تمام اعداد مرکزی حکومت کی شائع کی ہوئی کتابوں سے لیے گئے ہیں مثلاً سنہ ۱۹۲۳-۲۴ء سے سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء تک کے اعداد Statistical Abstract کی ۱۵ ویں اشاعت (مطبوعہ دہلی سنہ ۱۹۳۹ء) کے صفحہ ۲۸۹ اور ۲۹۰ سے ماخوذ ہیں۔ جدید برسوں کے اعداد سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء کے جنرل بجٹ سے لیے گئے ہیں۔

مرکزی حکومت ہند کے خالص اخراجات

مالیات اور شماریات کی کتابیں دیکھنے والوں اور بجٹ کا بغور مطالعہ کرنے والوں نے یہ ضرور نوٹ کیا ہوگا کہ جن محکموں پر یا جن مدوں پر خرچ ہوتا ہے ان میں سے اکثر سے کچھ نہ کچھ آمدنی بھی ہوتی ہے جس منطقی دلیل کے مطابق ہم نے "خالص آمدنیاں" بیان کی ہیں اسی طرح ہمیں خالص اخراجات بیان کرنے چاہیں۔ خرچ کرنے والے محکمے یا اخراجاتی محکمے (Spending Debts) جو کچھ آمدنی حاصل کرتے ہیں اسے متعلقہ محکمہ کے کل خرچ سے منہا کرنے کے بعد جو رقم خرچ ہوتی ہے وہی خالص خرچ ہے۔

اکثر محکموں کا کل خرچ اور خالص خرچ مختلف ہوتا ہے کیونکہ کل خرچ اور خالص خرچ کی رقمیں مختلف ہوسکتی اور عام طور پر ہوتی بھی ہیں۔ بعض محکمے جن پر بظاہر بہت خرچ ہوتا ہے خود بھی اتنا کما لیتے ہیں کہ ان کا خرچ اتنا اہم نہیں ہوتا اور دوسرے محکمے جن سے بظاہر بہت آمدنی ہوتی ہے دراصل اخراجاتی محکمے ہوتے ہیں یا آمدنی کے قریب قریب یا آمدنی کا تین چوتھائی خود ہی خرچ کر بیٹھتے ہیں اس لئے ان کی بہت آمدنی خرچ کی وجہ سے تھوڑی ہوجاتی ہے۔

کل خرچ اور خالص خرچ میں فرق معلوم کرنے کا خیال مجھے کئی بار ہوا تھا مگر اعداد کو یکجا کرنے اور تفریق کی جھنجھٹ سے پریشان ہوکر میں نے کبھی کوشش نہیں کی کہ خالص آمدنی اور خالص اخراجات کے گوشوارے یا جدولیں تیار کروں، اس مرتبہ جہاں اور بھی جدولیں تیار کی ہیں میں نے یہ کام بھی انجام دیدیا ہے جہاں تک مجھ سے بن پڑا بار بار حساب کرکے صحت کی امکانی کوشش کی گئی مگر تنہا اتنے مختلف حساب کرنے میں سہواً غلطیاں ہوئی ہونگی۔ اگرچہ توقع نہیں کہ ان کی اہمیت زیادہ ہو تاہم اگر کوئی صاحب ازراہ نوازش ان غلطیوں پر متوجہ کریں گے تو باعث ممنونیت ہوگا۔

اس جدول میں مرکزی حکومت ہند کے جدید ترین بجٹ (بابتہ ۴۱-۱۹۴۰ء) سے

۳۹-۱۹۳۸ئہ کے حقیقی اعداد لئے گئے ہیں۔ ۴۰-۱۹۳۹ئہ کے اعداد ترمیمی بجٹ کے اعداد ہیں اور ۴۱-۱۹۴۰ئہ کے محض متوقع اعداد ہیں۔ لہذا ۳۹-۱۹۳۸ئہ کے حقیقی اعداد کے مطابق حساب کیا گیا ہے اور جدول کی ترتیب اخراجات کی رقمی اہمیت کے مطابق کی گئی ہے۔

۳۹-۱۹۳۸ئہ میں مرکزی حکومت ہند کے خالص اخراجات

۱- فوج (حفاظتی خدمتیں)	۴۶،۱۸،۰۰،۰۰۰
۲- سود	۱۳،۳۸،۵۴،۰۰۰
۳- صوبائی حکومتوں کو امداد	۳،۰۴،۷۲،۰۰۰
۴- بڑھاپا الاؤنس اور پنشن	۲،۷۳،۴۹،۰۰۰
۵- سیول کام	۲،۱۹،۴۹،۰۰۰
۶- قبیلائی علاقے	۱،۹۹،۲۱،۰۰۰
۷- عام تنظیم	۱،۸۶،۵۷،۰۰۰
۸- تاج کے نمائندے کو ادائی	۱،۲۶،۰۴،۰۰۰
۹- تنقیح	۹۸،۸۹،۰۰۰
۱۰- علمی (تحقیقی محکمے)	۶۷،۰۹،۰۰۰
۱۱- خارجی بیرونی معاملے	۶۳،۸۷،۰۰۰
۱۲- زراعت	۴۷،۸۷،۰۰۰
۱۳- مذہب	۳۰،۲۵،۰۰۰
۱۴- چھپائی اور اسٹیشنری	۲۹،۹۹،۰۰۰
۱۵- پولیس	۲۸،۶۴،۰۰۰
۱۶- پرواز	۲۸،۳۶،۰۰۰

۱۷۔ تعلیم	۲۱،۸۶،۰۰۰
۱۸۔ جیل خانے اور مجرم گاہیں	۲۱،۶۹،۰۰۰
۱۹۔ علاج	۱۸،۳۳،۰۰۰
۲۰۔ لاسلکی (براڈکاسٹنگ)	۱۳،۱۸،۰۰۰
۲۱۔ آبپاشی کے کاموں میں لاگت	۹،۸۰،۰۰۰
۲۲۔ صحت عامہ	۹،۳۸،۰۰۰
۲۳۔ صنعت و حرفت	۸،۲۹،۰۰۰
۲۴۔ عدالت	۷،۳۴،۰۰۰
۲۵۔ بندرگاہیں اور ناخدائی	۵،۵۰،۰۰۰
۲۶۔ پٹہ خانوں اور تار گھروں میں لاگت	۳،۹۶،۰۰۰
۲۷۔ جنگل	۲،۷۴،۰۰۰
۲۸۔ ہندستانی سٹور کا محکمہ	۱،۹۹،۰۰۰
۲۹۔ متفرق ادائیاں (صوبوں کو)	۱،۶۱،۰۰۰
۳۰۔ باہمی امداد	۵۷،۰۰۰
۳۱۔ جانوروں کا علاج	۴۴،۰۰۰
۳۲۔ پنشنوں کا عوض	۴۲،۰۰۰
۳۳۔ نمک کے کاموں میں لاگت	۱۴،۰۰۰
۳۴۔ قحط	۱۴،۰۰۰
۳۵۔ روشنی گھر اور روشن کشتیاں	۴،۰۰۰
خالص خرچ کی میزان	۷۷،۹۸،۴۱،۰۰۰

خالص اخراجات کی جدول کا مقابلہ کل اخراجات کی جدول سے کرکے دیکھئے آپ چند باتیں ضرور نوٹ کریں گے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ہندستان میں خرچ کی دو اہم ترین مدیں ——— غیر پیداآور ہیں! فوج اور سود!!

خالص اخراجات کی میزان تقریباً ۸۰ کروڑ ہوتی ہے جس میں سے ۶۴ کروڑ سے زیادہ فوج پر صرف ہوتا ہے گویا ہندستان اپنی حفاظت پر اپنی آمدنی کا ۷۵ فی صد صرف کرتا ہے!

دونوں جدولوں کا مقابلہ بغور کرنے سے بعض اور باتیں معلوم ہوتی ہیں مثلاً یہی کہ مرکزی حکومت ——— مذہب پر ۳۰ لاکھ صرف کرتی ہے اور تعلیم پر بیس لاکھ! بیسویں صدی میں تعلیم سے زیادہ مذہب کے نام سے خرچ کرنا اندھیر ہے اور جب ہم اس بات کا خیال کرتے ہیں کہ حکومت زیادہ تر ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں سے آمدنی حاصل کرتی ہے مگر مذہب کے نام سے جو تیس لاکھ سالانہ صرف ہوتا ہے اس کا تقریباً تمام حصہ پادریوں کی تنخواہوں، گرجاؤں کی نگہداشت، عیسائیت کی تبلیغ پر صرف کر دیتی ہے تو ہمیں مذہبی اخراجات کی غیر منصفانہ نوعیت پر دس گونہ حیرت ہوتی ہے۔

مذہبی اخراجات کی تفصیل بھی آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں؟ تاکہ آپ کو اور زیادہ یقین ہوجائے کہ مرکزی حکومت کے خرچ کردہ تیس لاکھ میں سے تقریباً تمام عیسائیوں کو مل رہا ہے! ایک سرکاری اشاعت ہی سے میں نے یہ تفصیل معلوم کی ہے[1]

کلیسائے انگلستان	۱۵،۴۸،۰۰۰
〃 روم	۳،۴۷،۰۰۰
〃 سکاٹ لینڈ	۲،۰۲،۰۰۰
میتھوڈسٹ، یونیا یٹڈ بورڈ چرچ وغیرہ	۱،۲۵،۰۰۰
مختلف کلیساؤں کے مبلغوں کی تنخواہوں وغیرہ کی میزان	۲۳،۲۲،۰۰۰

[1] صفحہ ۲۶۱

گرجاؤں کی تعمیر ۴،۰۷،۰۰۰

عیسائیوں کے قبرستانوں کی حفاظت ۱،۴۶،۰۰۰

تعطیل پر انگلستان گئے ہوئے یا پنشن یافتہ پادریوں کا معاوضہ ۶،۵۰،۰۰۰

۲۵،۸۸،۰۰۰

بقیہ ۴ لاکھ ۱۲ ہزار کیونکر خرچ ہوئے اس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی! البتہ یہ ضرور معلوم ہوا کہ مذہبی نوعیت کے سرکاری اخراجات صرف ۳۰ لاکھ سالانہ نہیں ہوتے کیونکہ فوج اور ریلوے میں بھی مذہب کے نام سے اخراجات ہوتے ہیں اُن کی مجموعی رقم ۶ لاکھ ہوتی ہے!

عیسائیت کی مقدس تعلیم ہم مفت میں نہیں حاصل کر رہے ہیں۔ ایک تہائی کروڑ سے زیادہ تو صرف مرکزی حکومت کے باضابطہ اخراجات میں داخل ہے! اس کے علاوہ مختلف ناموں اور بہانوں سے نہ جانے کتنا سرکاری روپیہ صرف ہوتا ہے! مختلف صوبے اور دیسی ریاستیں، مقامی حکومتیں اور سرکاری اقتدار سے حاصل کردہ چندوں سے جو کچھ لیا جاتا ہے اس کی میزان ایک کروڑ سالانہ سے کیا کم ہوتی ہوگی!؟

چند دن قبل ۱۹۴۱-۴۲ء کا بجٹ بھی شائع ہوا ہے۔ اس میں ۱۹۳۸-۳۹ء سے موجودہ سال تک خالص آمدنی اور خالص اخراجات دیئے ہیں نیز مالی سال کی مختصر کیفیت یعنی بچت اور خسارہ کے اعداد بھی دیئے ہیں۔ یہ بہت سبق آموز اعداد ہیں اور ان سے موجودہ مالی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مرکزی حکومت ہند کے اخراجات[1]

	خالص آمدنی	خالص اخراجات	بچت	زائد اخراجات
۱۹۳۸-۳۹ء	۸۰ کروڑ ۲۵ لاکھ	۸۰ کروڑ ۵۷ لاکھ	+	۳۲ - لاکھ

[1] ۱۹۴۱-۴۲ء کا بجٹ۔ دوسرا حصہ۔ عام بجٹ صفحہ ۹۵ (مطبوعہ گورنمنٹ پریس نئی دہلی ۱۹۴۱ء)

سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء	۹۱ کروڑ ۲۰ لاکھ	۹۰ کروڑ ۳۹ لاکھ	۲۷ لاکھ +	
سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء	۸۰ 〃 ۱۴ 〃	۹۱ 〃 ۶۲ 〃		۱۱ کروڑ ۴۸ لاکھ
سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء	۷۷ 〃 ۲۹ 〃	۸۹ 〃 ۰۴ 〃		۱۱ 〃 ۷۵ 〃
سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء	۸۲ 〃 ۸۴ 〃	۸۱ 〃 ۲۹ 〃	۱ کروڑ ۵۵ لاکھ +	
سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء	۷۵ 〃 ۴۳ 〃	۷۴ 〃 ۸۰ 〃	۶۳ 〃 +	
سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء	۸۰ 〃 ۷۵ 〃	۸۰ 〃 ۳۹ 〃	۳۶ 〃 +	
سنہ ۱۹۳۵-۳۶ء	۷۸ 〃 ۲۹ 〃	۷۸ 〃 ۲۹ 〃	بالکل برابر	
سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء	۷۵ 〃 ۷۱ 〃	۷۷ 〃 ۵۰ 〃		۱ کروڑ ۷۹ لاکھ
سنہ ۱۹۳۷-۳۸ء	۸۱ 〃 ۲۹ 〃	۸۱ 〃 ۱۹ 〃	بالکل برابر	
سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء	۷۸ 〃 ۴۹ 〃	۷۹ 〃 ۱۳ 〃		۶۴ 〃
سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء	۸۸ 〃 ۸۳ 〃	۸۸ 〃 ۸۳ 〃	بالکل برابر	
سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء ترمیمی اندازہ	۹۷ 〃 ۲۳ 〃	۱۰۵ 〃 ۶۵ 〃		۸ کروڑ ۴۲ لاکھ
سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء بجٹ	۱۰۵ 〃 ۷۸ 〃	۱۱۹ 〃 ۶۳ 〃		۱۳ 〃 ۸۵ 〃

سنہ ۱۹۳۹ء کی پہلی ستمبر کو دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا اور اسی کا لازمی اثر ہے کہ ہمارے موازنہ پر اخراجات کا بار پڑ رہا ہے۔ جدید ترین متوقع اخراجات متوقع آمدنی سے تقریباً ۱۴ کروڑ زیادہ ہوں گے!

مرکزی حکومت ہند کے فرائض اور اخراجات کا نوعیتی تجزیہ

مرکزی حکومت ہند کے اخراجات کو سمجھنے کے لئے ان کا نوعیتی تجزیہ بھی بہت مفید ہو سکتا ہے چنانچہ میں نے حکومت ہند کے موجودہ قانون (سنہ ۱۹۳۵ء) سے مرکزی حکومت کے فرائض کی تقسیم کی ہے اور ہر نوعیت کے ذیلی عنوان قائم کئے ہیں نیز سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء کے

حقیقی اعداد کے مطابق جدید ترین اخراجات دیئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کیفیت کا مطالعہ کرنے سے ہمیں نہ صرف موجودہ دستور کے مطابق مرکزی حکومت کے فرائض معلوم ہوجاتے ہیں بلکہ ان فرائض کی انجام دہی میں گورنمنٹ جو کچھ خرچ کرتی ہے اس کی مختصر کیفیت بھی معلوم ہوجاتی ہے۔

مرکزی حکومت ہند کے فرائض کو میں نے ۶ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) حفاظت اور سیاست (۲) تنظیم (۳) کاروباری محکمے (۴) علمی ادارے۔

(۵) تمدنی فرائض اور (۶) متفرق۔

ظاہر ہے کہ ہر نوعیت کے تحت جو ذیلی عنوان میں نے قائم کئے ہیں اُن میں اختلاف رائے ممکن ہے۔ مثلاً تمدنی فرائض میں سے بعض کا شمار تنظیمی فرائض میں ہوسکتا ہے اور براڈکاسٹنگ یعنے نشرگاہوں کا شمار کاروباری محکموں کی بجائے تمدنی فرائض میں بھی ممکن ہے۔ تمدنی تعلیم میں اختلاف رائے کی گنجائش بہت ہوتی ہے بہرحال توقع ہے کہ مرکزی حکومت ہند کے فرائض اور اخراجات کا نوعیتی تجزیہ موجودہ دستور اور اس کی بدولت پیدا ہونے والے اخراجات کا خاکہ پیش نظر ہوجائیگا۔ اس سلسلہ میں تمام اعداد ۴۲-۱۹۴۱ء کے حالیہ بجٹ سے حاصل کئے گئے ہیں۔

حفاظت اور سیاست

صفحہ		۱۹۳۹-۴۰ء میں کل خرچ	آمدنی	خالص خرچ
۳۷۵	(۱) دفاعی خدمتیں (فوج، ہوائی بیڑہ اور سمندری بیڑہ)	۵۰،۲۶،۴۳،۰۰۰	۷۲،۵۲،۰۰۰	۴۹،۵۴،۹۱،۰۰۰
۲۵۸	(ب) سرحدی قبیلہ واری علاقے	۱،۸۸،۵۹،۰۰۰	x	۱،۸۸،۵۹،۰۰۰ [۱]

---

[۱] اسی رقم میں سے مجلس اقوام کو ۱۰ لاکھ دیئے گئے تھے! یہ معلوم ہی نہ تھا کہ مجلس اقوام ابھی زندہ ہے اور

(پ) بیرونی معاملے ۶۹،۵۶،۰۰۰ × ۶۹،۵۶،۰۰۰

(ت) تاج کے نمایندے کو ادائیاں ۱،۶۲،۴۷،۰۰۰ ۲۱،۷،۰۰۰ ۱،۴۱،۵۰،۰۰۰ [۱]

تنظیم

(ا) مختلف تنظیمی ادارے اور محکمے ۱،۹۴،۰۵،۰۰۰

[اسی رقم میں وائسرائے کی تنخواہ شامل ہے ۲،۵۰،۰۰۰
وائسرائے کا سکرٹیریٹ ۴،۰۶،۰۰۰
وائسرائے کا سفر خرچ ۵،۶۶،۰۰۰]

(ب) تنقیح ۹۷،۰۵،۰۰۰

(پ) وفاقی عدالت ۲،۴۴،۰۰۰

کاروباری ادارے

(ا) ریلیں اخراجات سے زیادہ آمدنی ہے خصوصاً جنگ کی وجہ سے

(ب) ڈاک خانے اور تار گھر سے بھی مرکزی حکومت کو خالص نفع ہوتا ہے۔

(پ) ٹیلیفون کا سررشتہ بھی ڈاک خانے سے متعلق لہذا نفع بخش ہے۔

(ت) ۲۵،۵۱،۰۰۰ ۱۰،۴۷،۰۰۰ ۱۵،۰۴،۰۰۰

(ٹ) پرواز ۳۵،۳۴،۰۰۰ ۱،۶۴،۰۰۰ ۳۳،۷۰،۰۰۰

[بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵] ہندستان سے بھی اسے ۱۰ لاکھ سالانہ ملتے ہیں۔

[۱] سیاسی محکمے اور دیسی ریاستوں میں گورنر جنرل کے نمایندوں کے اخراجات اسی میں شامل ہیں

علمی اور تعلیمی اِدارے

(۱) موسم کے متعلق باخبر رکھنے والا سررشتہ (موسمیاتی محکمہ) ... ۱۹،۶۴،۰۰۰

(۲) ہندستان کی پیمائش ... ۱۸،۹۱،۰۰۰

(۳) ہندستان کی ارضیاتی تفتیش (سروے) ... ۳،۹۶،۰۰۰

(۴) " " حیوانیاتی تفتیش ... ۱،۴۵،۰۰۰

(۵) " " نباتیاتی " ... ۵۱،۰۰۰

(۶) انجمنوں اور اداروں کی امداد اور عطیے ... ۲،۴۷،۰۰۰

(۷) تعلیم (بنارس یونیورسٹی اور علیگڈھ یونیورسٹی ... ۳۲،۳۵،۰۰۰ (خالص خرچ)
کو سالانہ چندہ اسی گنجائش سے عطا کیا جاتا ہے
کیونکہ یہ دونوں یونیورسٹیاں مرکزی حکومت کے
تحت ہیں مسلم یونیورسٹی کو سالانہ ۳ لاکھ دیئے جاتے ہیں)

تمدنی فرائض

(ا) قدیم یادگاروں کی حفاظت (آثار قدیمہ) ... ۱۰،۴۵،۰۰۰

(ب) فوجی عجائب خانہ اور دوسرے مرکزی حکومت کے عجائب خانے ... ۲۴،۰۰۰

(پ) روشنی گھر اور روشن کشتیاں ... ۵،۰۰۰

متفرق

(ا) عیسائی پادریوں کی تنخواہیں اور پنشن اور گرجاؤں کی تعمیر ... ۳۰،۲۲،۰۰۰
اسی میں تقریباً ۱½ لاکھ کی وہ رقم شامل ہے جو عیسائیوں کے

قبرستانوں پر مرکزی حکومت ہند کی فیاضی، دریادلی
انصاف اور مساوات کی وجہ سے خرچ ہوتا ہے۔

مرکزی حکومت کے اخراجات کا نوعیتی تجزیہ مکمل نہیں ہے اور نہ جزوی تفصیل دیجاسکتی ہے پھر بھی اس تجزیہ سے مرکزی حکومت کے فرائض کا علم تھوڑا بہت ہوجاتا ہے۔ بنارس کی ہندو یونیورسٹی اور علیگڈھ کی مسلم یونیورسٹی، رانچی کا ذہنی شفاخانہ، امپریل لائبریری کلکتہ (شاہی کتب خانہ) فوجی عجائب گھر، قدیم تاریخی یادگاروں کی کھوج اور اُن کی حفاظت، یورپینوں کے قبرستانوں کی نگرانی اور حفاظت ان فرائض میں داخل ہیں جن کا ذکر ۱۹۳۵ء کے قانون ہند میں بطور خاص کیا گیا ہے اور انھیں مرکزی حکومت ہند کی ذمہ داریوں میں شامل کیا گیا ہے۔

صوبائی حکومتوں کے اخراجات

ہمیں معلوم ہے کہ ہندستان میں گیارہ صوبے ہیں اور قانون حکومت ہند کے مطابق صوبائی حکومتوں کے ذرائع آمدنی اور خرچ کی مدیں مقرر ہیں۔ آمدنی کے باب میں ہم نے ۳۸-۱۹۳۷ء کے اعداد و شمار دیئے تھے مگر حال ہی میں ۴۰-۱۹۳۹ء کے بھی حقیقی اعداد شائع ہوگئے ہیں۔ اس لئے ہم ایک مشترکہ جدول میں آمدنی اور اخراجات کے جدید ترین اعداد پیش کرتے ہیں۔ ترتیب میں رقمی اہمیتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

۴۰-۱۹۳۹ء میں صوبوں کی آمدنی اور اخراجات

صوبے کا نام	آمدنی	اخراجات	زائد آمدنی یا بچت +	زائد اخراجات یا خسارہ −
مدراس	۱۶،۶۵،۹۰،۰۰۰	۱۶،۳۷،۳۹،۰۰۰	+۲۸،۵۱،۰۰۰	

بنگال	۱۴،۳۱،۴۶،۰۰۰	۱۳،۷۱،۴۴،۰۰۰	+۶۰،۴۳،۰۰۰
متحدہ صوبے آگرہ اور اودھ	۱۳،۵۲،۰۸،۰۰۰	۱۳،۴۴،۵۲،۰۰۰	+۷،۵۶،۰۰۰
بمبئی	۱۳،۱۴،۴۳،۰۰۰	۱۲،۸۳،۴۷،۰۰۰	+۳۰،۹۵،۰۰۰
پنجاب	۱۲،۱۱،۰۹،۰۰۰	۱۱،۹۵،۶۰،۰۰۰	+۱۵،۴۹،۰۰۰
بہار	۵،۴۷،۶۰،۰۰۰	۵،۳۵،۷۹،۰۰۰	+۱۱،۸۱،۰۰۰
متوسط صوبے	۵،۰۸،۵۰،۰۰۰	۴،۷۵،۶۰،۰۰۰	+۳۲،۹۰،۰۰۰
سندھ	۴،۲۸،۸۷،۰۰۰	۴،۰۵،۰۸،۰۰۰	+۲۳،۷۹،۰۰۰
آسام	۲،۹۳،۴۳،۰۰۰	۲،۹۲،۴۳،۰۰۰	+۱،۰۰،۰۰۰
اڑیسہ	۱،۸۷،۸۸،۰۰۰	۱،۸۴،۰۵،۰۰۰	+۳،۸۴،۰۰۰
سرحدی صوبے	۱،۸۲،۶۱،۰۰۰	۱،۸۷،۱۱،۰۰۰	× ۔۴،۵۰،۰۰۰
تمام صوبوں کی آمدنی	۹۱،۲۳،۷۶،۶۶۸	تمام صوبوں کا خرچ ۹۱،۱۱،۸۹،۴۴	

صوبائی حکومتوں کی آمدنی اور اخراجات کی تفصیل

صوبائی حکومتوں کے موازنوں کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صوبائی ذرائع آمدنی (اہمیت کے لحاظ سے) مالگزاری، آبکاری، سٹمپ اور آبپاشی ہیں ان کے مقابلہ میں جنگل آمدنی محصول اور رجسٹریشن کم اہمیت رکھتے ہیں۔ صوبائی حکومتوں کے اخراجات کی اہم ترین مدیں عام تنظیم، تعلیم، پولیس، آبپاشی، تعمیرات اور پنشن ہیں۔ ان کے علاوہ علاج، معالجہ، صحت عامہ، عدالت، صنعت و حرفت، جیل خانے، زراعت، قحط، جانوروں کا علاج، چھپائی اور اسٹیشنری کم اہم مدیں ہیں۔

چند ہفتے قبل تمام صوبوں کے جدید ترین حقیقی اعداد حاصل ہوئے ہیں۔ یہ اعداد ۴۰-۱۹۳۹ء

سے متعلق ہیں، آمدنی کے باب میں ہم نے ہر صوبے کی مجموعی آمدنی لکھ دی تھی وہ بھی ۱۹۳۶-۳۷ء سے متعلق تھی چونکہ ابھی حال میں دو سال بعد کے اعداد حاصل ہوئے ہیں لہذا ہم بعض اہم صوبوں کے ذرائع آمدنی اور خرچ کی مدیں تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

۱۹۳۹-۴۰ء میں مدارس کی صوبائی آمدنی اور اخراجات

حقیقی آمدنی (۱۹۳۹-۴۰ء)		حقیقی اخراجات (۱۹۳۹-۴۰ء)	
مالگذاری	۵،۱۶،۸۶،۹۶۲	عام تنظیم	۲،۷۵،۲۶،۳۴۵
آبکاری	۳،۳۶،۰۲،۴۷۳	تعلیم	۲،۶۳،۵۶،۹۶۹
آبپاشی	۱،۷۸،۷۹،۷۷۶	پولیس	۱،۶۳،۲۵،۴۲۶
سٹمپ	۱،۷۴،۲۵،۹۲۵	آبپاشی	۱،۲۶،۹۵،۹۹۳
موٹرسواری قانون کی بدولت آمدنی	۸۰،۵۰،۴۶۶	سیول کام (تعمیرات)	۱،۲۲،۴۶،۲۰۳
متفرق محصول	۷۹،۲۸،۰۰۳	بڑھاپا الاؤنس اور پنشن	۱،۱۲،۷۲،۸۲۳
جنگل	۴۴،۸۳،۲۶۰	علاج معالجہ	۹۷،۵۲،۹۲۱
آمدنی محصول	۴۱،۸۵،۰۰۰	عدالتیں	۸۸،۴۳،۹۴۸
رجسٹریشن	۳۲،۹۵،۹۶۱	موٹرسواری قانون کے تحت آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۷۴،۸۷،۲۷۳
سیول کام	۳۰،۹۵،۸۷۱		
سود	۲۳،۳۵،۱۰۰	جنگل کی آمدنی حاصل کرنے کا خرچ	۳۸،۷۱،۲۰۶
صنعت وحرفت	۲۱،۶۲،۶۱۵		
عدالت	۱۷،۶۴،۶۵۰	آبکاری " " "	۳۰،۲۸،۴۶۲
متفرق	۱۴،۳۴،۴۶۱	رجسٹریشن " " "	۲۸،۷۲،۸۴۶
بجلی	۱۲،۹۸،۵۱۷	صحت عامہ	۲۷،۴۰،۰۶۵

علاج معالجہ	۱۰،۰۸،۸۳۵	صنعت وحرفت	۲۵،۹۹،۶۸۰
تعلیم	۹،۲۸،۲۸۵	جیلخانے اور مجرم گاہیں	۲۴،۷۵،۵۶۳
پولیس	۸،۱۰،۲۶۶	مالگزاری کی آمدنی حاصل کرنے کا خرچ	۲۳،۷۸،۹۴۴
متفرق محکمے	۷،۷۵،۴۶۳		
جیل خانے اور مجرم گاہیں	۶،۳۳،۳۷۵	بجلی	۲۲،۶۳،۹۴۶
چھپائی اور اسٹیشنری	۴،۲۵،۹۱۲	چھپائی اور اسٹیشنری	۲۲،۰۷،۴۲۵
باہمی امداد	۳،۸۸،۸۵۵	متفرق محکمے	۲۱،۲۰،۶۲۳
زراعت	۳،۱۹،۴۰۹	زراعت	۱۹،۸۰،۷۶۸
بڑھاپا الاؤنس	۲،۷۲،۱۷۵	قحط	۱۷،۶۴،۶۳۵
صحت	۲،۵۹،۸۷۲	باہمی امداد	۱۴،۲۵،۱۹۲
جانوروں کا علاج	۱،۱۲،۵۹۹	جانوروں کا علاج	۱۲،۳۰،۲۱۱
مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان مختلف حسابوں کے ضمن میں وصول۔	۲۶،۹۷۶	متفرق محصول حاصل کرنے کا خرچ	۹،۰۹،۱۱۰
		متفرق	۵،۴۲،۹۵۱
		سٹمپ کی آمدنی حاصل کرنے کا خرچ	۴،۶۹،۳۳۳
		آبپاشی کے کام میں تعمیر	۱،۳۰،۰۳۹
		علمی محکمے	۹۵،۸۰۳
			۱۶،۷۶،۰۴،۷۰۴
کل آمدنی	۱۶،۶۵،۹۰،۲۴۲	زائد سود منہا طلب	۳۸،۶۵،۷۶۶
		کل خرچ	۱۶،۳۷،۳۸،۹۳۸

۱۹۳۹-۴۰ء میں صوبہ متحدہ کی آمدنی اور اخراجات

آمدنی		خرچ	
مالگزاری	۵،۸۷،۹۶،۰۵۱	تعلیم	۲،۱۲،۴۲،۲۵۸
آبپاشی	۱،۹۵،۷۴،۱۹۱	پولیس	۱،۷۵،۴۸،۴۶۱
سٹمپ	۱،۳۰،۱۰،۳۰۲	عام تنظیم	۱،۴۲،۸۶،۸۵۵
آبکاری	۱،۱۵،۷۱،۳۱۷	آبپاشی	۱،۱۵،۰۸،۹۳۵
جنگل	۵۲،۶۵،۲۶۶	بڑھاپا الاؤنس اور پنشن	۱،۱۰،۲۹،۶۴۰
متفرق محصول	۵۰،۹۰،۹۵۷	مالگزاری حاصل کرنیکا خرچ	۹۸،۰۲،۷۹۵
آمدنی ”	۴۱،۸۵،۰۰۰	عدالت	۷۰،۵۷،۶۸۰
مرکزی حکومت سے امداد	۲۵،۰۰،۰۰۰	زراعت	۶۷،۹۱،۷۱۷
زراعت	۲۲،۱۱،۲۶۲	تعمیر	۶۷،۶۵،۰۷۴
سیول کام (تعمیر)	۱۷،۹۵،۵۵۰	سود	۶۶،۷۷،۶۰۷
تعلیم	۱۴،۱۰،۰۱۸	علاج معالجہ	۳۷،۲۴،۱۱۵
سود	۱۳،۱۷،۲۶۶	جیل خانے اور مجرم گاہیں	۳۵،۲۵،۵۵۶
موٹر سواری قانون کی بدولت آمدنی	۱۲،۱۹،۱۶۱	جنگلوں سے آمدنی حاصل کرنے کا خرچ	۲۹،۶۲،۰۶۸
عدالت	۱۲،۱،۸۹۳	صحت عامہ	۲۳،۴۴،۹۰۷
پولیس	۹،۲۲،۷۹۱	صنعت وحرفت	۲۲،۱۸،۴۳۶
متفرق	۹،۲۰،۵۸۴	چھپائی اور اسٹیشنری	۱۶،۹۳،۱۲۳
رجسٹریشن	۸،۹۱،۷۶۰	موٹر سواری قانون کے تحت آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۱۱،۵۶،۶۵۴

چھپائی اور اسٹیشنری	۸،۱۳،۷۵۱	آبکاری کی آمدنی حاصل کرنے کا خرچ	۱۱،۴۲،۹۵۷
صنعت وحرفت	۵،۸۷،۳۰۱		
جیل خانے اور مجرم گاہیں	۵،۶۰،۲۲۸	متفرق	۸،۷۷،۴۶۹
علاج معالجہ	۳،۷۷،۸۸۹	باہمی امداد	۶،۸۴،۲۷۲
صحت عامہ	۳،۳۲،۵۴۱	جانوروں کا علاج	۵،۱۴،۷۷۵
باہمی امداد	۱،۹۶،۵۹۰	رجسٹریشن کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۴،۴۷،۳۸۹
متفرق محکمے	۱،۵۸،۸۲۰		
بڑھاپا الاؤنس میں امداد	۱،۳۸،۶۱۰	سٹمپ کی آمدنی حاصل کرنے کا خرچ	۲،۳۵،۰۸۷
جانوروں کا علاج	۱،۳۱،۴۵۶		
مرکزی اور صوبائی حساب	۲۰،۸۲۳	دوسرے محصول حاصل کرنے کا خرچ	۸۲،۹۳۸
قحط فنڈ میں منتقلی	۹،۴۴۷		
		متفرق محکمے	۷۹،۲۸۷
		علمی محکمے	۲۸،۵۴۹
		پرداز	۱۰،۵۹۶
		قحط	۹،۴۴۷
			۱۳،۴۴،۶۸،۳۶۷
		Refund آبپاشی کے حساب میں واپس وصول	۱۶،۳۴۳
		۱۹۳۹-۴۰ء میں خرچ	۱۳،۴۴،۵۲،۰۲۴

مدارس اور صوبہ متحدہ اگرہ واودھ کے موازنوں کا مطالعہ کرنے سے ہم دیکھتے ہیں کہ صوبائی آمدنی کے اہم ترین ذریعے مالگزاری، آبکاری، آبپاشی، سٹمپ، جنگل وغیرہ ہیں اور اخراجات کی اہم ترین مدیں عام تنظیم، تعلیم، پولیس، تعمیرات، پنشن، عدالتیں اور

۱۹۳۵ء میں نیا قانون حکومت ہند منظور ہوا جس کا نفاذ ۱ اپریل ۱۹۳۷ء سے کیا گیا، اسی تاریخ سے برما ہندستان سے علیحدہ کر دیا گیا۔ ۱۹۳۷ء سے قبل کے اعداد و شمار میں عموماً برما کے اعداد و شمار بھی شامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہندستان کے تمام صوبوں کے اخراجات کی اس جدول میں ۳۷-۱۹۳۶ء تک برما کے اخراجات شامل ہیں۔ ۳۸-۱۹۳۷ء سے برما کے اخراجات شامل نہیں ہیں۔

گذشتہ برسوں میں ہندستان کے تمام صوبوں کے اخراجات یہ تھے۔

۲۴-۱۹۲۳ء	۷۶،۰۹،۲۸،۰۰۰
۲۵-۱۹۲۴ء	۷۸،۴۰،۶۹،۰۰۰
۲۶-۱۹۲۵ء	۸۵،۸۹،۵۲،۰۰۰
۲۷-۱۹۲۶ء	۹۰،۱۷،۲۲،۰۰۰
۲۸-۱۹۲۷ء	۹۱،۵۰،۴۲،۰۰۰
۲۹-۱۹۲۸ء	۹۲،۹۱،۳۸،۰۰۰
۳۰-۱۹۲۹ء	
۳۱-۱۹۳۰ء	۹۴،۲۰،۰۰،۰۰۰
۳۲-۱۹۳۱ء	۸۶،۲۰،۰۰،۰۰۰
۳۳-۱۹۳۲ء	۸۵،۷۰،۰۰،۰۰۰
۳۴-۱۹۳۳ء	۸۵،۸۹،۸۴،۰۰۰
۳۵-۱۹۳۴ء	۸۵،۳۷،۳۱،۰۰۰
۳۶-۱۹۳۵ء	۸۸،۶۹،۴۳،۰۰۰
۳۷-۱۹۳۶ء	۹۱،۵۵،۰۶،۰۰۰

سنہ ۱۹۳۷-۳۸ء	۸۳،۲۰،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء	۸۶،۵۶،۸۳،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء	۹۱،۴۳،۷۶،۰۰۰

بعض دیسی ریاستوں کے اخراجات

حیدرآباد

مالی نقطۂ نظر سے ہندستان کی بعض دیسی ریاستیں ہیں جن کی اہمیت برطانوی ہند کے بعض صوبوں سے زیادہ ہے۔ اکثر ترقی پذیر دیسی ریاستوں میں آمدنی کے ذرائع اور اخراجات کی مدیں وہی ہیں جو برطانوی ہندستان کے تمام صوبوں میں ہیں اخراجات میں والیٔ ریاست اور شاہی خاندان کے مصارف نئی مد ہے۔ بطور مثال ہم بعض دیسی ریاستوں کے اخراجات کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ تمام اعداد متعلقہ ریاستوں کی سرکاری اشاعتوں سے حاصل کئے گئے ہیں صرف ترتیب بدل دی گئی ہے۔ اور رقمی اہمیت کے مطابق جدول مرتب کی گئی ہے۔

سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء (سنہ ۱۳۵۰ف میں) حیدرآباد ریاست کے اخراجات

تعلیم	۹۳،۹۴،۶۹۰
فوج	۸۹،۲۳،۹۲۱
تعمیر اور راستے	۷۷،۳۶،۸۰۴
مالگزاری حاصل کرنے کا خرچ	۷۲،۶۰،۱۰۴

پولیس	۶۴،۷۲،۵۲۰
اعلحضرت کی خدمت میں نذرانہ	۵۰،۰۰،۰۰۰
سود	۴۸،۴۵،۸۶۰
عام انتظام	۴۶،۹۴،۸۸۱
آبکاری، گانجہ اور افیون کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۳۶،۷۴،۳۸۲
علاج معالجہ	۳۰،۸۸،۵۷۴
میونسپالٹی اور صحت عامہ	۲۸،۰۵،۰۳۰
عدالتیں	۲۴،۶۶،۵۷۸
کروڑگیری کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۲۲،۳۵،۹۹۹
قرض کی ادائی	۲۰،۳۴،۰۰۰
شاہی خاندان کے ارکان، شاہی سفر خرچ وغیرہ	۱۹،۵۴،۰۵۸
سیاسی اخراجات	۱۸،۵۸،۱۸۶
پٹہ خانہ (ڈاک گھر)	۱۵،۴۷،۴۹۴
محفوظ بیمہ	۱۵،۰۰،۰۰۰
آبپاشی	۱۴،۹۴،۵۵۹
مذہبی اخراجات	۱۴،۱۰،۸۱۹
منصب	۱۴،۰۱،۴۳۳
متفرق اور ذیلی محکمے	۱۱،۸۳،۸۲۱
جنگل	۱۰،۱۴،۹۴۸
جیل خانے	۸،۷۵،۷۲۹
زراعت	۷،۶۷،۴۲۱

پٹرول محصول اور سواری محصول	۷،۲۵،۵۳۰
جانوروں کا علاج	۵،۲۸،۲۳۰
باہمی امداد	۴،۶۶،۸۹۰
متفرق خرچ	۴،۴۵،۹۷۷
صنعت و حرفت	۳،۹۱،۷۱۴
سکہ سازی، کاغذی زر اور تبادلہ	۳،۲۱،۳۰۱
رجسٹریشن کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۱،۹۴،۱۲۲
اسٹامپ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍	۱،۸۰،۰۳۲
ریلیں	۱،۴۵،۴۶۵
کانوں کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۵۰،۹۶۹
چھپائی	۴۲،۳۴۳
بجلی	۲۵،۱۵۲
جنگی امداد	۲۳،۱۷۳
جان کا بیمہ	۵،۹۰۴
	۸،۹۱،۵۸،۵۱۸
قحط	۱۴،۴۴،۱۱۴
منتقلیاں (صنعتی محفوظ اور ریٹرک فنڈ)	۷،۶۳،۹۴۰
کل میزان	۹،۱۳،۶۶،۵۷۲ حالی (عثمانیہ سکہ)
	۷،۸۳،۱۴،۰۳۴ کلدار (برطانوی سکہ)

حیدرآباد کا روپیہ برطانوی ہند کے روپیہ سے قدر و قیمت میں کم ہوتا ہے اور

شرح تبادلہ بازار کے بھاؤ سے مقرر ہوتی ہے مگر حکومت نے شرح تبادلہ کی اِنتہائی حد اور کمترین حد مقرر کر دی ہے اور اُصولی اعتبار سے شرح مبادلہ (۱۱۶ روپے ۱۰؍۴؍) مقرر ہے یعنے برطانوی ہند کے ایک سو روپیہ (کلدار) ۱۱۶ روپے ۱۰؍۴؍ حالی کے مساوی ہوتے ہیں۔ اس شرح کے مطابق ۶ روپیہ کلدار، ۷ روپیہ حالی کے مطابق ہوتے ہیں اور اِسی حساب سے ۹،۱۳،۶۶،۵۷۲ حیدرآبادی روپیے ۷،۸۳،۱۴،۰۴۴ روپیوں کے برابر ہیں۔

جس وقت میں نے آمدنی کا بیان مکمل کیا تھا اس وقت جدید ترین اعداد ۱۳۵۰ف (۱۹۴۰-۴۱ء) کے بجٹ سے حاصل کئے گئے تھے۔ اِس کے بعد ۱۳۵۱ف (۱۹۴۱-۴۲ء) کا موازنہ بھی شائع ہو گیا ہے جس میں ۱۳۴۹ف (۱۹۳۹-۴۰ء) کے حقیقی اعداد دیئے گئے ہیں۔ مرکزی حکومت ہند کے متعلق جس طرح خالص آمدنی اور خالص اخراجات کی جدولیں تیار کی گئی ہیں اسی طرح میں نے حیدرآبادی مالیات کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے خالص آمدنی اور خالص اخراجات کی جدولیں تیار کی ہیں۔

دنیا کی اکثر حکومتیں قومی فائدے کے لئے ایسے تجارتی کاروبار کرتی ہیں جس سے آمدنی اور حکومت کے اثر میں اضافہ ہو۔ مقصد چاہے آمدنی حاصل کرنا ہو یا آمدنی کے ساتھ ساتھ ملکی تنظیم اور خوش انتظامی میں حصہ لینا، تجارتی نوعیت کے سرکاری محکموں کے لئے لازمی ہونا چاہیئے کہ اُن کی بدولت سرکاری اخراجات پر بار نہ پڑے کم سے کم انہیں خود کفیل ہونا چاہیئے مگر حیدرآباد کے بعض تجارتی نوعیت کے سرکاری محکمے سہارا بننے کی بجائے بار بنے ہوئے ہیں۔ اِن محکموں میں ٹپہ خانہ اور آبپاشی کا سررشتہ ہے۔

۱۳۵۱ف کے بجٹ سے واضح ہے کہ ۱۳۴۹ف (۱۹۳۹-۴۰ء) میں ٹپہ خانہ (ڈاک گھر) سے کل آمدنی ۱۳،۶۲،۰۰۰ ہوئی مگر خرچ ہوا ۱۵،۲۹،۰۰۰ اس طرح ٹپہ خانے کی بدولت ۱،۶۷،۰۰۰ کا خالص خرچ ہوا۔ مرکزی حکومت ہند کے جدید ترین اعداد سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۳۹-۴۰ء ہی میں مرکزی حکومت کو ٹپہ خانوں اور تار گھروں کی وجہ سے ۱،۶۲،۵۳،۰۰۰

کی خالص آمدنی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ کل ہندستان سے جو خالص آمدنی ہوسکتی ہے وہ ایک حصۂ ملک سے کبھی نہیں ہوسکیگی مگر نوعیت اور مالی نتیجہ دونوں کا یکساں ہونا چاہیئے۔ یعنے یہ کہ وہ نفع بخش کم سے کم خودکفیل ہو۔ متحدہ امریکی ریاستوں اور انگلستان کی ریلیں اور بنک، پٹہ خانے اور تارگھر، ٹیلیفون اور ریڈیو نشریات سب خانگی ملکیت ہیں اور خانگی کاروبار نفع کی خاطر کیا جاتا ہے۔

پٹہ خانے کی طرح آبپاشی بھی حیدرآبادی مالیات پر بارِ گراں ہے۔ برطانوی صوبوں کے جدید ترین اعداد سے پتہ چلتا ہے کہ آبپاشی کی وجہ سے وہاں اچھی خاصی آمدنی ہوتی ہے مثلاً محکمۂ آبپاشی کا کل خرچ اور آبپاشی کے کاموں میں کارفرما سرمایہ کا سود نکالنے کے بعد بھی متحدہ صوبوں کو نصف کروڑ سے زیادہ آمدنی ہوئی تھی۔ آپ کہیں گے کہ متحدہ صوبے بہت زرخیز ہیں وہاں نہروں کا جال بچھا ہوا، آبپاشی قدرتی سہولتوں کی وجہ سے زیادہ آسان ہے مگر جب ہم متوسط صوبوں میں آبپاشی کی مالی کیفیت معلوم کرتے ہیں تب بھی یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ متوسط صوبوں کو آبپاشی کی وجہ سے خالص آمدنی ہوئی تھی ۱۹۳۹ء میں اخراجات ۶،۰۳،۰۰۰ ہوئے تھے مگر آمدنی ۷،۴۵،۰۰۰ ہوئی تھی گویا ۱،۴۲،۰۰۰ کا نفع ہی ہوا تھا!

ہم مزید تفصیل میں جانا نہیں چاہتے اور تبصرہ کئے بغیر جدید ترین بحث سے جدید ترین، حقیقی اعداد کے مطابق سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء کے خالص اخراجات اور خالص آمدنی کے اعداد پیش کرتے ہیں۔ سابقہ جدولوں کی تیاری میں جس طرح احتیاط برتی گئی تھی اسی طرح اس جدول کے تیار کرنے میں امکانی احتیاط کی گئی ہے تاہم قطعی صحت کا وعدہ نہیں کیا جاسکتا۔

سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء (۱۳۴۹ف) کے حقیقی اعداد کے مطابق حیدرآباد ریاست کی

خالص آمدنی		اور	خالص اخراجات	
مالگزاری	۲،۳۸،۳۵،۰۰۰		فوج اور جنگ[1]	۱،۳۶،۱۱،۰۰۰

[1] فوج کا خرچ ۸۰،۵۹،۰۰۰ تھا اور موجودہ جنگ عظیم کے سلسلہ میں ۴۸،۵۲،۰۰۰ کا پیشکش

آبکاری، گانجہ اور افیون	۱،۵۰،۵۸،۰۰۰
ریلیں	۱،۴۰،۴۸،۰۰۰
کروڑگیری	۱،۰۴،۹۲،۰۰۰
برار	۲۷،۲۲،۰۰۰
منٹ، کاغذی سکہ اور تبادلہ	۲۴،۶۷،۰۰۰
اسٹامپ	۱۶،۶۳،۰۰۰
دیاسلائی چنگی	۱۱،۵۹،۰۰۰
کانیں	۴،۵۱،۰۰۰
شکر چنگی	۳،۶۴،۰۰۰
جنگل	۳،۵۳،۰۰۰
بجلی	۲،۰۳،۰۰۰
سگریٹ چنگی	۱،۲۳،۰۰۰
رجسٹریشن	۸۷،۰۰۰
میزان	۷،۳۰،۴۲،۰۰۰

تعلیم	۱،۰۶،۹۴،۰۰۰
عمارتیں اور سڑکیں	۷۲،۹۷،۰۰۰
پولیس	۶۵،۳۳،۰۰۰
شاہی خاندان اور نذرانے	۶۴،۵۳،۰۰۰
عام تنظیم	۴۷،۵۱،۰۰۰
علاج معالجہ (طبی اخراجات)	۳۱،۷۲،۰۰۰
عدالتیں	۲۵،۴۳،۰۰۰
بلدیہ اور صحت عامہ	۲۳،۷۸،۰۰۰
قرض (اصل کی ادائی)	۲۲،۴۲،۰۰۰
آبپاشی	۲۰،۵۸،۰۰۰
قرض (خالص سود کی ادائی)	۱۷،۶۳،۰۰۰
سیاسی اخراجات	۱۵،۳۹،۰۰۰
قحط بیمہ	۱۵،۰۰،۰۰۰
منصب	۱۴،۳۷،۰۰۰
مذہب	۱۴،۰۸،۰۰۰
متفرق اور چھوٹے محکمے	۱۲،۷۸،۰۰۰
زراعت	۸،۹۳،۰۰۰
جیل	۶،۴۵،۰۰۰
جانوروں کا علاج	۵،۶۴،۰۰۰

بسلسلہ حاشیہ صفحہ (۴۶) سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں رہ گیا تھا لہذا فوج اور جنگ کے مجموعی اخراجات ۰۰۰،۱۱،۳۶،۱ (سو کروڑ سے زیادہ ہیں)

		باہمی امداد	۳،۵۵،۰۰۰
		صنعتیں	۳،۰۰،۰۰۰
		طباعت	۱،۷۶،۰۰۰
		پٹہ خانہ	۱،۶۷،۰۰۰
		متفرق	۴۵،۰۰۰
		زندگی کا بیمہ	۹،۰۰۰
خالص آمدنی	۷،۲۰،۴۲،۰۰۰	خالص اخراجات	۷،۳۸،۱۱،۰۰۰

جودھپوری مالیات

جودھپور ریاست کی آمدنی کا بیان گذشتہ باب میں ہوچکا ہے جس سے ظاہر ہوا تھا کہ سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں ریاست کی آمدنی پونے دو کروڑ تھی اور زیادہ تر ریلوں، کروڑگیری، آبکاری، نمک، سود، مالگزاری پر مشتمل تھی۔ سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں ریاست جودھپور میں خرچ کی اہم ترین مدین یہ تھیں:-

متفرقات	۸۴،۲۲،۰۰۰
مہاراجہ بہادر کی خدمت میں نذرانہ	۱۴،۷۴،۰۰۰
فوج	۱۲،۳۹،۰۰۰
تعمیر	۱۰،۶۰،۰۰۰
تعلیم	۹،۸۹،۰۰۰
پولیس	۹،۸۳،۰۰۰
طبی امداد	۷،۸۹،۰۰۰
بقیہ خرچ، آمدنی حاصل کرنیکے اخراجات، خراج زراعت، صنعت و حرفت، جیل خانے، عام تنظیم، وغیرہ	۵۲،۵۳،۰۰۰
میزان	۲،۰۵،۱۰،۰۰۰

اس سال کے اخراجات آمدنی سے بقدر ۲۹،۵۴،۰۰۰ زیادہ ہیں فی نفسہٖ یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس سال غیر معمولی طور پر خسارہ زیادہ ہوا ہو اور ریاستی مالیات کی یہ عام خصوصیت نہ ہو۔ ۳۸-۱۹۳۷ء اور ۳۹-۱۹۳۸ء میں جودھپور کے موازنے فاضل موازنے تھے۔ مگر ۴۰-۱۹۳۹ء میں قحط سالی کی وجہ سے ۳،۶۵،۰۰۰ صرف ہوئے۔ نیز جنگی امداد میں ۳،۵۰،۰۰۰ خرچ ہوئے۔ تعجب ہوتا ہے کہ موازنے میں یہ تشریح صرف ضمنی طور پر کی گئی اور اُن کا شمار "متفرقات" میں کیا گیا یہی وجہ ہے کہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں حقیقی اخراجات کی اہم ترین مد "متفرقات" ہے سچ پوچھئے تو ریاست جودھپور ہی پر منحصر نہیں یوں بھی یہ اصطلاح ہندستانی موازنوں میں بہت مقبول ہے اور مختلف نوعیت اور وسعت کے معنی رکھتی ہے۔

ناظرین نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ جودھپور کے موازنہ میں خراج آمدنی کا ذریعہ بھی ہے۔ اور خرچ کی مد بھی۔ یہ بظاہر متضاد باتیں ہیں مگر حقیقت میں یہ کوئی انوکھی بات نہیں، اور بھی ریاستیں ہیں جو خراج لیتی اور دیتی ہیں، مثلاً بروڈا، اصل یہ ہے کہ راجپوتانے کی بعض دیسی ریاستیں جودھپور کی باج گزار ہیں۔ ان باجگزار ریاستوں سے جودھپور کو تقریباً ۱ لاکھ ملتا ہے اور وہ خود برطانوی حکومت ہند کو خراج ادا کرتا ہے جس کی رقم تقریباً ۶۰ ہزار ہے حکومت ہند کی آمدنی کے بیان میں یہ بتایا گیا ہے کہ مرکزی حکومت کو ہندستان کی دیسی ریاستوں سے تقریباً ۶۰ لاکھ وصول ہوتا ہے۔ مرکزی حکومت کسی نہ کسی طرح ہر ریاست سے کچھ نہ کچھ بٹورتی ہے۔

جودھپور کے موازنے کی ورق گردانی سے ایک اور بات معلوم ہوتی ہے جو ریاستی مالیات کی عام خصوصیت ہے۔ والئی ریاست کی خدمت میں ۱۴ لاکھ ۴۰ ہزار کا نذرانہ دینے کے بعد بھی ریاست کے مالیہ کو ایسے بہت سے اخراجات کا بار اٹھانا پڑا جن کا تعلق کھلے طور پر والئی ریاست اور اس کے خاندان سے ہے۔ چنانچہ ۴۰-۱۹۳۹ء ہی میں یہ اخراجات ہوئے

زنانی ڈیوڑھی ۱،۳۹،۰۰۰

دربار کی اسپیشل گاڑی	۷۰،۰۰۰
مہاراجہ بہادر کا سفر	۱۲،۰۰۰
مہاراجہ بہادر کی سالگرہ	۷،۸۶۰
درباری تفریحیں	۷،۹۶۴
مہاراج کمار کی سالگرہ	۴،۱۱۹

شہر جودھپور کی میونسپلٹی کو سالانہ ڈھائی لاکھ امداد ملتی ہے۔ جودھپور میں آوارہ کتوں کے لئے ایک گھر بنایا گیا ہے جس پر سالانہ چار پانچ ہزار روپیہ صرف ہوتا ہے! ۱۹۲۶ء (۲۸-۱۹۲۷ء) کے حیدرآبادی موازنے میں بتایا گیا ہے کہ عید الضحیٰ کی تقریب میں بکروں کی تقسیم پر ۴،۲۹۷ روپیہ صرف ہوئے۔ اسی بجٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ غریبوں کے مرتاؤں کے لئے ۳۳۵، ا صرف ہوئے! جنگلی جانوروں کو مارنے کے لئے ۱۶۵، ۱۱ خرچ ہوئے اور بندروں کی غذا کے لئے ۲،۰۴۱ فراہم کئے گئے!!

ہندستان کے سرکاری موازنوں میں آخر وہ کونسی مد ہے جو کہیں نہ کہیں موجود نہ ہو؟!

میسور کے اخراجات

میسور کے اخراجات ۴۲-۱۹۴۱ء کے بجٹ سے حاصل کئے گئے ہیں اور ۴۰-۱۹۳۹ء کے حقیقی اعداد ہیں:-

سود اور اصل ادائی ذخیرہ	۷۲،۵۴،۲۰۷
تعلیم	۵۳،۸۸،۲۶۳
تعمیرات اور آبپاشی کے کام	۴۳،۵۶،۶۲۷
مالگزاری حاصل کرنے کا خرچ	۳۹،۲۱،۴۴۲

مہاراجہ بہادر کی خدمت میں پیشکش اور شاہی خاندان کے اخراجات	۲۶،۰۰،۹۷۳
پنشن اور بھتے	۲۵،۴۱،۸۶۹
پولیس	۲۰،۷۵،۹۲۱
برطانوی حکومت کو	۱۹،۱۱،۰۰۰
فوج	۱۷،۰۱،۸۰۶
طبی اخراجات	۱۶،۰۱،۹۰۸
عام تنظیم	۱۴،۸۶،۳۰۰
جنگل کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۱۲،۶۱،۹۹۰
عدالتیں	۱۱،۸۷،۲۹۸
مقامی خود حکومت	۱۰،۰۲،۲۸۰
متفرق	۹،۰۲،۲۷۲
زراعت	۴،۸۸،۵۰۵
آبکاری کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۳،۸۳،۸۸۶
جانوروں کا علاج	۳،۸۳،۲۸۵
چھپائی اور اسٹیشنری	۳،۲۶،۲۰۳
جیل خانے	۲،۴۳،۰۰۹
صحت عامہ	۲،۱۴،۱۰۳
کانوں کی وجہ سے خرچ	۲،۱۲،۳۹۷
صنعت وحرفت اور تجارت	۱،۹۲،۲۴۷
رجسٹریشن کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۱،۷۷،۱۵۷
باغ	۱،۷۴،۰۶۶

باہمی امداد	۱،۵۹،۸۸۴
ریشم کے کیڑوں کی پرورش	۱،۰۳،۲۸۷
علمی اور ذیلی محکمے	۱،۰۴،۸۶۰
آمدنی محصول حاصل کرنیکا خرچ	۶۷،۴۹۸
سٹمپ کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۶۷،۲۳۸
میزان	۴،۱۴،۹۷،۰۸۰

سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں میسور ریاست کی کل آمدنی ۴،۱۷،۹۸،۳۱۷ روپیہ تھی اِس لحاظ سے اِس سال کا موازنہ فاضل موازنہ تھا اور ۳،۰۱،۲۳۷ کی بچت ہوئی تھی۔ سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء کے بجٹ میں ۴،۴۸،۴۲،۰۰۰ کی آمدنی اور ۴،۴۷،۴۰،۰۰۰ کے اخراجات کا اندازہ کیا گیا ہے اور ۱،۲۰،۰۰۰ کی بچت کی توقع کی جاتی ہے۔

قومی تعمیری محکمے

اِس مضمون کی ابتدا میں گلیڈسٹن کا جو قول دیا گیا ہے اس کے مطابق عمدہ مالیات کی پہچان یہ ہے کہ حکومت حاصل کردہ آمدنی کو کیونکر خرچ کرتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ٹیکس بھی حق بجانب ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کا مصرف صحیح ہو۔ جدید زمانے میں مالیاتی پالیسی کو جانچنے کے لئے یہ معیار بھی منطبق کیا جاتا ہے کہ حاصل کردہ آمدنی کا کتنا حصہ "قومی تعمیری محکموں" پر صرف کیا جاتا ہے اور قومی تعمیر سے مراد وہ اِدارے اور تحریکیں ہیں جن سے قوم کی مادی مرفہ الحالی اور عام خوشحالی میں اِضافہ ہو۔

توپیں اور بندوقیں، دبابے اور مشین گن، بم برسانے والے ہوائی جہاز اور جہاز

غرق کرنے والی کشتیاں، پولیس اور جیل خانے، چاہے کیسے ہی ضروری ہوں یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ اُن سے مرفہ الحالی میں اضافہ نہیں ہوتا! آپ زیادہ سے زیادہ یہہ کہہ سکتے ہیں کہ اُن کی وجہ سے موجودہ مرفہ الحالی کی حفاظت ہوتی ہے۔ موجودہ بہبودی اور خوشحالی میں اضافہ کرنے کے لئے وہ تدبیریں اختیار کرنی پڑتی ہیں جن کا نتیجہ معیار صحت کی بلندی، دولت کی فراوانی، اور تہذیب کی ترقی میں نمودار ہوتا ہو۔

بیسویں صدی کے تمام تمدنی مسئلوں میں سب سے اہم مسئلہ بے روزگاری کا مسئلہ ہے اور ہندستان میں بھی کنبہ پروری، خاندانی احساس، اور بے غرضی جس رفتار سے کم ہو رہی ہے اور آبادی میں اضافہ ہو رہا اسی کے مطابق بے روزگاری کا مسئلہ بھی اہم تر ہوتا جا رہا ہے لوگوں کو اپنے معیار آرام کے بلند کرنے کا خیال ہو رہا ہے۔ بین اقوامی سابقت کی وجہ سے کشمکش حیات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ غرض مختلف وجوہ کی بنا پر حکومتوں کا یہ فرض مان لیا گیا ہے کہ وہ ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ قابل، طاقتور اور باصحت بنانے کے لئے مقدور بھر کوشش کرے۔

وباؤں کو نیست و نابود کرنا، احتیاطی تدبیریں اختیار کر کے بیماریوں کی شدت اور کثرت کم کرنا تمام ترقی پذیر قوموں کا آئینی فرض ہے۔ اس کوشش میں مغرب کی اکثر حکومتیں کامیاب ہوگئی ہیں اور مغربی ملکوں میں طاعون، ہیضہ اور چیچک وباؤں کی صورت میں سرے سے نمودار ہی نہیں ہوتے۔ بیماریوں کی شدت اور وسعت میں اسقدر کمی ہوگئی ہے کہ مغربی ملکوں کے باشندوں کا معیار صحت بڑھ رہا ہے اور مدت حیات میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ مغربی ملکوں میں یہ عمدہ نتیجے نمودار ہو رہے ہیں یہ منظم کوشش کا نتیجہ ہے اور منظم کوشش کرنے میں مغرب کی ترقی پذیر حکومتوں کی مالی پالیسی کا بڑا دخل ہے۔ معیار صحت اور معیار قابلیت میں اضافہ کرنے کے لئے یورپ کی حکومتوں نے بیدریغ طور پر پیسہ صرف کیا اور انتہائی دردسری گوارا کی۔ مختلف اوقات میں

صحت اور تعلیم سے متعلق قوانین نافذ کئے گئے۔ بیماریوں کو دور کرنے کے لئے زمین دوز نہریاں اور بے گردی سڑکیں بنائی گئیں، دواخانوں اور شفاخانوں میں اضافہ کیا گیا، غذا پر نگرانی قائم کی گئی، بیمار جانوروں کی قربانی ممنوع قرار دی گئی اور کھانے پینے کی چیزوں کو صحت بخش ماحول میں رکھنا لازمی قرار دیا گیا، اور بھی ہزاروں جتن کئے گئے تاکہ بیماریوں کا انسداد ہو، معیار صحت میں اضافہ ہو، وبائیں نیست ونابود ہوں! ہندستان کے کتنے بڑے بڑے شہروں میں آج بھی سرراہ غلاظت اور گندگی کی جاتی ہے، مرکزی مارکٹ اور منڈی کے قریب میں بھی کتنی کھلی نہریاں ہیں جن میں سڑاند پیدا ہوتی ہے، کتنی کم دوکانیں ہیں جہاں کھانے پینے کی چیزیں احتیاط اور صفائی سے رکھی جاتی ہیں!!

اس میں شک نہیں کہ قابلیت قدرت کا عطیہ ہے اور تا وقتیکہ قابلیت کا جوہر موجود نہ ہو، عاقل وقابل ہونا ممکن نہیں ہے اگر مختلف قابلیتوں کا ظہور اسی وقت ہوتا ہے جبکہ ابتدائی عام تعلیم کے بعد، فنی تعلیم، زراعتی تعلیم، صنعتی تعلیم، پیشہ وری تعلیم حاصل کرنے کے مواقع موجود ہوں۔ یہ شکایت بجا ہے کہ ہندستانیوں کا معیار کارکردگی ادنیٰ ہے، ماہر کاریگر موجود نہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ اس شکایت کو دور کرنے کا صرف ایک ہی موثر ذریعہ ہے! اگر ہزاروں کی تعداد میں فنی، زراعتی، صنعتی، تجارتی اور کاروباری مدرسے قائم کئے جائینگے اور ساری آبادی کے لئے مفت تعلیم کا انتظام کیا جائیگا تو یقیناً مختلف قسم کی قابلیتیں ظہور میں آئیں گی اور وہی لوگ جو تعلیم وتربیت، مشق اور تجربہ سے محروم ہونے کی وجہ سے اناڑی نظر آرہے ہیں، مشاق، کارگذار اور قابل افراد بن سکیں گے۔ قابلیت کا جوہر قدرت کا عطیہ سہی مگر اس کا پتہ صرف طلسم تعلیم کے بدولت چل سکتا ہے۔

صحت اور تعلیم کے علاوہ قومی تعمیر میں وہ تمام کوششیں شامل ہیں جن سے براہ راست مادی مرفہ الحالی اور قومی خوشحالی میں اضافہ ہوتا ہے مثلاً زراعت کی ترقی یا صنعت وحرفت کی ترقی کے لئے منظم کوشش، جانوروں کی نسل سدھار یا جانوروں کی بیماریوں کا علاج،

امداد باہمی، حفاظت صحت کی کارگر تدبیریں۔

عام دلچسپی کے مدنظر میں نے ایک علیحدہ جدول تیار کی ہے جس میں تمام برطانوی ہندستان اور بعض دیسی ریاستوں کے وہ اخراجات دیئے ہیں جن کا تعلق قومی تعمیری محکموں سے ہے۔

سب سے پہلے تعلیم کا خیال کیجئے۔ تمام برطانوی ہندستان میں تعلیم اور تعلیم کے نام سے ۴۰-۱۹۳۹ء کے حقیقی اخراجات کے مطابق تقریباً پونے ۱۴ کروڑ خرچ ہوئے تھے جس کے مقابلے میں ایک کروڑ فیس میں وصول ہوئے گویا مرکزی حکومت نیز تمام صوبائی حکومتوں کا مجموعی تعلیمی خرچ پونے ۱۲ کروڑ ہوا۔

اسی سال برطانوی ہندستان کی کل آمدنی ۰۰۰، ۰۰، ۱۳، ۱۷، ۲ یعنے ½۲ ارب ہوئی تھی اس لحاظ سے ہندستان کی آمدنی میں سے صرف ۵ فی صد سے کچھ زیادہ (یعنے ½۵ فی صد) تعلیم اور تعلیم کے نام سے خرچ ہوا ہے۔ اس میں سے بھی کتنی فضول خرچی ہوتی ہے کتنا روپیہ شاہ خرچیوں اور بڑی بڑی تنخواہوں پر لٹا دیا جاتا ہے، کتنا روپیہ "دفتری تنظیم" کے نام سے خرچ ہوتا ہے، کتنی رقم بیکار کتابوں کے خریدنے اور بھلتی کے رسالوں کی سرپرستی کرنے میں صرف ہوتی ہے، اس کا کوئی حساب نہیں ہو سکتا۔ تاہم یہ عام خیال ہے کہ دفتری اور تنظیمی اخراجات ضرورت سے زیادہ ہیں، نام نہاد تعلیمی اور علمی رسالوں کی سرپرستی کرنے اور "علمی" یا "درسی" نوعیت کی کتابوں کے خریدنے پر بہت زیادہ صرف کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ شکایت ہے کہ اعلیٰ تعلیم خاص کر جامعی تعلیم پر بہت ہی غیر متناسب رقم صرف ہوتی ہے۔ اور جامعی تعلیم میں "علوم عمرانی" اس سے بڑھکر علوم ذہنی، اور سب سے زیادہ نام نہاد "علوم" پر بہت خرچ ہوتا ہے، وہی لوگ جو ایمانداری اور غیر جانب داری سے موجودہ تمدن، کی فریبکاریوں پر غور کر سکتے ہیں، وہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ تعلیم کی آڑ میں کیسی بے دریغ فضول خرچی ہو رہی ہے تالیف و تصنیف، ترجمہ اور توسیعی تقریر نفع پرستی کا بہترین سرچشمہ ہے، بہتیرے موقعوں پر تعلیم کے نام سے بیکار لوگوں کی پرورش ہو رہی ہے، تعلیمی اداروں کے لئے من مانے کرایوں پر

خانگی عمارتیں لی جاتی ہیں، مردار اور بیجان کتابوں کے گٹھے کے گٹھے خرید لیئے جاتے ہیں، تحقیق کے بھیس میں خوشامد کی جاتی ہے، جھوٹی تعلیم اور جھوٹ موٹ کی تعلیم پر بھی کافی روپیہ برباد ہوتا ہے۔

جو حالت تعلیم کی ہے اسی سے ملتی جلتی کیفیت بقیہ تمام "قومی تعمیری" اخراجات کی ہے مگر ہم مجبور ہیں کہ کل اخراجات کو ملحوظ رکھیں۔ ہمارے پاس کوئی معیار نہیں کہ ہم ضروری اخراجات اور فضول خرچیوں میں امتیاز کر سکیں۔ اسی لئے ہم نے تمام قومی تعمیری اخراجات کی ایک جدول تیار کی ہے۔ اس جدول سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مختلف قومی تعمیری مدوں پر کتنا خرچ ہو رہا ہے۔

۱۹۳۹-۴۰ء میں ہندستان کے قومی تعمیری اخراجات

	خالص خرچ
برطانوی ہندستان کے مرکزی اور تمام صوبائی حکومتوں کا تعلیم پر خرچ	۱۱،۶۹،۴۶،۸۷۸ ؎
" " " " " " کے طبی اخراجات	۳،۲۹،۹۹،۲۰۷
" " " " " " کا زراعت پر خرچ	۱،۷۷،۹۳،۲۵۸
" " " " " " صحت عامہ پر "	۱،۳۰،۵۹،۰۱۵
" " " " " " سائنسی محکموں " "	۶۸،۰۹،۵۷۴
" " " " " " باہمی امداد " "	۶۷،۹۰،۷۲۰
" " " " " " جانوروں کے علاج پر "	۵۴،۲۸،۹۸۰

؎ سرکاری اشاعت Combined Finance Revenue for 1939-40 سے حاصل کردہ اعداد کے بموجب
سرکاری اشاعت میں کل آمدنی اور کل خرچ ہے۔ خالص خرچ میں نے نکالا ہے۔

برطانوی ہندستان کے مرکزی اور تمام صوبائی حکومتوں کا صنعت و حرفت پر خرچ ۴۱،۷۶،۵۴۲

تمام قومی تعمیری محکموں پر خالص خرچ ۲۰،۳۷،۰۴،۱۷۴

مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت کی آمدنی ۲،۱۷،۱۳،۴۲،۶۱۰ ہے اس لحاظ سے برطانوی ہندستان کی تقریباً ۱۰ فی صد آمدنی قومی تعمیری محکموں پر خرچ کی جاتی ہے

حیدرآباد ریاست میں قومی تعمیری محکموں پر خرچ[1]

(سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء ۱۳۴۹ ف کے حقیقی اعداد کے مطابق)

تعلیم	۱،۰۶،۹۴،۰۰۰ حالی (حیدرآبادی روپیہ)
طبی اخراجات	۳۱،۷۲،۰۰۰
بلدیہ اور صحت عامہ	۲۲،۷۸،۰۰۰
زراعت	۸،۹۳،۰۰۰
جانوروں کا علاج	۵،۶۴،۰۰۰
باہمی امداد	۳،۵۵،۰۰۰
صنعتیں	۳،۰۰،۰۰۰

سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں کل قومی تعمیری اخراجات = ۱،۸۳،۵۶،۰۰۰ حالی = ۱،۵۷،۳۳،۰۰۰ کلدار (برطانوی روپیہ)

سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں حیدرآباد ریاست کی کل آمدنی = ۹،۵۹،۶۳،۰۰۰ حالی یعنی ۸،۲۳،۰۰،۰۰۰ کلدار -

---

[1] موازنے میں صراحت نہیں کی گئی ہے کہ یہ رقمیں آمدنی منہا کرنے کے بعد خرچ کی گئی ہیں مگر قرائن سے یہی خیال کرنا پڑے گا کہ یہ رقمیں خالص اخراجات ہیں کیونکہ ان کی آمدنیاں نہیں بتائی گئی ہیں۔

اوراس حساب سے حیدرآباد نے قومی تعمیری محکموں پراپنی آمدنی کا ۱۹ فی صدحصہ صرف کیا۔ یہ حیدرآبادی مالیات کا سب سے زیادہ منور پہلو ہے کہ اخراجاتی تناسب کے لحاظ سے حیدرآبادی مالیات کو برطانوی ہند کی مالیات پر قومی تعمیری نقطۂ نظر سے فوقیت حاصل ہے۔

میسور ریاست کا شمار ہندستان کی ترقی پذیر ریاستوں میں ہوتا ہے۔ وہاں قومی تعمیری محکموں پر یہ اخراجات ہوتے ہیں :-

۱۹۳۹-۴۰ء میں قومی تعمیری محکموں پر میسور کے اخراجات

تعلیم	۵۳،۸۸،۰۰۰
طبی اخراجات	۱۶،۰۲،۰۰۰
زراعت	۴،۸۸،۰۰۰
جانوروں کا علاج	۳،۸۳،۰۰۰
صحت عامہ	۲،۱۴،۰۰۰
صنعت وحرفت اور تجارت	۱،۹۲،۰۰۰
باہمی امداد	۱،۵۹،۰۰۰
ریشم کے کیڑوں اور ریشم کی صنعت	۱،۱۳،۰۰۰
کل قومی تعمیری اخراجات	۸۵،۳۹،۰۰۰

۱۹۳۹-۴۰ء میں میسور ریاست کی آمدنی ۴،۱۷،۹۸،۰۰۰ تھی اس حساب سے میسور نے قومی تعمیری محکموں پر اپنی آمدنی کا ۲۰ فی صد حصہ خرچ کیا تھا۔

پُرانے زمانے کی یادگار اندھیرا اور تاریکی میں مبتلا ریاستوں میں علم کے نور اور تہذیب کی روشنی کو پھیلانے کے لیے جس دریادلی سے روپیہ صرف کیا جارہا ہے، اور قومی تعمیری محکموں اور تحریکوں کی جس قدر مالی سرپرستی کی جارہی ہے اُس کی مثال بقیہ ہندستان میں نہیں ملتی، حالانکہ

وہاں دستور، جمہوریت، حق انتخاب اور حق بازپرس سبھی ہے یا نہیں ہے یا کم ہے تو درداور ہمدردی!! خوشامد اور تملق سے نہیں بلکہ سچے یقین اور خلوص دل سے میں یہ کہتا ہوں کہ جس طرح بڑودا اور میسور میں سرکاری آمدنی کا صحیح تر اور بہتر مصرف ہوتا ہے اس کی نظیر "برطانوی ہندستان" کے کسی صوبے میں نہیں ملتی۔ ممکن ہے کہ ضابطے اور قاعدے، دستور اور آئین، حقوق اور قانون کے نقطۂ نظر سے برطانوی ہندستان کی حالت بہتر ہو مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ قاعدے کے پردے میں بے قاعدگیاں، ضابطے کی آڑ میں بے ضابطگیاں جتنی وہاں ہوتی ہیں اتنی ترقی پذیر اور ترقی پسند ریاستوں میں نہیں ہوتیں۔ ایک جگہ دستور اور آئین ہیں مگر روح دستور مفقود ہے دوسری جگہ تحریری آئین اور دستور موجود نہیں مگر روح عمل کارفرما اور روح آئین موجود ہے۔

نظری مالیات کی روشنی میں ہندستانی مالیات کی آمدنی اور اخراجات کی سرگذشت ختم ہوئی، آخر میں دوبارہ اُن حضرات سے جو اس مضمون کو ملاحظہ فرمانے کی زحمت گوارا کریں گذارش ہے کہ اپنے مشوروں اور تنقیدی اصلاحوں سے ممنون فرمائیں تاکہ جب کبھی "ہندستانی مالیات" کی کتاب کو ترتیب دینے کا موقع ملے مہربان علم دوستوں کی قیمتی رایوں سے استفادہ کیا جاسکے۔

فاشزم کا نظام معیشت اور اس کے عملی پہلو

از
جناب محمد عبد القادر صاحب، لکچرار معاشیات جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی

فاشزم کا نظریہ اور اس کا معاشی مسلک اٹلی کے سیاسی اور معاشی حالات سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ پچھلی جنگ عظیم کے دوران میں اور اس کے فوراً ہی بعد ملک میں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ ان کی وجہ سے فاشزم نے جنم لیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بہت سارے واقعات اور تحریکات، جو بادی النظر میں سیاسی معلوم ہوتی ہیں، ان کی تہ میں معاشی محرکات موجود ہوتے ہیں، چنانچہ پچھلی جنگ عظیم کے اسباب کا مطالعہ کرتے ہوئے، محض ایک شہزادے کے قتل کا حادثہ یا یورپ میں توازنِ قوت کے مسئلہ کی اہمیت کو معلوم کر لینا کافی نہیں، بلکہ اس زمانہ کی معاشی تاریخ اور بالخصوص یورپ کے ممالک کی نو آبادیاتی پالیسی کا جاننا بیحد ضروری ہے اسی طرح فاشزم کو بخوبی ذہن نشین کرنے کے لئے اس کے معاشی پس منظر سے واقفیت اہم ہے۔

جنگ عظیم نے اٹلی کو بہت کچھ متاثر کیا۔ ابتدائی زمانہ میں یہ ملک غیر جانبدار رہا لیکن ۲۴ مئی ۱۹۱۵ء کو اتحادین کا ساتھ دینے کے لئے یہ جنگ میں کود پڑا مسولینی نے (جو اس زمانہ میں ایک اخبار کا اڈیٹر تھا) اس کی موافقت میں مضامین لکھے اور خود جنگ میں شریک ہو گیا۔ دوران جنگ میں اٹلی کے کارنامے کچھ زیادہ شاندار نہ رہے۔ اور بحیثیت مجموعی اٹلی کے لئے جنگ مفید ثابت نہ ہوئی۔ جنگ کے اختتام پر ملک میں پریشانی اور انتشار کا دور دورہ رہا۔ ملک کے مالیات پر

جنگ کا بہت کچھ بار پڑا تھا، اس کے مصارف...... ملین لیرا (Lira) ہوئے تھے۔ بسوائے جنگی منافع کمانے والی جماعت کے ملک کے سب طبقوں میں افلاس کا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مصارف زندگی بڑھتے جا رہے تھے اور ہر طرف بے چینی کے آثار پائے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس ملک کا معاشی نظام درہم برہم ہو، وہاں کیا سکون ہو سکتا ہے۔ بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ مالیاتی تنظیم کا کام بیحد مشکل بن گیا ہو۔ اسی بے چینی کا اثر تھا کہ اشتراکی لیڈروں کے زیر اثر ملک میں ہڑتالیں ہونے لگیں، اشتراکین کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ جنگ سے پہلے انکی تعداد جو ۵۰ ہزار تھی اب یہ دو لاکھ ہوگئی۔ مزدور سبھاؤں کے اراکین ۵ لاکھ سے ۲ لاکھ ہوگئے مجلس وضع قوانین میں پہلے صرف ۵۰ اشتراکی اراکین تھے لیکن اب یہ بڑھکر ۱۵۰ ہوگئے۔ بہرحال حکومت کے خلاف بے چینی روز بروز بڑھتی گئی۔

اِن حالات سے لوگوں کی بیزاری اور حکومت سے نا اُمیدی نے اب ایک عملی صورت اختیار کرلی۔ مسولینی نے ۱۹۱۹ء میں بطور ردّعمل ایک چھوٹی سی جماعت Fascist Party قائم کی۔ یہ جماعت بدامنی اور انتشار کے زمانہ میں معرض وجود میں آئی۔ لہذا شروع میں اسکا نہ کوئی نظریہ تھا اور نہ کوئی باقاعدہ پروگرام، یہاں یہ چیز قابل ذکر ہے کہ اشتراکیت کی نوعیت اس کے بالکل برعکس تھی۔ مارکس نے ایک سائنٹفک نظریہ پیش کیا تھا۔ اس نے سرمایہ داری کے عروج و زوال سے بحث کی۔ طبقہ واری کشمکش کے راز کا انکشاف کیا۔ تاریخ کی معاشی تعبیر پیش کی۔ اور اشتراکی پروگرام کی وضاحت کی۔ ابتدائی دور میں فاشستی جماعت کا مقصد بس یہ تھا کہ مزدوروں کے حالات بہتر بنائے۔ اور ملک کے لئے ایک طاقتور حکومت قائم کرے۔ لہذا اس جماعت کے رجحانات اشتراکیت کی طرف تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں کلیسا کی املاک، اور جنگی منافع کی ضبطی، کسانوں کے لئے زمین کا حاصل کرنا اور مزدوروں کو صنعتی اقتدار کا مالک بنانا، یہ سب چیزیں فاشزم کے مقاصد میں شامل تھیں، لیکن بعد میں جب کہ ہڑتالیں بکثرت ہونے لگیں اور بدامنی میں اضافہ ہوا تو مسولینی نے اشتراکیت سے قطع تعلق کرلیا۔ اس سلسلہ میں صنعت گر ول

اور زمینداروں نے جو اشتراکیت کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خائف نظر آتے تھے، فاسی جماعت کی ہر طرح سے مالی امداد کی تاکہ اُن کے حقوق کی خاطر خواہ محافظت ہو سکے۔ اَب کیا تھا، فاسی جماعت کی طاقت رفتہ رفتہ بڑھنے لگی اور ۱۹۲۲ء میں مسولینی نے کامل اقتدار حاصل کرلیا۔

اِس میں کلام نہیں کہ فاشزم نے ابتدائی دَور میں کوئی نظریہ پیش نہیں کیا، لیکن بعد میں چلکر جب اس کی وضاحت کی گئی تو فرد اور جماعت کے متعلق ایک ایسا فلسفہ پیش کیا گیا جس سے کہ فاشزم کے معاشی مسلک کی توجیہ ہو سکے۔ فاشزم نے جماعت کی اہمیت جتلانے میں فرد کی آزادی اور شخصیت کا خیال نہیں رکھا ہے۔ اس کے رو سے اِنفرادی زندگی سے کہیں زیادہ اہم جماعتی زندگی ہے۔ اور جماعت کی معاشی اور سیاسی زندگی کے دوام کے لئے اِنفرادی حقوق اور مفاد کو قربان کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جماعت افراد کے لئے نہیں بلکہ افراد کو جماعت کے لئے زندہ رہنا چاہیئے۔ اِس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے افراد کے حقوق کے بجائے اُن کے فرائض پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ حکومت کی طرف سے معاشی آزادی صرف اُسی قدر دی جاتی ہے کہ جماعتی اغراض متاثر نہ ہونے پائیں۔ اِس فلسفہ کے تحت افراد کی حیثیت بہت ہی مخدوش ہو جاتی ہے۔ اور حکومت کو موقع ملتا ہے کہ افراد کو اپنا آلۂ کار بنائے۔ معاشی آزادی جو افراد کو دی جاتی ہے وہ ایک رعایت کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے جسے حکومت جب چاہے چھین لے سکتی ہے۔ الغرض اس فلسفہ سے اِنسان کی شخصیت باقی نہیں رہتی اور وہ حکومتوں کے اغراض کی تکمیل کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے اور ہر نار وا ظلم کو جماعتی فلاح و بہبود کے بہانے روا رکھا جاتا ہے۔ بلاشبہ افراد کی جد وجہد جماعتی فلاح و بہبود کے لئے ہونی چاہیئے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انفرادی شخصیت کو بالکل ہی ختم کر دیا جائے۔ واقعات اس کے شاہد ہیں کہ اس خطرناک نظریہ کے تحت لاکھوں اِنسان مملکت کے اغراض کی بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں۔

اِس اجتماعی فلسفہ کے بعد اگر سب سے زیادہ کسی چیز کو فاشزم میں اہمیت حاصل ہے تو وہ نیابت کا مسئلہ ہے۔ ہم جس نظام نیابت کے عادی ہیں وہ جغرافیائی بنیادوں پر قائم ہے

اور اس کے تحت ملک کے سارے رقبہ کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور ہر حصہ کیلئے ایک یا ایک سے زائد نمائندے ہوتے ہیں۔ لیکن فاشزم کے تحت نیابت کی بنیادیں پیشوں پر قائم ہیں۔ سارے ملک کو مختلف پیشہ ورانہ جماعتوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس طرح یہاں ۱۳ اتحادات قائم کئے گئے ہیں جو کہ "سنڈیکیٹس" (Syndicate) کہلاتے ہیں۔ ان میں سے ۶ مزدوروں، ۶ آجروں اور ایک آزاد پیشوں Professional man سے متعلق ہے۔ مزدوروں کے جو ۶ اتحادات ہیں وہ صنعت و حرفت، زراعت، بری نقل و حمل، بحری اور ہوائی نقل و حمل، بنک کاری و انشورنس میں کام کرنے والے مزدوروں پر مشتمل ہیں۔ اور انہیں صنعتوں کے لئے آجروں کے ۶ مماثل اتحادات ہیں۔

اس نظام نیابت کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ مزدوروں اور آجروں کے درمیان اشتراک عمل قائم کرنے کے لئے بہت سے (Corporation) "کارپوریشن" قائم ہیں۔ مثلاً حمل و نقل کے لئے جو "کارپوریشن" قائم ہے اس میں حمل و نقل میں کام کرنے والے مزدور، حمل و نقل سے متعلق مختلف کاروباروں کے آجر، چند فنی ماہرین، اور فاسِتی جماعت کے نمائندے شامل ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ آجر اور مزدور کے مشترکہ مسائل کا تصفیہ کریں، مزدوروں کے جھگڑوں کو رفع کریں۔ یہ سب "کارپوریشن" کی وزارت (Ministry of corporation کے تحت ہیں اور اسے "کونسل آف کارپوریشن" سے مدد ملتی رہتی ہے۔ اس نظام مملکت کو جس میں کہ "سنڈیکیٹس" اور "کارپوریشن" کو بڑی اہمیت حاصل ہے، "کارپوریٹ اسٹیٹ" (Corporate State) کا نام دیا گیا ہے۔

یہاں ہم پیشہ ورانہ اور جغرافیائی نیابت کے فوائد و نقصانات کی بحث میں اُلجھے بغیر اتنا واضح کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ ان "کارپوریشن" میں کئی نقائص پائے جاتے ہیں چنانچہ سب سے پہلے ان کا طریقۂ انتخاب حد درجہ ناقص ہے۔ "کارپوریشن" کے نمائندے نام نہاد طور پر منتخب کئے جاتے ہیں۔ اصل میں سارے "کارپوریشن" فاسِتی جماعت کے تحت ہوتے ہیں

ہر "کارپوریشن" کے اراکین وہی ہوتے ہیں جن کا شمار فاستی جماعت کے وفادار اراکین میں ہوتا ہے۔ ان کے اختیارات بھی کچھ زیادہ وسیع نہیں ہوتے۔ چونکہ ان کی صدارت "منسٹر آف کارپوریشن" کرتا ہے، لہذا اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ (اجنڈے) میں کوئی ایسی بات نہ آنے پائے جس کی اجازت پارٹی یا حکومت کی طرف سے نہ دی گئی ہو۔ ان "کارپوریشن" کی حیثیت محض مشاورتی رہجاتی ہے۔ جہاں تک کہ اتحادات میں شامل ہونے والے مزدوروں کا تعلق ہے یہ غیر فاستی جماعتوں سے تعلق نہیں رکھ سکتے۔ جب خود نظام نیابت میں آزادی کی بہت کم گنجائش رکھی گئی ہے تو یہ توقع رکھنا بیسود ہے کہ ان فاستی اداروں کے ذریعہ مزدوروں کی خاطر خواہ نمائندگی ہوسکیگی۔ بہرکیف جملہ اداروں پر فاستی جماعت اور حکومت کا کامل تسلط ہے۔

لیکن فاشزم کا دعویٰ ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت، دونوں کا یکساں مخالف ہے۔ جہاں تک کہ دعویٰ کا دوسرا حصہ ہے یہ تو ہماری سمجھ میں آسانی سے آجاتا ہے، البتہ اُسکے پہلے حصے کے ماننے میں ہمیں تامل ہوتا ہے۔ فاشزم کے تحت ایسی کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی گئی ہے جو کہ سرمایہ دارانہ نظام کو کھوکھلا کر دے۔ خانگی ملکیت اور ذرائع پیدائش پر خانگی تسلط کو بحال رکھا گیا ہے۔ مسولینی کے برسراقتدار آنے سے پہلے سرمایہ دار سپید و سیاہ کے مالک تھے اور اب بھی ان کی حیثیت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی ہے بلکہ اس نئی تحریک کی کامیابی کا انحصار ایک بڑے درجہ تک، سرمایہ داروں کے تعاون اور اشتراک عمل پر رہا ہے نیز مسولینی نے جمہوری نظام کا خاتمہ کر کے سرمایہ داروں کے حصول مقاصد کی راہ میں آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ بات یہ ہے کہ سیاسی جمہوریت اور معاشی سرمایہ داری ایک دوسرے کے ضد ہیں۔ اور جمہوری نظام کے تحت مزدوروں کو اپنے حقوق منوانے کا موقع رہتا ہے۔ اور سیاسی جمہوریت کے نتائج معاشی جمہوریت کی شکل میں نمودار ہونے کے ہمیشہ امکانات رہتے ہیں۔ اب اس سے بچنے کا جو بہترین طریقہ نکالا گیا وہ بس یہ تھا کہ جمہوری نظام کا یک سر خاتمہ کر دیا جائے۔

فاشزم اس پر زور دیتا ہے کہ گو اُس نے انفرادی جد و جہد کو روا رکھا ہے لیکن اُس کے حدود قائم کر دیئے ہیں تاکہ یہ قومی مفاد سے ٹکرانے نہ پائے۔ نظری اعتبار سے تو یہ دعویٰ بہت ہی دل خوش کن ہے لیکن واقعات اس کے بالکل برعکس ہیں۔ جہاں تک کہ مزدور سبھاؤں کا تعلق ہے اُن کے قیام کی اجازت ضرور دی گئی ہے لیکن اُن پر جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں وہ اُنہیں مخدوش بنا دیتی ہیں۔ مزدوروں کے لئے ۱۹۲۷ء میں ایک منشور (Charter of Labour) عطا کیا گیا۔ اسکی بہت کچھ تعریف کی گئی اور یہ کہا گیا کہ اس کی وہی حیثیت ہے جو کہ فرانیسی انقلاب کے زمانہ میں "حقوق انسانی" (Rights of man) نامی دستاویز کی تھی۔ اس "منشور مزدوران" کی رُو سے محنت کے معاشرتی پہلو پر زور دیا گیا ہے۔ مزدوروں کو چند سہولتیں دی گئی ہیں مثلاً کئی ہزار کلب اور انجمنیں قائم ہیں جہاں کہ مزدور اپنے اوقاتِ فرصت میں تفریح اور تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اس کے علاوہ زچہ اور بچہ کے فلاح وبہبود کے ادارے قائم ہیں جہاں کہ مزدور عورتوں کے لئے زچگی سے پہلے اور اس کے بعد نیز شیر خوار بچوں کے لئے بھی طبی امداد کا انتظام کیا جاتا ہے۔ یہ چیزیں بیشک قابل تعریف ہیں لیکن محنت کو معاشرتی حیثیت قرار دینے کے دوسرے پہلو بھی ہیں چنانچہ اُس کی رو سے مزدوروں کا کام یہ ہے کہ بغیر چون و چرا آجر کے احکام مانیں۔ مزدوروں سے ہڑتال کا قانونی حق چھین لیا گیا ہے اور یہاں (اٹلی) کے مزدوروں کا حال وہی کر دیا گیا ہے جو ایک صدی سے زائد پہلے انگلستان کے مزدوروں کا تھا۔ ہڑتال کے بجائے "محنت کے اجتماعی معاہدوں" (Collective Labour Agreement) کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

آجر اور مزدور کے درمیان جھگڑے کی صورت میں "کارپوریشنس" کے ذریعہ تصفیہ ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اگر سمجھوتہ کروانے میں انہیں ناکامی ہو تو یہ مسئلہ صنعتی عدالتوں (Labour Tribunal Confidential Courts) کے تفویض کر دیا جاتا ہے۔ ان کی طرف سے جو اوقات کار اور اُجرتیں مقرر کی جاتی ہیں اُنہیں پر مزدوروں کو کام کرنا پڑتا ہے۔ ان عدالتوں کیا

حکومت کے نمائندے ہوتے ہیں اور بالعموم تصفیہ فاستی جماعت کے سیاسی اغراض کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی بازاروں میں اٹلی کے اشیاء کو دوسرے ممالک کے اشیاء کا مقابلہ کرنے کے قابل بنانے کے لئے یہاں کے مصارف پیدائش کم کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اور تخفیف اُجرت کی پالیسی کی حمایت کی جاتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء تا ۱۹۳۲ء مصارف زندگی میں اوسطاً ۵ فیصد تخفیف ہوئی لیکن اُجرتوں میں ۴۰ تا ۵۰ فیصد تخفیف ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اُجرتوں کی اہمیت مصارف زندگی کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ اور جب مصارف زندگی میں ناقابل ذکر تخفیف ہو لیکن اُجرتوں میں بہت کچھ تخفیف ہو جائے تو مزدور کی اُجرت صحیحہ بُری طرح متاثر ہوتی ہے (زرعی مزدوروں کی اُجرت صحیحہ میں بھی تخفیف ہوئی بات یہ ہے کہ فاشزم کے تحت ترک وطن پر قیود عائد کئے گئے تھے اور اضلاع میں زائد آبادی کا بار زمین پر پڑ رہا تھا، اور نتیجۃً اُجرتوں کی سطح میں تخفیف ہو رہی تھی۔)

ایک اور اہم سوال جو پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے آیا فاشزم کے تحت مزدور کی معاشی حالت بہتر ہوئی ہے یا نہیں۔ اس کا جواب دینے کے لئے ہمیں بے روزگاری کے مسئلہ پر توجہ کرنی ہوگی ۱۹۳۲ء میں تقریباً ایک ملین بے روزگار تھے۔ لیکن ۱۹۳۵ء میں بے روزگاروں کی تعداد میں حیرت انگیز تخفیف ہوئی، ان کی کھپت یا تو جنگ حبش یا فوجی خدمات یا مختلف صنعتوں میں ہوئی۔ نیز مزدوروں اور آجروں کے درمیان ایک سمجھوتہ ہو گیا تھا کہ فی ہفتہ ۴۰ گھنٹہ کام ہوگا اس لحاظ سے بھی بہت سارے مزدوروں کی کھپت ہو گئی۔ لیکن یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ وہ ملک جو اپنی بے روزگاری کے مسئلہ کے حل کے لئے جنگ کا محتاج ہو، کچھ زیادہ سائنٹفک معاشی پالیسی کا حامل نہیں کہا جا سکتا۔

لیکن روزگار کے حاصل کرنے میں بھی مزدوروں کو دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ آجروں کے لئے بطور خاص یہ ہدایت دی جاتی ہے کہ ملازمت کے وقت وہ فاستی جماعت اور فاستی مزدور سبھاؤں کے ارکین کو ترجیح دیں۔ ہر مزدور کے پاس ایک "پاس"

ہوتا ہے جس میں اس کے سیاسی اعتقادات اور فوجی خدمات کی تفصیل ہوتی ہے۔ اور ملازمت کے وقت ان تمام چیزوں کو دیکھا جاتا ہے۔ مخالف پارٹی سے تعلق رکھنے والوں کو نہ صرف ملازمت سے محروم رکھا جاتا ہے بلکہ ہمیں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ اشتراکیں اور مزدور سبھا کے لیڈروں کو جلاوطن یا قتل کر دیا گیا۔

فاشزم کا مزدوروں سے جو سلوک رہا ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی قابل تحقیق ہے کہ اس نے مسئلہ آبادی کے متعلق کیا پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ مسئلہ آبادی کی اہمیت کو اٹلی میں سبھی نے تسلیم کر لیا ہے۔ چنانچہ فاسقی مجلس اعلیٰ (Fascist Grand Council) میں اسکو سب مسئلوں سے بڑا اور قومی زندگی کے نقطۂ نظر سے اہم بتلایا گیا۔ نیز ۲۶ مئی سنہ ۱۹۲۷ء کو اٹلی کے چیمبر کے روبرو مسولینی نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ ۱۹۵۰ تک اٹلی کی آبادی ۶۰ ملین ہونی چاہیئے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر اٹلی جیسے ایک چھوٹے سے قطعہ میں چالیس ملین انسان آباد ہیں تو دوسری طرف اٹلی کے اطراف ایسے علاقہ ہیں جن کا رقبہ تو اٹلی سے دگنا ہے لیکن جہاں کی آبادی اٹلی سے بہت کم ہے۔ لہٰذا اٹلی کی توسیع (Expansion) کا مسئلہ درحقیقت اُس کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اِس سلسلہ میں جو طرز استدلال اختیار کیا گیا ہے وہ نہایت دلچسپ ہے یہ کہا جاتا ہے کہ اٹلی میں جو متزائد آبادی ہے اُس کی کھپت دوسرے ممالک میں توطن خارجی کے ذریعہ ہوا کرتی تھی لیکن آج کل جب ہر ملک وطن گیری پر قیود عائد کر رہا ہے یہ چیز غیر ممکن ہوجاتی ہے لہٰذا خود اپنے مملکت کے حدود میں متزائد آبادی کے لئے جگہ نکالنی چاہیئے اور اسی غرض سے اپنے علاقوں کو بڑھانا چاہیئے۔

محض اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ آبادی میں اضافہ کرنے پر بھی زور دیا گیا۔ اضافۂ آبادی کے جواز میں دو اہم دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔ پہلی تو سیاسی دلیل ہے یعنی طاقتور اطالوی قوم کی تعمیر کے لئے کثیر التعداد آبادی نہایت ہی ضروری ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ گرتی ہوئی شرح پیدائش کو روکنے اور اس کے بُرے اثرات سے ملک کو بچانے کے لئے بھی اضافہ آبادی ضروری ہے

اٹلی نے گرتی ہوئی شرح پیدائش کے رجحانات کو روکنے کے لئے کئی طریقے اختیار کئے ہیں ناکتخدائی کو پسند نہیں کیا جاتا اور مجرد اشخاص پر ٹیکس بڑھا دیا جاتا ہے۔ شادی کے لئے مختلف سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں مثلاً اس کے لئے قرضے دئے جاتے ہیں اور جیسے جیسے بچے پیدا ہوتے جاتے ہیں اداشدنی رقم میں کمی کر دی جاتی ہے اور بالآخر چوتھے بچے کی پیدائش پر قرضہ معاف کر دیا جاتا ہے ایسے مزدور جن کے ۸ بچے ہوں ان کے ٹیکس میں تخفیف کی جاتی ہے۔ ملازمتوں میں شادی شدہ اشخاص کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ضبط تولید اور استقاطِ حمل کے خلاف قوانین وضع کئے گئے ہیں۔ کثیر الاولاد مایوں کو اعزازی تحفے دئے جاتے ہیں۔

ایک اور طریقہ جو اضافہ آبادی کے لئے اختیار کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ باشندوں کے دیہات چھوڑ کر شہروں کی طرف جانے پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ شہروں کی آبادی کے بڑھنے سے شرح اموات میں اضافہ کے جو امکانات ہوتے ہیں اُنہیں روکا جائے انہیں پابندیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شہر میں آنے کے بعد کچھ عرصہ تک بیروزگار رہے تو اُسے دیہات واپس کر دیا جاتا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ شہروں کی طرف منتقلی کو بالکلیہ بند کر دیا گیا ہے۔ اٹلی میں ایک ایسا محکمہ قائم ہے جو لوگوں کو البتہ ترقی یافتہ صنعتی علاقوں میں جانے میں مدد دیتا ہے علاوہ ازیں اس محکمہ کی طرف سے لوگوں کے لئے افریقی نوآبادیات میں جانے کی سہولتیں بھی مہیا کی جاتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اٹلی کے باشندوں کو ایسے علاقوں میں جانے سے روکا جاتا ہے جو کہ اس ملک کے سیاسی حدود سے باہر ہوں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان تمام طریقوں کا نتیجہ کیا ہوا ہے۔ اور آبادی کے متعلق اٹلی کی پالیسی کہاں تک کامیاب رہی ہے۔ شادیوں اور شرح پیدائش میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں خالص اضافہ کی شرح ۸٫۷ فی ہزار رہی گویا گرتی ہوئی شرح پیدائش میں پچھلے سالوں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہونے پایا ہے۔ لیکن اس کے باوجود

اٹلی اپنی آبادی کے بڑھانے کی پالیسی پر ثابت قدم رہا نئے نئے علاقوں کا مطالبہ بڑھتا گیا اور منجملہ اور اسباب کے یہ واقعہ بھی جنگ کے پیدا کرنے میں ممد و معاون رہا۔

اٹلی کی معاشی پالیسی کا ایک اور اہم جزیہ ہے کہ ملک کے لئے معاشی خود اکتفائی حاصل کی جائے۔ معاشی خود اکتفائی کی آسان تشریح یہ ہے کہ ہر ملک کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے اپنے معاشی ضروریات کے لئے دوسروں کا محتاج نہ رہے۔ بلکہ خود اپنے طور پر ضروری اشیاء اور بالخصوص اشیاء خور د و نوش پیدا کرلے۔ اس پالیسی کی تائید مختلف اسباب کی بنا پر کی جاتی ہے لیکن یہاں اس کے صرف ایک پہلو کو واضح کر دینا کافی ہوگا یعنی وہ جو جنگی مصلحتوں سے تعلق ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ پچھلی جنگ میں جرمنی کی شکست اس لئے ہوئی کہ وہ ملک خود اپنے ضروریات کی تکمیل نہیں کرسکتا تھا اور دوسروں کا محتاج تھا۔ ناکہ بندی کی وجہ سے درآمد جب روکی گئی تو اس کی مصیبتوں میں مزید اضافہ ہوا۔ لہذا اب یہ سوچا گیا کہ بیرونی مال پر انحصار نہ ہو بلکہ خود ملک میں اس کا انتظام ہو۔ ۱۸ نومبر ۱۹۳۵ء کو جب اٹلی کے خلاف تحریرات Economic sanctions نافذ کئے گئے تو مسولینی نے اعلان کیا کہ اس وقت سے اٹلی کی تاریخ کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے کیونکہ اقل ترین مدت میں زیادہ سے زیادہ معاشی آزادی حاصل کرنے کا محرک درحقیقت یہی واقعہ تھا۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک قلیل مدت میں کوئی ملک اپنے جملہ ضروریات اپنے ہی حدود میں پیدا نہیں کرسکتا تو اس کا کیا رویہ ہونا چاہئیے۔ اس مشکل کا حل اس طرح پر کیا جاتا ہے کہ دوسرے ممالک سے مختلف اشیاء حاصل کرنیکا انتظام کیا ہے۔ اس مقصد کے لئے پہلے تو چھوٹے چھوٹے ممالک اپنے طاقتور پڑوسی کی مدد پر مجبور کردیئے جاتے ہیں اور ان کی سیاسی و معاشی آزادی سلب کی جاتی ہے۔ نیز مقبوضہ ممالک (Occupied Territory) کو بھی بطور آلہ کار استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں جب کہ خاص خاص اشیاء خود اپنے ملک میں پیدا نہ ہوسکیں تو ان کے بدل ڈھونڈھے جاتے ہیں۔ مثلاً جرمنی میں اون کے بجائے "Zellwoole

کا استعمال۔

اِس خود اکتفائی پالیسی کے تحت اٹلی نے اپنے حدود میں گیہوں کی پیداوار بڑھانا شروع کیا حال حال تک یہ بیرونی گیہوں درآمد کرنا تھا لیکن بیرونی رسد سے آزاد بننے کی خاطر ملکی پیداوار بڑھانے کی کوششیں ہونے لگیں۔ اِس سلسلہ میں تحقیقی طریقوں، زرعی مشنری اور زرعی تعلیم سے بہت کچھ فائدہ اُٹھایا گیا۔ نیز بیکار زمینوں کو اِستعمال کے قابل بنایا جانے لگا۔ چنانچہ Land Reclamation کی پالیسی کے تحت کئی ہزار مربع میل زمین جو پہلے بیکار تھی اب کاشت کے قابل بنائی جارہی ہے بیرونی گیہوں پر اعلیٰ محصول درآمد عائد کئے گئے۔ اس میں کلام نہیں کہ اس پالیسی کے نتائج تشفی بخش رہے اور اٹلی بیرونی گیہوں کا محتاج نہ رہا۔ لیکن اِس مسئلہ کے دوسرے پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا صارف کے لئے اعلیٰ قیمتیں ادا کرنی پڑیں۔ چنانچہ بیرونی قیمتوں کے مقابلہ میں اٹلی کے صارفین کو ۳۰ فیصد زائد قیمت دینی پڑتی ہے۔ نیز اس پالیسی سے بین الاقوامی رقابتوں میں اضافہ ہونے لگا۔ اٹلی نے دوسرے ممالک پر تجارتی پابندیاں عائد کرنی شروع کیں۔ درآمد پر محاصل، (quotas) اور درآمد کے لئے اجازت نامہ (License) کے طریقے اختیار کئے گئے ان قیود کی وجہ سے دوسرے ممالک کو بھی اٹلی کا مال خریدنے میں تامل ہونے لگا، اور اٹلی کی تجارت برآمد بُری طرح متاثر ہوئی۔ لہٰذا اٹلی نے محسوس کیا کہ معاشی خود اکتفائی کی پالیسی میں ترمیم کی ضرورت ہے چنانچہ اسے بہت سارے بیرونی اشیاء مثلاً گوشت، کوئلہ، خام روئی وغیرہ پر محاصل درآمد میں تخفیف کرنی پڑی۔

اٹلی کے محاصل درآمد اس کے نظام مالیات کے محض ایک جزء ہیں۔ اٹلی کے مالیات کا اندازہ لگانے میں ہمیں سب سے بڑی مشکل جو ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں حساب کتاب، اور موازنہ مرتب کرنے کے طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی تو قومی موازنہ میں اسٹیٹ ریلوے، ٹپہ، تار، ٹیلیفون سے جو آمدنی ہوتی ہے اسے شامل کرلیا جاتا ہے اور کبھی اس کو خارج کردیا جاتا ہے۔ اِس طرح سال بسال قومی موازنوں میں یکسانیت باقی نہیں رہتی اور جب تک کہ ہر موازنہ کے مدات کا

تفصیلی امتحان نہ کر لیا جائے، محض مجموعی اعداد کی بنا پر مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں کے موازنہ کی دو تین خصوصیتیں قابل ذکر ہیں۔ محصول بالواسطہ میں برابر ترقی ہو رہی ہے۔ روئی، کافی، شکر وغیرہ پر محصول عائد کیا جاتا ہے اور اس کا بار غریب طبقہ پر زیادہ پڑتا ہے۔ دوسری چیز جو قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ صلح کے زمانہ میں بھی تعلیم اور دیگر معاشرتی خدمات کے مصارف کے لئے بہت کم گنجائش رکھی جاتی ہے۔ موازنہ کا بڑا حصہ فوج اور پولیس کے مصارف پر مشتمل ہوتا ہے نیز نوآبادیات پر ایک کثیر رقم صرف ہوئی ہے۔ ایک اندازہ کی رو سے نوآبادیات پر ۲۰۰ ملین لیرا (Live) صرف ہوتا تھا۔ چونکہ اٹلی کے نوآبادیات معاشی لحاظ سے فائدہ مند نہیں ہیں، لہذا جو رقم کہ ان پر صرف ہوتی ہے اس کو غیر پیدا آور قرار دیا جا سکتا ہے۔ محض اپنی سطوت قائم کرنے اور رومی شہنشاہی کی جانشینی کی خواہش نے اٹلی کو اس قدر مصارف برداشت کرنے پر آمادہ کیا ہے۔

اب ذرا جنگ حبش کے مالیاتی پہلو کو لیجئے۔ ایک اندازہ کی رو سے ۱۹۳۶ء تک اس پر کل مصارف ۱۲۱۱۱ ملین لیرا رہے۔ اور دو سال یعنی ۳۴ تا ۳۵ء اور ۳۵ تا ۳۶ء کے لئے موازنہ میں ۶۱۷۴ ملین لیرا کا خسارہ رہا۔ یہ مصارف زیادہ تر اندرونی قرضوں اور اعلیٰ محاصل کے ذریعہ پورے کئے گئے۔ نیز املاک پر بھی محصول عائد کیا گیا۔ علاوہ ازیں اس جنگ کے اور اسلحہ کے مصارف پورے کرنے کے لئے مشترک سرمایہ دار کمپنیوں کے ادا شدہ اصل پر ۱۰ فیصد کے حساب سے محصول عائد کیا گیا۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ محصول کا بار، محصول ادا کرنے والوں کے لئے گراں ثابت ہو رہا ہے۔ خود مسولینی نے اٹلی کے چیمبر کے سامنے اپنی ایک تقریر کے دوران میں اس کا اعتراف کیا اور محصول کا بار ہلکا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

مضمون کے اختتام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فاشزم کے نمایاں کارنامے کیا رہے ہیں۔ فاشزم نے دل خوش کن وعدے تو کئے تھے۔ یعنی اس کے ذریعہ ملک کو سیاسی امن اور معاشی خوشحالی حاصل ہوگی۔ مزدور کے لئے روزگار، دوکاندار کے لئے خریدار، کسان کیلئے

زمین، اور سرمایہ دار کے لئے منافع، فراہم کیا جائے گا۔ ملک کو طاقتور بنانے کے لئے اٹلی نے اضافۂ آبادی اور معاشی خود اکتفائی کے طریقے اختیار کئے لیکن یہ پالیسی کچھ زیادہ کامیاب نہ رہی نو آبادیات اور بالخصوص حبش حاصل کرنے اور اسلحہ بڑھانے کے سلسلہ میں جو مالیاتی بار ملک پر پڑا وہ بہت ہی گراں ثابت ہو رہا ہے۔ اور باشندوں کا معیار زندگی گھٹتا جا رہا ہے "کارپوریٹ" نظام کے تحت مزدوروں کی تحریک پر ضرب کاری لگی ہے اور جو مزدور سبھائیں مخالفت کی جرأت کرتی ہیں وہ مٹا دی جاتی ہیں۔ الغرض اس نظام کے تحت جو ادارے کہ قائم کئے گئے ہیں وہ اٹلی کے باشندوں کی معاشی خود مختاری کے لئے نہیں، بلکہ فاسی مملکت کے اغراض کے لئے ہیں۔

جاپان کی صنعتی ترقی

از

جناب محمد ناصر علی صاحب ام۔ اے (عثمانیہ) لکچرار شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ سرکار عالی

تاریخی پس منظر۔ جاپان کی صنعتی ترقی کے حالات بیان کرنے سے پہلے جاپانی تاریخ کے اہم ارتقائی مدارج کی مختصر تشریح ضروری ہے۔ کیونکہ اس کی بدولت جاپان کے دور جدید یا اس کے نشان ثانیہ کے سمجھنے میں مدد ملیگی۔ چین کی طرح جاپان بھی ایک قدیم سلطنت ہے۔ ۶۶۰ ق۔م میں اس کی بنیاد ڈالی گئی۔ جیمو[1] یہاں کا سب سے پہلا شہنشاہ گزرا ہے اور یہی اس سلطنت کا بانی بھی تھا۔ جیمو کی وفات کے بعد سے ساتویں صدی سنہ عیسوی تک اس کے جانشین پورے اختیارات کے ساتھ ملک پر حکومت کرتے رہے لیکن ساتویں صدی کی ابتداء میں فوجی[2] وارا نامی ایک ذی اثر درباری خاندان کو قوت حاصل ہوگئی۔ ملک کے عاملانہ اختیارات اس خاندان کے ہاتھ میں منتقل ہوگئے اور شہنشاہ کا وجود برائے نام رہ گیا۔ قوت اور اقتدار کے گھمنڈ میں جب اس خاندان کے اراکین عیش وعشرت کا شکار ہوگئے تو نویں صدی میں ٹائرا[3] فوجی خاندان نے اور دسویں صدی میں میناموٹو[4] فوجی خاندان نے اثر پیدا کرلیا۔ جنوب اور مغرب میں ٹائرا خاندان کا اثر تھا اور شمال اور مشرق کے علاقے میناموٹو خاندان کے زیر اثر تھے۔ بارہویں صدی کے وسط تک ان دونوں خاندانوں نے اتنی قوت حاصل کرلی کہ فوجی وارا خاندان کو پورے طور پر زوال ہوگیا۔

---

[4] Minamalo [3] Taira [2] Fujwara [1] Jimmu

اس خاندان کے زوال کے ساتھ ہی اقتدار کلی حاصل کرنے کے لئے ٹائرا خاندان اور مینا موٹو خاندان میں کشمکش شروع ہوئی۔ مینا موٹو خاندان کے مقابل ٹائرا خاندان کو ابتداً فتح حاصل ہوئی اور کچھ عرصے تک اس کی حکمرانی رہی لیکن ٹائرا خاندان نے مینا موٹو خاندان کو شکست دینے کے بعد سب سے اہم غلطی یہ کی کہ شکست خوردہ مینا موٹو سردار کے دو لڑکوں (یوری ٹومو[1] اور یوشی ٹسون[2]) کو زندہ چھوڑ دیا۔ بعد ازاں انھی لڑکوں نے اثر اور قوت حاصل کرکے وسط بارہویں صدی (۱۱۸۵ء) میں ٹائرا خاندان کو شکست فاش دی اور اس کا خاتمہ کر دیا۔ نتیجتاً جاپان کی حکومت مینا موٹو خاندان کے ہاتھ میں آگئی۔ یہیں سے شوگنی[3] دور حکومت کی ابتدا ہوتی ہے۔ شوگن[4] وہ اعلیٰ ترین خطاب ہے جو شہنشاہ کی جانب سے فوج کے سپہ سالار کو عطا کیا جاتا تھا۔ چونکہ فوج کے سپہ سالاروں نے غیر آئینی طور پر شہنشاہ کی قوت کو معطل کرکے عملاً خود حکمرانی شروع کر دی تھی اس لئے اُن کا عہد حکومت عام طور پر شوگنی دور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وسط بارہویں صدی تا وسط انیسویں صدی کا زمانہ شوگنی دور میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس دور میں مختلف فوجی خاندانوں نے حالات اور موقعوں کا لحاظ کرتے ہوئے باری باری سے حکومت کی۔ یوری ٹومو اور آئی یاسو[5] اہم شوگن گزرے ہیں۔ یوری ٹومو نے شوگنی نظام حکومت کی بنیاد ڈالی اور آئی یاسو نے اُسے درجہ کمال پر پہنچایا۔ اس دور کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جاگیرداری نظام کو بہت تقویت پہنچی اور اس نظام کی ترقی کے ساتھ ملک میں وہ تمام خرابیاں پیدا ہو گئیں جو عام طور پر اس نظام میں پائی جاتی ہیں۔ شوگنوں کی قوت اور اقتدار اس قدر بڑھ گیا تھا کہ تخت و تاج کے حقیقی مالک یعنی شہنشاہ کی حیثیت ایک گوشہ نشین سے زیادہ نہ تھی۔ شوگن سفید و سیاہ کے مالک تھے حکومت کی باگ جس طرف چاہتے موڑ لیتے۔

لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔ ہر عروجے را زوالے — بالآخر شوگنوں کی قوت ٹوٹنے کے

---

[1] Yoretomo [2] Yoshitsime [3]

[4] Shogan [5] Iyeyasac

سامان مہیا ہونے لگے۔ ابتدائے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں علی الترتیب دو اہم کتابیں شائع ہوئیں۔ ان میں سے ایک کا نام ہسٹری[۱] آف گریٹ جاپان یعنی جاپان عظمیٰ کی تاریخ تھا اور دوسری کا نام اکسٹرنل[۲] ہسٹری آف جاپان یعنی جاپان کی خارجی تاریخ تھا۔ پہلی کتاب میں جیمو کی تخت نشینی کے بعد سے ۱۴۱۲ء تک کے حالات بیان کئے گئے تھے اور دوسری میں شوگنی دورِ حکومت کی ابتدا (وسط بارہویں صدی) سے لیکر آئی یاسو کی تخت نشینی (کے زمانہ) تک کے حالات کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ ان دونوں کا اہم مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ملک کا حقیقی حکمران شہنشاہ (جس کا رشتہ جیمو سے ملتا ہے) ہے اور شوگن غیر آئینی حکمران ہیں جنھوں نے تلوار کے زور سے ملک کی حکومت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا لوگوں نے ان کتابوں کو شوق سے پڑھا۔ حقیقتِ حال سے واقفیت کے بعد ان کے دلوں میں شوگنوں کے خلاف احساسات پیدا ہو گئے۔ لیکن شوگنوں کی قوت کو توڑنے میں ان کتابوں کی اشاعت سے کہیں زیادہ اہم حصہ ایک اور واقعہ کا ہے: سولہویں صدی کے نصف آخر اور سترہویں صدی کے پہلے ربع میں یورپی تاجروں کو جاپان میں آنے اور تجارت کرنے کی عام اجازت تھی۔ چنانچہ پرتگالی، ولندیزی اور انگریز جاپان کے ساتھ تجارت کرتے تھے۔ لیکن رومن[۳] کیتھولک چرچ کے مشنریوں[۴] نے ساتھ ہی ساتھ تبلیغ کا کام بھی شروع کر دیا۔ ان کی اس جدوجہد کی وجہ سے ایک صدی کے اندر دس لاکھ سے زائد جاپانی عیسائی مذہب قبول کر لیے۔ اس واقعہ سے ملکی افراد میں یورپیوں کے خلاف بدظنی پھیل گئی۔ عیسائیت اور یورپیوں کے خلاف حکومت کی پالیسی بھی بدل گئی۔ ملک سے انہیں نکالا جانے لگا اور اکثر مبلغ قتل کر دیئے گئے۔ سوائے ڈچوں کے یورپ کی دوسری قوموں کو جاپانی ساحلوں پر آنے اور تجارت کرنے سے روک دیا گیا۔ اس کے بعد دو سو سال سے کچھ زیادہ عرصے تک جاپان کے تجارتی تعلقات بیرونی دنیا سے منقطع رہے۔ لیکن وسط انیسویں صدی میں یورپی قومیں دوبارہ جاپانی سمندروں پر

۱ـ History of Great Japan ۲ـ External History of Japan

۳ـ Roman Catholic Church ۴ـ Missionaries

نمودار ہوئیں۔ امریکہ نے بھی اس امر پر زور دیا کہ جاپانی بندرگاہیں بیرونی تاجروں کے لئے کھول دیجائیں مگر جاپانیوں کا عام خیال یہ تھا کہ بیرونی قوموں سے تجارتی معاہدات نہ کئے جائیں اور جاپانی بندرگاہیں حسب سابق بند رکھی جائیں۔ شوگن وقت نے حالات کی نزاکت کا لحاظ کئے بغیر رائے عامہ کو ٹھکراتے ہوئے اور شہنشاہ کی نام نہاد منظوری کی پرواہ نہ کر کے بیرونی اقوام سے تجارتی معاہدے طے کر دیئے اس واقعہ نے شوگن کے خلاف ملک میں ہر طرف شورشیں عام کر دیئے۔ شہنشاہ کے موافقین کو شوگن کی علی اعلان مخالفت کے لئے اچھا موقعہ ہاتھ آیا۔ ہر طرف سے یہ آوازیں شروع ہوئیں کہ "شوگن غدار، غاصب اور غیر آئینی حکمران ہے۔ اُسے نکال باہر کیا جائے" شہنشاہ کے طرفداروں کو اس مقصد میں کامیابی ہوئی اور شوگنی حکومت کو زوال ہوا۔ ۹ر نومبر ۱۸۶۷ء کو آخری شوگن یوشینوبو[۱] نے اپنا استعفا شہنشاہ وقت مٹ سوہی ٹو[۲] کے پاس روانہ کیا۔ اس طرح ملک کی حکومت دوبارہ اس کے اصلی حکمران کے ہاتھ میں آگئی۔ شہنشاہ مٹ سوہی ٹو (جیمو کی نسل کا ایک سو اکیسواں[۱۲۱] شہنشاہ) نے اپنا لقب می جی[۳] (می جی کے معنی این لائینڈ[۴] گورنمنٹ یا بیدار مغز حکومت کے ہیں) اختیار کیا۔ اسی لئے اس کا دور حکومت می جی عہد کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۴ مارچ ۱۸۶۸ء کو شہنشاہ نے اپنے درباریوں کو جمع کیا اور ملک کی ہر جہتی ترقی سے متعلق ایک قسم کھائی جسے چارٹر اوتھ[۵] کہا جاتا ہے اس قسم کے پانچ اجزا حسب ذیل ہیں:-

(i) عام جلسوں کے انعقاد کی اجازت ہوگی۔ قومی امور کا انتظام قومی مفاد کے تحت کیا جائے گا۔

(ii) حاکم اور محکوم متفقہ طور پر خود کو ملک کی فلاح اور بہبود کے لئے وقف کر دیں گے۔

(iii) تمام دیوانی یا فوجی عہدہ دار ہر ملکی صنعت کی سرپرستی کریں گے اور افراد کو ان کی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق جد و جہد کرنے میں مدد دینگے۔

۱ـ Yoshinobu ۲ـ Mulsu Hito ۳ـ Meiji

۴ـ Enlightened Government ۵ـ Charter Oath

(۶) قوم کے اخلاقی اور سماجی نقائص کی اِصلاح کی جائیگی۔

(۷) بیرونی دنیا میں جو مفید تعلیم جاری ہے اس کا ملک میں اِنتظام کیا جائیگا اور اِس طرح سلطنت کی بنیادوں کو مضبوط بنایا جائیگا۔

مذکورۂ بالا قسم کے اجزا کو تفصیل کے ساتھ اس لئے بیان کیا گیا کہ یہی درحقیقت جاپان کے اِصلاحی پروگرام کی روح ہے۔ اگر ہم جدید جاپان کی اصلاح کے نظام العمل کا مطالعہ کریں تو وہ ہمیں متذکرہ پانچ اجزا پر مشتمل نظر آئیگا۔ ۱۸۶۸ کا سنہ جاپان کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہیں سے جاپان کے دورِ جدید یا اس کے نشاتِ ثانیہ کی ابتداء ہوتی ہے۔ جاپانی مدبروں نے سیاست، معیشت اور معاشرت کی اصلاح کی طرف ایک ساتھ توجہ کی اور ان کے نقائص پر ہر طرف سے چھاپا مارا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی عشروں میں جاپان نے سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی میں حیرت انگیز ترقی کرلی۔ یہاں پر ہم معاشی ترقی کے صرف ایک جزو ـــــ یعنی صنعتی ترقی پر بحث کرینگے۔

دورِ جدید اور صنعتی ترقی میجی عہد کی ابتدا (۱۸۶۸ء) کے وقت جاپان کی صنعتی حیثیت بہت ہی پست تھی۔ جدید طرز کا صرف ایک کارخانہ موجود تھا، عام طور پر دستکاریوں کا رواج تھا۔ ملکی صنعتیں پارچہ بافی، ظروف سازی اور دوسری معمولی ضروریات کی چیزوں تک محدود تھیں۔ جو مصنوعات تیار کی جاتیں اُن سے زیادہ تر مقامی ضروریات پوری کی جاتی تھیں۔ برآمد کا بڑا جزو خام اشیاء پر اور درآمد کا بیشتر حصہ مصنوعات پر مشتمل ہوتا تھا۔ لیکن میجی دور کی ابتداء کے ساتھ ہی مختلف صنعتوں کو تیزی کے ساتھ وسعت دینے کی کوشش کی جانے لگی۔ صنعتی تنظیم کی ادنیٰ حالت اور بیرونی مقابلہ کی شدت کے پیشِ نظر ملک کے سرمایہ دار صنعتی کاروبار میں کثیر رقومات صرف کرنے کو پرخطر سمجھتے تھے (یہ حالت ایک حد تک اب بھی ہندوستان میں پائی جاتی ہے) اِس دِقت کو رفع کرنے کے لئے خود حکومت نے اپنی طرف سے مختلف کاروبار براہِ راست جاری کرنا شروع کیا۔ مزید برآں جاگیرداروں اور اُمیروں کی

توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی گئی کہ وہ ذاتی طور پر کارخانے قائم کریں اور صنعت و حرفت کی ترقی میں حصہ لیں۔ چنانچہ ایک سے زاید جاگیرداروں اور امیروں نے کثیر رقومات صنعتی کاروبار میں لگانا شروع کیا۔ دو تین عشروں تک رفتار ترقی مقابلتاً سست رہی۔ ۱۸۹۴ئہ میں جب جنگ چین و جاپان کا آغاز ہوا تو مصنوعات کی طلب بڑھ گئی۔ حکومت اور امیروں کے کارخانوں کی کامیابی سے متاثر ہو کر دوسرے خانگی افراد بھی اس طرف مائل ہونے لگے۔ حکومت کی یہ پالیسی ہوتی کہ ابتداً کارخانہ اپنی طرف سے قائم کرے اور جب وہ کامیابی کے ساتھ چلنے لگے تو بتدریج اس سے علحدگی اختیار کرے۔ اس حکمت عملی کا اثر یہ ہوا کہ چند عشروں کے اندر اندر حکومت کی براہ راست صنعتی جد و جہد محدود ہو گئی اور بکثرت خانگی افراد کے کاروبار نظر آنے لگے۔ اُنیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کی ابتدا تک جاپان کی صنعتی سرگرمی نُمایاں طور پر بڑھ چکی تھی۔ جنگ روس و جاپان ۱۹۰۴ئہ نے جاپانی صنعتوں کے لئے ترقی کا ایک اور موقعہ بہم پہنچایا۔ ضروریات جنگ کے لئے مختلف قسم کی چھوٹی بڑی مصنوعات بقدر کثیر طلب کی جانے لگیں۔ صنعتی گرم بازاری اور منافعوں کی بڑھتی ہوئی شرح نے سرمایہ کاروں کی ہمتیں بہت بلند کر دیئے۔ کارخانوں اور مزدوروں کی تعداد میں سرعت کے ساتھ اضافہ ہونے لگا۔ اندرونِ ملک مصنوعات کی مقدار پیدائش میں اضافہ کی وجہ سے برآمدی اشیاء میں خام پیداواروں کا حصہ گھٹنے اور مصنوعات کا حصہ بڑھنے لگا۔ برعکس اس کے درآمدی اشیاء میں مصنوعات کا حصہ گھٹنے اور خام پیداواروں کا حصہ بڑھنے لگا۔ ۱۹۱۳ئہ تک یہ عمل درآمد بہت نُمایاں ہو گیا۔ گزشتہ جنگ عظیم نے جاپان کی صنعتوں کی ترقی کے لئے زرین ترین موقعہ فراہم کیا۔ دنیا کے ترقی یافتہ صنعتی ممالک چونکہ جنگ میں مشغول تھے اس لئے مختلف ایشیائی ممالک میں ان کی مصنوعات کی درآمد یا تو موقوف ہو گئی یا بہت گھٹ گئی۔ خود جاپان میں ان ممالک کی مصنوعات کی درآمد موقوف ہو جانے یا گھٹ جانے کی وجہ سے مقامی صنعتیں بیرونی شدید مقابلہ سے بہت بڑی حد تک آزاد ہو گئیں۔ اعلیٰ قیمتوں نے گراں مصارف پیدائش کے

مسئلہ کو بھی حل کر دیا۔ دوران جنگ جاپان کی بعض مصنوعات محض اس وجہ سے ترقی کر سکیں اور اُن کی مقدار پیدائش صرف اس بنا پر بڑھ سکی کہ بیرونی ممالک سے اُن کی درآمد موقوف ہو چکی تھی یا ناقابل لحاظ تھی۔ جاپان نے اِس موقعہ سے خوب فایدہ اُٹھایا۔ مقدار پیدائش میں بہت اضافہ کر دیا گیا۔ مقامی ضروریات کو پورا کرنے کے علاوہ امریکہ اور اس کے رفیق دوسرے جنگ آزما ممالک کو مختلف قسم کی مصنوعات کثیر مقداروں میں روانہ کی گئیں۔ مقابلہ کی عدم موجودگی یا اس کی خفیف حیثیت کی وجہ سے بہ آسانی اور بہ سرعت مختلف ایشیائی ممالک کی مارکٹوں پر قبضہ جما لیا گیا۔ جنگ عظیم کے اختتام تک جاپان نے صنعت و حرفت میں اتنی ترقی کر لی کے معدودے چند اشیاء کے سوا ضروریات، آسائشات اور تعیشات کی معمولی چیزوں سے لیکر بھاری ترین اور نازک ترین چیزیں اندرون ملک تیار ہونے لگیں۔ بعض صنعتوں میں اس کی ترقی کا یہ عالم رہا کہ خود ترقی یافتہ قدیم صنعتی ممالک کے لئے یہ امر دقت طلب ہو گیا کہ بین الاقوامی بازاروں میں جاپانی مصنوعات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کریں۔ میجی عہد کی ابتداء کے ساتھ اِس میں شک نہیں کہ مختلف قسم کی صنعتیں تیزی کے ساتھ ترقی کرنا شروع کیں اور جنگ عظیم کے ختم تک ترقی کے اہم نقطہ پر یا اس کے بہت قریب تک پہنچ چکی تھیں تاہم ۱۹۱۳ء تک بھی جاپان کے آگے بھاری مشنری کی پیدائش کا مسئلہ بہت اہم رہا دوران جنگ بھاری مشنری کی پیدائش کی طرف ممکنہ توجہ کی گئی اور ختم جنگ تک اِس میں نمایاں کامیابی حاصل کی گئی۔ اہم شینوں اور آلات و اوزار کی پیدائش کی طرف جاپان کی توجہ جنگ کے بعد بھی مبذول رہی۔ اب جاپان تقریباً ہر قسم کی بھاری مشنری تیار کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ جاپان کی موجودہ جنگی جد و جہد سے بھی ہم اس کی صنعتی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں جاپانی صنعتوں کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا ہے۔ سہولت کی خاطر ہم انہیں چند حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: (۱*) بنائی کی صنعتیں (۲) معدنیاتی صنعتیں۔

---

* ے Weaving Industries   ے Mining Industries

(۳) میکانی صنعتیں (۴) کیمیائی صنعتیں (۵) سرامک صنعتیں (۶) غذائی صنعتیں (۷) متفرق صنعتیں. اب ان میں سے ہر ایک صنعت میں ایک سے زاید صنعتیں شامل ہیں۔ ذیل کے نقشے میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ مذکورہ سات مدات کے تحت کونسی صنعتیں شامل ہیں

جاپانی صنعتیں

(۱) بنائی کی صنعتیں	(۲) معدنیاتی صنعتیں	(۳) میکانی صنعتیں	(۴) کیمیائی صنعتیں	(۵) سرامک صنعتیں	(۶) غذائی صنعتیں	(۷) متفرق صنعتیں
(۱) روئی	(۱) لوہا اور فولاد	(۱) جہاز	(۱) بھاری کیمیائی اشیاء	(۱) شیشہ	(۱) آٹا	(۱) ربر
(۲) ریشم	(۲) کوئلہ	(۲) سواری	(۲) ادویات	(۲) سمنٹ	(۲) چائے	(۲) کاغذ
(۳) اون	(۳) تانبہ	(۳) برقی انجینرنگ	(۳) رنگ	(۳) مٹی کے برتن	(۳) شکر	(۳) تمباکو
(۴) سوتی اُونی ململ	(۴) معدنیاتی تیل	(۴) متفرق	(۴) مصنوعی کھاد			
(۵) مصنوعی ریشم						
(۶) ہمپ اور فلاکس						

مندرجہ بالا نقشہ کی مناسبت سے ہم ہر صنعت کی ترقی کے مختصر حالات معلوم کریں گے جس کے ذریعہ بحیثیت مجموعی جاپان کی صنعتی ترقی کا اندازہ ہوسکیگا۔

بنائی کی صنعتیں

(۱) روئی کی صنعت — جاپان میں روئی کی صنعت قدیم زمانے سے جاری ہے البتہ ابتداً اس کی حیثیت بہت محدود تھی۔ جدید اُصولوں پر اس صنعت کی ترقی کا آغاز میجی دور کی ابتداء سے چند سال پہلے ہوا۔ ۱۸۶۲ء میں روئی کی

Mechanical Industries

Chemical Industries

Ceramic Industries

سب سے پہلی گرنی قائم کی گئی۔ ۱۸۶۲ء تا ۱۸۸۵ء روئی کی صنعت کی یہ خصوصیت رہی کہ کارخانے یا تو حکومت کی طرف سے یا سابقہ جاگیرداروں کی جانب سے قائم کئے جاتے رہے۔ بعض دوسرے خانگی افراد نے بھی حکومت کی امداد سے کچھ کارخانے قائم کئے۔ لیکن کاروبار کا پیمانہ محدود تھا اور بیرونی پارچہ کا مقابلہ کرنے میں بہت دقت ہوتی تھی۔ اس صنعت کی حالت اس قدر پست تھی کہ کارخانہ دار ہندوستانی پارچہ کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے۔ لیکن جدید مشنری کے استعمال، اعلیٰ صنعتی تنظیم اور ارزان محنت کے ذریعہ قوت مقابلہ کو بتدریج مستحکم کیا جانے لگا۔ ۱۸۸۵ء تک کتائی اور بنائی کی گرنیوں کی تعداد ۲۰ ہو گئی۔ ۱۸۸۶ء تا ۱۸۹۳ء کا زمانہ اس صنعت کے لئے بحیثیت مجموعی مفید رہا۔ ۱۸۸۵ء کے مقابل ۱۸۹۳ء میں گرنیوں کی تعداد دوگنی یعنی ۴۰ ہو گئی۔ ۱۸۹۴ء اور ۱۹۱۳ء کے درمیان دو جنگوں یعنی جنگ چین و جاپان اور جنگ روس و جاپان نے اس صنعت کو بہت فایدہ پہنچایا۔ ۱۹۱۳ء میں گرنیوں کی تعداد ۱۵۲ تک پہنچ گئی۔ گرنیوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ تکلے[1]، کرگھوں[2] اور مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور پیدائش کی مقدار بھی بہت بڑھ گئی۔ گزشتہ جنگ عظیم کا زمانہ بھی اس کی ترقی کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ بڑھتی ہوئی طلب کے پیش نظر بہت سی نئی گرنیاں قائم ہوئیں لیکن جنگ کے ختم کے ساتھ ہی جب طلب میں کمی ہوئی اور قیمتوں میں تخفیف ہونا شروع ہوئی تو نئی گرنیوں کی حالت بہت ابتر ہو گئی۔ ان کے لئے کاروبار جاری رکھنے کا مسئلہ بہت دقت طلب ہو گیا۔ سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۲۲ء کے درمیان تنظیم جدید، انضمام، تخفیف تعداد اور تخفیف پیدائش کی پالیسی اختیار کی گئی۔ روئی کی صنعت کی گرتی ہوئی حالت کو سنبھالنے میں قدیم نو بڑی کمپنیوں نے (جو دی بگ نائین[3] کے نام سے مشہور تھیں) بہت مدد دی۔ ستمبر ۱۹۲۳ء میں جاپان میں ایک اہم زلزلہ ہوا۔ اس زلزلہ کی وجہ سے ضلع کوانٹو[4] میں روئی کی صنعت کو سخت نقصان پہنچا۔ یہ صنعت ابھی

---

[1] Spindle [2] Looms

[3] The Big Nine [4] Kwanto

ناموافق حالات سے دوچار رہی ہوئی تھی کہ سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء کی عالمی کساد بازاری شروع ہوگئی۔ دوسری صنعتوں کی طرح یہ صنعت بھی اس کے مضر اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ طلب و رسد کے حالات میں مطابقت پیدا کرنے اور قیمتوں کو معاشی سطح پر برقرار رکھنے کے لئے مقدار پیدائش میں کمی کرنا پڑا اور برآمد کی مقدار میں بھی کمی ہوگئی۔ ان تمام مخالف اثرات کے باوجود مجموعی حیثیت سے اس صنعت کی ترقی برابر جاری رہی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۴ء تک گرنیوں کی تعداد ۲۷۵ ہوگئی۔ سوت کی مقدار پیدائش تقریباً ۳۵ لاکھ گٹھے اور کپڑے کی پیداوار ڈیڑھ ارب گز سے بھی زیادہ رہی۔ حالانکہ سنہ ۱۹۰۸ء میں گرنیوں کی تعداد صرف ۵۱، سوت کی مقدار پیدائش ۸ لاکھ گٹھوں سے زائد اور پارچہ کی پیداوار تقریباً ۱۵ کروڑ گز تھی۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں مزدوروں کی تعداد ۸۰۵۴۹ تھی لیکن سنہ ۱۹۳۳ء تک بڑھ کر ۲۱۶۳۲۵ ہوگئی حسب ذیل اعداد سے روئی کی صنعت کی ترقی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

سال	کتائی اور بنائی کی گرنیوں کی تعداد	تکلوں کی تعداد (۱۰۰۰)	کرگھوں کی تعداد (۱۰۰۰)	سوت کی پیدائش (گٹھوں میں)	کپڑے کی پیدائش (۱۰۰۰ گز میں)
۱۸۸۵	۲۰	۶۵۴	—	—	—
۱۹۰۸	۵۱	۱۳۸۱	۱۱	۱۵۱۷۹۸۲	۱۴۷۴۴۳
۱۹۱۳	۱۵۲	۳۴۱۴	۲۶	۲۱۷۱۱۵۳	۴۱۶۷۲۵
۱۹۲۲	۲۴۱	۴۴۳۶	۶۱	۲۵۲۵۰۰۰	۱۰۰۰۰۷۹
۱۹۳۰	۲۶۳	۷۲۱۴	۷۹	۲۸۰۷۰۰۰	۱۳۸۸۴۲۵
۱۹۳۴	۲۷۵	۹۵۳۰	۹۱	۳۴۷۲۰۰۰	۱۷۹۳۸۴۵

مندرجہ بالا نقشہ میں اگر ہم ۱۸۸۵ء اور ۱۹۳۴ء کے اعداد کا مقابلہ کریں تو ترقی کی نوعیت ٹھیک طور پر واضح ہو جائیگی۔

جنگ عظیم سے پہلے جاپان سوت زیادہ مقدار میں برآمد کرتا تھا اور پارچہ کی مقدار برآمد مقابلتاً بہت کم تھی۔ جنگ کی وجہ سے جب اندرون ملک پارچہ کی پیدائش بڑھ گئی تو سوت کی برآمد میں کمی ہو گئی کیونکہ اس کی کھپت زیادہ تر اندرون ملک میں ہونے لگی۔ ۱۹۱۳ء میں ۶۶۲۰۰۰۰۰ ین (ین جاپانی نقروی سکہ ہے اور یہ دو شلنگ ½ پنس کے مساوی ہوتا ہے) کا سوت اور ۲۳۶۰۵۰۰۰ ین کا کپڑا برآمد کیا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۳۴ء تک سوت کی برآمد ۲۳۴۸۴۰۰۰ ین رہ گئی اور پارچہ کی برآمد بڑھ کر ۴۹۲۳۵۱۰۰۰ ین ہو گئی۔

۱۹۲۸ء میں جاپان کی روئی کی مصنوعات کے اہم خریدار چین، برطانوی ہند، ندرلینڈز شرق الہند، ہانگ کانگ اور مصر تھے۔ ۱۹۳۶ء میں زیادہ اہمیت ہندستان، ندرلینڈز اور مانچوکو کو حاصل رہی۔

جاپان کی تمام صنعتوں میں سب سے زیادہ اہمیت روئی کی صنعت کو حاصل ہے۔ کیونکہ ۱۹۳۴ء کے اعداد کے مطابق جملہ برآمد کا ۲۳ر۳ فی صد روئی کی مصنوعات پر مشتمل تھا۔ ۱۹۳۶ء میں گو کہ یہ فی صد گھٹ کر ۱۹ر۷ رہ گیا تاہم برآمدی اشیاء میں پہلا درجہ روئی کی مصنوعات ہی کو حاصل رہا۔

انگلستان کے مقابل جاپان نے کوئی سو سال بعد روئی کی صنعت میں ترقی کرنا شروع کی لیکن اس کی رفتار اس قدر تیز رہی کہ وہ نصف صدی سے کچھ ہی زیادہ مدت میں انگلستان سے بھی بڑھ گیا۔ جنگ عظیم سے قبل برطانیہ سالانہ اوسطاً ۶۵۰۰ ملین گز اور جاپان صرف ۲۵۰ ملین گز کپڑا برآمد کرتا تھا۔ ۱۹۳۷ء تک برطانیہ ۲۲۰۰ ملین گز اور جاپان ۲۷۵۰ ملین گز کپڑا برآمد کرنے لگا۔ ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے جاپانی روئی کی صنعت کی ترقی کی وجہ سے برطانوی روئی کی صنعت کو سخت نقصان پہنچا۔

Yen ین

جدید طرز پر ہندوستان میں روئی کی سب سے پہلی گرنی بمقام کلکتہ ۱۸۱۸ء میں قائم ہوئی بمبئی میں پہلی گرنی کا قیام ۱۸۵۵ء میں ہوا۔ لیکن جاپان میں ۱۸۶۱ء تک بھی اس کے قیام کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ۱۸۷۷ء میں ہندوستان میں روئی کی گرنیوں کی تعداد ۵۱ تھی لیکن ۱۸۸۹ء میں جاپان کے پاس صرف ۲۰ گرنیاں تھیں۔ اس فرق کے باوجود جاپان نے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدا سے جنگ عظیم کے اختتام تک اس صنعت میں اس قدر تیز ترقی کی کہ ہندوستان تو کجا خود قدیم ترقی یافتہ صنعتی ممالک کے لئے جاپانی ارزاں سوتی پارچہ کا مقابلہ کرنا مشکل ہو گیا۔

حیرت اس امر کی ہے کہ خود جاپانؔ خاص میں خام روئی کی پیداوار نہیں ہوتی۔ البتہ چوزنؔ میں اس کی قلیل مقدار حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن طلب کی بھاری مقداروں کی مناسبت سے یہ ناقابل لحاظ ہے۔ جاپان کو جتنی خام روئی مطلوب ہوتی ہے اس کی تمام مقدار باہر سے درآمد کی جاتی ہے۔ ابتداً جاپان سب سے زیادہ روئی ہندوستان سے خرید تا تھا۔ ہندوستان کے بعد امریکہ کا درجہ تھا۔ لیکن ۱۹۳۲ء تک پہلا درجہ امریکہ کا اور دوسرا ہندوستان کا ہو گیا ۱۹۳۴ء میں جاپان نے جملہ مطلوبہ روئی کا ۴۰٫۹ فی صد امریکہ سے، ۴۲٫۷ فی صد ہندوستان سے اور باقی ۹٫۴ فی صد مصر، چین اور دوسرے حصوں سے خریدا۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جاپان میں روئی کی خام پیداوار نہ ہونے کے باوجود وہ کونسے اسباب تھے جن کی بنا پر وہ اس صنعت میں اس قدر ترقی کر گیا کہ روئی پیدا کرنے والے صنعتی ممالک بھی خاص خاص پارچوں کی حد تک اس کے مقابلے سے قاصر رہنے لگے؟ ان اسباب میں اہم حصہ قومی اسپرٹ، حکومتی امداد، ماحول کی مناسبت، ترقی یافتہ مشنری، اعلیٰ صنعتی تنظیم، ارزان محنت، زائد اوقات کار اور فروخت پیداوار کے اعلیٰ انتظامات کا ہے۔

(۲) ریشم کی صنعت ——— روئی کی طرح ریشم کی صنعت بھی جاپان میں بہت قدیم

ا۔ Japan Proper ۲۔ Chosen

زمانے سے جاری رہی ہے۔ مختلف تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ ۴۸۰ ق۔م میں بھی اس کا وجود پایا جاتا تھا۔ لیکن یہ بتانا کہ تجارتی نقطہ نظر سے اس وقت اس کو کیا اہمیت حاصل تھی بہت دقت طلب ہے۔ البتہ قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ اس کی نوعیت محدود اور مقامی ہوگی دور جدید میں اس کی ترقی اس وقت سے شروع ہوئی جب کہ ۱۸۵۹ء میں یوکوہاما کی بندرگاہ بیرونی تاجروں کے لئے کھولدی گئی۔ موجودہ زمانہ میں یہ صنعت اس قدر ترقی کرگئی ہے کہ بہت سی ذیلی صنعتیں اس سے متعلق ہوگئی ہیں۔ سہولت کی خاطر ہم اس صنعت کو دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں (۱) خام ریشم کی صنعت (۲) ریشمی پارچہ کی صنعت۔

(۱) خام ریشم کی صنعت ——— خام ریشم کی پیدائش کے تین مدارج ہیں؛ شہتوت کے درختوں کی کاشت، ریشم کے کیڑوں کی پرورش اور کوئے (ریشم کے کیڑے کا خول جس سے ریشم نکالا جاتا ہے) کی پیدائش، کوئے سے خام ریشم کی علحدگی۔ جاپان کی زراعت میں شہتوت کے درختوں کی کاشت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ۱۹۱۵ء ۰۰۰،۶ کاشتکار خاندان کوئے کی پیدائش کے کام میں مشغول تھے۔ ۱۹۲۹ء تک یہ تعداد بڑھ کر ۰۰۰،۷ ۲۲۱ ہوگئی جو جاپانی کاشتکار خاندانوں کی مجموعی تعداد کا ۴۰ فی صد ہے۔ شہتوت کی کاشت کرنے والے خاندانوں کی تعداد میں اضافہ کی وجہ سے رقبہ کاشت میں بھی زیادتی ہوگئی۔ ۱۹۱۵ء میں زیر کاشت رقبہ ۰۰۰،۴۵۴ چو — (زمین ناپنے کا پیمانہ۔ ایک چو = ۲،۴۵۵ ایکر) تھا۔ ۱۹۳۰ء تک بڑھ کر ۰۰۰،۷۱۴ چو ہوگیا۔ رقبہ کاشت میں اضافہ کی وجہ سے کوئے کی مقدار پیدائش کا بڑھنا بھی لازمی تھا۔ ۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۴ء کوئے کی سالانہ اوسط پیداوار ۰۰۰،۶۳۴۵ اکوان (وزن کی اکائی۔ ایک کوان = ۸،۲۸ پونڈ) تھی ۱۹۳۰ء تک یہ ۰۰۰،۴۶۴۱۰۶ اکوان ہوگئی۔

کوئے کی مقدار میں جوں جوں اضافہ ہونے لگا تو کوئے سے خام ریشم نکالنے کے پرانے طریقوں میں تجدید کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اواخر انیسویں صدی میں فرانس اور اٹلی سے

Kwan Kan   Cho ؎   Coccon ؎   Yokohama ؎

کویے سے ریشم علیحدہ کرنے کی مشینیں درآمد کی گئیں۔ اس کے بعد مشینوں کے استعمال میں دن بدن اضافہ ہونے لگا۔ موجودہ زمانے میں جاپان میں کویے سے ریشم نکالنے کے تین طریقے جاری ہیں: ہاتھ کے ذریعہ، پاؤں کے ذریعہ اور مشینوں کے ذریعہ۔ شہتوت کے رقبہ کاشت میں اضافے، کیڑوں کے فن پرورش میں ترقی اور ریشم نکالنے کے جدید طریقوں کی بدولت خام ریشم کی مقدار پیدائش میں بھی بہت زیادتی ہوگئی۔ ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان خام ریشم کی پیدائش کا سالانہ اوسط ۳۵۴۶۰۰۰ کوان تھا۔ ۱۹۳۴ء تک اس کی پیداوار ۱۲۰۶۵۰۰۰ کوان رہنے لگی۔ گویا مقدار پیدائش میں تین گنے سے بھی زیادہ اضافہ ہوا۔

شہتوت کے درختوں کی کاشت اور ریشم کے کیڑوں کی پرورش کے لئے جاپان کی آب وہوا بہت موزوں ہے جسکی وجہ سے خام ریشم کی پیدائش کے لئے جاپان کو دنیا کے تمام ممالک میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ ۱۹۳۴ء میں دنیا میں جتنا خام ریشم پیدا کیا گیا اس کا ۸۲٫۳ فی صد جاپان اپنے پاس پیدا کیا۔ چین اور اٹلی کا حصہ علی الترتیب ۱۱٫۰ اور ۴٫۹ فی صد تھا۔ باقی ۱٫۸ فی صد میں دوسرے ممالک شامل تھے۔ تخمینہ کیا گیا ہے کہ جاپان اپنے پاس کی جملہ مقدار پیدائش کا ۷۰ فی صد خام ریشم برآمد کرتا ہے اور ۳۰ فی صد صنعتی اغراض کے لئے اندرون ملک رکھ لیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۶ء کے اعداد کے مطابق جملہ برآمد میں روئی کی مصنوعات کے بعد خام ریشم کا حصہ تھا۔ روئی کی مصنوعات کا حصہ ۱۹٫۷ فی صد اور خام ریشم کا حصہ ۱۲٫۸ فی صد تھا۔ ان اعداد سے جاپان میں خام ریشم کی صنعت کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں خام ریشم کی جملہ برآمد کا ۸۴٫۴ فی صد امریکہ نے خریدا، ۱۱٫۵ فی صد یورپی ممالک نے اور ۴٫۱ فی صد میں مختلف ممالک کی خریداری شامل ہے۔

(۱۱۱) ریشمی پارچہ کی صنعت —— اس میں شک نہیں کہ ریشمی پارچہ کی صنعت بھی جاپان میں صدیوں سے جاری رہی ہے لیکن می جی دور کی ابتداء سے پہلے اس کی پیدائش کا پیمانہ بہت محدود تھا۔ وسط انیسویں صدی سے جب کہ مختلف صنعتوں میں نئی روح پڑنے لگی تو

اِس صنعت کو بھی ترقی ہونے لگی۔ ۱۸۸۲ء سے اس کی رفتار ترقی مقابلتاً تیز ہوگئی ۱۸۸۶ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان سالانہ اوسطاً ۰۰۰۴۲۵۰۱ ین کا ریشمی پارچہ تیار کیا جانے لگا۔ ۱۸۹۶ء تک مقدار پیدائش کی قیمت ۰۰۰،۴۷۱۴۱۸ ین رہنے لگی۔ ۱۹۱۳ء میں ۲۰۳۲۶۰۰۰ ین کا پارچہ تیار کیا گیا اور ۱۹۳۴ء تک ۰۰۰۶۵۵۵۶۳ کا مال تیار کیا جانے لگا۔ اِس طرح ۱۸۸۶ء تا ۱۸۹۰ء کے مقابل ۱۹۳۴ء میں پیداوار کا اِضافہ بہت زیادہ رہا۔

مقدار پیدائش میں اضافہ کے ساتھ ساتھ مقدار برآمد میں بھی زیادتی ہوتی گئی ۱۸۸۶ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان سالانہ اوسطاً ۰۰۰۲۴۱۲ ین کا مال برآمد کیا جاتا تھا۔ ۱۸۹۵ء تک اس کی مقدار بڑھ کر ۰۰۰۴۰۸۹۰۳ ین ہوگئی ۱۹۱۳ء میں برآمد کی مقدار کسی قدر کم رہی لیکن ۱۹۳۴ء میں ۰۰۰۸۸۴۷،۷ ین رہی ۱۹۳۶ء میں جملہ برآمد کا کوئی ۲،۳ فی صد ریشمی مصنوعات پر مشتمل تھا۔ اس کے اہم خریدار ہندوستان، برطانیہ اور امریکہ تھے۔

(۳) اونی صنعت —— روئی اور ریشم کی صنعتوں کے برعکس اون کی صنعت جاپان کے لئے جدید ہے۔ اس کی ابتدا یوں تو می جی عہد کے شروع ہونے سے کچھ عرصہ قبل ہی ہوچکی تھی لیکن اس وقت اُسے کچھ زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی۔ نئے دور کی ابتدا کے ساتھ جب طرز رہائش اور طریقہ بود و باش میں تبدیلی ہوئی تو اونی کپڑے کی طلب بھی بڑھنے لگی۔ بالخصوص فوجی اغراض کے لئے اس کی مانگ زیادہ ہوگئی۔ ۱۸۷۶ء میں اون کی سب سے پہلی گرنی حکومت کے زیر نگرانی اس غرض سے قائم ہوئی کہ اس کے ذریعہ فوجی ضروریات کے لئے اونی مصنوعات فراہم کی جائیں۔ اِس گرنی کے قیام کے دو سال بعد یعنی ۱۸۷۸ء میں ایک اور خانگی کمپنی بھی قائم ہوئی لیکن آئندہ دس سالوں تک یہ صنعت کچھ زیادہ ترقی نہ کرسکی جس کے اہم اسباب یہ تھے کہ یہ صنعت نوخیز ہونے کی وجہ سے بیرونی ارزاں کپڑے کا مقابلہ ہمت شکن تھا۔ سرمایہ دار اس میں روپیہ لگانے سے گریز کرتے تھے۔ مزید برآں ملک میں اچھے فن داں بھی موجود نہ تھے۔ حکومت تا مین اور دیگر قسم کی سرپرستی کے ذریعہ اس کی حالت بہتر بنانے کی

کوشش کر رہی تھی پھر بھی نتائج زیادہ اُمید افزا نہ تھے۔ ۱۸۸۷ئہ اور ۱۹۰۶ئہ کے درمیان مزید پانچ کمپنیاں قائم ہوئیں۔ ۱۹۰۴ئہ میں جب جنگ روس و جاپان کا آغاز ہوا تو فوجی ضروریات کے لئے حکومت کی طرف سے اُونی کارخانوں کو کثیر فرمائشات ملنے لگیں۔ ایک طرف تو طلب میں اضافہ ہوگیا تھا اور دوسری طرف قیمتیں بھی بڑھ گئی تھیں۔ یہ دونوں اُمور کارخانہ داروں کے حق میں بہت مفید ثابت ہوئے۔ لیکن جب جنگ ختم ہوئی تو طلب میں کمی کے ساتھ قیمتوں میں بھی تخفیف ہوگئی۔ لہذا کارخانہ داروں کے لئے پھر مصیبت کا زمانہ آگیا۔ تقریباً تمام کمپنیوں کو بھاری نقصان اُٹھانا پڑا۔ لیکن ۱۹۱۴ئہ میں جب جنگ عظیم کی ابتدا ہوئی تو اس کے لئے دوبارہ منافع کمانے اور ترقی کرنے کے مواقع نکل آئے۔ جب قدیم ترقی یافتہ صنعتی ممالک جنگ میں شریک ہوگئے تو اندرون ملک بیرونی ارزاں اور اچھے پارچے کے شدید مقابلے کا مسئلہ خود بخود حل ہوگیا۔ نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرونی ممالک کی مارکٹوں میں بھی مقابلہ کی نوعیت بہت کچھ گھٹ گئی۔ طلب کی زیادتی اور قیمتوں کی گرانی نے کارخانہ داروں کی ہمتیں بلند کر دیئے اس موقعہ سے فایدہ اُٹھا کر قدیم کمپنیوں نے اپنے کاروبار کو وسعت دی اور سرمایہ زیر استعمال کی مقدار میں اضافہ کیا گیا۔ پرانی کمپنیوں کی حالت کو بہتر پاکر نئی کمپنیاں بھی قائم ہونا شروع ہوئیں

جنگ کے اختتام پر اس صنعت کی حالت پھر تنزل کی طرف مایل ہوگئی۔ طلب میں کمی ہوچکی تھی اور قیمتیں بھی گر رہی تھیں۔ دوران جنگ مانگ کی زیادتی اور قیمتوں کی گرانی کے پیش نظر بہت سامال تیار کر لیا گیا تھا۔ مگر جب طلب گھٹ گئی تو مال کی نکاسی میں دقتیں ہونے لگیں۔ بعض کمپنیوں کے دیوالے نکل گئے۔ اکثر کمپنیوں کا انضمام عمل میں لایا گیا۔ مقدار پیداوار اور قیمتوں کو قابو میں رکھنے کی وجہ سے ۱۹۲۲ئہ تک حالات پھر معمولی حیثیت اختیار کر سکے۔ جدید مشینوں کے استعمال، اعلیٰ فن دانوں کے تقرر اور پیدائش کے طریقوں کی اصلاح کی بدولت یہ صنعت دوبارہ ترقی کرنے لگی۔ ۱۹۲۸ئہ تک کارخانوں کی تعداد ۵۲ ۸ ہوچکی تھی۔ آئندہ سالوں میں بھی کارخانوں کی تعداد میں اضافے کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۳۳ئہ تک ان کی تعداد ۱۱۰۷ ہوگئی

اندرون ملک اس صنعت کی ترقی کی وجہ سے تین تبدیلیاں ہوئیں: ایک یہ کہ باہر سے درآمد ہونے والے مال میں غیر معمولی کمی ہوگئی اور اندرون ملک بہت بڑی حد تک ملکی مال استعمال ہونے لگا۔ ۱۹۲۴ء میں جاپان نے ۶۳۵۹۶۰۰۰ ین کی اُونی مصنوعات درآمد کیا تھا لیکن اسکے بعد درآمد کی مقدار بحیثیت مجموعی گھٹتے گھٹتے ۱۹۳۴ء تک صرف ۵۰۸۱۰۰۰ ین رہ گئی۔ دوسرے یہ کہ مقامی ضروریات پورا کرنے کے بعد باہر جانے والے مال کی مقدار بہت بڑھ گئی۔ ۱۹۲۴ء میں جاپان نے ۶۱۱۶۸۰۰۰ ین کی اونی مصنوعات برآمد کی تھیں لیکن ۱۹۳۴ء تک وہ ۲۹۸۴۸۰۰۰ ین کی مصنوعات برآمد کرنے لگا۔ تیسرے یہ کہ خام اون کی درآمد میں بہت زیادتی ہوگئی۔ کیونکہ خود جاپان میں خام اون کی پیدائش ناقابل لحاظ ہے۔ ۱۹۲۳ء میں جملہ ۵۱۷۸۲۶۰۰۰ کِن[۱] (وزن کی اکائی۔ ایک کِن = ۱٫۳۲۲۸ پونڈ) اون درآمد کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۴ء تک اس کی مقدار بڑھکر ۱۳۷۲۸۶۰۰۰ کِن ہوگئی۔ ۱۹۳۶ء میں جو اشیاء جاپان نے مختلف ممالک سے اپنے پاس درآمد کیں اُن میں بلحاظ اہمیت دوسرا درجہ خام اُون کو حاصل رہا۔ پہلا درجہ خام روئی کا تھا۔ مذکورہ سنہ میں جملہ اشیاء درآمد کا کوئی ۳۱ فی صد خام روئی پر اور ۷٫۳ فی صد خام اون پر مشتمل تھا۔ جاپان میں اون کی سب سے زیادہ درآمد آسٹریلیا سے ہوتی ہے۔ ۱۹۳۴ء میں جاپان نے جسقدر اون خریدا اسکا ۹۰ فی صد آسٹریلیا نے فراہم کیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں جاپان کی اونی مصنوعات کا سب سے اہم خریدار کوآن ٹنگ[۲] تھا۔

(۴) سوتی اونی ململ[۳] — جاپانی آب وہوا، موسم اور مذاق کا لحاظ کرتے ہوئے اونی سوتی ململ بہت موزوں ثابت ہوا ہے۔ اس کپڑے کا استعمال اواخر انیسویں صدی سے بہت بڑھ گیا جب کہ مغربی ممالک سے اس کی درآمد کی جانے لگی۔ ۱۸۶۸ء میں اس کی درآمد ۳۴۷۰۰۰ گز تھی لیکن صرف پانچ سال کے اندر یعنی ۱۸۷۳ء تک درآمد کی مقدار میں تقریباً پندرہ گنا اضافہ ہوا۔ آخر الذکر سنہ میں درآمد کی مقدار ۵۰۵۴۰۰۰ گز رہی۔ اس کے بعد بھی

---

۱ Kin ۲ Kwantung ۳ Mousseline de Laine

درآمد کی مقدار میں سال بہ سال اضافہ ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ ۱۸۹۶ء میں یہ ۳۶۳۵۰۰۰ گز تک پہنچ گئی۔ درآمد میں اس قدر کثیر اضافہ کے باوجود ملکی سرمایہ داروں کی توجہ اس پارچہ کی پیدائش کی طرف نہیں مبذول ہوئی تھی۔ اس کی اہم وجہ یہ تھی جاپانی اس کی تیاری کا طریقہ نہیں جانتے تھے۔ جنگ چین وجاپان کے اختتام کے بعد دو کمپنیاں خاص طور پر اس کپڑے کی پیدائش کے لئے قائم ہوئیں ۱۸۹۶ء میں مزید دو کمپنیاں قائم کی گئیں۔ بیرونی پارچہ کے شدید مقابلہ کی وجہ سے ابتداً ان کمپنیوں کو بہت مایوسی رہی اور ایک طویل مدت تک مقسوم کا اعلان نہیں کیا جا سکا جنگ روس وجاپان کی وجہ سے اس صنعت کو بہت فایدہ پہنچا۔ طلب کی زیادتی اور قیمتوں کی گرانی کی وجہ سے یہ کمپنیاں معقول منافع کمانے کے قابل ہوگئیں۔ بالخصوص ۱۹۰۶ء تا ۱۹۰۸ء کا زمانہ بہت خوشحالی کا رہا۔ گنجایش کی مناسبت سے قدیم کمپنیوں نے کاروبار کو وسعت دی۔ علیحدہ جدید کمپنیاں بھی قائم ہوئیں اور بعض ایسے کارخانوں نے جو ابتداً صرف اونی مصنوعات تیار کرتے تھے اس پارچہ کی پیدائش میں بھی حصہ لینا شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندرون ملک اونی سوتی ململ کی پیدایش بہت بڑھ گئی۔ ۱۸۹۵ء میں یا تو پیداوار مطلق نہ تھی یا یہ کہ ۱۹۰۵ء تک ۱۶۷۹۶۰۰۰ گز اور ۱۹۱۲ء تک ۴۷۵۶۰۰۰۰ گز کپڑا تیار کیا جانے لگا۔ ۱۹۰۵ء میں جاپان ملکی ضروریات کو پورا کرنے کے علاوہ دیگر ممالک کو بھی برآمد کرنے کے قابل ہوگیا۔ اس کے بعد برآمد کی مقدار مسلسل بڑھنے اور درآمد کی مقدار لگاتار گھٹنے لگی حتیٰ کہ ۱۹۲۰ء تک درآمد کی مقدار قطعی طور پر موقوف ہوگئی۔ آئندہ صفحے کی جدول میں درآمد و برآمد کے جو اعداد دیئے گئے ہیں ان کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

اونی سوتی پارچہ کی درآمد اور برآمد

سال	درآمد (۱۰۰۰ گزوں میں)	برآمد (۱۰۰۰ گزوں میں)
۱۸۹۹ - ۱۹۰۳ (اوسط)	۱۶۴۲۱	×

۱۹۰۵	۱۱۳۶۳	۹۷
۱۹۱۰	۳۳۶۵	۶۶۸
۱۹۱۵	۱۲۳	۴۶۰۷
۱۹۲۰	×	۲۱۲۱
۱۹۳۲	×	۱۵۱۶
۱۹۳۴	×	۴۱۰۲

مندرجہ بالا اعداد سے واضح ہے کہ ۱۸۹۹ئہ اور ۱۹۰۳ئہ کے درمیان سوتی اونی پارچہ کی درآمد بہت بڑہی ہوئی تھی اور برآمد صفر تھی لیکن ۱۹۲۰ئہ تک یہ صنعت اِتنی ترقی کرگئی کہ درآمد صفر ہوگئی اور ۲۱ لاکھ گز سے زاید پارچہ برآمد کیا گیا۔ ۱۹۱۵ئہ میں اُسکی برآمد ۴۶ لاکھ گز سے بھی زیادہ تھی۔ ۱۹۳۲ئہ میں برآمد کی کمی عالمی کساد بازاری کا نتیجہ تھی۔ لیکن ۱۹۳۴ئہ تک پھر مقدار برآمد بڑھ کر ۴۱ لاکھ گز سے زیادہ رہی۔ اِس صنعت کی ترقی کا اندازہ پیدائش کی مقدار سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ ۱۹۰۵ئہ میں جملہ مقدار پیدائش ۱۶۷۹۶۰۰۰ گز تھی۔ ۱۹۱۳ئہ تک ۱۹۵۸۵۰۰۰ گز ہوگئی۔ ۱۹۳۰ئہ میں پیدائش کی مقدار اس قدر بڑھ گئی جو اس کے بعد آئندہ چار سالوں میں کبھی بھی اِتنی نہیں رہی۔ مذکورہ سنہ میں پیدائش کی مقدار ۱۶۵۸۵۸۰۰۰ گز تھی۔ اور ۱۹۳۴ئہ میں ۱۲۰۹۴۵۰۰۰ گز رہی۔ سوتی اونی پارچہ کی صنعت جاپان کی اُن صنعتوں میں سے ایک ہے جو بہت قلیل عرصے میں نمایاں ترقی کرگئیں۔

(۵) مصنوعی ریشم کی صنعت —— دنیا کے اکثر و بیشتر حصوں میں مصنوعی ریشم کی اشیاء کا اِستعمال بہت عام ہوچکا ہے اور ہوتا جارہا ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر مختلف ترقی یافتہ صنعتی ممالک نے جاپان سے بہت عرصہ پہلے اپنی توجہ اس صنعت کی ترقی کی طرف مبذول کی

ﻄ Rayon　Artificial-Silk

اس میں شک نہیں کہ جاپان میں بہت سی صنعتوں کی ترقی کا آغاز وسطِ انیسویں صدی سے ہو چکا تھا لیکن بیسویں صدی کے پہلے عشرے کے اِختتام تک بھی یہ صنعت جاپان میں جاری نہ ہو سکی تھی۔ مشرقی صنعتی کمپنی[1] کے نام سے مصنوعی ریشم کی سب سے پہلی کمپنی جاپان میں ۱۹۱۴ء میں قائم ہوئی۔ یہ ایسا زمانہ تھا جب کہ جنگ عظیم کا ابھی ابھی آغاز ہوا تھا۔ طلب میں زیادتی ہو گئی تھی اور بیرونی ممالک سے مال لانے میں دِقتیں ہو رہی تھیں۔ لہٰذا اِس نوخیز صنعت کیلئے یہ ترقی کا بہترین موقعہ تھا جاپانی باشندوں نے اس سے پورا پورا اِستفادہ کیا۔ مصنوعی ریشم کے کارخانے تیزی کے ساتھ قائم ہونے شروع ہوئے لیکن جنگ کے ختم پر جب طلب گھٹ گئی اور قیمتیں گرنا شروع ہوئیں تو ان کارخانوں کی حالت بہت بُری ہو گئی کیونکہ اُنہیں قائم ہو کر ابھی قلیل عرصہ ہوا تھا اور یہ پورے طور پر مستحکم نہیں ہو سکے تھے۔ نتیجہ یہ کہ شاہی[2] مصنوعی سلک کمپنی کے سوا بہت سی کمپنیاں بند ہو گئیں۔ مابعد جنگ کے زمانے میں سب سے زیادہ اہمیت شاہی مصنوعی سلک کمپنی ہی کو حاصل رہی کیونکہ جملہ مقدار پیدائش کا تخمیناً ۹۰ فی صد حصہ اسی کمپنی سے متعلق ہوتا تھا۔ ۱۹۲۲ء تک ۲۳۸۰۰۰ پونڈ وزن کی مصنوعات تیار کی جانے لگیں۔ صرف ایک سال بعد یعنی ۱۹۲۳ء میں مقدار پیدائش دوگنے سے بھی زاید یعنی ۵۸۰۰۰۰ پونڈ ہو گئی لیکن یہ مقدار مقامی صرف کے ۴۰ فی صد سے زاید نہ تھی۔ گویا مقدار پیدائش میں اس قدر اضافے کے باوجود جاپان کو اپنی ضروریات کا ۶۰ فی صد حصہ باہر سے منگوانا پڑتا تھا۔ بیرونی ممالک کی مصنوعات کی درآمد کو روکنے کے لئے حکومت جاپان نے ۹ر۷۰ ین محصول درآمدی سو کِن پر عاید کر رکھا تھا۔ لیکن ملکی پیداوار سے ملکی طلب پوری نہ ہو سکنے کی وجہ سے اِس قدر گران محصول عاید کرنے کے باوجود بیرونی مصنوعات کی درآمد بڑھتی ہوئی مقداروں میں جاری رہی پیدائش کی گنجائش کے پیش نظر مصنوعی سلک کی مزید کمپنیاں قائم ہونے لگیں۔ بالخصوص ۱۹۲۳ء

[1] The Eastern Industail Co.

[2] Industrial Artificial Silks Company

اور ۱۹۲۶ء کے درمیان متعدد کمپنیاں قائم ہوئیں۔ روئی کی اکثر بڑی کمپنیوں نے بھی مصنوعی ریشمی اشیاء کی پیدائش کو ذیلی کاروبار کی حیثیت سے انجام دینا شروع کر دیا۔ کمپنیوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ مقدار پیدائش میں بھی زیادتی کا ہونا لازمی امر تھا۔ عالمی کساد بازاری کے زمانے میں اس صنعت کی نمایاں خصوصیت یہ رہی کہ ملک کی دوسری صنعتوں کے کاروبار میں سرد بازاری کی صورت نمودار ہو گئی تھی تو اس نے ۱۰ اور ۳۰ فی صد کے درمیان مقسوم ادا کیا۔ اس صنعت کے لئے یہ بات اس لئے ممکن ہو سکی کہ اندرون ملک ایک طرف تو پیدائش کی سہولتیں تھیں اور دوسری طرف وسیع مارکٹ بھی موجود تھا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد بھی کمپنیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور قدیم کمپنیوں نے اپنے کاروبار کو حسب گنجائش وسعت دی چنانچہ ۱۹۳۳ء میں مقدار پیدائش ۸۹۰۰۰۰۰۰ پونڈ ہو گئی اور ۱۹۳۴ء میں ۱۴۸۰۰۰۰۰۰ پونڈ تک بڑھ گئی۔ واضح رہے کہ ۱۹۲۲ء میں پیدائش کی مقدار صرف ۲۳۸۰۰۰۰ پونڈ تھی ۱۹۲۲ء کے مقابل ۱۹۳۴ء میں ترقی کی یہ رفتار بہت حیرت ناک ہے۔ تخمینہ کیا گیا ہے کہ اس صنعت میں ترقی کے اس معیار پر پہنچنے کے لئے یورپ کے صنعتی ممالک کے لئے نصف صدی سے زاید عرصہ لگا لیکن جاپان نے ۱۹۱۴ء میں اس صنعت کا آغاز کر کے ۱۹۳۲ء تک اس میں ایسی ترقی کر لی کہ فرانس کو پیچھے چھوڑتے ہوئے انگلستان، اٹلی اور جرمنی کے بعد کا درجہ حاصل کر لیا۔ لیکن ایک ہی سال میں یعنی ۱۹۳۳ء تک اس نے انگلستان، جرمنی اور اٹلی سے بھی سبقت لے گیا۔ ۱۹۳۳ء میں اس صنعت کی حد تک امریکہ کے بعد جاپان ہی کا درجہ تھا۔

مصنوعی ریشم کی بین الاقوامی پیدایش کے حسب ذیل اعداد کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔

مصنوعی ریشم کی بین الاقوامی پیدایش کے اعداد ۱۹۳۴ء

(۱۰۰۰ پونڈوں میں)

ملکوں کے نام	مقدار پیدایش
(۱) ریاستہائے متحدہ امریکہ	۲۱۰۰۰۰

(۲)	جاپان	۱۴۸۰۰۰
(۳)	اٹلی	۱۰۱۰۰۰
(۴)	برطانیہ عظمیٰ	۹۲۰۰۰
(۵)	جرمنی	۹۰۰۰۰
(۶)	فرانس	۷۳۰۰۰

۱۹۳۷ء میں دُنیا میں مصنوعی ریشم کی جملہ مقدار پیدائش (جس میں متذکرۂ بالا ممالک کے علاوہ دوسرے ملک بھی شامل ہیں) ۷۹۱۰۰۰۰۰۰ پونڈ تھی۔ اِس میں امریکہ کا حصہ تقریباً ۲۷ فی صد اور جاپان کا تقریباً ۱۹ فی صد رہا۔ جاپان کی اشیائے برآمد میں مصنوعی ریشم کی مصنوعات کو تیسرا درجہ حاصل رہا (۱۹۳۶ء کے اِعداد کے مطابق) پہلا درجہ روئی کی مصنوعات کا تھا، دوسرا خام ریشم کا اور تیسرا مصنوعی ریشم کی اشیاء کا۔ اشیائے برآمد کی مجموعی قیمت کے تناسب سے مصنوعی ریشم کی مصنوعات کی قیمت کا فی صد ۹،۴ تھا۔ ۱۹۳۷ء میں اُسکے اہم خریدار ہندوستان، ——— آسٹریلیا اور ندرلینڈز تھے۔

(۶) ہمپ[1] اور فلاکس کی صنعت ——— ہمپ اور فلاکس ریشہ دار پودے ہیں جن کے ریشوں سے مختلف قسم کی مصنوعات تیار کی جاتی ہیں۔ اُن کی پیدائش کے لئے جاپان کی آب و ہوا، موسم اور زمینات بہت موزوں ثابت ہوئی ہیں۔ تجربہ کے طور پر فلاکس کی کاشت سب سے پہلے ۱۸۸۹ء میں کی گئی یہ اِس قدر کامیاب ہوئی کہ ۱۸۸۹ء کے مقابل ۱۹۱۹ء میں رقبہ کاشت ۲۵ چو سے بڑھ کر ۳۷۹۲۹ چو ہو گیا۔ اسی مناسبت سے مقدار پیدائش میں بھی اِضافہ ہوا۔ روئی اور اون، ریشم اور ہمپ کی صنعتوں کی یہ خصوصیت ہے کہ اولذکر دو کے لئے تقریباً تمام خام پیداوار دوسرے ملکوں سے درآمد کی جاتی ہے لیکن آخری دو کی

---

[1] The Hemp and Flax Industry

یہ خصوصیت ہے کہ اُن کے لئے جملہ خام پیداوار اندرون ملک ہی دستیاب ہوتی ہے۔ منجملہ اور اسباب کے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمپ اور فلاکس کی صنعت بہت تیزی کے ساتھ ترقی کر سکی۔ ذیل میں جو اعداد دیئے گئے ہیں ان سے ہمپ کے رقبۂ کاشت اور مقدار پیداوار کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہمپ کا رقبۂ کاشت اور مقدار پیداوار

سال	رقبۂ کاشت (چو)	مقدار پیداوار (کوان)
۰۷-۱۹۰۳ (اوسط)	۵۵۰۳	۳۶۶۰۰۰
۱۲-۱۹۰۸ (")	۵۱۳۲	۳۵۵۰۰۰
۱۹۳۰	۱۰۰۱۰	۴۷۵۹۰۰۰
۱۹۳۳	۱۲۹۰۰	۶۲۳۲۰۰۰

روئی اور ریشم کی طرح ہمپ اور فلاکس کی صنعت جاپان میں قدیم زمانے سے جاری ہے لیکن اُنیسویں صدی کے آٹھویں دہے تک بھی اِس کی حیثیت محدود تھی۔ اومی ہمپ یارن کمپنی[1] کے نام سے سب سے پہلی کمپنی ۱۸۸۴ء میں قائم کی گئی۔ اس کے دوسرے سال ایک اور کمپنی قائم ہوئی لیکن ابتداً اِن کمپنیوں کے کاروبار کو کچھ زیادہ کامیابی نہ ہو سکی۔ ۱۸۹۴ء میں جب جنگ چین و جاپان کی اِبتدا ہوئی تو جنگی اغراض کے لئے ہمپ اور فلاکس کی مصنوعات کی طلب میں نمایاں اِضافہ ہو گیا جس کی وجہ سے عارضی طور پر اِن کمپنیوں کی دقتیں حل ہو گئیں۔ ہر کمپنی نے اپنے کاروبار کو وسعت دی اور نئی کمپنیاں بھی قائم ہوئیں۔ بڑھتی ہوئی طلب کے پیش نظر تمام کمپنیوں نے کثرت سے مال تیار کرنا شروع کر دیا۔ اور ہر ایک کی یہ کوشش ہونے لگی کہ

---

[1] The Omi Hemp Yarn Company

زیادہ سے زیادہ مال فروخت کر کے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرے۔ اِس رجحان نے گلو تراش[1] مقابلے کی صورت پیدا کر دی۔ جنگ کے ختم پر ہر کمپنی کے پاس اسٹاک کی مقدار زیادہ تھی لیکن طلب کم ہو چکی تھی قیمتیں گر رہی تھیں اور باہر کا مقابلہ بھی شدید تھا۔ اندرونی مقابلہ نے حالات میں مزید اَبتری پیدا کر دی۔ اکثر کمپنیاں دیوالیہ کی حد کو پہنچ گئیں لہٰذا حالات کو بہتر بنانے کیلئے تین بڑی کمپنیوں نے باہمی سمجھوتے سے ایک اتحاد[2] قائم کیا۔ سن ۱۹۰۲ء سے اِس پر عمل ہونے لگا اِس اتحاد کا اصل مقصد ارکان کے لئے مالی سہولتیں بہم پہنچانا، ہر ایک کی قوت پیدا آوری کا لحاظ کرتے ہوئے مقدار پیداوار مقرر کرنا اور ایک مقررہ قیمت پر پیداوار کی فروخت کا انتظام کرنا تھا۔ اِس اتحاد کی بدولت ارکان اتحاد کو بہت فایدہ پہنچا۔ مزید برآں مقابلے کے گھٹ جانے سے صنعت کی عام حالت بھی بہتر ہوگئی۔ جنگ روس و جاپان نے اِس صنعت کے لئے ترقی کا ایک اور موقعہ فراہم کیا۔ طلب کی زیادتی اور قیمتوں کی گرانی کی بدولت معقول منافع ملنے لگا۔ لیکن ختم جنگ کے ساتھ ہی پھر سرد بازاری کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ گرتی ہوئی قیمتوں کے مضر اثرات سے بچنے کے لئے سابقہ تین کمپنیوں کے اتحاد نے باقی ماندہ ایک اور کمپنی کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ سن ۱۹۰۷ء میں اِس نئے اتحاد کا نام امپیریل[3] ہمپ مینوفیکچرنگ کمپنی رکھا گیا۔

جنگ عظیم سے پہلے مزید دو کمپنیاں قائم ہوئیں لہٰذا امپیریل ہمپ مینوفیکچرنگ کمپنی اور ان کے مابین پھر مقابلہ شروع ہوگیا۔ مقابلہ کے اثرات زیادہ مضرت رساں اِس لئے نہیں ثابت ہوئے کہ جنگ عظیم کی ابتدا کے ساتھ ہی کاروباری سرگرمی شروع ہوگئی اور پیدائش کے لئے وسیع مواقع نکل آئے۔ دوران جنگ اِن کمپنیوں نے خوب منافع کمایا

ؔ۱ Cut-throat Competition ؔ۲ Combine

ؔ۳ Imperial Hemp Manufacturing Company

اَب ان کی حالت اِتنی مستحکم ہوچکی تھی کہ مقامی ضروریات کے لئے اشیاء کی فراہمی کے علاوہ بیرونی ممالک کو مال روانہ کیا جانے لگا۔ اور بعض ایسے ممالک کے بازاروں پر بھی قبضہ کیا گیا جو پہلے جاپانی مصنوعات کے خریدار نہیں تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کہ روس میں فلاکس کی کاشت بہت خراب ہوگئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس، بلجیم، جرمنی اور انگلستان کے ایسے کارخانے جو روس سے فلاکس حاصل کرتے تھے بری طرح متاثر ہوئے۔ اِس واقعہ سے بھی جاپان میں ہمپ اور فلاکس کی صنعت کو بہت فایدہ پہنچا۔ جنگ عظیم کی ابتدا سے قبل اِس صنعت کے لئے بیرونی مقابلے کا مسئلہ بہت اہم تھا لیکن جنگ کے مواقعوں سے فائدہ اُٹھا کر اس نے مقامی بازاروں پر پورے طور سے قبضہ کرلیا اور برآمد کی مقدار مسلسل بڑھتی گئی۔

(باقی)

ا Imperial Hemp Manufacturing Company

رفتارِ عالم

جنگ اسٹالن گراڈ کی لڑائی نے اب نہایت نازک اور فیصلہ کن صورت اختیار کرلی ہے. اس لڑائی میں روسیوں نے جس استقلال، بہادری اور اخلاقی اوصاف کے جوہر دکھائے ہیں وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے. اس لڑائی میں جرمنوں نے لاکھوں فوج اور کروڑوں کا سامان جنگ جھونک دیا لیکن پھر بھی انھیں جیسی کامیابی کی توقع تھی وہ حاصل نہ ہوئی. اب صورت حال یہ ہے کہ جرمن فوجیں شہر کے شمالی صنعتی علاقہ میں گھس آئی ہیں. دوسرے حصوں میں ایک ایک مکان اور ایک ایک گلی کے لئے لڑائی ہو رہی ہے. روسیوں نے شہر کے جنوبی حصے پر سخت حملے کرکے دشمن کا ناطقہ بند کر دیا ہے. اب اگر اسٹالن گراڈ پر جرمنوں کا قبضہ ہو بھی جائے تو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ اس شہر کی مدافعت سے ہٹلر کے سب منصوبے خاک میں مل گئے. جرمنوں کی کوشش ہے کہ والگا پر تصرف حاصل ہو جائے تاکہ دریائی آمد و رفت اور رسل و رسائل بالکل منقطع ہو جائے.

قفقاز میں بھی جرمنوں کا اقدام رکا ہوا ہے. مزدک سے آگے ابھی جرمن فوجیں نہیں بڑھ سکیں جو گروزنی کے تیل کے چشموں سے پچاس میل کے فاصلہ پر واقع ہے. جنرل ٹیموشنکو نے روس کے وسطی مورچوں پر اور اسٹالن گراڈ کے شمال مغرب میں جرمنوں پر سخت حملے شروع کر دیئے ہیں اور متعدد شہروں کو جرمنوں سے واپس حاصل کر لیا ہے. ٹیموشنکو کا طریق عمل یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدافعت کی بہترین صورت یہی ہے کہ اقدامی حملے کئے جائیں. چنانچہ اس وقت تک اسٹالن گراڈ

کو فتح کرنے میں جرمنوں کو جو ناکامی ہوئی ہے وہ دراصل اسی طریق عمل کا نتیجہ ہے۔ غرضکہ روسیوں نے لینن گراڈ سے لیکر قفقاز تک اس جارحانہ مدافعت کے مسلک پر عمل کیا ہے اور اس کی خاطر ایسی بیش بہا قربانیاں کی ہیں کہ جن کی نظیر جدید تاریخ میں نہیں ملتی۔ روسیوں نے اس امر کا ثبوت دیدیا کہ نئے نظام حیات سے جو ان کے ملک میں گزشتہ ۲۵ برس سے جاری ہوا ہے، اُن کی ذہنیت میں کسقدر زبردست انقلاب پیدا کر دیا ہے اور ان کی اخلاقی قوت کو زار کے زمانہ کے مقابلہ میں کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے۔

اگرچہ اب تک اتحادیوں کے لیئے یہ ممکن نہ ہوسکا کہ وہ اپنے حلیف روس کی خاطر اور خود اپنی خاطر بھی مغربی یورپ میں جرمنوں کے خلاف محاذ قایم کریں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اُن کے طیاروں نے رہائن لینڈ کے صنعتی مرکزوں اور فرانس کے ساحلی فوجی مرکزوں پر ہزاروں ٹن گولے برسائے جن سے دشمن کو سخت نقصان پہونچا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ گولہ باری قطعی نتائج نہیں پیدا کرسکتی جیسا کہ جرمنوں کی گولہ باری سے ثابت ہوگیا تھا جو انھوں نے انگلستان کے مختلف شہروں پر کی تھی۔

جزائر سلیمان اور نیوگنی میں ابھی جنگ کا سلسلہ جاری ہے۔ کوئی فیصلہ کن صورت اَب تک نہیں پیدا ہوئی۔ نتیجہ کا دارومدار زیادہ تر سامان رسد کی فراہمی پر ہوگا۔ جو فریق زیادہ کارکردگی کے ساتھ موثر طور پر اپنی سپاہ کو جنگ کا اعلیٰ قسم کا ضروری سازوسامان پہونچانے میں کامیاب ہوگا وہ یقیناً آخر میں بالا مارے گا۔ جزائر سلیمان میں بعض چھوٹے چھوٹے جزیروں پہ پچھلے دنوں اقتدار و تصرف ادلتا بدلتا رہا۔ کبھی آسٹریلیا اور امریکہ والے قابض ہوگئے اور کبھی جاپانی۔ جنگ کا رنگ کچھ ایسا ہے کہ اندیشہ ہے کہ شاید ابھی کچھ عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہے اور کوئی فریق دوسرے کو پوری طرح سے زچ نہ کر پائے۔ آخر میں نتیجہ چاہے کچھ بھی نکلے لیکن فوری طور پر اس فوجی اقدام سے اتحادیوں کو یقیناً فائدہ ہوا ہے اور جاپانیوں کے لئے بحرالکاہل میں سخت دشواریاں پیدا ہوگئی ہیں۔ غالباً جزائر سلیمان کی جنگ کی بدولت جاپانی ابھی اس قابل نہیں ہوسکیں گے

کہ کچھ عرصہ تک ہندوستان کے مشرقی ساحل پر بحری مہم کا منصوبہ باندہیں یا خشکی سے ہندوستان پر کسی بڑے حملہ کا ڈول ڈالیں چھوٹے موٹے ہوائی حملے ہوں گے لیکن ان سے کوئی دور رس نتیجہ نہیں نکلے گا۔ اب اگر اتحادیوں نے وسیع پیمانے پر برما پر حملہ شروع کر دیا تو ممکن ہے جاپان کو اپنی چین کی مہم کو بھی اُدہورا چھوڑ کر اس جانب متوجہ ہونا پڑے۔ اگر ایسا ہوا تو جاپان سخت مشکل میں پھنس جائے گا اور اس کو ایک ایک کر کے سب نوالے اُگلنے پڑیں گے جو اس نے ہڑپ کئے ہیں۔

ہندوستان۔ کانگریسی لیڈروں کی گرفتاری کے بعد پچھلے دو ماہ میں ملک کے طول وعرض میں کافی انتشار پیدا ہو گیا لیکن حکومت نے اب صورتِ حال پر پوری طرح قابو حاصل کر لیا ہے۔ اگرچہ اب بھی کہیں کہیں ایسی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں جن سے نظم ونسق کو برہم کرنا مقصود ہوتا ہے لیکن اس قسم کی کوششیں بے نتیجہ رہیں گی اسواسطے کہ ان کے سامنے کوئی واضح اور اعلیٰ مقصد نہیں ہے۔ اور اعلیٰ مقصد وہی ہو سکتا ہے جو قومی نوعیت رکھتا ہو۔ اگر کسی ایک سیاسی پارٹی کو مقتدر بنانے کے لئے ملک میں دہشت انگیزی شروع کر دی جائے تو اسے کسی طرح بھی قومی مقصد سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ کانگریس کے باہر ملک میں جو دوسری سیاسی جماعتیں اور مفادہیں وہ موجودہ انتشاری تحریک میں ملک کے مفادِ عامہ کے لئے سخت خطرہ محسوس کر رہی ہیں اور بعض دیانتدار کانگریسی بھی اسی خیال کے ہیں چنانچہ مسٹر راجگوپال چاری نے ابھی حال میں ان تمام انتشاری رجحانات کی سخت مذمت کی ہے جو بعض کانگریسی لیڈروں کے اشارہ پر ملک میں پیدا کئے گئے ہیں چنانچہ مسٹر راجگوپال چاری کے خیال کے مطابق گاندھی جی اور کانگریس کے دوسرے ذمہ دار لیڈروں کا منشا ہرگز یہ نہ تھا۔ ہم اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ آیا کانگریسی لیڈروں کا منشا یہ تھا یا نہ تھا کیونکہ اس میں تو مطلق شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ کانگریس یہ تہیہ کر چکی تھی کہ برطانوی حکومت کو سول نافرمانی کی تحریک کے ذریعہ اس دفعہ ایسا زچ کر دے کہ وہ اس کے مطالبات تسلیم کرنے پر بالکل مجبور ہو جائے۔ ان مطالبات کی تہ میں یہ نیت کارفرما ہے کہ سارے ملک کا اقتدار ملنے کے بعد من مانے طور پر اقلیتوں اور دوسرے مفادات سے اپنے شرائط تسلیم کرائے جائیں۔ اگر یہ

نیت نہیں تو سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے سے پہلے مسلم لیگ سے مفاہمت کیوں نہیں کی گئی جس کے بغیر کانگریس کے تمام اقدامات کبھی بھی قومی رنگ نہیں اختیار کر سکتے۔

اب انگلستان کے ارباب اقتدار کا کہنا یہ ہے کہ ہندوستان کی طرف سے کوئی اقدام ہونا چاہیئے تاکہ وہ مسئلہ ہند پر از سر نو غور کریں۔ اس اقدام کی صورت کیا ہوگی کسی کو معلوم نہیں۔ کیا مسٹر راجگوپال چاری انگلستان جا کر صلح وصفائی کی کوشش کریں گے؟ اور کیا اُن کی یہ مساعی بارآور ہوں گی یا نہیں اس کی نسبت کوئی رائے فی الوقت نہیں دی جا سکتی۔ سنا ہے کہ سر تیج بہادر سپرو عنقریب والسرائے اور مسٹر جناح سے مل کر کوئی ایسی تجویز پیش کرنے والے ہیں جس سے حکومت اور کانگریس میں کوئی مفاہمت ممکن ہو۔ لیکن اس مفاہمت سے کوئی فائدہ نہیں جب تک کہ کانگریس اپنے اس دعویٰ سے دستبردار نہ ہو کہ صرف وہی پوری ہندوستانی قوم کی نمائندہ جماعت ہے۔ ہندوستانی قوم ہے کہاں؟ پہلے اسے تخلیق کرنا ہے اس کے بعد کسی جماعت کو حق ہوگا کہ وہ اس کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکے۔ ہندوستانی قوم کی تخلیق اُس وقت تک نہ ہوگی جب تک ہمارے نام نہاد قومی لیڈر تنگ نظری اور خیال پستی کو چھوڑ کر وسعت فکر اور حقائق پسندی اختیار نہ کریں گے۔ ہمیں ایمانداری کے ساتھ اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیئے۔ جب تک ہم دلی نہو اس وقت تک ہم وطنی کا جذبہ کبھی پنپ نہیں سکتا۔

دوسرے رسائل

The Indian Journal of Economics بابتہ جولائی ۱۹۴۲ء

"گذشتہ دس سال میں ٹراونکور کی مالیات" از آر۔ این، پوڈوال

ہندوستان کی ممتاز اور ترقی یافتہ دیسی ریاستوں کی مالیات کا مطالعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے خصوصاً اس لئے بھی کہ آجکل صوبہ داری خود مختاری کے تحت قومی تعمیر کے کاموں پر مصارف بیحد ضروری سمجھے جاتے ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ چند دیسی ریاستوں نے بعض تعمیری کاموں پر روپیہ صرف کرنا پہلے ہی سے شروع کر دیا تھا اس مقالہ میں مسٹر پوڈوال نے تفصیلی اعداد و شمار کی مدد سے ٹراونکور کی مالیات پر تنقیدی بحث کی ہے اور یہ امر واضح کیا ہے کہ پچھلے چند سالوں میں حکومت ٹراونکور کی معاشی پالیسی میں بنیادی تبدیلی واقع ہوئی ہے حکومت کا خاص خاص تجارتی کاروبار کو خود اپنے ہاتھوں میں لینا اور معاشرتی خدمات پر فیاضی سے روپیہ صرف کرنا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ حکومت کو عوام کی معاشی فلاح و بہبود کا بہت زیادہ خیال ہے۔ عالمگیر کساد بازاری کے اثرات سے ٹراونکور کو حقیقی معنوں میں ۱۹۳۶ء۔ ۱۹۳۷ء میں نجات ملی کساد بازاری کی وجہ سے مالگزاری، انکم ٹیکس، کروڑگیری، جنگلات، اسٹامپ اور رجسٹریشن کے ذریعہ جو آمدنی ملا کرتی تھی اس میں خاصی تخفیف ہوئی لیکن حکومت نے بہت ہی جلد مختلف ذرائع اور بالخصوص تخفیف مصارف کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے مالیہ میں توازن پیدا کر دیا۔ اس کے بعد ملک کی آمدنی میں اضافہ ہونے لگا۔

۱۹۳۶ء۔ ۱۹۳۷ء کے بعد سے جو چیز قابل ذکر ہے وہ یہ کہ مختلف طریقوں سے حکومت نے تعمیری کاموں پر روپیہ صرف کرنا شروع کیا ہے۔ زرعی ترقی کیلئے جدید طریقوں کا استعمال کیا جانے لگا ہے۔ زرعی اور صنعتی قرضوں میں سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے ایک بنک کا قیام ہوا ہے طبی امداد اور صحت عامہ کی خاطر دیہی رقبوں میں بیروزگار ڈاکٹروں کو دواخانے قائم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور ان کے لئے ادویہ کے ذخیرے فراہم کئے گئے ہیں سر سی، پی، راماسوامی ایر کے تدبر کا نتیجہ ہے۔ کہ پلی واسل (Pallivasal) کی برقی اسکیم نے عملی حیثیت اختیار کی۔ کنڈارا میں سفال گری کی صنعت (Ceramic industry) کا قیام اور سرکاری طور پر نقل و حمل کا انتظام کیا گیا۔ ان تمام کاروباروں کے ذریعہ آمدنی میں اضافہ کے بہت کچھ توقعات وابستہ ہیں اور اسطرح محصول ادا کرنیوالوں پر مزید محصول کا بار عائد کئے بغیر اُن کی ترقی کا سامان مہیا ہو سکتا ہے۔

ع - ق

تنقید و تبصرہ

Indian Trade (ہندوستانی تجارت) از بی۔ وی۔ نارائینا سوامی نائیڈو صدر شعبہ معاشیات جامعہ انا ملے صفحات ۲۷۰ کپڑے کی جلد قیمت دو روپیہ ۱۹۴۲ ملنے کا پتہ انامَلے یونیورسٹی

از جناب ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی۔ صدر شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ

پروفیسر نائیڈو کی یہ کتاب نہایت بروقت شائع ہوئی ہے۔ موجودہ جنگ نے ہندوستان کی تجارت کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے پرانے بازار اور تعلقات درہم برہم ہوگئے ہیں بعض لوگ اسے جنگی تبدیلی سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ جنگ کے ختم ہوتے ہی پھر وہی پرانا سلسلہ شروع ہوجائیگا اس خیال کے لوگ موجودہ اثرات کو عارضی سمجھکر اس کی طرف چنداں توجہ نہیں کرتے لیکن ملک کے کئی سمجھدار لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ جنگ کا نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو دنیا پرانی ڈگر پر پھر واپس نہ آئیگی جو گذر گیا سو گذر گیا۔ موجودہ عارضی تبدیلیاں رنگ لائے بغیر نہ رہینگی۔ ان حالات میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی تجارت کے مسایل کا عمیق مطالعہ کریں پروفیسر نائیڈو نے دس ابواب میں ہندوستان کے لئے تجارت کی اہمیت سے لیکر اسے مختلف دوروں کا تجزیہ اور ان پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے مختلف مراحل سے گذار کر ہمیں ایک ایسی منزل پر پہنچا دیا ہے جہاں سے ہم حالات و واقعات سے کماحقہٗ واقف ہوکر آئندہ کے لئے کوئی مناسب راہ ڈھونڈ سکتے ہیں۔ یہ کتاب غالباً طلبا کے لئے لکھی گئی ہے لیکن عوام بھی اس کے مطالعہ سے مستفید ہوسکتے ہیں۔ کتاب کا نواں باب مجھے بہت مفید اور اہم معلوم ہوتا ہے اس میں فاضل پروفیسر نے ان تمام معاہدات کا

تذکرہ کیا ہے جو گذشتہ دس برس میں ہندوستان نے مختلف ممالک کے ساتھ کئے ہیں۔ اِن معاہدات کے متعلق مواد عام درسی کتابوں میں آسانی سے نہیں ملتا۔ کتاب کا سب سے کمزور حصہ کتاب کا آخری باب ہے جس میں نتائج بیان کئے گئے ہیں یہ باب نہایت مختصر ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلدی کے عالم میں لکھا گیا ہے۔ نتائج نہایت سطحی اور سرسری معلوم ہوتے ہیں۔ کتاب کا تمام اسلوب بیان اکثر علمی متانت اور سنجیدگی سے گریز کر رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فاضل پروفیسر نے پہلے سب نتائج اپنے ذہن میں محفوظ کر لئے تھے اور پھر واقعات بیان کر کے اُن کے نیچے وہ نتائج جڑ دیئے۔ کتاب کا طرز بیان وہی ہے جس کا سودا آجکل تمام ہندوستانیوں کے سروں پر چھایا ہوا ہے یعنی نیشنل۔ مجھے باوجود کوشش کرنے کے آجتک یہ سمجھ میں نہ آیا کہ معاشیات میں اور بالخصوص بین الاقوامی تجارت میں یہ نیشنل کیا بلا ہے۔ اور کسی ملک میں نیشنل مفاد سے کیا مراد ہے؟

مجھ سے کئی مرتبہ بہت بلند مرتبہ لوگوں نے اکثر پوچھا ہے کہ آیا ہندوستان کے لئے شرح تبادلہ ایک شلنگ چھ پنس مفید ہے یا ایک شلنگ چار پنس میں نے اس سوال کے کئی پہلو بتلانے کی کوشش کی ہے لیکن ہمیشہ مجھے یہی کہا گیا ہے کہ تم صرف اتنا بتاؤ کہ ان دونوں میں سے کونسی شرح مفید ہے اِس قسم کا یک طرفہ جواب سیاست دان تو شاید دے سکتے ہیں لیکن ایک ایماندار معاشی کے لئے یہ کام چنداں آسان نہیں میں تو ہمیشہ یہ سمجھتا ہوں کہ ہر ملک کا مفاد اس کے مختلف طبقوں کا مفاد ہے اور یہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو چیز ایک طبقہ کے لئے مفید ہو وہ دوسرے طبقے کے لئے قطعی طور پر نقصان دہ ہو۔ انگلستان میں آزاد تجارت کی پالیسی پر عمل رہا اس سے کارخانہ داروں اور مزدور پیشہ طبقہ کو بہت فائدہ پہنچا کیونکہ اشیائے خوردونوش اور اجناس خام ملک میں سستے داموں میسر آتی تھیں لیکن اِس حکمتِ عملی پر کاربند رہنے سے انگلستان کے زراعت پیشہ طبقہ کو سخت نقصان پہنچا۔ انگلستان میں تو یہ نقصان قابل لحاظ سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ وہاں تو دس فیصد سے بھی کم آبادی کا انحصار زراعت پر ہے لیکن ہندوستان ایسا ملک جس کی آبادی کا ۷۰ فیصد حصہ زراعت پر بسر کرتا ہے اس کے لئے ایسی حکمتِ عملی پر بغیر سوچے سمجھے کاربند ہونا قرینِ دانش نہیں ہے۔ علمی

کتابوں میں تجارت وغیرہ کے متعلق یک طرفہ اسلوب بیان مناسب نہیں ہے۔ ایک پروفیسر کی لکھی ہوئی کتاب میں عام خوش کن سستے جملے زیب نہیں دیتے۔ مثلاً ہندوستان کی بیرونی تجارت کا ذکر کرتے سب سے پہلے پروفیسر نائیڈو اپنے ناظرین سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ پانچ چار اہم باتیں اپنے پیش نظر رکھیں ان اہم باتوں میں پہلی بات یہ ہے۔

"ہندوستان سے جو مال انگلستان کو بھیجا جاتا ہے اُس کا زیادہ حصہ خام مال ہے اور خام پیداوار کی دنیا کے ہر ملک کو ضرورت ہے۔"

جس وقت ہم کالج میں پڑھا کرتے تھے اس وقت کے پروفیسر صاحبان اور مصنفین ہمیں یہ بتایا کرتے تھے کہ تجارتی لحاظ سے ہندوستان کی حیثیت بہت مضبوط ہے۔ ہم زیادہ تر خام مال اور خوردنی اجناس باہر بھیجتے ہیں جن کی ہر ملک کو ضرورت ہے۔ چنانچہ انہیں پروفیسروں اور مصنفین کے مشوروں پر حکومت ہند بھی بہت مدت تک عمل پیرا رہی اور یہاں سے جو مال باہر بھیجا جاتا تھا اس میں سے کئی ایک چیزوں کی برآمد پر بھی محصول عاید کیا جاتا تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہماری حیثیت اجارہ دار کی سی ہے اس لئے ہمیں کوئی پرواہ نہیں۔ یورپ کو چائے کے لئے ہمیشہ ہمارا دست نگر رہنا پڑتا ہے۔ لنکاشائر کی گرنیاں ہماری کپاس کے بل بوتے پر ہی چل رہی ہیں اور بعض لوگ تو اپنی ناسمجھی کے عالم میں یہاں تک کہہ گئے کہ اگر ہم انگلستان کو اجناس خوردنی نہ بھیجیں تو وہاں کے لوگ بھوکے مرجائیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان بیانوں میں کہاں تک حقیقت ہے بیرونی تجارت کے سلسلہ میں ہماری حقیقی حالت کیا ہے! جہاں تک اجناس خورد و نوش کی برآمد کا تعلق ہے ہندوستان کی حیثیت صفر کے برابر ہے بلکہ اب تو برما کی علیحدگی کے بعد سے ہماری حیثیت صفر سے بھی کہیں کم ہوگئی ہے۔ ۱۹۱۸ء سے پہلے ہم کافی گندم کی برآمد کرتے تھے۔ ۱۹۳۲ء تک ہماری اپنی آبادی اور ضروریات میں اضافہ ہونیکی وجہ سے ہماری خالص برآمد نہ صرف غایب ہوگئی بلکہ اکثر سالوں میں ہمیں اپنی ضروریات کے لئے دوسرے ممالک کا دست نگر ہونا پڑا۔ چاول کی حد تک ہم اپنی ضروریات کا دس سے پندرہ فی صد حصہ باہر سے منگواتے ہیں۔ یہ تو وہی اجناس

خوردنی کی حالت اور ہمارا یورپی ممالک کو بھوکے مارنے کا زعم اب جنگ نے ہمیں بتادیا ہے کہ خوردنی اجناس کی حد تک ہماری حالت کسقدر کمزور رہے اور خود ملک کے اندر ملک کی ضروریات کے لئے کافی غلہ موجود نہیں صوبجاتی حکومتیں اب ہر ممکن ذرائع سے "زیادہ غلہ اگاؤ" کی مہم کی نشر و اشاعت کر رہی ہیں۔ خام مال کی حد تک بھی ہماری حیثیت اتنی شاندار نہیں جتنی کے ہم سمجھتے ہیں بلکہ اگر زیادہ عمیق مطالعہ کیا جائے تو ہماری حالت چنداں تشفی بخش نہیں۔

لنکا شائر کی گرنیوں کو بند کرنا تو کیا خود اچھے درجے کا کپڑا بنانے کے لئے ہمیں روئی دوسرے ممالک سے منگوانی پڑتی ہے۔ ہماری تو صورت حال یہ ہے کہ

پہونچی ہیں بے کمالیاں اپنے کمال کو

ہم ہر قسم کے گھٹیاپن میں آگے آگے ہیں ہماری روئی اتنی گھٹیا قسم کی ہے کہ بس جاپان کے علاوہ اس کی فروخت کے لئے آسانی سے بازار مہیا نہیں ہو سکتے۔ اس کے برعکس دنیا میں روئی پیدا کرنیوالوں میں دو اہم ملک ہیں۔ امریکہ اور مصر ان دونوں ملکوں کی روئی نہایت اعلیٰ قسم کی ہوتی ہے لیکن یہ دونوں ملک حیران و پریشان ہیں کہ وہ اپنی روئی کہاں فروخت کریں ان ممالک میں اکثر و بیشتر سالوں میں یہ کوششیں ہوتی رہی ہیں کہ روئی کے زیر کاشت رقبہ کو کم کیا جائے۔ امریکہ میں تو یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ چند مرتبہ کھڑی روئی کے کھیتوں میں ہل چلا دیئے گئے اور فصلیں تباہ کر دی گئیں تاکہ روئی کی زیادہ مقدار بازار میں پہلے سے کم قیمتوں کو اور زیادہ کم نہ کر دے۔ یہ تو رہی روئی کی حالت۔ اسلئے اب ذرا ان اجناس کو بھی دیکھیں جن کا ہمیں اجارہ حاصل ہے انہیں سب سے اہم سن ہے۔ دنیا کے سن کا بہترین حصہ ہندوستان ہی میں پیدا ہوتا ہے اور ہم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اگر ہم ذرا اکڑ جائیں تو دنیا سے سن مانی قیمت وصول کرلیں۔

معاشیات کے ابتدائی اصولوں سے واقفیت رکھنے والے طلباء یہ جانتے ہیں کہ اجارہ دار کو دو میں سے صرف ایک چیز پر اختیار حاصل ہے یعنی یا تو وہ قیمت مقرر کر سکتا ہے یا مقدار فروخت۔ اگر وہ قیمت مقرر کر دے تو مقدار فروخت صارفین کی شرمندہ احسان رہتی ہے اور اگر وہ مقدار فروخت

مقرر کر دے تو پوری قیمت پر اختیار نہیں ہوتا قیمت عام اجناس کی طرح طلب و رسد کی قوتوں کے توازن سے قایم ہوتی ہے اجارہ دار ایک ہی وقت میں یہ نہیں کر سکتا کہ وہ قیمت بھی من مانی مقرر کر دے اور مقدار پیدائش بھی حسب مرضی فروخت کرے۔ دوسرے ہمیں یہ جان لینا چاہیئے کہ اجارہ بڑی حد تک قیمت کے تابع ہے۔ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی بدل ضرور ہوتا ہے۔ اجارہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس قیمت پر آسانی سے کوئی دوسرا بدل دستیاب نہیں ہو سکتا۔ سن کی بھی یہی حالت ہے، سامان بھرنے کے لئے سن کی بوریاں اور تھیلے سب سے سستی چیزیں ہیں سامان کو بھرنے کے لئے اگر کوئی دوسری چیز استعمال کی جائے تو اس کا خرچ سن کے تھیلوں کے مقابلہ میں زیادہ آتا ہے یہی وجہ ہے کہ سن کے تھیلوں کو ہی ترجیح دی جاتی ہے اگر سن کے تھیلوں کے مقابلہ میں کسی دوسری چیز کے تھیلے یا سامان بھرنے کا کوئی دوسرا طریقہ ایجاد ہو جائے تو ہمارا اسن دھرا کی دھرا رہجائیگا۔ چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ معاشی خود اکتفائی کا سودا اکثر ملکوں کے سروں پر اس بری طرح سوار ہوا ہے کہ وہ ہر ممکن طریق سے اپنی ضروریات اپنے ملک کے اندر سے ہی پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں توازن ہائے ادائیگی میں گڑبڑ ہونیکی وجہ سے یہ جنون اور بھی تیز ہو رہا ہے چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ کنیڈا اور آسٹریلیا میں گندم کو بغیر تھیلوں کے ہی جمع کرنے اور جہازوں میں بھرنے کا طریقہ کافی رائج ہو چکا ہے۔

امریکہ میں روئی اس قدر کثرت سے پیدا ہو رہی ہے اور اس کی مانگ اتنی کم ہوتی ہے کہ باوجود زیادہ مہنگے ہونے کے امریکہ میں کپڑے کے تھیلے بننے لگے ہیں۔ کینیڈا میں کاغذ کے تھیلوں کا رواج ہو رہا ہے اور ہماری حالت یہ ہے کہ

یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

اسی طرح چائے کے بازار میں ہمارا ہمسایہ لنکا ہمارا زبردست حریف ہے ادھر جاوا سماٹرا وغیرہ میں اس کی پیدائش بڑھ رہی ہے۔ روغنی تخموں کی حد تک ہمیں ارجنٹائن سے سخت مقابلہ کرنا

پڑ رہا ہے وہ ملک منظم ہو کر بیرونی بازاروں پر چھا جانے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہم سمجھ رہے ہیں کہ دنیا ہماری اجناس کے بغیر قایم ہی نہیں رہ سکتی۔

اگر گذشتہ ۲۰ برس کی دنیا کی تجارت کا عمیق مطالعہ کیا جائے۔ تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ بازار حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ میں خام اور خوردنی اجناس پیدا کرنے والوں نے بہت زیادہ سرگرمی دکھائی ہے۔ اور انہی لوگوں کو بڑھتی ہوئی دقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ خام مال اور زرعی اجناس کی قیمتیں ساختہ اشیا کی قیمتوں کے مقابلے میں بہت پیچھے رہی ہیں۔ ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۹ء جو امریکہ میں انتہائی خوشحالی کا زمانہ گنا جاتا ہے۔ اس گرم بازاری کے دور میں بھی خام اور خوردنی اجناس کی قیمتیں بہت پست رہیں۔ ان قیمتوں کے تفاوت کو درست کرنے کے لئے روز ویلٹ نے ۱۹۳۳ء میں اپنی "اے۔ اے۔ اے" کی مہم شروع کی "اے۔ اے۔ اے" سے مراد اگریکلچرل ایڈجسٹ منٹ ایکٹ لیا جاتا ہے ۔ اس قانون کے پاس کرنے کا مقصد یہ تھا کہ زرعی اجناس کی جو قیمتیں پست ہو رہی تھی۔ ان کو استوار کیا جائے۔ اور زرعی اور صنعتی اجناس کی قیمتوں کے درمیان جو خلیج بڑھ رہی تھی اس کو کم کیا جائے۔ ۱۹۳۲ء میں اوٹاوہ کے مقام پر جو شاہی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس میں برطانیہ سے کہیں بڑھ چڑھ کر نوآبادیات اور مملکتوں کے نمائندوں نے سرگرمی دکھائی برطانوی مملکتوں میں زیادہ تر خام مال اور زرعی اجناس پیدا کی جاتی ہیں۔ اور انہی ملکوں کے نمائندے اس بات کے لئے کوشاں تھے کہ برطانیہ کو ان کی پیدا کردہ اجناس خریدنے پر مجبور کیا جائے۔ ۱۹۳۱ء میں جب انگلستان نے معیار طلا ترک کیا۔ تو یورپ کے وہ ممالک جو برطانیہ کے ساتھ تجارت کرتے تھے اپنی تجارت کے تحفظ کے لئے انہیں بھی اس معیار کو خیرباد کہنا پڑا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ڈنمارک جو برطانیہ کے بازاروں میں نیوزی لینڈ کے مکھن اور دیگر اشیائے خوردنی کے لئے نیوزی لینڈ کا حریف ہے۔ اس نے اس خیرباد کی رسم میں سب سے سبقت لے لی۔

زرعی اجناس اور خام مال پیدا کرنے والے ممالک کی حکومتیں ہمیشہ اسی تگ و دو میں رہتی ہیں کہ کسی طرح وہ اپنے ممالک کا مال دوسرے ملکوں میں زیادہ سے زیادہ مقدار میں بھیجنے میں کامیابی

حاصل کریں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے رنگارنگ کی کوششیں کی گئی ہیں۔ ملک کا بہتر سے بہتر مال باہر بھیجا جاتا ہے۔ اس کی درجہ بندی کے متعلق کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔ اور اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے کہ اس معیار میں ہمیشہ ہموار پن اور یکسانیت رہے۔ مال کی درجہ بندی پر زور دیا جاتا ہے۔ حکومت کی طرف سے اس مال کی جانچ پڑتال کرنے کے لئے افسر مقرر کئے جاتے ہیں مثال کے طور پر آسٹریلیا کو لے لیجئے۔ آسٹریلیا میں مکھن کی برآمد پر اسی قسم کی پابندیاں عائد کی گئیں برآمد کا انتظام ایک برآمدی ادارے کے ہاتھ میں ہے۔ جو "بٹر کنٹرول بورڈ") کے نام سے موسوم ہے۔ جو مکھن آسٹریلیا سے باہر بھیجا کرتا ہے۔ یہ ادارہ اس کی نگرانی کرتا ہے۔ آسٹریلیا سے جو مکھن باہر بھیجا جاتا ہے۔ اس پر "کنگرو" کا نشان لگایا جاتا ہے۔ اور اس کو "کنگرو چھاپ" مکھن کہتے ہیں۔ یہ آسٹریلیا کا بہترین مکھن ہوتا ہے۔ جو بہترین قسم کی تازہ کریم سے بنایا جاتا ہے۔ مکھن باہر بھیجے جانے سے پہلے حکومت کے مقرر کردہ انسپکٹر باہر جانے والے مال میں سے چار یا پانچ فی صد مال کا امتحان کرتے ہیں۔ اور پتہ چلاتے ہیں کہ یہ مکھن مقررہ فواید کے مطابق تیار کیا گیا ہے یا نہیں اگر کوئی کنستر مقررہ معیار سے گرا ہوا ہو تو تمام کا تمام مال روک لیا جاتا ہے۔ آسٹریلیا کی حکومت کی کوششیں صرف یہاں ہی ختم نہیں ہوتیں۔ بلکہ آسٹریلیا کی حکومت نے محسوس کیا کہ انگلستان کے بازاروں میں آسٹریلوی مکھن کی بجائے ڈنمارک کا مکھن کہیں زیادہ آسانی سے فروخت ہوتا ہے۔ اہل انگلستان کو آسٹریلیا کے مکھن کی خوبیوں سے آگاہ کرنے کے لئے آسٹریلیا کی حکومت نے کئی لاکھ روپئے اشتہارات پر صرف کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آسٹریلیا کے مکھن کی مقدار فروخت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔

ادھر ہم ہیں کہ ہندوستان کا مال جو باہر بھیجا جاتا ہے۔ وہ اپنے گھٹیا پن کے لئے دنیا کے بازاروں میں بہت خاص شہرت رکھتا ہے۔ ایک تو پہلے ہی ہمارا مال گھٹیا ہوتا ہے۔ دوسرے برآمدی مال پر کسی قسم کی معیاری نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے گھٹیا تجارتی ہتھکنڈے بے روک ٹوک استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً ہماری روئی کو لے لیجئے۔ ہندوستان کی روئی پہلے تو ویسے ہی مصر اور امریکہ

کی روئی سے گھٹیا ہوتی ہے۔ رہی سہی کسر روئی میں ریت اور نمی کی آمیزش سے پوری کردی جاتی ہے۔ ہندوستان اگر بیرونی تجارت میں ترقی کرنا چاہتا ہے۔ تو اس کو اپنی گذشتہ تمام پالیسی پر نظرثانی کرنا پڑیگی۔ اور یہ بے بنیاد سودا دل سے نکالنا پڑیگا۔ کہ دنیا ہمارے مال کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔ معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ اور اگر ہندوستان کی طرف سے باضابطہ منظم کوششیں نہ کی گئیں تو بہت جلد ہماری حالت بد سے بدتر ہوجائے گی۔

یہ چند معترضہ جملے کتاب زیر تبصرہ کی وقعت کو کم نہیں کرتے۔ یہ کتاب نہایت محنت سے لکھی گئی ہے۔ اور طلباء کے لئے بہت مفید معلوم ہوتی ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ کارکنان اناملہ یونیورسٹی کی کاروباری کارکردگی ہے۔ کتاب اگست ۱۹۴۲ء میں مجھے ملی۔ پروفیسر نائیڈو نے اس کتاب پر جو دیباچہ لکھا ہے۔ وہ جون ۱۹۴۲ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس کتاب پر پیش لفظ "سر شینکم چیٹی" نے لکھا ہے۔ جو چند ماہ پیشتر تک امریکہ میں ہندوستان کے تجارتی نمائندے تھے۔ حال ہی میں واپس تشریف لائے ہیں۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کتاب چند ماہ میں ہی چھپکر تیار ہوئی ہے۔ کتاب کی جلد عمدہ کپڑے کی ہے اس کا سرورق نہایت خوشنما ہے۔ کتاب کا کاغذ نہایت دبیز اور عمدہ ہے صفحات کی تعداد جیسا کہ اُوپر ذکر کیا جاچکا ہے (۲۷۰) ہے لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود کتاب کی قیمت محض ۳ روپئے ہے۔ گذشتہ تین برس کے عرصہ میں اناملہ یونیورسٹی نے معاشیات کے متعلق تقریباً دس کتابیں پروفیسر نائیڈو کی ادارت میں شائع کی ہیں۔ یہ کتابیں اپنی نوعیت اور موضوعوں کے لحاظ سے نہایت ہی اہم ہیں۔ مثلاً ۱۹۳۷ء میں حکومت مدراس نے مقروضین کی امداد کے لئے جو ایکٹ پاس کیا تھا اس کے متعلق ایک کتاب ۱۹۳۸ء میں شائع کی۔ اسی سال میں جب کانگریس نے ترک مسکرات کی پالیسی پر عمل شروع کیا۔ اور سیلم کے ضلع میں کلیتاً مسکرات کی فروخت کو ممنوع قرار دیا۔ تو تمام ہندوستان کے باخبر حلقے یہ جاننا چاہتے تھے کہ اس پالیسی کا کیا اثر ہوا۔ چنانچہ اس قانون کے ۶ ماہ تک عمل پذیر رہنے کے بعد اس کا اندازہ کرنے کے لئے اناملہ یونیورسٹی نے اپنے محققین کو بھجوا کر صورت حالات کی جانچ پڑتال کروائی۔ اور اس کے نتائج ایک کتاب کی صورت میں

شائع کئے۔ اسی طرح انٹرمیڈیٹ کے طلبار کے لئے تامل زبان میں ایک کتاب تالیف کی گئی۔ تین برس کے عرصہ میں تقریباً دس کتابیں شائع کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے اور وہ بھی انامل جیسے ننئے خانگی ادارے کے لئے جس کی مالی حالت کچھ ایسی زیادہ عمدہ نہیں ہے۔ اس پر خوبی یہ ہے کہ اس کتاب کی قیمت بالکل واجبی رکھی گئی ہے۔ اور اکثر و بیشتر کتابیں علمی اداروں اور ذی علم ارباب کو مفت نذر کی جاتی ہیں۔ تاکہ علم کی زیادہ سے زیادہ ترویج و اشاعت ہو۔

اس کے برعکس ہماری یونیورسٹی ہے جہاں بفضل تعالیٰ سلطنت آصفیہ کی علم پروری اور فیاضی کی وجہ سے مالی تنگ دامانی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ علمی خدمت کے متعلق بالخصوص اُردو کے ذریعہ ہمارے دعوے بہت بلند ہیں۔ لیکن جہاں تک عملی کام کا تعلق ہے ہماری کوششیں ہمارے اخراجات کے مقابلے میں بہت ہی حقیر معلوم ہوتی ہیں۔ معاشیات اس یونیورسٹی میں گذشتہ ۲۰ برس سے اردو زبان میں پڑھائی جاتی ہے۔ جامعہ کی طرف سے معاشیات کی حد تک اس وقت تک معاشیات کی کوئی تحقیقی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ تراجم کی حد تک صرف ایک درجن کتابوں کا ترجمہ اب تک شائع ہوا ہے۔ حال ہی میں مجھے پنجاب کوآپریٹیو یونین لاہور نے اپنے تراجم تصانیف و تالیفات کا ایک پورا سلسلہ تحفتاً بھیجا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر انتہائی حیرانی ہوئی۔ کہ ایک نامعلوم گمنام سے صوبجاتی ادارے نے اِس وقت تک معاشیات کی دس متند کتابوں کا ترجمہ اُردو میں شائع کیا ہے۔ ایک یونیورسٹی جو اُردو میں تعلیم کا دعویٰ کرتی ہے۔ جہاں معاشیات کی ایم۔ اے۔ تک تو کیا پی۔ ایچ۔ ڈی۔ تک اُردو میں تعلیم ہوتی ہے۔ وہاں بیس برس کے طویل عرصہ میں صرف ایک درجن معاشیات کی کتابوں کا ترجمہ ہوتا ہے۔ جس پر بلاشبہ کئی لاکھ روپے صرف ہوئے ہونگے۔ لیکن ایک مختصر سا گمنام صوبجاتی ادارہ دس۔ بارہ برس کے عرصے میں دس متند کتابوں کا ترجمہ شائع کرتا ہے۔ ہمارے یہاں اگر ایک کتاب کا ترجمہ دو برس میں ہوتا ہے تو دوسروں کے یہاں وہی ترجمہ چار۔ چھ ماہ میں ہو جاتا ہے۔ ہمارے یہاں جو کتاب دو برس میں چھپتی ہے باوجود اس کے کہ ہمارے یہاں اپنا مطبع موجود ہے۔ دوسروں کے یہاں وہی کتاب

باوجود اپنا مطبع نہ ہونے کے تین چار ماہ میں شائع ہوجاتی ہے۔ ہمارے یہاں جس کتاب کی قیمت آٹھ۔ دس۔ روپیے سے کم نہیں رکھی جاتی۔ دوسروں کے یہاں وہی کتاب دو۔ ڈہائی روپیے میں ملجاتی ہے ہمارے یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ اس بات کی کوشش کی جاتی ہے۔ کہ کسی اُردو ترجمہ کی قیمت اصل انگریزی کتاب سے بڑھنے نہ پائے۔ محدود کاروباری نقطۂ نگاہ سے یہ پالیسی مفید ہو تو ہو لیکن علمی لحاظ سے اور بالخصوص ادبی خدمت کی حد تک یہ پالیسی بالکل بے معنی ہے۔ کیونکہ اُردو داں طبقہ انگریزی داں طبقہ سے مقابلتاً کہیں زیادہ غریب ہے۔ اور وہ اتنی قیمت ادا نہیں کرسکتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ جامعہ عثمانیہ کی پالیسی کے بالکل برعکس پنجاب کوآپریٹیو یونین نے انگریزی کتابوں کی قیمت کے مقابلے میں اُردو ترجموں کی قیمت برائے نام رکھی ہے۔ ذیل میں ہم ایک فہرست درج کرتے ہیں جس سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہاں یہ بیان کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ جتنی کتابیں ہیں سب کی سب سنہری مجلد ہیں:-

نام کتاب	نام مصنف	حجم	انگریزی قیمت	اُردو قیمت
۱۔ داستان دہقان	ڈارلنگ	۳۵۰ صفحات	دس روپیے	دو روپیے
۲۔ دیہاتی زندگی	”	۴۴۸ ”	آٹھ ”	ڈہائی ”
۳۔ مناظر امداد باہمی	”	۳۰۳ ”	چار ”	دو ”
۴۔ امداد باہمی اور ہندوستان	مکرجی	۶۴۴ ”	پانچ ”	تین روپے
۵۔ مالیات دیہات	ہیرک	۵۹۶ ”	آٹھ ”	تین ”
۶۔ آئینۂ پنجاب	کیلورٹ	۴۳۰ ”	پانچ ”	بارہ آنے
۷۔ جمہوریت امداد باہمی	ہو	۱۹۲ ”	پانچ ”	چار آنے
۸۔ اِمداد باہمی اور برہما	بریٹو	۱۷۳ ”	چار روپے	”
۹۔ معاشیات دیہات	کارور	۴۴۸ ”	آٹھ ”	بارہ آنے
۱۰۔ بنک ہائے عوام	وولف	۵۶۰ ”	آٹھ روپے	تین روپے

۱۱- حیاتِ دیہات	سید ظہور حسین شاہ	۱۷۶	تالیف	آٹھ آنے
		۶	۶۵ روپے	۱۸ روپے

اِس جدول سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اِن گیارہ کتابوں کی مجموعی انگریزی قیمت ۶۵ روپے ہے اور اُردو تراجم کی صرف (۱۸) روپے ہے۔ اَب ذرا جامعہ عثمانیہ کی شائع شدہ تصانیف پر بھی نظر ڈالیئے۔

نام کتاب	نام مصنف	حجم	انگریزی قیمت	اُردو قیمت کلدار
معاشیات ہند	بیرجی		تین روپے آٹھ آنے	تین روپے آٹھ آنے
معاشی تاریخ ہند جلد اول	ادیش چند دت	۴۸۸	چھ روپے چار آنے	چھ روپے چار آنے
،، ،، دوم	،،	۶۸۱	سات روپے ،،	سات روپے ،،
معاشیاتِ ہند	الیاس برنی	۸۲۶	تالیف	پانچ روپے ،،
اُصول معاشیات	،،	۶۱۹	،،	،، بارہ آنے
تاریخ ،،	انگرم		چار روپے بارہ آنے	چار ،، ،،
مقدمہ ،،	سورنیڈ		تین روپے	تین روپے
اُصول ،،	ٹائنگ جلد اول	۸۱۴		
،، ،،	،، ،، دوم			
مبادت	توڈ		چار روپئے	چار روپے دو آنے
میفوم زر	وودرز			
	،،		،،	،، ،،

دونوں جدولوں کے مقابلے سے ہماری علم پروری کا پتہ چلتا ہے۔ بہ نفسہٖ اِن دونوں جدولوں کے مقابلے سے حقیقی صورت حال کا پتہ نہیں چلتا حقیقی صورتِ حال کا پتہ اُس وقت چلتا ہے جب یہ پوچھا جائے کہ بقدرِ گراں قیمت رکھنے پر جامعہ عثمانیہ کی تصانیف کی فروخت سے کیا رقم حاصل ہوئی۔ اور پنجاب کو آپریٹو یونین کو اِن کتابوں کی فروخت سے کیا رقم حاصل ہوئی۔ ہماری کتابوں کے انبار دارالترجمہ کی الماریوں میں مقفل رہتے ہیں۔ اِس لئے کہ اکثر حضرات اِس گراں قیمت پر یہ تصانیف خرید نہیں سکتے۔ اگر یہ کتابیں

طلباء کے فائدے کے لئے لکھی گئی ہیں۔ تو اُن کے لئے بھی اُن کی خریداری ممکن نہیں ہے۔ بالخصوص عثمانیہ کے طلباء کے لئے جو تعلیمی فیس تک ادا نہیں کر سکتے۔ یہ کتابیں علم دوست حضرات تک آسانی سے نہیں پہنچتیں۔ یہ بھی ہماری تجارت کا ایک پہلو ہے جو ہمدردانہ غور و فکر کا محتاج ہے۔

The Strategy of Freedom از ہیرلڈ جے لاسکی (صفحات ۱۲۳ قیمت ۵ شلنگ شائع کردہ جارج ایلن اینڈ اینون لمیٹڈ۔ لندن)

اِس میں لاسکی نے نوجوانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ موجودہ جنگ میں برطانیہ کو کامیاب بنانے اور ہٹلر اور اسکے فلسفۂ حیات کو دنیا سے مٹانے کے لئے اپنی توانائیوں کو وقف کر دیں۔ خاص طور پر امریکہ کے نوجوانوں سے خطاب کیا گیا ہے اور اُن کے جذبات عالیہ نیز ذاتی مفاد سے اپیل کی گئی ہے کہ بغیر برطانیہ کی کامیابی کے اُن کا مستقبل خطرہ میں پڑ جائے گا اور اُن کے ساتھ موجودہ تہذیب و تمدن کا مستقبل بھی۔

پروفیسر لاسکی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ جنگ گذشتہ جنگ عظیم کی طرح شہنشاہی مفاد کے لئے نہیں لڑی جا رہی ہے بلکہ انسانی مقاصد کے لئے۔ اگرچہ پروفیسر موصوف کو اِس کا اِعتراف ہے کہ ہندوستان کے ساتھ جو برتاؤ روا رکھا گیا ہے وہ کسی طرح بھی حق بجانب نہیں لیکن اگر ہندوستان میں برطانوی حکومت نہ رہے اور جاپان کو غلبہ و استیلا حاصل ہو جائے تو آئندہ سو سال تک وہاں کوئی شخص آزادی یا حقوق کا نام اپنی زبان پر نہ لا سکے گا۔ پروفیسر لاسکی کا خیال ہے کہ اگر اس جنگ میں برطانیہ کو کامیابی حاصل ہوئی تو ان انسانی مقاصد کو بروئے کار لانا زیادہ آسان ہوگا جو انسانیت کو عزیز ہیں بہ مقابلہ اس حالت کے جب کہ ہٹلر اور اس کے ساتھیوں کو کامیابی حاصل ہو۔

امریکہ کے نوجوانوں میں خاص طور پر موجودہ جنگ کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں اُن کو پروفیسر لاسکی نے رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ انداز بیان دلنشین اور کہیں کہیں خطیبانہ ہے۔ موصوف کی دوسری تحریروں کی طرح یہ کتاب بھی اس لائق ہے کہ ہر سیاست سے دلچسپی رکھنے والا شخص اس کو پڑھے۔

ہمارے بچے | از پروفیسر جگدیش سنگھ۔ پریت لڑی پبلشرز۔ پریت نگر (پنجاب) قیمت عہ

صفحات ۱۵۶۔

اِس کتاب میں سائنٹفک طریقہ پر ان اصول کو بتلایا گیا ہے جو ہندوستانی گھروں میں بچے کے پیدا ہونے کے وقت سے لے کر اس کے اِسکول جانے تک والدین کے پیش نظر رہنے چاہئیں۔ اِس ضمن میں ہندوستانیوں کی معاشی خرابیوں کی طرف مصنف نے اِشارہ کئے ہیں جن کی اِصلاح ترقی پسند تمدنی زندگی کے لئے ازبس ضروری ہے۔ چھوٹے بچوں کی عادتوں کھلونوں کے اِنتخاب، بچے پر والدین کی زندگی کا اثر اور بچے کے عام ماحول کے متعلق دلچسپ اور مفید معلومات درج ہیں۔ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کے علاوہ عام پبلک بھی اِس کتاب سے اِستفادہ کرسکتی ہے۔

مکتبۂ جامعہ کی نئی کتابیں

خطوط محمد علی۔ یہ اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا نے اپنے عزیزوں، دوستوں اور ملک کے سربرآوردہ حضرات کو لکھے تھے۔ اُن میں سے چند خط اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور بقیہ محمد علی میوزیم مکتبۂ جامعہ سے لئے گئے ہیں۔

کسی شخص کے خط صحیح معنوں میں اس کی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ سوچتا ہے اور جو اس کے دل پر گزرتی ہے بلا تکلف اپنے دوستوں کو لکھ دیتا ہے۔ مرحوم کا تو یہ حال تھا کہ وہ سیاست تک میں زمانہ سازی اور ظاہرداری کے قائل نہ تھے اور اپنے دوستوں کو لکھنے میں تکلیف نہ برتتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ خطوط ہندوستان کے ایک ہنگامہ خیز دور کی تاریخ کے ابواب ہیں اور مرحوم کی شخصیت کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ۔ حجم ۲۰۳ صفحات۔ قیمت عہ

بحر الکاہل کی سیاست۔ مصنفہ امین خالدی۔ اس مقالے میں مصنف نے بحر الکاہل کی سیاسی اور معاشی اہمیت ظاہر کی ہے۔ موصوف نے امریکہ، جاپان، روس، انگلستان اور چین کے مفاد کے باہمی اتحاد اور ان کی ایک دوسرے سے ٹکر کے امکانات پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔ قیمت عہ روپیے۔

اسلامی ممالک کی سیاست۔ مصنفہ عشرت علی۔ مصنف نے اس کتاب میں مختلف اسلامی ملکوں کی سیاسی اور تاریخی ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ جنگ عظیم سے پہلے مصر، ترکی، عراق، عرب اور ایران وغیرہ کی سیاسی اہمیت کیا تھی اور جنگ عظیم کے بعد ان ملکوں میں کس قسم کی نئی سیاسی تحریکیں اٹھیں، اُن کا کیا حشر ہوا اور موجودہ وقت میں ان کی سیاسی اور جنگی حیثیت کیا ہے۔ قیمت عہ روپیے۔

قومیت اور بین اقوامیت۔ مصنفہ محمد قاسم حسن۔ مصنف نے اس مقالے میں قومیت کے مفہوم کی تشریح کی ہے اور اس کے عناصر سے بحث کی ہے نیز بتایا ہے کہ قومیت کا ارتقا کس طرح ہوا، مشرق میں قومیت کا تصور کیا ہے اور یورپ والے کس قسم کی قومیت کے قائل ہیں۔ اس مسئلہ کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ بین اقوامیت کے تخیل کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ اسکا موجودہ تصور کیا ہے اور مستقبل میں اس کی کیا نوعیت ہوگی۔ آخر میں انجمن اقوام کی ہیئت، اس کے ارتقا، اس کی کارگزاریاں اور اس کی ناکامی کے اسباب پر بھی تبصرہ ہے۔ قیمت عہ روپیے۔

نازیت۔ مصنفہ شاہد حسین رزاقی۔ یہ سمجھنا کہ نازیت کا تخیل ہٹلر کی دماغی پیداوار ہے اور ہٹلر نہ رہے تو

نازیت خود بخود ختم ہوجائے گی بالکل غلط ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہٹلر نازیت کی پیداوار ہے اور یہ نظریہ دراصل ایک جدید ارتقاء کا نتیجہ ہے جسے ہٹلر نے پروان چڑھایا۔ مصنف نے آخر میں نازیت کے اچھے اور برے پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا ہے۔ قیمت عاں روپئے۔

ناموران سیاست۔ موجودہ جنگ کی وجہ سے ہر شخص کو سیاسی معاملات سے خاص دلچسپی پیدا ہوگئی ہے ہٹلر، مسولینی، روزولٹ، اسٹالن، چرچل اور عصمت انونو ہر شخص کی زبان پر رہتے ہیں۔ ان کے حالات سے ناواقفیت کی بنا پر معاملات صحیح طور پر سمجھنے میں کبھی کبھی دشواری پیدا ہوتی ہے۔ اس کتاب میں ایشیا اور یورپ کے انھیں مسلمہ سیاسی رہنماؤں کے حالات درج ہیں اس میں بہت سے ایسے لوگوں کے حالات بھی ملیں گے جو غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے لیکن اپنی ہمت کی رہنمائی سے آج بڑی بڑی سلطنتوں کی آزادی اُن کے رحم وکرم پر موقوف ہے۔ قیمت حصہ اول ۶ر حصہ دوم "مشاہیر عالم" زیر ترتیب ہے۔

ٹروٹسکی۔ مترجمہ ایم، ایم، جوہر۔ ٹروٹسکی کو کون نہیں جانتا موجودہ روسی حکومت نے اسے باغی قرار دیدیا تھا۔ اس کے جو ساتھی اب تک روس میں موجود تھے ۱۹۳۷ء میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ ان مجرموں نے اپنے جرم کی ذمہ داری ٹروٹسکی پر ڈال دی۔ ٹروٹسکی کی صفائی اور غداری کی خاطر امریکہ میں ایک کمیشن بنایا گیا جس نے ٹروٹسکی کے بیانات لئے۔ یہ کتاب انہی بیانات کا خلاصہ ہے۔ اس میں ان تمام کارناموں کا کچا چٹھا ہے جو روس میں اشتراکیت کے پردے میں کئے جارہے ہیں۔ شروع میں روسی انقلاب کی مختصر سی تاریخ بھی آگئی ہے۔ زبان اتنی صاف اور سہل ہے کہ معمولی استعداد کا آدمی بھی اچھی طرح ذہن نشین کرسکتا ہے۔ قیمت دس آنے۔

بت تراش از پروفیسر اشتیاق حسین قریشی۔ اس ڈرامے میں مصنف نے ایک بت تراش کی نفسی کیفیات کی تصویر کھینچی ہے اور اسی سلسلے میں حسن و عشق اور دنیا کی تخلیق میں رنج و مسرت کے وجود پر ایک فلسفیانہ نظر ڈالی ہے۔ انداز تحریر اس قدر دلکش ہے کہ پڑھنے والا مصنف کی نظر سے دیکھتا ہے اور اُسی کے دماغ سے سوچتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ قیمت عہ

صدر دفتر مکتبہ جامعہ، قرول باغ، نئی دہلی

شاخیں ۱۔ مکتبہ، جامع مسجد دہلی۔ ۲۔ مکتبہ جامعہ، بیرون لوہاری دروازہ، لاہور۔ ۳۔ مکتبہ جامعہ امین آباد لکھنو۔ ۴۔ مکتبہ جامعہ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳۔

سول ایجنسیاں۔ ۱۔ کتاب خانہ عابد شاپ۔ حیدرآباد دکن۔ ۲۔ سرور بک ایجنسی بازار قصہ خوانی پشاور

سیاست، ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ء

کتب خانہ

حیدرآباد میں یوں تو کئی کتب خانے ہیں لیکن کمیاب، نادر اور جدید اردو، ادبی، تاریخی، مذہبی و اخلاقی کتب مکمل طور سے ایک جگہ کہیں بھی دستیاب نہیں ہو سکتی تھیں۔ یہ کمی حیدرآباد کے قدیم پچاس سالہ کتبخانہ "سید عبدالقادر اینڈ سنس" چار مینار نے پوری کردی ہے۔ مثال کے طور پر مولوی سید علی بلگرامی مرحوم کی شہرۂ آفاق کتاب "تمدن عرب" کو جو کہ مدتوں سے نایاب تھی اور جو سو روپیہ پر بھی نہیں مل سکتی تھی اس کتب خانہ کے مالک ہمت کر کے دوبارہ نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کی اور اس کی قیمت صرف ۵۰ روپیہ رکھی۔ فون نمبر (۳۴۰۱)

اس کتب خانہ کے زیر اہتمام ایک خاص شعبہ قائم ہے جو مشہور مؤلفین و مصنفین کی کتب کے شائع کرنے کا انتظام کرتا ہے۔ جو اہل قلم حضرات اپنی تصانیف کو شائع کرنا چاہتے ہیں اس کے متعلق ہر وقت مشورہ فرما سکتے ہیں۔ اس کتب خانہ کے تحت ایک پریس بھی ہے جو اعظم اسٹیم پریس کے نام سے مشہور ہے۔ جہاں ہر قسم کا رنگین و سادہ کام بکفایت اور وعدہ کی پابندی کے ساتھ ہوتا ہے۔ فون نمبر (۳۴۰۲)

معزز حضرات کی سہولت کی خاطر اس کتب خانہ کی ایک شاخ موسومہ سید عبدالرزاق تاجر کتب عابد روڈ پر بھی قائم کی گئی ہے جہاں اردو، انگریزی لٹریچر کا کثیر اسٹاک موجود ہے جہاں تشریف فرما ہو کر کتب ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔ فون نمبر (۲۸۰۷)
